www.Paksociety.com
AUGUST 2011
ماہنامہ
کرن
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com
Scan & PDF
WWW.PAKSOCIETY.COM

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

مستقل سلسلے

اگست 2011

جلد 34 شمارہ 5

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 600 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 6000 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

اداریہ

مدیرہ

اگست کا کرن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

رمضان المبارک کا مہینہ سایہ فگن ہے۔ فرمان الٰہی ہے: "رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ لوگوں کے لیے ہدایت اور رہنمائی اور فیصلے کی روشن باتیں۔ تو تم میں جو کوئی یہ مہینہ پائے ضرور اس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں پورے کرے۔ اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے۔ تم پر دشواری نہیں چاہتا اور اس لیے کہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت کی۔"

حقیقت یہ ہے کہ جس نے پرہیزگاری اختیار کی، احکام الٰہی اور تعلیمات رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر چلا وہی شخص کامیاب ہوا لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اس ماہ مقدس میں فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ نوافل کا بھی اہتمام کریں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگیں تاکہ جنت پانے والوں میں ہمارا شمار ہو جائے۔

پاکستان 27 رمضان المبارک کو وجود میں آیا۔ پاکستان کے قیام کے سلسلے میں ہمارے بزرگوں نے جو قربانیاں دیں ہم وہ فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ محبتوں کی جگہ نفرتوں کو ذہن میں جگہ دے رہے ہیں۔ ہمیں سوچنا ہو گا اپنے ملک کی بقا کے لیے اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔ ہم میں اخوت و بھائی چارے کے جذبے کو ابھارے۔ پاکستان ہے تو ہم ہیں۔ ہماری شناخت صرف اور صرف پاکستان ہے۔

ادارہ کرن کی طرف سے قارئین کو ماہ رمضان کی آمد اور جشن آزادی مبارک۔

اس شمارے میں،

- اداکارہ "انوشے عباسی" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکار "شہود علوی" دو کے پہاڑے کے ساتھ،
- اداکارہ "ماریہ واسطی" قارئین کی عدالت میں،
- مجھ سے ملیے "دلِ تمن بلال" کی باتیں،
- "آواز کی دنیا سے" ایف ایم 107 کے پریزنٹر "عدیل اظہر" کی باتیں،
- "دستِ کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول،
- "دردِ دل" نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول،
- "او رے پیا" نایاب جیلانی کے طویل مکمل ناول کی دوسری قسط،
- "اسیرِ موسم ہجراں" صنوبر نادیہ ساحر کے ناول کی تیسری اور آخری قسط،
- سعدیہ عزیز آفریدی، روشنی بخاری اور شاہدہ ملک کے ناولٹ،
- نازیہ جمال، ام ثمامہ، راؤ سمیرا ایاز اور ام طیفور کے افسانے، اور مستقل سلسلے،

مفت،

رمضان المبارک میں سحر و افطار میں دسترخوان سجائیں۔ کرن کتاب "سحر و افطار اسپیشل" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔ استفادہ کریں۔

محمود خاور کی برسی،

کچھ لوگ دنیا میں محبتیں بانٹنے اور سمیٹنے آتے ہیں۔ ان کی ذات سایہ دار شجر کی طرح ہوتی ہے۔ محمود خاور صاحب بھی ایسی ہی ہستی تھے۔ بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول، سب سے محبت کرنے والے۔ ایسے لوگ دنیا سے چلے بھی جائیں تو ان کی یادیں انہیں زندہ رکھتی ہیں۔

20 اگست کو محمود خاور کی برسی کے موقع پر آپ سب سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

نہ کوئی اس کا ثانی ہے جہاں میں
ہر اک شے میں وہی جلوہ نما ہے

وہی تو چارہ گر ہے کُل جہاں کا
مصائب میں وہی مشکل کُشا ہے

سمجھ سے بالا ہے حکمت خدا کی
کسی پہ اُس کا عقدہ کب کھلا ہے

ہر اک شے اُس کی ہے تخلیق کردہ
حقیقت میں وہی سب سے بڑا ہے

وہی ہے مالک و خالق جہاں کا
ہمیں اس کی مدد کا آسرا ہے

اقبال آرزو

خدا کی عظمتیں کیا ہیں محمدؐ مصطفیٰ جانے
مقامِ مصطفیٰؐ کیا ہے حقیقت میں خدا جانے

صدا کرنا میرے بس میں تھا میں نے تو صدا کر دی
وہ کیا دیں گے میں کیا لوں گا سخی جانے گدا جانے

میری مٹی مدینے پاک کی راہ میں بچھا دینا
کہاں لے جائے گی مجھ کو مدینے کی ہوا جانے

کہا جبرئیلؑ نے سدرہ تلک میری رسائی ہے
ہے کتنی منزلیں آگے نبیؐ جانے خدا جانے

ہمیں تو سرخرو ہونا ہے آقاؐ کی نگاہوں میں
زمانے کا ہے کیا ناصر بھلا جانے برا جانے

سید ناصر چشتی

انوشے عباسی سے ملاقات

شاہین رشید

اکثر والدین اپنے بچوں کو اپنے پروفیشن میں ہی لانا پسند کرتے ہیں۔ اس طرح فنکاروں میں بھی یہ ٹرینڈ ہے کہ ان کے بچے ان کی فیلڈ میں آئیں۔ آج کل ڈرامہ سیریل "ٹوٹے ہوئے پر" میں آپ ایک کم عمر مگر فریش چہرہ دیکھ رہے ہوں گے "نمرہ" کے روپ میں جن کی اداکاری خاصی جاندار ہے انوشے عباسی معروف رائٹر زبیر عباسی کی صاحبزادی اور جویریہ عباسی اور شمعون عباسی کی بہن اور سیما غزل کی بھتیجی ہیں۔

معصوم خدوخال کی مالک انوشے عباسی "ٹوٹے ہوئے پر" میں بہت اچھا پرفارم کر رہی ہیں۔ آیئے ان سے آپ کی ملاقات کرواتے ہیں۔

☆ "کیسی ہیں؟ انوشے کا مطلب کیا ہے اور یہ بھی بتائیں کہ آج کل کیا ہو رہا ہے؟"

* "میں جی الحمدللہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور میرے نام کا مطلب ہے "سرسبز" اور مصروفیات کچھ یوں ہیں کہ "ٹوٹے ہوئے پر، خوشبو کا گھر" آن ایئر ہیں لیکن اس میں میری انٹری آخری اقساط میں ہوگی۔ جو بچے بڑے ہوتے ہوئے دکھائے گئے ہیں ان میں ایک میں بھی ہوں۔"

☆ "ٹوٹے ہوئے پر" میں آپ بہت اچھا پرفارم کر رہی ہیں یہ بتائیں کہ جس سچویشن سے آپ ڈرامے میں گزر رہی ہیں اگر حقیقی زندگی میں بھی ایسا میاں ملتا جو آپ کی بہن سے محبت کرتا ہے تو آپ کیا کرتیں؟"

* "تب بھی میں یہی کرتی جو میں ابھی ڈرامے میں کر رہی ہوں۔ کیونکہ بہن کو چھوڑ سکتی ہوں نہ شوہر کو نہ بہن سے لڑ سکتی ہوں اور نہ ہی شوہر سے۔"

☆ "تو ٹھیک ہو جائے گا یا سارے ڈرامے میں ایسا ہی ہوتا رہے گا؟"

* "آپ دیکھیں تو سہی..... بتا دوں گی تو مزا نہیں آئے گا۔"

☆ "آپ کا سب سے پہلا ڈرامہ "کاہے کو بیاہی بدلیس" تھا نا؟"

* "نہیں نہیں..... میں تو بہت چھوٹی عمر سے ڈراموں میں کام کر رہی ہوں اور جب میں چار یا پانچ سال کی تھی تو ایک ڈرامہ کیا تھا "ڈبل" کے نام سے اور یہ ڈرامہ شمعون بھائی نے بنایا تھا۔"

☆ "گویا بچپن سے ہی آپ اس ماحول میں پرورش پا رہی ہیں تو آپ کو کوئی مشکل تو پیش نہیں آ رہی ہوگی"۔

* "مشکل کیسے ہوگی پاپا زبیر عباسی رائٹر ہیں۔ بھائی شمعون عباسی ڈائریکٹر ہے۔ بہن جویریا عباسی معروف فنکارہ ہیں۔"

☆ "پھر تو کیمروں سے بھی دوستی ہوگی اور ماحول کا بھی علم ہوگا۔ "خیر ٹوٹے ہوئے پر" میں جو رول آپ کر رہی ہیں اس کے لیے آپ کا انتخاب ہوا تھا یا کسی اور رول کے لیے کہا گیا تھا؟"

* "جی بالکل کیمروں سے بھی دوستی ہے اور ماحول کا بھی علم ہے اور جہاں تک رول کی بات ہے تو اسی رول کے لیے میرا انتخاب ہوا تھا اور "اجیہ" والا رول مجھے اس لیے نہیں مل سکتا تھا کہ اس لڑکی کو بہت بولڈ فیشن ایبل اور بدتمیز دکھانا تھا۔ تو ڈائریکٹر نے مجھے کہا کہ تمہارا اور اجیہ (عائزہ) کا فیس بالکل الگ ہے۔ تمہارے چہرے پر معصومیت ہے اور وہ چالاکی والے رول کر سکتی ہے اور اس کے چہرے سے بھی لگتا ہے کہ تم چھوٹی ہو اور وہ بڑی ہے۔ اس لیے انہوں نے مجھے "نمرہ" والا رول دیا۔"

☆ "ویسے اس معصوم چہرے کے ساتھ نگیٹو رول ملا تو کریں گی؟"

* "او..... بالکل مجھے بہت شوق ہے نگیٹو رول کرنے کا۔ میں نگیٹو رول کر کے سب کو بتانا چاہتی ہوں کہ معصوم چہرے والے ایسے بھی ہوتے ہیں۔"

☆ "تو پھر کیا آپ بھی ایسی ہیں؟"

* "ارے نہیں..... ہرگز نہیں..... میں تو کردار کی بات کر رہی ہوں مگر مجھے ابھی تک ایسا کوئی رول ملا نہیں ہے اور ایسے رول بھی نہیں کرنا چاہتی جس میں خدانخواستہ میں کسی کا گھر اجاڑ رہی ہوں۔ میں ایک بدتمیز لڑکی کا رول کرنا چاہتی ہوں۔ ویسے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں ہر طرح کے رول کروں۔ اللہ کرے گا تو مل ہی جائیں گے۔"

☆ "اس فیلڈ میں مزا آ رہا ہے؟"

* "بہت مزا آ رہا ہے۔ سب اپنے ہی ہیں۔ سب میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

☆ "اس فیلڈ میں آنے کی خواہش آپ نے خود کی تھی یا گھر والوں کی طرف سے اس فیلڈ کا انتخاب ہوا؟"

* "سچی بات بتاؤں کہ شروع میں تو مجھے اس فیلڈ میں آنے کا کوئی شوق نہیں تھا..... جب پاپا، حیدر امام رضوی کے لیے ڈرامے لکھتے تھے تو حیدر انکل مجھے کہتے تھے کہ انوشے تم بھی کام کرو۔ جب میں پانچویں کلاس میں تھی تو میں نے اپنے امتحان چھوڑ کر ایک پروجیکٹ کیا۔ اس وقت ایک گاؤں میں جا کر شوٹنگ کی تھی۔ بہت ہی گندا گاؤں تھا اور بہت خوار ہو کر ہم لوگ شام کو گھر آئے تھے۔ اور پھر وہ آن ایئر بھی نہیں ہوا اور مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے صاف کہہ دیا کہ میں اب کام نہیں کروں گی پھر جب میں تھوڑی بڑی ہوئی تو ایک سیریل محسن طلعت کر رہے تھے "اک لمحہ چاہیے" انہوں نے مجھے آفر دی اور میں نے کام کر لیا بس پھر اس کے بعد مجھے شوق ہوا اور مجھے یہ فیلڈ اچھی لگنے لگی۔"

☆ "پیسے کی بھی کشش محسوس ہونے لگی ہوگی؟"

* "نہیں..... پیسوں کا مجھے اتنا خیال نہیں ہے..... جب میں نے "اک لمحہ چاہیے" کیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں اداکاری کر سکتی ہوں اور مختلف کردار کر سکتی ہوں اس لیے مجھے اس فیلڈ میں کام کر کے اپنے آپ کو منوانا چاہیے اور جہاں تک پیسوں کی بات ہے تو جب مجھے فون آیا کہ آپ سے پیسے ڈسکس کرنے ہیں تو

میں نے کہا کہ مجھے تو نہیں پتا میرے پاپا سے بات کریں تو اب بھی زیادہ تر وہی بات کرتے ہیں۔"

☆ "اپنے بارے میں کیا کہیں گی؟"

* "میرے بارے میں تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں ویسے میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو شیشہ دیکھ کر بولیں کہ ہائے میں کتنی پیاری ہوں یا ہائے میں اتنی بری کیوں لگ رہی ہوں۔ میں تو ہر دم اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے ایک مکمل انسان بنایا ہے۔"

☆ "شوبز کو لوگ برا کیوں کہتے ہیں؟"

* "سچی بات بتاؤں..... مجھے تو اس فیلڈ میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ اور پھر میں کچھ برا نہیں کروں گی تو لوگ مجھ سے برا کیوں کریں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شوبز تو اتنی گندی فیلڈ ہے تم کیسے آگئیں..... تو میں کہتی ہوں کہ ہم اچھے ہیں تو سب اچھے ہیں۔"

☆ "لوگ پہچان لیتے ہیں۔ اچھا لگتا ہے؟"

* "ہاں جی..... بالکل پہچان لیتے ہیں اور مزے کی بات یہ کہ نام سے نہیں جانتے بلکہ کردار کے حوالے سے جانتے ہیں اور ماشاء اللہ اب لوگ اتنا پہچاننے لگے ہیں کہ میں عام لوگوں کی طرح بازار نہیں جا سکتی اور اگر چلی جاؤں تو یہی آوازیں آ رہی ہوتی ہیں کہ وہ دیکھو نمرہ جا رہی ہے اور بہت اچھا لگتا ہے۔"

☆ "پھر تو زندگی بہت اچھی لگ رہی ہو گی؟"

* "جی بالکل بہت اچھی لگ رہی ہے۔ بہت انجوائے کر رہی ہوں۔ کبھی کوئی وقت برا لگ سکتا ہے مگر زندگی بری نہیں لگتی کہ بہت بڑی نعمت ہے۔"

☆ "فضول خرچ ہیں اور ڈراموں کے لیے جو ڈریسز ملتے ہیں وہ واپس کر دیتی ہیں یا اپنے ہو جاتے ہیں؟"

* "فضول خرچ نہیں ہوں لیکن اپنے کپڑے اور جیولری پہ کافی خرچ کرتی ہوں اور ڈراموں میں بہت کم ڈریسز ملتے ہیں۔ زیادہ تر ہمارے اپنے ہوتے ہیں۔ موبل پروڈکشن والے وارڈ روب دیتے ہیں۔ باقی کوئی نہیں دیتا۔ ٹائٹل کے لیے کپڑے دے دیتے ہیں یا پھر شادی' ڈلیے کا سین ہو تو دے دیتے ہیں۔ ورنہ اپنے ہی ہوتے ہیں اور ہم بھی بوتیک سے منگواتے ہیں۔"

☆ "ڈائریکٹرز کو کیسا پایا اور سینئر جونیئرز سے دوستی ہے؟"

* "بالکل ہے اور سب لوگ بہت اچھے ہیں۔ سینئرز لوگ تو بہت ہی اچھے ہیں اور جونیئرز میں کچھ لڑکیاں ہیں جن میں بہت جیلسی ہوتی ہے اور کبھی کبھی وہ غلط باتیں بھی کر دیتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر لوگ اچھے ہوتے ہیں۔"

☆ "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"

* "اچھی تو یہ ہے کہ میں دوسروں کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیتی ہوں اور بری تو بس ایک ہی ہے کہ مجھے غصہ جلدی آ جاتا ہے۔"

☆ "اس فیلڈ میں آنے سے روٹین لائف پہ اثر پڑا؟"

* "جی ہاں..... بہت اثر پڑا ہے۔ عام طور پر لوگوں کی تو روٹین ہوتی ہے کہ صبح اٹھے ناشتا کیا۔ نو سے پانچ کی ڈیوٹی دی اور گھر آ گئے۔ عموماً گھر والوں کو زیادہ ٹائم دیتے ہیں اور رات کو جب دل چاہا سو جاتے ہیں۔ جبکہ ہم صبح اٹھتے ہیں ناشتے کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ شوٹ پہ چلے جاتے ہیں کچھ مل گیا تو کھا لیتے ہیں ورنہ صبر کرتے ہیں۔ پھر کتنی بھی گرمی ہو۔ ریکارڈنگ کے لیے بغیر پنکھے کے سارا کام کرنا ہوتا ہے اور کتنا بھی مشکل سین ہو وہ کرنا ہی ہوتا ہے..... اگر روزے ہیں تو افطار کے وقت کھجور منہ میں ڈالی اور پہلے سین مکمل کرواتے ہیں پھر افطاری کرتے ہیں۔ گھر سے نکلو تو لوگ مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ریمارکس دے رہے ہوتے ہیں۔ ہر طرح سے روٹین لائف پہ اثر پڑا ہے۔"

☆ "روزے رکھتی ہیں؟"

* "جی۔ اللہ کا شکر ہے روزے رکھتی ہوں اور پھر عید بھی اہتمام سے مناتی ہوں روزے رکھ کر ہی تو عید منانے کا مزا ہے۔"

☆ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

* "میرا نام انوشے عباسی ہے۔ نام کا مطلب میں نے آپ کو بتا ہی دیا ہے اور میں 24 نومبر 1993ء میں کراچی میں پیدا ہوئی اور میرا ستارہ Sagittarius ہے اور امی ابو کے بارے میں تو آپ کو سب معلوم ہے۔"

☆ "بہن بھائی اور تعلیمی قابلیت؟"

* "دو بھائی اور ہم تین بہنیں ہیں اور میرا نمبر آخری ہے اور میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہوں اور اگر میں اس فیلڈ میں نہ ہوتی تو پھر میں فیشن ڈیزائنر ہوتی۔"

☆ "آپ کی وجہ سے کوئی سین بار بار ہوا اور اسکرپٹ سیٹ پہ ملتا ہے یا پہلے سے مل جاتا ہے تیاری کر کے؟"

* "میری وجہ سے کوئی سین بار بار نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں بہت محنت سے کام کرتی ہوں اور جہاں تک اسکرپٹ کی بات ہے تو سیٹ پہ نہیں ملتا بلکہ پہلے سے ہی مل جاتا ہے۔ اس طرح ہمیں اپنا کردار سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے اور ڈائلاگ بھی یاد ہو جاتے ہیں اور جب تک یاد نہیں کریں گے پرفارم کیسے کریں گے۔"

☆ "اب تک کتنے ڈرامے کر چکی ہیں؟ اور کیا ماڈلنگ بھی کی ہے؟"

* "ڈرامے تو میں نے کافی کیے ہیں کیونکہ بچپن سے کر رہی ہوں اور جہاں تک ماڈلنگ کی بات ہے تو ابھی تک میں نے ماڈلنگ نہیں کی اور ابھی تو میں ویسے بھی ڈرامے کر رہی ہوں۔ اگر مجھے کوئی بہت اچھا کمرشل ملا تو ضرور کروں گی۔ کمرشل اور ماڈلنگ دونوں ہی اس وقت کروں گی جب کوئی بہت ہی اچھی آفر آئے گی۔"

☆ "ریمپ پہ ماڈلنگ کیسی لگتی ہے؟"

* "بالکل بھی اچھی نہیں لگتی اور ریمپ ماڈلنگ تو بالکل بھی نہیں کروں گی..... مجھے کمرشل کرنا اور فوٹو شوٹ کروانا بہت پسند ہے۔ ریمپ پر اس صورت میں ماڈلنگ کروں گی جب بہت اچھے لوگ آفرز دیں گے۔"

☆ "فلم کے بارے میں کیا خیالات ہیں؟"

* "اگر ہمارے یہاں "بول" اور "خدا کے لیے" جیسی فلمیں اور بھی بننے لگیں تو ضرور کام کروں گی۔ انکار نہیں کروں گی۔"

☆ "آپ کا دل چاہتا ہے ڈرامہ رائٹنگ کی طرف آنے کا؟"

* "نہیں مجھے بالکل بھی ڈرامہ رائٹر بننے کا شوق نہیں ہے بلکہ مجھے تو اپنے گھر میں لکھنے والوں پہ حیرت ہوتی ہے کہ وہ اتنا سب کچھ کیسے لکھ لیتے ہیں۔ ایک آدھ پلے تو بندہ لکھ لے مگر اتنا ڈھیر سارا لکھنا مجھے حیرت زدہ کر دیتا ہے۔"

☆ "تو اسی فیلڈ میں رہ کر اداکاری کرنے کا ارادہ ہے؟"

* "اس فیلڈ میں رہوں گی ایک حد تک اور اس کے بعد ان شاء اللہ نارمل لائف میں آ جاؤں گی۔"

☆ "اس فیلڈ میں سفارش ہے؟..... یا گروپ بندی ہے؟ آج کل آپ کے خیال میں بہترین ڈرامے کون ڈائریکٹ کر رہے ہیں؟"

* "کچھ جگہوں پہ ہے..... سب طرف نہیں ہے اور بابر جاوید بہترین ڈرامے ڈائریکٹ کر رہے ہیں اور بابر جاوید پروڈیوسر بھی ہیں۔ اب جیسے "ٹوٹے ہوئے پر" کے ڈائریکٹر محسن مرزا ہیں جبکہ پروڈیوسر بابر جاوید اور آصف رضا میر ہیں۔ اور "خوشبو کا گھر" کے بھی محسن مرزا ڈائریکٹر ہیں اور بابر جاوید اور آصف رضا میر پروڈیوسر ہیں۔"

☆ "گھرداری سے کتنا لگاؤ ہے اور فیلڈ میں کیا کشش بہت زیادہ ہے؟"

* "کچھ زیادہ نہیں ہے۔ کھانا پکانا آتا ہے اور میں "نہاری" "آلو قیمہ" بہت اچھا پکا لیتی ہوں..... اور فیلڈ میں ہمارے لیے کام کی کشش ہے اور لوگوں کے لیے پیسے کی کشش ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انوشے عباسی سے اجازت چاہی۔

☆ ☆

دو کا پہاڑہ

شہود علوی

شاہین رشید

1 "آپ کے دو پسندیدہ نام؟"
★ "جو نام میرے بچوں کے ہیں وہ سب مجھے پسند ہیں۔ کیونکہ جو نام آپ کو پسند ہوتے ہیں وہی نام آپ اپنے بچوں کے رکھتے ہیں۔"
2 "آپ کے دو لکی نمبر؟"
★ "0 اور 00۔"
3 "اپنی کن دو باتوں سے پریشان رہتے ہیں؟"
★ "مجھ میں قوت برداشت بہت کم ہے اور مجھے غصہ بہت جلدی آجاتا ہے۔"
4 "بچپن کی دو باتیں جو بھول نہیں سکتے؟"
★ "دو مار ہیں نہیں بھول سکتا۔ ایک مرتبہ اسکول نہ جانے کے لیے بہانہ بنایا مگر گھر والوں نے نیت بھانپ لی اور ڈانٹ بھی پڑی اور ہلکی پھلکی مار بھی پڑی۔ اس طرح ایک مرتبہ والد صاحب نے کسی کام کے لیے کچھ پیسے دیے بجائے وہ کام کرنے کے میں نے ان پیسوں سے کچھ کھا پی لیا۔ اس پر تو خاصی مار پڑی تھی۔"
5 "آپ کے دو راز جو کسی نے بتا دیے ہوں؟"
★ "سیانے کہتے ہیں کہ اپنے راز کسی کو نہ بتاؤ۔ کیونکہ کوئی کسی کا راز نہیں رکھ سکتا۔ بچپن کی ہی بات ہے کہ میں ایک مرتبہ خالہ کے گھر وی سی آر پر فلم دیکھ رہا تھا اور اپنے کزن کو کہا کہ گھر میں کسی کو نہ بتانا۔ مگر اس نے بتا دیا اور ایک مرتبہ گھر میں مجھ سے کسی چیز کا نقصان ہو گیا تو میں نے بھائی کو کہا کہ کسی کو گھر میں نہ بتانا کہ نقصان مجھ سے ہوا ہے۔ مگر یہ بات بھی گھر والوں کو پتا چل گئی۔"
6 "دو قابل بھروسہ دوست؟"
★ "کوئی نہیں سوائے میری ماں کے' دوستوں سے بہت دھوکے کھائے ہیں۔"
7 "دو تہوار جو آپ اہتمام سے مناتے ہیں؟"
★ "رمضان المبارک اور عید۔"
8 "ملک میں کون سی دو تبدیلیاں ضروری ہیں؟"
★ "پرانے سارے سیاست دانوں کو آزمانے کی بجائے نئے لوگوں کو ملک کا نظام مل جائے یہ بہت ضروری ہے اور اسلامی قوانین نافذ کرنا بھی ضروری ہے۔"
9 "دن کے چار پہر میں سے کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟"
★ "صبح سویرے کا وقت اور پھر سہ پہر کا وقت۔"
10 "دو کھانے جو سامنے آجائیں تو ہاتھ نہیں رکتے؟"

★ "حلیم اور بریانی۔"
11 "کوئی دو باتیں جو اپنے گھر والوں سے کہنا چاہتے ہیں؟"
★ "اپنی بیوی سے کہنا چاہتا ہوں کہ میرے لیے اس کے دل میں جو بات ہے، جو شک ہے وہ مجھے بتائے اور بس اور کچھ نہیں۔"
12 "دنیا میں دو خوب صورت رشتے؟"
★ "بہن اور بھائی کے۔"
13 "زندگی کے دو خوب صورت دن آپ کی نظر میں؟"
★ "ایک دن تو وہ ہو گا جب میں دنیا سے رخصت ہوں گا۔ کیونکہ جب انسان دنیا سے جاتا ہے تو اس کے چہرے پر نور آجاتا ہے۔ تو میرے بھی چہرے پر ان شاءاللہ نور ہو گا اور دوسرے وہ دن ہوں گے جب میں اپنے بچوں کو اعلا مقام پر دیکھوں گا۔"
14 "دو فنکار جن کے ساتھ کام کر کے انجوائے کرتے ہیں؟"
★ "جویریا عباسی اور ہمایوں سعید بہترین فنکار ہیں دونوں۔"
15 "دو پسندیدہ فلمیں؟"
★ "بہت سی ہیں۔ کوئی دو مخصوص نہیں ہیں۔"
16 "دو چیزیں جنہیں لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"
★ "گاڑی کی چابی اور موبائل فون۔"
17 "دو الفاظ جو بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں؟"
★ "ماشاءاللہ اور الحمدللہ۔"
18 "سات دنوں میں دو پسندیدہ دن؟"
★ "جمعہ اور جس دن چھٹی ہو۔ خواہ وہ کوئی بھی دن ہو۔"
19 "اپنے گھر میں دو جگہیں جہاں سکون ملتا ہے؟"
★ "اپنے کمرے میں اور واش روم میں۔"
20 "دو ملک جن کی ترقی سے متاثر ہیں۔"
★ "پاکستان اور انڈیا۔"
21 "کون سے دو رنگ کے لباس زیادہ پہنتے ہیں؟"
★ "نیوی بلیو اور لائٹ بلیو۔"
22 "کون سی دو چیزیں والٹ میں لازمی رکھتے ہیں؟"

★ "پیسے اور آئی ڈی کارڈ کیونکہ یہ اب بہت ضروری ہوگیا ہے آج کل کے حالات کی وجہ سے۔"

23 "دو افراد جن پر بہت غصہ نکالنے کو دل چاہتا ہے؟"

★ "دو افراد پر نہیں اپنی قوم پر جانے یہ قوم کب باشعور ہوگی۔"

24 "کون سے دو وقت ایسے ہیں جب بہت انجوائے کرتے ہیں؟"

★ "اپنے گھر سے سمندر کا نظارہ اور میری بہن جب پاکستان آتی ہے تو سب بہن بھائی مل کر بہت انجوائے کرتے ہیں۔"

25 "سال کے چار موسموں میں سے کون سے دو موسم پسند ہیں؟"

★ "بہار اور سردی۔"

26 "لڑکیوں کی دو ناپسندیدہ باتیں؟"

★ "کہتی کچھ ہیں اور کرتی کچھ ہیں اور ایک مرد کو سمجھنے میں ساری زندگی گزار دیتی ہیں۔"

27 "ٹی وی پہ تمام کردار کرنے کے باوجود کوئی دو کردار جو کر نہیں سکے؟"

★ "نہیں اللہ کا شکر ہے سب کردار کرلیے ہیں۔ میرا اپنا تو یہی خیال ہے۔ لیکن اگر ناظرین کی کوئی چوائس ہے تو بتائیں۔"

28 "صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام سب سے پہلے کرتے ہیں؟"

★ "کلمہ پڑھتا ہوں اور پانی پیتا ہوں۔"

29 "دو کھلاڑی جن کی وجہ سے کرکٹ دیکھتے ہیں؟"

★ "جو اچھا کھیلے وہی اچھا لگتا ہے۔ اور سب کھلاڑی ہمیشہ اچھا نہیں کھیلتے۔ ویسے جاوید میاں داد پسند تھا۔"

30 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی؟"

★ "اگر میری غلطی ہے تو کسی سے بھی معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں ہوتی۔"

31 "بارہ مہینوں میں کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟"

★ "اپنے بچوں کی سالگراؤں کے مہینے۔"

32 "آپ کے نزدیک دنیا کی خوب صورت ترین خواتین؟"

★ "میری ماں اور میری بیوی۔"

33 "کن دو افراد کے SMS کے جواب فوری دیتے ہیں؟"

★ "بیگم کے اور جنہوں نے کوئی ضروری بات پوچھنی ہو۔"

34 "کن دو برائیوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں؟"

★ "سگریٹ نوشی سے اور پان کھانے سے۔"

35 "والدین کی دو نصیحتیں جو گرہ سے باندھ لی ہوں؟"

★ "کہ عورت اور شراب سے ہمیشہ دور رہو۔ یہ تباہی کی طرف لے جاتی ہیں۔"

36 "آج کے دور کے دو گلوکار جو پسند ہیں؟"

★ "فیوژن سجاد علی اور راحت فتح علی بھی۔"

37 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سے دو وقت کی نمازیں پڑھتے ہیں؟"

★ "فجر اور عصر کی۔"

38 "بیرون ملک شاپنگ میں کون سی دو چیزیں لازمی خریدتے ہیں؟"

★ "کپڑے اور پرفیومز۔"

39 "دو پسندیدہ مشروب جن کے بغیر نہیں رہ سکتے؟"

★ "اگر وہ مشروب جو حرام ہے حلال ہوتا تو پسندیدہ ہوتا اور اور شراب طہور جو جنت میں ملے گی۔ جن کے بغیر نہیں رہ سکتا تو ایسا کوئی مشروب نہیں ہے۔"

40 "شادی کی دو پسندیدہ رسمیں؟"

★ "نکاح اور ولیمہ میری نظر میں باقی رسمیں وقت اور پیسے کو ضائع کرنے والی بات ہے۔"

41 "کن دو باتوں سے آپ کا موڈ خراب ہو جاتا ہے؟"

★ "دو باتیں...... بہت سی باتیں جن سے موڈ آف ہو جاتا ہے۔ ایک تو تب جب لوگوں کو غلط ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھتا ہوں اور ایک تب جب میں گھر آؤں اور گھر مجھے گندہ ملے۔"

42 "کسی کی کوئی دو دلچسپ نصیحتیں جو یاد رہ گئی ہوں؟"

★ "دو تو نہیں ہیں ایک ہی ہے...... ویسے تو لوگ بہت سی دلچسپ نصیحتیں کرتے رہتے ہیں۔ مجھے اپنے ماموں اقبال انصاری کی ایک نصیحت یاد ہے انہوں نے کہا تھا کہ "بیٹا زندگی میں تین "ت" سے بچ کر رہنا "عورت" دولت اور "شہرت" بچ کر اس لیے رہنا کہ ان سے جتنا دور رہو گے یہ تمہارے پیچھے بھاگیں گی اور کسی ایک کی طرف بھاگو گے تو باقی دو تم سے دور ہو جائیں گی۔"

43 "دو تبدیلیاں جو آپ اپنے میں لانا چاہتے ہیں؟"

★ "میں اپنا غصہ کم کرنا چاہتا ہوں اور برداشت کی قوت پیدا کرنا چاہتا ہوں۔"

44 "کن دو باتوں سے خوفزدہ رہتے ہیں؟"

★ "گناہوں کی پکڑ سے اور بے روزگاری سے۔"

45 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں؟"

★ "کہ دھبے نہ لگے ہوئے ہوں اور کریز ٹھیک ہو۔"

46 "لوگ پہچان لیں تو کون سی دو باتیں ڈسٹرب کرتی ہیں؟"

★ "سوال جواب اور ٹائم مانگتے ہیں کہ ملاقات کرنی ہے۔"

47 "کھانے کی ٹیبل پر کیا دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"

★ "میں شور مچانے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ لیکن سلاد اور پانی کا ہونا ضروری ہے۔"

48 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتے ہیں؟"

★ "اپنی بیٹیوں کے ساتھ۔"

49 "کمپیوٹر پر بیٹھ کر آپ کی دو دلچسپیاں؟"

★ "گیم کھیلتا ہوں اور گوگل پر جا کر نئی اپ ڈیٹ لیتا ہوں۔"

50 "زندگی کے دو سال جو برے گزرے؟"

★ "الحمد للہ ایسے کوئی سال نہیں ہیں۔"

☆ ☆

قارئین کی عدالت

ماریہ واسطی

نازیہ کنول نازی

اس ماہ آپ کی عدالت میں معروف فلم/ٹی وی اسٹار ماریہ واسطی سے آپ کے بھیجے گئے دلچسپ سوالات کے جوابات لیے جارہے ہیں ہمارے آئندہ کے مہمان معروف اداکار نبیل اور ورسٹائل فنکار عابد علی ہوں گے آپ اپنے دلچسپ سوالات جلد سے جلد ارسال کرنے کی کوشش کیا کریں۔ انٹرویو کے بعد موصول ہونے والے سوالات سلسلہ میں جگہ نہیں پا سکتے۔ اس کے علاوہ بہنیں زیادہ سے زیادہ صرف دو سوال ارسال کیا کریں۔ ایک ہی بہن کے اس سے زائد سوال شامل کرنا ممکن نہیں۔ آپ کے سوال دلچسپ اور برجستہ ہونے ضروری ہیں تاکہ سلسلے کو خوب صورت بنایا جاسکے۔

ماریہ واسطی سے گفتگو کرتے ہیں۔

○ "السلام علیکم ماریہ۔۔۔ کیسی ہیں آپ؟"

☆ "جی وعلیکم السلام میں ٹھیک ہوں۔"

○ "ماریہ ہمیشہ کی طرح آج کل بھی ٹی وی پر خاصی مصروف نظر آتی ہیں۔ کبھی تھکن محسوس نہیں ہوتی اتنی مصروفیت سے؟"

☆ مسکراتے ہوئے "ہاں تھکن تو لازمی بات ہے ہوتی ہے مگر میں تھکن کو سر پر سوار نہیں کرتی ہوں کیونکہ مجھے اپنے کام سے پیار ہے اور میں اسے انجوائے کرتی ہوں۔"

○ "آپ کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی اور کامیابی آپ کا خوش اخلاق ہونا ہے۔ ہر صحافی کے ساتھ تعاون اس فیلڈ کی آپ جیسی نامور اور معروف فنکارائیں ذرا کم ہی کرتی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

☆ "دیکھیں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کامیابی اور ناکامی سب اللہ کی طرف سے ہوتی ہے تو غرور کس بات کا' میرے ذہن میں تو کبھی کسی بھی کامیابی پر یہ نہیں آیا کہ مجھے غرور کرنا ہے' آج جو عزت اور مقام ہے لازمی طور پر ایک وقت میں وہ نہیں ہوگا تو تب آپ کیا کریں گے۔ لوگ تو آپ کو یاد بھی نہیں کریں گے اور دوسری بات کچھ صحافی بھی ایمانداری سے کام نہیں کرتے' اپنی طرف سے جانے کیسی کیسی باتیں خواتین فنکاراؤں کے بارے میں شائع کر دیتے ہیں' جس کا لازمی بات ہے کہ ان فنکاروں کی زندگی پر اثر پڑتا ہے تو یہ غلط ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

بالکل' صحیح کہا آپ نے' چلیے جی اب آتے ہیں ان سوالوں کی طرف جو ہماری قارئین نے آپ کے لیے بھجوائے ہیں۔

یہ سب سے پہلا سوال پیاری بہن "اقصیٰ شاہد" نے چنیوٹ سے بھجوایا ہے' ان کا کہنا ہے۔

○ "ابھی وقت ہے" آپ کا یہ ڈرامہ میرا موسٹ فیورٹ ڈرامہ تھا جس میں آپ کے کردار کی موت نے مجھے بے حد رلایا' لہٰذا اب جلدی سے کوئی اچھا سا شعر سنا کر دل خوش کریں؟"

☆

کل تلک تیرے جسم کا حصہ تھے ہم
آج کاٹے گئے ناخنوں کی طرح!

"خوش۔"

یہ دوسرا سوال فوزیہ ثمریٹ کا گجرات سے ہے۔ مستقل تبصرہ نگار بہن ہیں ہماری' پوچھتی ہیں۔

○ "آپ نے اداکاری کب شروع کی اور کیا اس فیلڈ میں آنا آپ کا بچپن کا شوق تھا؟"

☆ "جی بالکل جب میں چھوٹی تھی تو سب مجھ سے پوچھتے تھے کہ بڑی ہو کر کیا بنو گی اور میرا ہمیشہ یہی جواب ہوتا تھا کہ اداکارہ بنوں گی۔ 95ء سے میں نے اس فیلڈ کو جوائن کیا اور میرا پہلا ڈرامہ "سارا اماره" تھا' احمد بختیار صاحب اس کے پروڈیوسر تھے اور وہی مجھے اس فیلڈ کی طرف لے کر آئے۔"

ان کا دوسرا سوال ہے۔

○ "کھانے پینے کے معاملے میں سادہ مزاج ہیں یا نخرہ کرتی ہیں اور کھانے میں کیا پسند ہے؟"

☆ "کھانے میں بالکل نخرہ نہیں کرتی' مجھے گھر کا کھانا پسند ہے اور گھر میں جو بھی بنا ہو شوق سے کھا لیتی ہوں۔"

یہ اگلا سوال بہن ثوبیہ مرزا کا ہے وزیر آباد سے آپ کا ہر ڈرامہ بہت شوق سے دیکھتی ہیں اور اس سلسلے کے لیے یہ کرن والوں کی مشکور بھی ہیں۔ ان کا سوال ہے۔

○ "کیا آپ کو خواتین کے رسائل سے دلچسپی ہے اور ہمارا کرن ڈائجسٹ پڑھتی ہیں کہ نہیں؟"

☆ "دلچسپی ہے مگر وقت نہیں ملتا' وقت میسر ہو تو جو چیز بھی ہاتھ لگے پڑھ لیتی ہوں' کیونکہ اردو ادب سے مجھے بہت لگاؤ ہے اور ہماری خواتین رائٹرز بہت اچھا لکھنے والوں میں سے ہیں۔ شروع میں سب پڑھتی تھی۔ ایوب خاور صاحب کی وجہ سے۔ بہت سے اچھے لوگوں کو پڑھنے کا موقع ملا اب ذرا مشکل ہے۔"

ثوبیہ کا آپ سے دوسرا سوال ہے کہ۔

○ "آپ اپنے ڈرامے خود بھی کبھی دیکھتی ہیں کہ نہیں؟"

☆ "اگر چل رہا ہو تو دیکھ لیتی ہوں' خاص طور سے کبھی دیکھنے کی فرصت نہیں ملی۔"

یہ سوال رضوانہ ادریس اور ڈاکٹر عاصم ادریس کا ہے ڈیرہ اسمٰعیل خان سے' آج کل پشاور شفٹ ہیں پوچھتی ہیں۔

○ "آپ کا ڈرامہ "ایک تھی گڑیا" اور "ایک تھی کلو" کبھی فراموش نہیں کیے جاسکتے' دونوں میں سے

کس کردار کو آپ نے خود زیادہ انجوائے کیا؟"

☆ "ایک تھی کلو" کیونکہ یہ خاصا مختلف اور مشکل کردار تھا میرے لیے اور بہت مزے کا بھی تھا۔"

ان کا دوسرا سوال۔

○ "فنکاروں کی زندگی میں حقیقی محبت کی کتنی اہمیت ہے؟"

☆ "بہت زیادہ' کیونکہ فنکار عام لوگوں سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔"

ان کا تیسرا سوال!

○ "کیا آج کے دور میں محبت کرنی چاہیے؟"

☆ "دیکھیں آج کل کے دور میں زندگی بہت مصروف ہو گئی ہے۔ اب لوگوں کے پاس محض جذبات کے لیے وقت نہیں ہے۔ ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں وقت تنگ پڑتا جا رہا ہے تو اس کا اثر لوگوں کے احساسات پر بھی پڑ رہا ہے اس لیے اب وہ پہلے سی بات نہیں رہی ہے۔ محبت ضرور کریں کیونکہ زندگی محبت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے مگر یہ محبت شادی کے بعد اپنے شوہر کے لیے ہی ہو تو بہت اچھی بات ہے۔"

ہماری بہت پیاری بہن نرجس رانی' ساہیوال سے اور عالیہ راجا' ہری پور سے پوچھتی ہیں۔

○ "خواتین کے لیے فلم' ٹیلی ویژن کی طرف آنا خاصا مشکل ہوتا ہے گھر والے اجازت نہیں دیتے اور اس فیلڈ کو اچھا بھی نہیں سمجھتے' کیا آپ کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ ہوا؟"

☆ "نہیں' کیونکہ میرے ذہن میں بچپن سے تھا کہ میں نے اس فیلڈ کی طرف آنا ہے' پھر لاہور سے میری ممی بھی اس فیلڈ میں تھیں خالہ طاہرہ واسطی اور خالو رضوان واسطی بھی تھے تو روکنا کس نے تھا' اصل میں میرے والدین بچوں پر روک ٹوک کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی سوچ ہے کہ زبردستی بچوں پر اگر اپنے فیصلے مسلط کر بھی دیے جائیں تو وہ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔"

یہ سوال شگفتہ خان کا بھلوال ضلع سرگودھا سے ہے۔

○ "بچپن کیسا گزرا؟ کیا بچپن میں بہت شرارتی تھیں کہ نہیں؟"

☆ "بالکل نہیں۔ بہت اچھے بچوں کی طرح بچپن گزرا' کبھی والدین کو تنگ نہیں کیا کبھی مار نہیں کھائی نہ بے وجہ کوئی فرمائش کی۔"

سمندری سے بہن ابابیل نے آپ کے لیے سوال بھجوایا ہے' بہت بڑی فین ہیں یہ آپ کی' پوچھتی ہیں

○ "اداکارہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟"

☆ "اداکارہ نہ ہوتی تو ضرور آرٹ کی کسی فیلڈ سے ہی وابستہ ہوتی۔"

○ "ٹیلی ویژن پر کن ساتھی فنکاراؤں کو بہترین دوستوں میں شمار کرتی ہیں؟"

☆ "بہت سے لوگ ہیں' طوبیٰ ہے' ثانیہ سعید ہے' عائشہ عمر' ماہ نور بلوچ' سویرا ندیم' سونیا خان اور بھی بہت سے لوگ ہیں' ہم لوگ کام کے علاوہ بھی ایک دوسرے سے اٹیچ رہتے ہیں' آنا جانا رہتا ہے۔"

فیصل آباد سے امرت الہدیٰ اور کھیوڑہ سے بہن دعا ثانی کا مشترکہ سوال ہے۔

○ "کوئی آپ کو پیار سے گفٹ دینا چاہے تو کیا لینا پسند کریں گی؟"

☆ "کوئی بھی چیز جو خلوص سے دی جائے۔ ویسے یہ ڈیپنڈ کرتا ہے کہ گفٹ کون دے رہا ہے؟ کیونکہ صرف آپ کے قریبی لوگ ہی آپ کی پسند ناپسند کے بارے میں جان سکتے ہیں اور یہ کتابیں بھی ہو سکتی ہیں پھول بھی ہو سکتے ہیں اور میوزک بھی۔"

یہ سوال اوکاڑہ سے ہماری بہن بشریٰ نوید باجوہ اور وہاڑی سے بہن عائشہ ملک نے مشترکہ بھجوایا ہے؟ پوچھتی ہیں۔

○ "کہاں پیدا ہوئیں اور تعلیمی قابلیت کتنی ہے؟"

☆ "14 اگست 1980ء کو لاہور میں پیدا ہوئی اور تعلیم بی اے تک حاصل کی پھر ٹیلی ویژن کی طرف آ گئی۔"

ان کا دوسرا سوال۔

○ "آپ نے انڈین فنکاروں کے ساتھ بھی کچھ ڈرامے کیے ہیں' یہ تجربہ کیسا رہا؟"

☆ "بہت اچھا رہا' بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اصل میں جو سہولیات اور ماحول انڈین فنکاروں کو میسر ہے وہی اگر پاکستانی فنکاروں کو بھی حاصل ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان سے بہتر پرفارم نہ کر سکیں۔"

سرگودھا سے بہن سائرہ مشتاق لنگڑیال کا آپ کے لیے سوال ہے۔

○ "کتنے بہن بھائی ہیں اور آپ گھر میں کس سے زیادہ اٹیچ ہیں؟"

☆ "جی ہم تین بہن بھائی ہیں۔ دو بہنیں اور ایک بھائی اور میں اپنے بھائی یاسر سے زیادہ اٹیچ ہوں۔ بہن ملیحہ اور بھائی یاسر دونوں ہی مجھ سے چھوٹے ہیں۔"

یہ بہت مزے کا سوال ہماری پیاری لکھاری بہن نادیہ جہانگیر کا مومبر آزاد کشمیر سے ہے۔ پوچھتی ہیں۔

○ "زندگی کا کوئی ایسا واقعہ جو جب بھی یاد آئے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دے؟"

☆ "ال... بہت سے واقعات ہیں" (کھل کر مسکراتے ہوئے) ایک بار ٹی وی پر انڈیا پاکستان کا میچ چل رہا تھا۔ میں اسکول سے آئی تو وہ لگا ہوا تھا' سب بہت ایکسائیٹڈ تھے تو میں بھی وہ میچ دیکھنے بیٹھ گئی' دعائیں مانگ مانگ کر میں نے پاکستان کو جتوایا مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ تو پرانا ریکارڈ میچ تھا۔ جو دوبارہ ریپیٹ ہو رہا تھا تو سب نے اتنا مذاق بنایا' وہ یاد ہے اور اب بھی کبھی ذکر ہو جائے تو سب ہنستے ہیں۔"

یہ سوال بہاول نگر سے بہن پروین افضل شاہین نے ارسال کیا ہے پوچھتی ہیں۔

○ "ہم نے سنا ہے آپ کامیاب اداکارہ کے بعد کامیاب پروڈیوسر بھی بن گئی ہیں کیا یہ بات سچ ہے؟"

☆ "جی ہاں بالکل سچ ہے 2002ء سے میں نے پروڈکشن ہاؤس کا آغاز کر دیا تھا۔"

باغ آزاد کشمیر سے بہن ارم گل مہر کا سوال ہے۔

○ "کن ساتھی فنکاروں کے ساتھ کام کر کے بہت لطف آتا ہے؟"

☆ "سبھی اچھے ہیں۔ اصل میں مجھے ایک طویل عرصہ ہو گیا ہے اس فیلڈ میں آئے ہوئے تو تقریباً سبھی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اب تو سینئرز بھی

بہت عزت کرتے ہیں اور جونیئرز بھی۔ ابھی جو میں نے ملے کیا "تجھ پر قربان" اس میں عظمیٰ آغا بھی ہیں اور عظمیٰ گیلانی بھی۔ عظمیٰ گیلانی نے اس ملے میں ایک طویل عرصے کے بعد کام کیا ہے تو بہت اچھا لگا۔"

ہمارے پاس یہ سوال عروسہ وحید کا ہے پاک پتن سے پوچھتی ہیں

○ "دیگر فنکاروں کی طرح اگر آپ کو بھی بالی وڈ کی فلموں میں کام کرنے کی آفر ہوئی تو کام کریں گی یا انکار کردیں گی؟"

☆ "دیکھیں فلموں میں تو میں نے پہلے بھی کام کیا ہے۔ اب یہاں پاکستان میں جو فلمیں ہیں وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان میں ایکٹنگ کی جاسکے۔ اس لیے اگر بولی وڈ سے آفر ہوئی تو ضرور کام کروں گی۔"

یہ سوال ہمیں لاہور سے موصول ہوا ہے مگر بہن نے اپنا نام نہیں لکھا۔ ان کا سوال ہے۔

○ "کیا آپ اپنی دوستوں کی اچھی دوست ہیں؟"

☆ "مسکراتے ہوئے" لازمی طور پر یہ تو میری فرینڈز ہی بتا سکتی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں دوستی میں کچھ اور ہو نہ ہو مگر ایمانداری ضرور ہونی چاہیے۔ اور یہ اب ضروری نہیں کہ دوستی ہی ہو، تعلق کوئی بھی ہو دوستی، محبت، کچھ بھی مگر as a person دونوں پارٹیز کو گرو کرنے کا مارجن ضرور ملنا چاہیے، کسی بھی تعلق میں ایک دوسرے کو ہرٹ نہیں کرنا چاہیے۔"

یہ سوال ہمیں ہماری بہن چندا امشال نے قصور سے بھیجا ہے پوچھتی ہیں۔

○ "ہمایوں سعید کا ساتھ آپ کی جوڑی بہت جچتی ہے آپ ان کے ساتھ اب زیادہ کام کیوں نہیں کرتیں؟"

☆ "ایسی بات نہیں ہے۔ ہمایوں سعید کے ساتھ میں نے کافی کام کیا ہے۔ ابھی حال ہی میں انہی کی پروڈکشن میں "تیرے لیے" میں نے کیا ہے۔"

انہی کا دوسرا سوال ہے آپ سے کہ۔

○ "میں کئی سالوں سے آپ کو ٹیلی ویژن اسکرین پر دیکھ رہی ہوں کچھ اندازہ ہے کہ اب تک آپ کتنے ڈراموں میں کام کرچکی ہیں؟"

☆ "جی نہیں، کوئی اندازہ نہیں یقیناً" 90/80 کے قریب یا اس سے کچھ زائد تو ہو ہی چکے ہوں گے۔"

یہ سوال بہاول پور سے ہماری بہت اچھی بہن مبین شفیع نے ارسال کیا ہے۔ پوچھتی ہیں۔

○ "زندگی میں رشتوں کو کتنی اہمیت دیتی ہیں اور آپ کا پسندیدہ کلر کون سا ہے؟"

☆ "ہم ں..... زندگی میں رشتوں کو بہت زیادہ اہمیت دیتی ہوں اور میرا پسندیدہ کلر "گولڈن" ہے۔"

اس ماہ کا یہ آخری سوال۔ بہن رانیہ خان نے ہمیں ڈی آئی خان سے ارسال کیا ہے۔

○ "آپ کا پسندیدہ موسم کون سا ہے؟"

☆ "دیکھیں دل کا موسم اچھا ہو تو سارے موسم اچھے ہیں، ویسے مجھے نہ سردی کی شدت پسند ہے نہ گرمی کی۔ ان کے جو درمیان کا موسم ہے جب بہار کے بعد خزاں آتی ہے۔ تو وہ مجھے بہت پسند ہے کیونکہ یہ اداسی کا موسم ہوتا ہے اور ہر طرف تبدیلی ہو رہی ہوتی ہے، آسمان، زمین، مٹی، پودے سب کا رنگ بدل رہا ہوتا ہے تو بہت اچھی لگتی ہے یہ تبدیلی۔"

چلیے جی، بہت شکریہ ماریہ کہ آپ نے اتنی مصروفیت کے باوجود ہمارے لیے اتنا ٹائم نکالا۔ آخر میں ان بہنوں کے نام جن کے سوال تاخیر سے موصول ہونے کے باعث سلسلہ میں شامل نہ ہوسکے۔

حفصہ سعید، گجرات، نازیہ، منڈی بہاؤالدین، منزہ سعید، سیال موڑ، شہلا، ثانیہ، سدرہ، خانیوال، نورین نوید، ڈوگر بونگہ اور حمیدہ جاوید کھروڑپکا۔

☆ ☆

مجھ سے ملیے

دُرِ ثمن بلال

ادارہ

○ "تاریخ پیدائش، ستارہ؟"

☆ "دکیس منتی ٹورس۔"

○ "خدا سے تعلق؟"

☆ "الحمدللہ بہت گہرا ہے۔"

○ "فرصت کا وقت گزارنے کا پسندیدہ طریقہ؟"

☆ "اچھا میوزک سننا یا پھر کوئی اچھی کتاب پڑھنا۔"

○ "کون سی چیز خوشگوار تاثر قائم کرتی ہے؟"

☆ "پرخلوص مسکراہٹ۔"

○ "وہ چیز جو موڈ خراب کردے؟"

☆ "منافقت، جھوٹ، غلط بیانی کرنا۔"

○ "مشکل ترین لمحہ؟"

☆ "جب میری ماں کا انتقال ہوا۔"

○ "بہترین تعریف جو وصول کی؟"

☆ "اللہ کے کرم سے تعریف کئی بار وصول کی ہے..... جب میرے پہلے ناول کے متعلق قارئین نے ڈھیروں ڈھیر تعریفی خطوط لکھے، جب امثل نے میرے افسانے "یہ عجیب میری محبتیں" میں محبت اور تم کے متعلق تعریفی کلمات ادا کیے..... میری کوکنگ کے متعلق جب وقار بھائی (میرے جیٹھ) نے کہا، ثمن تمہارے ہاتھ میں جادو ہے اور سب سے بڑھ کر جب میرے ہزبنڈ بلال نے یہ کہا کہ ثمن میں دنیا کا خوش نصیب انسان ہوں جسے تم جیسی بیوی ملی۔"

○ "وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟"

☆ "موبائل فون پہ پیکیج کرکے گھنٹہ گھنٹہ فضول باتیں کرنا۔"

○ "زندگی کا خوفناک واقعہ؟"

☆ "دو سال پہلے ہم سب بہن بھائی اپنے ابو کے ساتھ ایک ہفتے کے لیے ناران، کاغان ٹور پر گئے تھے آٹھویں دن واپسی پہ راستے میں لینڈ سلائیڈنگ ہونے سے گاڑیوں کی لمبی لائن میں پھنس گئے ایک طرف بلند و بالا پہاڑوں سے نہایت تیزی سے پتھر گر رہے تھے اور سڑک کی دوسری جانب ہزاروں فٹ گہری کھائیاں اور شور مچاتا دریائے کنہار..... اس خوفناک صورت حال میں میرے بھائی نے بل کھاتی خطرناک سڑک سے ہم پندرہ افراد کو کمال مہارت سے گاڑی ڈرائیو کرکے اللہ کے حکم سے باحفاظت رات سے پہلے سرگودھا پہنچا دیا تھا۔ آج بھی واپسی کے اس سفر کا خوفناک واقعہ یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

○ "بہترین تحفہ میری نظر میں؟"

☆ "پھول، پرفیوم اور کتاب۔"

○ "ایسی تاریخی شخصیت جس سے ملنا چاہوں؟"

☆ "اپنے انکل میجر عزیز بھٹی شہید سے۔"

○ "پسندیدہ ساتھی؟"

☆ "میرے ہزبنڈ بلال۔"

○ "پسندیدہ ہستی؟"

☆ "میری بہن صدف ضیاء۔"

○ "پسندیدہ پروفیشن؟"

☆ "ڈریس ڈیزائننگ۔"

○ "بہترین کاوش؟"

☆ "اب میرے ہو کے رہو" (میرا یہ ناول میری نظر میں ایک بہتر کاوش تھی۔)

○ "پسندیدہ ملکیت؟"

☆ "میری تحریریں۔"

○ "زندگی کی خواہش؟"

☆ "اپنے بچوں کی مثالی تربیت کروں اور میرے مرنے سے پہلے میرے ہزبنڈ کم از کم میری ایک تحریر ضرور پڑھیں (میرے ہزبنڈ نے آج تک میری ایک بھی تحریر نہیں پڑھی) تاکہ جب میں اس دنیا سے جاؤں تو یہ حسرت میرے دل میں نہ رہے (بلال سن رہے ہیں آپ؟)

○ "پریشان کن لمحہ؟"

☆ "جب ایک پرخلوص محبتوں سے گندھی، مجھ سے والہانہ محبت کرنے والی بہت پیاری لڑکی ثوبیہ جہانگیر کے انتقال کی خبر سنی تھی۔"

○ "جب موڈ آف ہو تو کیا کرتی ہوں؟"
☆ "خود سے بھی خفا ہو جاتی ہوں۔ دل ہی دل میں خود سے لڑتی ہوں ایسے میں اکیلے رہنا پسند کرتی ہوں۔"
○ "کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکوں؟"
☆ "میری اکلوتی پھپھو جو میری ساس بھی ہیں میں ان سے بے پناہ محبت کرتی ہوں اور ان کی کوئی بات ٹال ہی نہیں سکتی ہوں۔"
○ "فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟"
☆ "جب بے حیائی میں تبدیل ہو جائے۔"
○ "انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟"
☆ "جب امیدیں ٹوٹتی ہیں۔"
○ "کیا چیز جذباتی کر دیتی ہے؟"
☆ "محبت محبت اور صرف محبت...... چاہے یہ کسی بھی رشتے میں لپٹی ہو مجھے جذباتی کر دیتی ہے۔"
○ "زندگی کا یادگار دن؟"
☆ "میری شادی کا دن' ناران کاغان ٹور کا ہر دن' جس دن میرا پہلا ناول شائع ہوا' جس دن میں نبیلہ عزیز سے ملی' جس دن اچانک مجھے آمنہ ریاض کی جانب سے ایک خوب صورت بر تھ ڈے گفٹ موصول ہوا ...... اور وہ دن جب میری بیٹی وانیا پیدا ہوئی۔"
○ "موسیقی میرے نزدیک؟"
☆ "ریلیکسشن کا بہترین ذریعہ ہے موسیقی۔"
○ "پسندیدہ گانا؟"
☆ "وقت کے ساتھ ساتھ پسند بھی بدلتی رہتی ہے۔"
○ "پسندیدہ فقرا؟"
☆ "جو چیز اللہ تمہیں نہ دے اسے انسانوں سے نہ مانگو۔" (عمیرہ احمد)
"مرد کی محبت عورت کو کبھی مکمل سایہ نہیں دیتی اس کے رویوں کی دھوپ کہیں نہ کہیں سے عورت پہ پڑتی ہی رہتی ہے۔" (بانو قدسیہ)
"کون کہتا ہے محبت سکھ اور چین کا دوسرا نام ہے؟ محبت تو آسیب کی طرح ہوتی ہے صائم شاہ! یہ جس کو چمٹ جائے اسے ویران کھنڈر میں بدل کر رکھ دیتی ہے چپ چاپ کھا جاتی ہے دیمک کی طرح یہ محبت تو اپنے آپ کے قابل بھی نہیں چھوڑتی اور صائم تم اسے سکھ کہتے ہو؟ چین سمجھتے ہو؟" (میرے افسانے سے اقتباس)
○ "پسندیدہ کردار؟"
☆ "درید بخت۔" (میرے ناول کا کردار)
○ "سب سے زیادہ عزیز اور قیمتی اثاثہ؟"
☆ "میرے ہزبنڈ' میری بیٹی وانیا اور میری پوری فیملی میرا قیمتی اثاثہ ہیں میں ان سب کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی ہوں۔"
○ "اچھا اور خوب صورت موسم؟"
☆ "اچھا خاصا رومانٹک کر دیتا ہے۔"
○ "ناقابل فراموش واقعہ؟"
☆ "جس دن میری ماں کا انتقال ہوا' آج بھی وہ لمحات یاد آتے ہیں تو سوچتی ہوں کہ پتا نہیں میں کیسے زندہ ہوں؟"
○ "پہلی کاوش شائع ہونے پر تاثرات؟"
☆ "بہت دلچسپ تھے آج بھی وہ دن آنکھوں میں یاد بن کر اترے تو ہونٹوں پہ مسکراہٹ کھل جاتی ہے۔ اس دن خوشی سے حلق خشک' ہاتھ ٹھنڈے منہ گرم اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں میری......"
○ "وہ رات جو کبھی نہ بھولے گی؟"
☆ "اس سوال کا جواب ہر شادی شدہ لڑکی یہی دے گی کہ "شادی کی رات" ویسے میرے ہزبنڈ نے شادی کی پہلی سالگرہ پہ مجھے لانگ ڈرائیو کے بعد ڈنر کروایا تھا وہ رات بھی کبھی نہیں بھولے گی۔"
○ "میرا خواب؟"
☆ "مستقبل میں ایک اچھی ڈرامہ رائٹر بنوں۔"
○ "پسندیدہ مزاج؟"
☆ "جو کسی کو ہرٹ نہ کرے۔"
○ "حسد محسوس کرتی ہوں؟"
☆ "نہیں' الحمدللہ۔"
○ "پسندیدہ خوشبو؟"

☆ "Y.S.L" اور Blueberry کی دیوانی ہوں۔"
○ "خوشبو پسند ہے تو کیوں؟"
☆ "خوش گوار تاثر قائم کرتی ہے شخصیت پہ......"
○ "آخری کتاب جو میں نے پڑھی ہو......؟"
☆ "وصی شاہ کی کتاب پڑھی تھی' میرے ہو کے رہو۔"
○ "پسندیدہ جگہ؟"
☆ "ناران' کاغان۔"
○ "وہ جگہ جہاں چھٹی گزارنا پسند کروں؟"
☆ "شوگران کا پائن پارک ہوٹل' وہاں چھٹی نہیں چھٹیاں گزارنا پسند کروں گی۔"
○ "میری قوت ارادی؟"
☆ "مضبوط ہے۔"
○ "گھر کا پسندیدہ کمرہ؟"
☆ "میرا بیڈ روم۔"
○ "کیا پہننا پسند کرتی ہو لباس میں؟"
☆ "ہر وہ اچھا اور خوب صورت لباس جس کے پہننے سے میری شخصیت کے وقار میں اضافہ ہو۔"
○ "پسندیدہ رنگ؟"
☆ "بلیک اور پنک۔"
○ "پسندیدہ مصنف؟"
☆ "کوئی ایک نہیں بہت سے ہیں...... لیکن میں نے واصف علی واصف کو بہت پڑھا ہے۔"
○ "پسندیدہ شاعر؟"
☆ "محسن نقوی۔"
○ "ویران سنسان جزیرے پر سب سے پہلا کام کیا کروں گی؟"
☆ "اپنے ہزبنڈ کو کال کر کے انہیں وہاں پہنچنے کو کہوں گی۔"
○ "خود اپنی بری عادت؟"
☆ "میں محبت نہیں کرتی تو کسی صورت نہیں کرتی اور اگر محبت کرتی ہوں تو ہر رشتے ہر تعلق سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتی ہوں...... اور بدلے میں اسی پر خلوص محبت کی توقع بھی رکھتی ہوں...... اور جب بدلے میں مجھے ویسی پر خلوص محبت نہیں ملتی تو میں بہت ڈسٹرب ہو جاتی ہوں اور اندر ہی اندر سوچتی رہتی ہوں دکھ سے...... مجھے اپنی یہ عادت بہت بری لگتی ہے ...... آج کل لوگ محبتوں کی' رشتوں کی' اخلاص کی پروا نہیں کرتے مگر میں بہت پروا کرتی ہوں میری نظر میں یہی میری بری عادت ہے۔"
○ "کھانے کی پسندیدہ جگہ؟"
☆ "اپنے سرگودھا میں فرائی چکس' ہٹس اور زم زم بہت پسند ہیں۔"
○ "اگر میں مصنفہ نہ ہوتی تو؟"
☆ "تو ایک اچھی مصورہ ضرور ہوتی۔"
○ "ایک لفظ جو مجھے واضح کر دے؟"
☆ "یہی کہ انسان بہت حقیر سی چیز ہے غرور تو ہمیں کسی بھی صورت میں نہیں کرنا چاہیے۔"
"جنس مخالف کے بارے میں رائے؟"
☆ "پچاس فیصد جھوٹ بولتے ہیں شادی سے پہلے جس محبت کے دعوے کرتے ہیں شادی کے بعد وہ سب بھول جاتے ہیں اور اگر بھول کر کسی لڑکی کی نگاہ ان پر پڑ جائے تو خوامخواہ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔"
○ "پسندیدہ رشتہ؟"
☆ "ماں بیٹی کا' اس سے سچا اور مخلص رشتہ دنیا میں کوئی نہیں باقی سب رشتے مطلب کے رشتے ہوتے ہیں...... سب اپنی غرض پوری کرتے ہیں۔"
○ "اگر محبت کی تو کیا نتائج نکلیں گے؟"
☆ "سچی محبت زندگی میں صرف ایک بار ہی ہوتی ہے اور وہ میں اپنے ہزبنڈ سے کر چکی ہوں اور اس محبت کا نتیجہ میری بیٹی کی صورت میں موجود ہے۔"
○ "پسندیدہ لو اسٹوری؟"
☆ "ویسے میری اپنی - لو اسٹوری بھی خاصی انٹرسٹنگ ہے کزنز ہونے کے باوجود ہم میاں' بیوی نے لڑکپن سے اپنی شادی تک ایک دوسرے کو روبرو دیکھا تک نہیں تھا تین سال منگنی رہنے کے بعد شادی والے دن ہم نے روبرو ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ایک دوسرے سے Love ہو گیا...... (ہے نا آج کل

کے ترقی یافتہ دور کی حیرت انگیز لو اسٹوری؟")

○ "کوئی ایسی فلم جو بار بار دیکھنا چاہیں۔۔۔؟"

☆ "انڈین فلم "کچھ کچھ ہوتا ہے" تین بار دیکھی ہے۔"

○ "چہرے کچھ بتاتے ہیں؟"

☆ "چہرے تو شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں اور میں بہت جلد چہرے پڑھ لیتی ہوں۔"

○ "شاعری کے بارے میں خیال؟"

☆ "شاعری جذبوں کے خوب صورت اظہار کا نام ہے میں نے آج تک جتنا بھی لکھا اس کی انسپائریشن مجھے شاعری سے ہی ملی۔"

○ "میری جستجو میری کھوج؟"

☆ "ایک اچھی ڈرامہ رائٹر کہلواؤں۔"

○ "بہترین کامیابی؟"

☆ "میرا لکھا ہر وہ لفظ ہر وہ جملہ جو قارئین کی یادداشت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہو۔"

○ "وہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہوں؟"

☆ "اللہ کو کثرت سے یاد کرتی ہوں۔"

○ "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

☆ "موبائل فون اگر اس کا استعمال مثبت ہو۔"

○ "بدترین ایجاد؟"

☆ "موبائل فون اور انٹرنیٹ' آج کل نوجوان ان دونوں چیزوں کو کثرت سے منفی انداز میں استعمال کر رہے ہیں۔"

○ "ایسی شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہے؟"

☆ "اپنی ماں' اللہ انہیں جنت نصیب کرے میں اپنی ماں کی بے پناہ لاڈلی تھی' ان کے جانے سے وہ لاڈ وہ پیار نہ جانے کہاں کھو گئے؟"

○ "بستر پر جانے سے پہلے کیا جانے والا آخری کام؟"

☆ "اپنی سائیڈ ٹیبل پہ پانی رکھتی ہوں اور اپنی بیٹی کے فیڈر دھو کر رکھتی ہوں۔"

○ "ایک بات جو ہمیشہ یاد رہی؟"

☆ "انسانوں کی بجائے صرف اللہ پہ توکل رکھو۔۔۔ میں نے ہمیشہ انسانوں کی بجائے اللہ پہ توکل رکھا ہے اور الحمدللہ ہمیشہ اس ذات پاک نے مجھے میری توقع سے بڑھ کر نوازا' بے شک وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔"

○ "زندگی کا خوب صورت ترین دن؟"

☆ "جب ہم سب بہن بھائی اپنے ابو کے ساتھ ایک ہفتے کے ٹور پہ ناردن ایریاز گھومنے گئے تھے وہاں گزرا ہر دن ہر پل ایک خوب صورت یاد بن کر ہمیشہ یاد رہے گا۔"

○ "پیغام قارئین کے لیے؟"

☆ "ڈیئر قارئین! میں نے آج تک جو بھی جتنا بھی لکھا ہے وہ آپ کی بے پناہ چاہتوں اور قیمتی آرا سے لکھ پائی ہوں' کام چاہے کوئی بھی ہو' محبت اور مثبت حوصلہ افزائی اس کام میں نکھار لے آتی ہے۔۔۔۔ قارئین! آپ کے خلوص' محبتوں سے لبریز بھرے آج بھی میرے دل پہ نقش ہیں جتنی محبتیں آپ سب نے مجھے بخشی ہیں ان محبتوں کے آگے شکریہ لفظ بہت چھوٹا پڑ جاتا ہے۔۔۔۔ درثمن ہمیشہ آپ کے خلوص اور بے پایاں محبتوں کے آگے بہت ممنون و مشکور رہے گی۔"

○ "کرن کے بارے میں رائے؟"

☆ "کرن ڈائجسٹ نے اپنی مثال آپ کے تحت ہمیشہ نئے لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم کی حیثیت سے آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے ہیں اس کی سب سے بڑی مثال میں خود ہوں کرن کی مدیرہ ریحانہ علی احمد کی حوصلہ افزائی' ان کی ڈانٹ اور ان کی گائیڈنس سے مجھ سمیت نجانے کتنی لڑکیاں قاری سے لکھاری کا سفر طے کر چکی ہیں؟ کرن ڈائجسٹ کی مقبولیت ریحانہ کی منہ بولتی محنت کا ثبوت ہے اس کے لیے وہ مبارک باد کی مستحق ہیں جن کی محنت سے نا صرف ڈائجسٹ کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ وہ نئے لکھنے والوں کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی کر رہی ہیں تھینکس کرن"

☆ ☆

آواز کی دنیا سے

عدیل اظہر

شاہین رشید

"صبح تازہ دم" عموماً کہا جاتا ہے کہ صبح کا ناشتا انسان کو تازہ دم کر دیتا ہے۔ لیکن گھروں سے جلدی نکلنے والے وہ لوگ جو دفتروں، اسکول، کالج اور یونیورسٹی کا رخ کرتے ہیں انہیں بھلا ناشتا کرنے کا کہاں ٹائم ملتا ہوگا کیونکہ کراچی کی ٹریفک ہر بندے کو گھر سے کم سے کم ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے نکلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

لہٰذا اپنی کار ہو یا یونیورسٹی کالج کی وین یا پھر بس، ایف ایم کے پریزینٹر سامعین کو اپنی باتوں سے فریش کر دیتے ہیں اور اگر آپ ایف ایم 107 لگائیں تو "عدیل اظہر" جن کے پروگرام کا نام بھی "صبح تازہ دم" ہے واقعی لوگوں کو تازہ دم کر دیتا ہے۔ اس ماہ "آواز کی دنیا" میں ہم نے عدیل اظہر سے گفتگو کی جو نذر قارئین ہے۔

☆ "کیا حال ہیں.... ریڈیو کے سننے والے تو آپ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ ریڈیو کے علاوہ آپ کیا کرتے ہیں؟"

* "جی اللہ کا شکر ہے ریڈیو کے علاوہ میں دبئی اسلامک بنک کا وائس پریذیڈنٹ ہوں اور اصل کام تو اپنی جاب ہے اور ریڈیو تو میرا شوق ہے۔"

☆ "ریڈیو سے گھر تو چل نہیں سکتا ہوگا؟"

* "اگر ریڈیو سے اچھے پیسے ملنے لگیں تو سفید پوشی کی زندگی تو گزار ہی سکتے ہیں۔ اگر آپ مقبول ہو جائیں ورنہ تو گھر چلانا بہت مشکل ہے۔"

☆ "آپ کا صبح کا پروگرام تقریباً سات بجے سے نو بجے تک ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ریڈیو آنے کے لیے آپ کو بہت صبح اٹھنا پڑتا ہوگا۔ جبکہ لڑکوں کو تو اتنی صبح اٹھنے کی عادت ہی نہیں ہوتی؟"

* "دیکھیں جی.... جب مجھے یہ اندازہ ہوا کہ لوگ میرے پروگرام کو شوق سے سنتے ہیں اور بہت پسند کرتے ہیں تو ایک خود بخود موٹیویشن سی ہونے لگتی ہے اور پھر آپ اپنا شو اس وجہ سے مس نہیں کرتے کہ میرے پیسے نہیں بنیں گے بلکہ پھر آپ اپنا شو اس وجہ سے مس نہیں کرتے کہ میرے سننے والے مجھے مس کریں گے میری غیر موجودگی کو محسوس کریں گے.... پھر جب اس طرح کا فیڈ بیک ملنا شروع ہوا تو صبح اٹھنا کوئی مسئلہ نہیں لگا۔ آپ یقین کریں کہ اگر رات کو کبھی دیر سے بھی سوتا ہوں تو صبح چھ بجے آنکھ کھل جاتی ہے۔ تو میں تو اپنے کام کو بہت انجوائے کرتا ہوں۔"

☆ "صبح کا ٹائم آپ نے اپنی پسند سے لیا یا آپ کو دیا گیا؟"

* "میں نے اپنی پسند سے لیا ہے کیونکہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی اور ٹائم نہیں ہے اور یہ ایسا ٹائم ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میری فیملی لائف ڈسٹرب نہیں ہوگی اور اگر کبھی ایسا ہوا کہ میری فیملی لائف ڈسٹرب ہوئی تو میں یہ پروگرام کرنا چھوڑ دوں گا عموماً لوگ فجر میں اٹھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔ جبکہ میں سوتا نہیں ہوں نماز پڑھ کر تیار ہو کر ریڈیو آجاتا ہوں اور پھر سوا نو، ساڑھے نو بجے تک اپنے آفس (بنک) بھی پہنچ جاتا ہوں اور کافی لوگوں سے پہلے آفس پہنچ جاتا ہوں۔"

☆ "صبح کے وقت آپ کا پروگرام سننے والوں میں کس کلاس کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں؟"

* "صبح سات سے آٹھ بجے وہ والدین پروگرام سنتے ہیں جو اپنے بچوں کو اسکول چھوڑنے جا رہے ہوتے ہیں۔ طالب علم ہوتے ہیں جو کالج اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہوتے ہیں۔ انہی اداروں میں پڑھانے والے اساتذہ ہوتے ہیں اور آٹھ بجے کے بعد پھر وہ لوگ پروگرام سنتے ہیں جو اپنے آفس جا رہے ہوتے ہیں۔ تو یہ ٹائم ایسا ہوتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہر کلاس کے لوگ ریڈیو سن رہے ہوتے ہیں تو ایسے وقت کے لیے ایک ایسے بندے کو پروگرام کرنا چاہیے جو ہر قسم کے معاملات کو سمجھتا ہو جو خود پڑھا لکھا ہو۔ جو خود ایک پروفیشنل آدمی ہو۔ تو اس لحاظ سے میرے لیے یہ پروگرام کرنا زیادہ بہتر تھا۔"

☆ "آپ کو کیسے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا پروگرام لوگ شوق سے سن رہے ہیں؟ فیڈ بیک کیسے ملتا ہے؟"

* "میں اپنے شو میں اکثر یہ بات کہتا ہوں کہ اگر آپ کو صبح کے وقت گانے سننے ہیں تو اور ایف ایم چینل ہیں جو صرف گانے لگاتے ہیں لیکن اگر آپ کو خبریں سننی ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ آفس جاتے وقت آپ کوئی نئی بات سن کر یا سیکھ کر جائیں۔ تو میرا پروگرام سنیں۔ میں کوئی ایک بات کر کے لوگوں کو سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔ تو میرا پروگرام وہی لوگ سنتے ہیں جنہیں مختلف موضوعات سے دلچسپی ہوتی ہے۔

اب فیڈ بیک کیسے ملتا ہے تو اس کے تین چار طریقے ہوتے ہیں جن میں ایک طریقہ "فیس بک" کا بھی ہے میری فیس بک پہ میرے فینز کی تعداد ساڑھے تین ہزار ہے۔ پھر جب میں باقی آر جے کے ساتھ موازنہ کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مجھے لوگ زیادہ سنتے ہیں۔ پھر آپس میں ملنے سے بھی پتا چلتا ہے۔ میں کہیں میٹنگ میں جاؤں، کسی تقریب میں جاؤں تو لوگوں کو جب پتا چلتا ہے تو بے ساختہ بولتے ہیں اچھا آپ عدیل اظہر ہیں۔ پھر لوگ آواز سے بھی پہچان لیتے ہیں۔ تو اس طرح فیڈ بیک ملتا ہے۔

اور آپ کو یہ سن کر بھی میرے پروگرام کی مقبولیت کا اندازہ ہوگا کہ میرے پروگرام کو کمرشلز بھی سب سے زیادہ ملتے ہیں اور اکثر ایڈورٹائزرز یہ کہہ کر کمرشل دیتے ہیں کہ ہمیں عدیل اظہر کے پروگرام میں چلوانے ہیں۔"
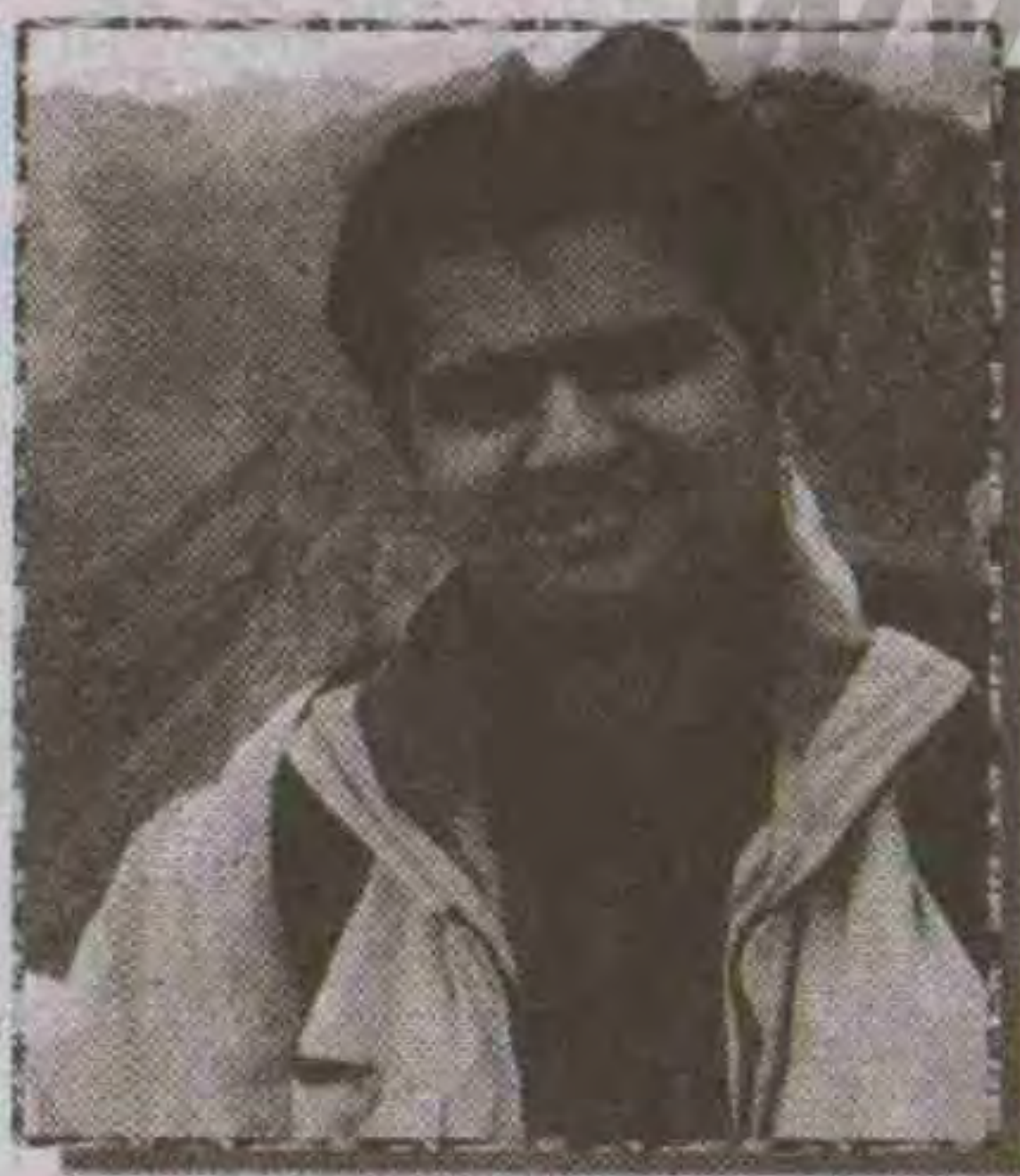
☆ "آپ نے کہا کہ لوگ آپ کو شکل سے نہیں جانتے تو کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ ٹی وی اسکرین پہ آئیں تاکہ آپ کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہو؟"

* "یہاں میں آپ کو بتاتا چلوں کہ میں ٹی وی پہ آتا ہوں مگر مخصوص پروگرام میں، میں — پی ٹی وی پہ اسپورٹس کے پروگرام لائیو کرتا چلا آ رہا ہوں۔ فٹ بال ورلڈ کپ کے پروگرام لائیو کیے ہیں اور پورے ٹورنامنٹ میں، میں لائیو رہا۔ لیکن پھر بھی لوگ میری شکل سے اس لیے واقف نہیں کہ بڑے شہروں میں پی ٹی وی کو زیادہ شوق سے نہیں دیکھا جاتا جبکہ اندرون شہر میں پی ٹی وی بہت دیکھا جاتا ہے۔ کرکٹ ورلڈ کپ میں بھی میں نے لائیو پروگرام کیے۔ ایک مخصوص ٹیم ہے کہ جس کے ساتھ میں کام کرتا ہوں پی ٹی وی پہ اسپورٹس کی ہیڈ شاہدہ شعیب رضوی جب مجھے بلاتی ہیں تو میں انہیں انکار نہیں کر سکتا۔ دوسرے چینلز میں اس لیے نہیں آتا کہ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔"

☆ "ایف ایم میں آمد کیسے ہوئی؟"

* "بڑی دلچسپ اسٹوری ہے اور جب بھی موقع ملتا ہے بہت شوق سے سناتا ہوں۔ جس زمانے میں میں کسی دوسرے بنک میں کام کرتا تھا تو ہم کریڈٹ کارڈ لاونچ کر رہے تھے اور جب ہم اپنی ایڈ کمپین بنا رہے

تھے تو معلوم یہ ہوا کہ ریڈیو ایڈ بھی بنا تا ہے۔ ہم نے اپنی ایڈ ایجنسی سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ ایف ایم 107 آپ کو ریکارڈنگ کی سہولت دے دے گا وہاں سے ایڈ ریکارڈ کرائیں وہاں آپ کو سستا پڑ جائے گا۔

میں نے وہاں فون کیا تو مارکیٹنگ ہیڈ کے ساتھ میری بات ہوئی انہوں نے کہا کہ آپ شام کو آجائیں ہم آپ کے ساتھ بیٹھ کر آپ کا ایڈ ڈسکس کرلیں گے.... میں نے ای میل کے ذریعے بریفنگ دی کہ ان پوائنٹس کو ہائی لائٹ کرنا ہے ہمیں اپنے ایڈ میں .... پھر شام کو آفس آف ہونے کے بعد وہاں پہنچ گیا جہاں میری ملاقات مہدی رضا صاحب جو کہ "سی او" ہیں ان کے ایک پروڈیوسر آئے اور کہا کہ آپ کے ایڈ کی یہ کاپی ہم نے لکھی ہے۔ وہ کاپی مجھے کچھ خاص اچھی نہیں لگی میں نے اس میں ترمیم کی اور کہا کہ آپ مجھے اس طرح پڑھ کر سنائیں۔ میں نے ان کو اپنے انداز میں پڑھ کر سنایا تو مہدی صاحب نے کہا کہ آپ تو خود بہت اچھا بول رہے ہیں۔ تو میں نے انہیں بتایا کہ مجھے ان کاموں سے تھوڑا لگاؤ ہے۔ کیونکہ جب میں اسکول میں تھا تو کافی ایونٹس وغیرہ ہوتے رہتے تھے پھر کچھ ٹی وی شوز بھی کیے ہیں.... ٹیچنگ بھی کی تو اس لیے بولنے کی عادت ہے۔ تب مہدی صاحب نے کہا کہ تم اپنی آواز میں ریکارڈ کروادو.... اور میں نے اپنی آواز میں ریکارڈ کروادیا۔

پھر چند دن کے بعد مہدی صاحب نے مجھے فون کر کے کہا کہ آپ ہمارے ایف ایم پہ پروگرام کرنا پسند کریں گے۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ میں تو بہت شوق سے سنتا ہوں بس تو پھر انہوں نے مجھے صبح کا پروگرام دے دیا اور وہ دن اور آج کا دن.... ہم ہیں اور ہمارا پروگرام ہے۔ ساڑھے چھ سال ہو گئے ہیں مجھے پروگرام کرتے ہوئے۔"

☆ "ماشاء اللہ میں سمجھتی ہوں کہ جتنا ٹی وی شوق سے دیکھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ ریڈیو شوق سے سنا جاتا ہے؟"

* "بالکل آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں.... اور میرا یہ خیال ہے کہ ٹی وی کے مقابلے میں ریڈیو ایک پرسنل قسم کا میڈیا ہے۔ آواز کے ذریعے سے آپ کسی کے ساتھ Relate کرسکتے ہیں مجھے نہیں لگتا کہ تصویر کے ساتھ کرسکتے ہوں گے۔"

☆ "ساڑھے چھ سال سے آپ پروگرام کررہے ہیں اتنے سالوں میں کیا کیا تبدیلیاں آئی ہیں آپ کے خیال میں؟"

* "بحیثیت ایک ریڈیو پریزنٹر کے میری اپنی کارکردگی بہت بہتر ہوئی ہے۔ لوگوں کے مزاجوں میں بہت تبدیلی نظر آتی ہے۔ جنوری 2005ء سے لے کر اب تک ہمارے ملک میں بہت سی تبدیلیاں آگئی ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ تبدیلی برائی کی طرف ہی آئی ہے۔ پہلے حالات اتنے برے نہیں تھے کہ جتنے اب ہوگئے ہیں۔ میں نے پاکستان کو ایک بہت ہی Optimistic ملک سے ایک بہت ہی Pessimistic ملک ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

اور یہ بہت ہی خطرناک اور بہت ہی خوفناک بات ہے۔ جو پاکستان کی ورکنگ پروفیشنل کلاس ہے وہ Pessimistic ہوگئی ہے۔ پاکستان کے حوالے سے۔

ان ساڑھے چھ سالوں میں لوگوں کے رویوں میں تبدیلی آئی ہے۔ لوگوں کا غصہ بڑھ گیا ہے۔ شارٹ ٹمپر ہوگئے ہیں پہلے کے مقابلے میں۔"

☆ "اپنا کراچی 107 کیا صرف کراچی تک ہی محدود رہے گا؟"

* "نہیں جی ان شاء اللہ جب آواز پورے پاکستان میں پہنچے گی تو زیادہ خوشی ہوگی۔"

☆ "اس فیلڈ میں آگے بڑھنے کے چانس ہوتے ہیں"

* "اس فیلڈ میں بڑھنے کے چانس اس شخص کے لیے ہے جو اس ایکٹویٹی کو فل ٹائم کے طور پر لینا چاہتا ہے۔ جیسے ہمارے پروگرام مینجر دانش سعید صاحب تھے، تھے اس لیے کہ اب انہوں نے ایک بہت بڑا میڈیا گروپ جوائن کرلیا ہے وہ میڈیا گروپ اپنا چینل شروع کرنے والا ہے اور دانش سعید اس کو لیڈ کریں

گے۔ تو وہ بحیثیت آر جے آئے تھے اور اب ماشاء اللہ انہوں نے کتنی ترقی کرلی ہے۔ ہر ایک کو ایسی ترقی نہیں ملتی لیکن آگے بڑھنے کے چانسز ضرور ہوتے ہیں۔"

☆ "کبھی ایسا ہوا کہ موڈ خراب ہے، طبیعت خراب ہے۔ گھر میں ٹینشن ہے اور پروگرام کرنا پڑ رہا ہے؟"

* "یہ سب کچھ ہوتا ہے اور میں ریڈیو پروگرام ان سب باتوں کو ریلیف کرنے کے لیے ہی کرتا ہوں۔ جب میں شو کررہا ہوتا ہوں تو اس وقت صرف میں ہوتا ہوں اور میرا شو ہوتا ہے۔ یہ جو دو گھنٹے ہیں یہ میرے ہیں۔ مرد کی زندگی میں دو چیزیں بری ہوتی ہیں۔ بیگم سے لڑائی اور ماں کی ڈانٹ، اگر دونوں بھی سن کر آیا ہوں تب پرفارمنس پوری ہوتا ہوں۔"

☆ "اپنے بارے میں بتائیں؟"

* "2 اگست 1980ء کو میں کراچی میں پیدا ہوا۔ والدین کا تعلق الہ آباد سے ہے۔ ان کی پیدائش انڈیا کی ہے اور ہم اردو اسپیکنگ ہیں ننھیال کا تعلق میرٹھ سے ہے۔ پاکستان ہجرت کرکے آئے تو پہلے لیاقت آباد میں رہے پھر ناظم آباد میں۔ میری پیدائش نارتھ ناظم آباد کی ہے میں اپنے شو میں بھی اسے اپنا آبائی گاؤں کہتا ہوں اور میں عید کی نماز اپنے اس آبائی گاؤں میں ہی پڑھنے جاتا ہوں۔ کیونکہ اس علاقے سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

میرے والد کا انتقال ہوچکا ہے پی آئی اے میں کافی عرصہ کام کیا انہوں نے فلائیٹ سروس سے وابستہ تھے، ان کی وجہ سے ہم نے دنیا بہت دیکھی ہے اور آج جو مجھے حالات حاضرہ سے لگاؤ ہے اور جو معلومات عامہ میرے پاس ہیں اس میں والد صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کا بڑا کردار ہے ہمیں بنانے سنوارنے میں۔

والدہ میری ہاؤس وائف ہیں.... دو بہنیں ہیں۔ دونوں ہی شادی شدہ ہیں۔ ایک کینیڈا اور ایک سعودی عرب میں ہیں۔ میری اپنی شادی جنوری 2006ء میں ہوئی اور میرے ایک صاحبزادے ہیں "احمد" شادی میری پسند سے ہوئی، میں نے آئی بی اے سے بی بی اے آنرز اور ایم بی اے کیا ہے۔ دسمبر 2002ء میں تعلیم سے فارغ ہوگیا تھا۔ اور ہاں بیگم کا نام تسمیہ ہے۔"

☆ "مزاجا" کیسے ہیں آپ؟"

* قہقہہ.... "یہ تو میرے آس پاس کے لوگ ہی بتا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ٹھنڈے مزاج کا ہوں۔ غصہ کم آتا ہے اور آتا ہے تو جلدی چلا بھی جاتا ہے ہاں آتا اچانک ہی ہے۔ چیزوں کا پریشر لینا، ٹینشن لینا یہ مجھے نہیں آتا ریلیکس رہتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مسائل دیے ہیں تو دور بھی وہی کرے گا۔ بس اللہ پر ایمان پختہ ہونا چاہیے۔"

☆ "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟"

* "چھٹی کے دن کوئی ایکٹویٹی نہیں رکھتا۔ پوری کوشش کرتا ہوں کہ فیملی کو فل ٹائم دوں۔ صاحبزادے بھی بہت خوش ہوتے ہیں کہ ان کے بابا آج گھر میں ہیں۔ تو چھٹی کے دن کہیں نہ کہیں ضرور نکل جاتے ہیں ویک اینڈ پر کھانا باہر کھاتے ہیں.... سنڈے کو ڈریم ورلڈ چلے جاتے ہیں یا رشتے داروں کے یہاں چلے جاتے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں سنڈے کو گھر پر رہوں.... کیونکہ پورے ہفتے کام کاج کے بعد ریلیکس کرنے کو دل چاہتا ہے۔ مگر بیوی اور بیٹے کا تو دل چاہتا ہے نا گھومنے پھرنے کا، تو ان کی خاطر گھر سے نکلتا ہوں۔"

☆ "کبھی کمبائن پروگرام کرنے کا اتفاق ہوا؟ اور کرنے میں مزا آتا ہے؟"

* "مجھے کمبائن پروگرام کرنے میں مزا آتا ہے لیکن اس کے لیے ہم جن کے ساتھ پروگرام کررہے ہیں اس کے لیے کیمسٹری کا ہونا بہت ضروری ہے۔ میری، دانش اور سکینہ کی کیمسٹری بہت زبردست چلتی ہے۔ اب سکینہ کی شادی ہوگئی ہے دانش بھی چلے جائیں گے۔ تو سکینہ اب دیر سے آتی ہے تو بس اس کے ساتھ تھوڑی دیر کا ہی پروگرام ہوتا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عدیل اظہر سے اجازت چاہی۔

☆ ☆

فوزیہ یاسین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی، جبکہ زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔ اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔۔۔ زوبیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے۔۔۔ وہ روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو لنچ کی دعوت دیتی ہے۔۔۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، وکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے، اور انہیں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے۔

۱۷

ستر ہویں قسط

خرم بڑی شدت سے اپنے والدین کے واپس آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے یہ تو یقین تھا کہ مسز فرقان کو نمل ضرور پسند آجائے گی' ایک تو اس لیے کہ اس نے ان کے سامنے اپنی بے تحاشا پسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا اور وہ بیٹے کی کسی خواہش کو رد نہیں کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ نمل واقعی ایسی ہی تھی کہ اسے دیکھتے ہی پسند کر لیا جائے' اس کے صرف نین نقش خوب صورت نہیں تھے بلکہ اس کے چہرے میں بلا کی کشش تھی کہ دیکھنے والا خود کو اس کی جانب کھنچتا ہوا محسوس کرے۔

اس لیے اپنے والدین کی طرف سے تو وہ کافی حد تک بے فکر تھا۔ البتہ اسے نمل کے گھر والوں کا جواب جاننے کی جلدی تھی اور اس سے بھی زیادہ خود نمل کا رد عمل کے متعلق سوچ سوچ کر وہ متجسس ہو رہا تھا۔

پتا نہیں رومیلہ نے کن الفاظ میں خرم کی بات اس تک پہنچائی ہوگی' وہ سب سن کر اگر نمل نے یقین نہیں بھی کیا ہوگا تو بھی اب اس کے والدین کو اپنے گھر پر دیکھ کر وہ اس کی باتوں پر ایمان ضرور لے آئی ہوگی۔

اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ خود بھی ساتھ چلا جائے اور نمل کے تاثرات خود اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

مگر ایک تو فرقان حسن اور مسز فرقان نے اسے چلنے کے لیے کہا ہی نہیں اور اس سے پہلے کہ وہ خود ہی ڈھیٹ بن کر کہتا مسز فرقان نے اپنے بولنے کی عادت کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہوئے خود ہی اس پر باور کرا دیا کہ اس کا فی الحال جانا مناسب نہیں' انہوں نے کہا تھا کہ۔۔۔

"میں تو اتنی بے چین ہو رہی ہوں کہ دل چاہ رہا ہے انگوٹھی بھی ساتھ ہی لے جاؤں اور خود ہی پہنا بھی دوں' کیونکہ خرم کا تو اس وقت جانا کسی بھی طرح سے ٹھیک نہیں' ایک تو ہم ابھی لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں اور تمہارے ڈیڈ نے انہیں کھل کر بتایا بھی نہیں کہ ہم کس مقصد سے آ رہے ہیں۔

نمل کو تو بے شک تم بتا دو گے' مگر نمل سے کہنا ابھی گھر میں ذکر نہ کرے ہو سکتا ہے ہمارے ارادے کا پتا چلنے پر وہ غیر ضروری تواضع اور تکلفات میں پڑ جائیں۔

بلکہ عین ممکن ہے وہ ہمیں پھر کسی دن کے لیے ٹال دیں' جبکہ مجھے تو آج اور ابھی جانا ہے۔" ان کے جوش و خروش کو ظاہر کرتی لمبی سی تقریر سن کر خرم نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

لیکن جیسے ہی وہ لوگ گھر میں داخل ہوئے خرم صبر نہ کر سکا اور عین ان کے سر پر پہنچ گیا۔

"پھر کچھ بات بنی ڈیڈ۔" خرم کی اتنی بے قراری پر وہ دونوں ہی معنی خیز انداز میں مسکرانے لگے۔

"بتائیں نا۔" خرم چڑ گیا تھا ان کی مسکراہٹ کا مطلب سمجھتے ہوئے۔

"بھئی کیا بتائیں' اپنی بات ان کے آگے رکھ کر آ گئے ہیں' اب کچھ دن تو لگیں گے نا انہیں سوچنے میں۔

بیٹی اتنی بھاری تو کسی پر بھی نہیں ہوتی کہ سنتے ہی ہاں کر دیں اور اگر زیادہ غور و فکر کرنے والے لوگ ہوئے تو مہینہ بھی لگ سکتا ہے۔" فرقان حسن نے ایک جان دار قہقہہ لگانے کے بعد کہا تو خرم صرف انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

وہ دونوں جس قدر خوش نظر آ رہے تھے اس سے اتنا تو ظاہر تھا کہ وہاں جا کر انہیں مایوسی نہیں ہوئی' پھر بھی خرم نے ان کے چھیڑنے کی پروا کیے بغیر دو ٹوک پوچھ لیا۔

"اور نمل کیسی لگی آپ دونوں کو۔" اب کی بار وہ دونوں جواب دینے کی بجائے اسے گھورنے کے انداز میں دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا؟" خرم کچھ ٹھٹک سا گیا۔

"فرض کرو اگر ہم کہہ دیں کہ بالکل اچھی نہیں لگی تو کیا تم اسے چھوڑ دو گے۔" مسز فرقان نے تھوڑا ڈپٹنے والے انداز میں کہا۔

"جی۔" خرم کی سمجھ میں نہ آیا کیا جواب دے' اسے پریشان دیکھ کر مسز فرقان کھلکھلا کر ہنس دیں اور کہنے لگیں۔

"اتنا ٹینس ہونے کی ضرورت نہیں' تمہاری پسند یقیناً" اچھی ہی ہوگی' لیکن افسوس کی بات ہے کہ نمل سے ملاقات نہیں ہو سکی' وہ گھر پر ہی نہیں تھی۔

کیا تم نے اسے بتایا نہیں تھا ہماری آمد کے متعلق۔"

"آں۔۔۔ وہ۔" ابھی خرم سوچ ہی رہا تھا کیا جواب دے کہ فرقان حسن بول پڑے۔

"بتایا بھی ہوتا تو بھی نمل شاید نہ رکتی' اس کے گھر کا ماحول کافی پوزیسو ہے۔

مجھے تو جیسے ہی عظمت خلیل کی ذہنیت کا اندازہ ہوا میں نے فوراً" اس رشتے کو تمہاری یک طرفہ پسند ظاہر کر دیا۔"

یہ کہہ کر فرقان حسن نے نمل کے گھر پر ہوئی تمام گفتگو کا احوال خرم کو سنا دیا اور آخر میں کہنے لگے۔

"نمل نے تمہارا کوئی ذکر نہیں کیا ہے گھر میں اور مجھے لگتا ہے عظمت خلیل اس معاملے میں اس کی رائے کو زیادہ اہمیت بھی نہیں دیں گے' حالانکہ انہوں نے کہا تو ہے کہ سب سے مشورہ کروں گا۔

مگر جو تاثرات میں نے ان کے چہرے پر دیکھے ہیں اس سے لگتا نہیں کہ ایسا ہوگا۔" فرقان حسن کا مشاہدہ کافی اچھا تھا اور کیوں نہ ہوتا اتنا بڑا بزنس چلا رہے تھے' طرح طرح کے لوگوں سے ملتے تھے۔

خرم ان کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا تو وہ اسے سنجیدہ دیکھ کر ماحول خوش گوار بناتے ہوئے کہنے لگے۔

"نمل کو متاثر کر لینا کافی نہیں ہے' عظمت خلیل کا دل تمہیں الگ جیتنا ہوگا' گھر میں اپنا حلیہ ہر وقت اچھا رکھا کرو' ہو سکتا ہے وہ بھی ہماری طرح بغیر بتائے چھاپہ مار دیں۔" ان کے شوخ انداز پر خرم خود کو مطمئن ظاہر کرنے کے لیے زبردستی مسکرا دیا۔

اصل میں وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ عظمت خلیل کا نمل کی رائے لینا اس کے حق میں بہتر ہے یا نہ لینا۔

عظمت خلیل کا فوری طور پر اس رشتے کے بارے میں کچھ بھی سوچنے کا ارادہ نہیں تھا۔ ایک طرح سے ان کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں تھا کہ نمل کے لیے آئے رشتوں پر غور و غوض کرتے اور پھر ان کے پیچھے معلومات کراتے پھرتے۔

انہیں ہزار کام تھے جو ان کی نظر میں نمل کی شادی سے زیادہ اہم تھے۔ نمل کی شادی کا کیا تھا وہ تو کبھی بھی ہو سکتی تھی۔

البتہ رشیدہ کو کافی تجسس تھا کہ عظمت خلیل نے اس رشتے کے متعلق کیا سوچا ہے۔ حالانکہ انہیں یہ بھی اندازہ تھا کہ عظمت خلیل نے فی الحال اس پروپوزل پر غور بھی نہیں کیا ہوگا۔ مگر پھر بھی انہیں بے چینی سی ہو رہی تھی۔

ایک تو ماں ہونے کی حیثیت سے بیٹی کے لیے پھیلایا گیا ہر دست سوال ان کے لیے اہم تھا' دوسرے یہ کہ انہوں نے نمل کے منہ سے خرم کا ذکر سنا تھا۔

حالانکہ نمل نے ہمیشہ اس کی برائی میں بات کی تھی۔ مگر رشیدہ کے دل میں خرم کے لیے کوئی میل نہیں تھا۔ وہ تو نمل کے غصے کو بھی اس کا جذباتی پن کہتی تھیں۔ (وہ خرم کی بہت ساری باتوں سے واقف نہیں تھیں' جیسے کہ دوستوں کے ساتھ نمل سے فلرٹ کرنے کی شرط لگانا یا نمل کو چھیڑنے کے لیے غنڈے وغیرہ بھیجنا کم از کم نمل تو یہی سمجھتی تھی کہ سب خرم نے کیا ہے' مگر اس نے رشیدہ کے پریشان ہونے کے خیال سے انہیں ان باتوں کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ ورنہ ان سے ہر بات ڈسکس کرنا اس کی عادت تھی)

مگر ہزار رہا بے چینی کے باوجود وہ عظمت خلیل سے کچھ پوچھ نہ سکیں۔ ایک تو ویسے ہی ان سے بات کرنا رشیدہ

کے لیے سوہان روح تھا اور اب تو جب سے نمل کینیڈا گئی تھی وہ ہر وقت ہری مرچیں چبا رہے ہوتے تھے' یہ تو شکر تھا کہ وہ اتنے مصروف رہتے تھے کہ انہیں کھل کر غصہ کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا تھا۔ مگر وہ جتنی دیر بھی گھر میں رہتے رشیدہ کی جان عذاب کیے رہتے' ان کی کوشش ہوتی وہ ان کے سامنے کم سے کم جائیں' مگر وہ ان کی ذات سے لاپروا بھی نہیں ہو سکتی تھیں' اپنی خدمت گزار فطرت کے باعث ملازموں کی موجودگی میں بھی ان کی کوشش ہوتی کہ ان کا کام خود کریں۔

نمل ان کی اس عادت پر چڑتی بھی تھی' مگر ان میں فرق نہیں آتا تھا' اس وقت بھی وہ عظمت خلیل کی چائے ان کے سامنے رکھ رہی تھیں' جب ان کا موبائل بج اٹھا۔

"اتنی صبح صبح ابرار کا فون۔" عظمت خلیل نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا تو رشیدہ بھی چونکی ہو کر انہیں دیکھنے لگیں۔

ان کا دل تو ویسے ہی ہر وقت خوف زدہ رہتا تھا' اب بھی کسی انہونی کا سوچ کر وہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئیں جو فون ریسیو کر کے کہہ رہے تھے۔

"ہیلو... ہاں... وعلیکم السلام... ہاں' ہاں گھر پر ہوں' ابھی آفس کے لیے نکل رہا تھا آخر کیا بات ہے۔" وہ ایسے لٹھ مار انداز میں جواب دے رہے تھے جیسے دوسری طرف ابرار بڑی تیزی سے ان سے ایک کے بعد ایک سوال کر رہا ہو۔

"ماموں بات جو ہے وہ اتنی شرمناک ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے بتاؤں۔" ابرار نے سلام بھی اتنے غصے بھرے انداز میں کیا تھا کہ عظمت خلیل ٹھٹک گئے تھے۔ اب اس کے منہ سے ایسی بات سن کر تو وہ فوراً ازحد گمبھیر لہجے میں پوچھنے لگے۔

"کیا بات ہے ابرار' اب کیا کر دیا ہے نمل نے۔" رشیدہ کی سانس رک گئی تھی' ان کے جملے اور جملے کی طرز ادائیگی پر۔

"ماموں نمل وہاں صرف اور صرف گلفام سے ملنے اور اسے دیکھنے گئی ہے۔" ابرار نے ایسے بتایا جیسے یہ سن کر عظمت خلیل چونک اٹھیں گے۔

مگر عظمت خلیل نے کسی قسم کے ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا' وہ تو ابرار کا تنفس دیکھتے ہوئے اس کی پوری بات سننے کے منتظر تھے، جو اصل بات سے ہٹ کر نمل کی تعریف میں رطب اللسان ہو گیا تھا۔

"آخر وہ اتنی بڑی کب سے ہو گئی کہ بڑوں کے فیصلوں کو دیکھنے اور پرکھنے نکل پڑی' کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہے نمل یہ سب کر کے' آخر میں نے یہ فیصلہ کچھ سوچ کر ہی کیا ہو گا رومیلہ میری بہن ہے کوئی سڑک سے اٹھائی ہوئی لے پالک نہیں۔

لیکن نمل نے آپ سے ذکر تک کیے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھا لیا کیا سمجھتی ہے وہ خود کو۔"

"مجھے تو پتا ہے۔" عظمت خلیل کو اس کی بات کاٹ کر بولنا پڑا۔

وہ بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی انہیں نیچا دکھائے' بھلے ہی نمل کے جانے کی وجہ انہیں بھی اس کے جانے کے بعد پتا چلی تھی اور انہیں بھی سخت بے عزتی کا احساس ہوا تھا' مگر یہ بات دوسروں کو کیوں پتا چلے کہ ان کی اولاد ان کی اجازت کے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھا سکتی ہے اس طرح تو ان کی اور سبکی ہو جائے گی۔

اب یہ کہہ کر انہوں نے اپنا بھرم تو رکھ لیا تھا۔ مگر ابرار کا دماغ بالکل ہی گھوم گیا' وہ تو چلا پڑا۔

"کیا؟ آپ کو پتا تھا؟

تو یعنی وہ آپ کی اجازت سے وہاں گئی ہے' مجھے یقین نہیں آ رہا ماموں' آپ اتنے بے غیرت کیسے ہو گئے۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو ابرار۔" عظمت خلیل جلال میں آتے ہوئے بولے' مگر ابرار پر اثر نہ ہوا وہ ان سے

بھی زیادہ طیش میں آتے ہوئے بولا۔

"نہیں زبان سنبھال کر بات کروں؟ میں... ارے ماموں آپ کو نمل کو سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہے میرے دوست کی بیوی نے فون کر کے نمل کے بارے میں جو بتایا ہے نا اسے سن کر تو دل چاہ رہا ہے اسے گولی مار دوں۔"

"آخر ایسا کیا ہو گیا؟" عظمت خلیل کا سرخ ہوتا چہرہ رشیدہ کے ہاتھ پاؤں پھلا رہا تھا۔

"ارے رہنے دیں ماموں آپ تو اتنے آزاد خیال ہو گئے ہیں کہ شاید نمل کی اس حرکت کا سن کر بھی آپ کہہ دیں گے مجھے پتا ہے۔"

"ابرار تمیز سے بات کرو اور صاف صاف کہو کیا کیا ہے نمل نے۔" عظمت خلیل چیخ کر بولے۔

"نمل وہاں جا کر میرے دوست کے ساتھ اتنی بے تکلف ہو گئی ہے کہ اس کی بیوی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

وہ فون پر اتنا رو رہی تھی کہ میں تو آپ لوگوں کو خاندانی سمجھتی تھی' عزت دار اور شریف گھرانوں کا سمجھتی تھی اور آپ کی کزن نے آتے ہی میرے شوہر کو اپنی اداؤں کے جال میں پھنسا لیا ہے کہ وہ اس کے پیچھے بھی اس کی حمایت میں بول رہے ہوتے ہیں۔

جعفر کو تو میں نے فون کر کے خوب ہی سنائی ہے' میں اسے کیا سمجھتا تھا اور وہ کیا نکلا۔ لیکن... لیکن نمل کو قابو میں رکھنے کی سخت ضرورت ہے۔" عظمت خلیل بے یقینی سے ابرار کی بات سنے گئے۔

یہ بات نہیں تھی کہ انہیں اپنی بیٹی پر بڑا مان تھا یا بھروسہ تھا' لیکن انہیں لوگوں کی پہچان کافی تھی' اسی لیے نمل سے کئی نظریاتی اختلاف ہونے کے باوجود انہیں اتنا ضرور یقین تھا کہ وہ کافی اصولی قسم کی لڑکی ہے اور اس قسم کے خرافات میں نہیں پڑتی۔

خرم اس کے ساتھ پڑھتا تھا' پھر بھی انہوں نے فوراً یقین کر لیا تھا کہ یہ خرم کا یک طرفہ فیصلہ ہے' کیونکہ اپنی تربیت پر بھروسہ نہ سہی (جو کام کیا ہی نہیں اس پر بھروسہ کیا کرتے) اپنے تجربے پر انہیں بڑا مان تھا اور نمل اور اس کی ماں کے لیے ان کی حتمی رائے یہ ہی تھی کہ چاہے انہیں مار دو پھٹکار دو' مگر گو یہ خاندانی اقدار کی پاس دار ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتیں جو انہیں ان کی نظروں میں گرا دے۔

ایسے میں نمل کے لیے یہ کہنا کہ اس نے ایک شادی شدہ مرد اور ایک بچے کے باپ کو اداؤں کے جال میں پھانس لیا ناقابل یقین تھا۔

"تمہارے دوست کی بیوی کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔ ورنہ..."

"ماموں بس کریں جو میں نے سنا ہے نا اسے سنانے اور سننے کے لیے پتھر جیسا کلیجہ چاہیے۔

میرے دوست کی بیوی ڈاکٹر ہے اس کا دماغ خراب نہیں ہے، جو بلاوجہ ایسی باتیں کرے کچھ دیکھا ہے۔ اس نے تب ہی ایسا کہہ رہی ہے۔"

"ابرار میرے ضبط کو مت آزماؤ' اتنی بکواس کرنے کی بجائے صاف صاف بتاؤ ہوا کیا ہے۔" عظمت خلیل بری طرح تپ کر بولے تو دوسری طرف ابرار بھی بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"نمل جب جعفر کے ساتھ ایئرپورٹ سے گھر گئی ہے تو اس کی فیملی گھر پر موجود نہیں تھی' پوری رات دونوں گھر میں اکیلے رہے ہیں۔"

عظمت خلیل کو لگا کوئی بم ان کے سر پہ پھٹا ہو اتنا زوردار دھماکا تھا کہ وہ سر سے پیر تک ہل گئے تھے۔

"اب آپ خود بتائیں یہ سب بھلا کون سی عورت برداشت کرے گی۔ اگلے دن جب وہ اپنی ڈیوٹی سے واپس آئی تو اس نے جعفر اور نمل میں اتنی بے تکلفی اور دوستانہ انداز دیکھا کہ وہ بھڑک اٹھی۔

ایسے میں بجائے اس کے کہ نمل کچھ شرمندہ ہوتی اس سے معافی مانگتی وہ اسے ہی باتیں سنانے لگی۔

وہ بے چاری روتی ہوئی گھر چھوڑ کر چلی گئی' مگر جعفر کے سر پر نمل کا جادو اتنا چڑھا ہوا تھا کہ اس نے بیوی کو روکا تک نہیں۔" عظمت خلیل کے کان ایسے جھنجنا رہے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

مگر ابرار ان کی حالت کا اندازہ لگائے بغیر نان اسٹاپ بولے جا رہا تھا۔

رشیدہ تو دم بخود کھڑی عظمت خلیل کو دیکھ رہی تھیں جن کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ وہ یہ تو سمجھ گئی تھیں کہ ابرار' نمل کے متعلق کچھ کہہ رہا ہے' کچھ ایسا جو بہت برا اور غلط ہے' لیکن جو ابرار کہہ رہا تھا وہ رشیدہ کے گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔

"جب سے میں نے یہ سب سنا ہے میرا دل چاہ رہا ہے خودکشی کرلوں' آخر نمل ہم سب کی عزت ہے۔ ماموں آپ نے ایک جوان بیٹی کو اتنی دور تن تنہا کیا سوچ کر بھیجا تھا۔ یہ دیکھنے کہ 'گلفام' رومیلہ کے قابل ہے یا نہیں۔

اب آپ خود سوچیں کیا نمل کسی کے قابل رہی ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے ہم یہ بھی فرض کرلیں کہ ان دونوں کے بیچ کچھ نہیں ہوا تو نمل کا رویہ اس سوچ میں حائل ہو رہا ہے۔

جعفر کی بیوی نے جب اتنا بڑا الزام اس پر لگایا تو اس میں سچائی تھی یا نہیں نمل کو خودداری کا تقاضا پورا کرتے ہوئے فوراً" واپس آجانا چاہیے تھا۔

مگر وہ بے شرم اور بے حیا تو ابھی تک وہیں رہ رہی ہے' جعفر کی بیوی گھر چھوڑ کر چلی گئی' مگر وہ جعفر کو چھوڑ کر نہیں آرہی۔" ابرار ایک سا چیخے جا رہا تھا۔

وہ تو نمل کا فون نہیں ملا تھا ورنہ اس سے بھی زیادہ گرے ہوئے الفاظ میں وہ نمل پر اپنی بھڑاس نکالتا۔

اس نے جعفر سے بھی ایسے ہی بات کی تھی اور اسے کچھ بولنے نہیں دیا تھا ورنہ جو کچھ جعفر نے کہا تھا ابرار نے اس پر کون سا یقین کیا تھا۔

جعفر نے اسے بتایا تھا اس کی بیوی کی عادت ہے' چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑ کر گھر چھوڑ دینے کی۔ اس کی ان ہی حرکتوں کی وجہ سے اس نے اپنے بیٹے کو بورڈنگ بھیج دیا تھا۔ مگر شرین میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

ابھی بھی موڈ ٹھیک ہونے پر وہ خود ہی لوٹ آئے گی' اسے مہمان داری وغیرہ سے سخت چڑ ہے۔ اس نے یہ سارا ڈرامہ اس لیے کیا ہے تاکہ میں آئندہ کسی کو گھر نہ بلاؤں۔ ورنہ وہ خود بھی جانتی ہے کہ میں اس قسم کا نہیں ہوں کہ مجھ پر شک کیا جائے۔

اور نمل تو تب سے ہوٹل میں رہ رہی ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ اسے سیٹ نہیں ملی۔ ورنہ وہ فوراً" واپس آجاتی' اب جو فلائٹ اسے ملی ہے اس میں دو دن لگ جائیں گے پاکستان پہنچنے میں۔

مگر ابرار نے اس کی ساری باتیں ان سنی کردی تھیں' وہ تو بس روایتی غیرت مند بھائی کی طرح بس نمل کو قتل کردینا چاہتا تھا۔

جبکہ عظمت خلیل کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا چاہ رہے ہیں' اتنی بڑی بات اپنی بیٹی کے متعلق سن کر بھی انہیں بیٹی کی فکر نہیں ہوئی تھی۔

کہ جانے ابرار کا وہ دوست کیسا آدمی تھا جوان کی بیٹی کو اپنے خالی گھر میں لے گیا اور اتنا کچھ ہونے کے باوجود اب بھی اسے واپس نہیں آنے دے رہا۔

انہیں بس یہ تشویش تھی کہ اب ابرار سے ایسا کیا کہیں کہ ان کا دامن صاف ہو جائے۔

یہ تو وہ کہہ چکے تھے کہ نمل ان کی اجازت سے گئی ہے' اب اس بات سے تو مکر نہیں سکتے تھے' پھر کیا صفائی دیں کہ ان کا نمل کو بھیجنا کوئی غلط فیصلہ نہیں تھا۔

بہت سوچنے پر بھی جب ذہن کوئی اچھا بہانہ بنانے کے قابل نہیں ہوا تو انہوں نے جھنجلا کر — کچھ کہے بغیر فون بند کردیا اور اپنی بے بسی کو شدت سے محسوس کرتے تلملا کر کھڑے ہوگئے۔

رشیدہ جو فکرمندی سے انہیں ہی دیکھ رہی تھیں ان کے انداز دیکھ کر ڈر کے مارے کچھ پوچھ ہی نہ سکیں۔ مگر وہ سامنے ہی تو موجود تھیں عظمت خلیل کی جیسے ہی ان پر نظر پڑی ان کا چڑھا ہوا پارہ ہر حد پھلانگتا بالکل ہی ٹوٹ گیا۔

انہوں نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ رشیدہ کے منہ پر مارا تھا کہ رشیدہ وہیل چیئر پر ایک طرف کو لڑھ گئیں' اتنا زوردار ہاتھ تھا اور اتنے غصے میں اٹھا تھا کہ رشیدہ کا پورا جبڑا ہل گیا تھا۔

ایک تھپڑ مار کر عظمت خلیل کے احساس بے بسی میں ذرا سی کمی آئی تھی تو وہ خود کو تھوڑا بہتر محسوس کرنے لگے۔ ابرار کے سامنے بولنے کی جو صلاحیت سلب ہوگئی تھی۔ وہ دوبارہ بحال ہوگئی اور وہ رشیدہ پر برس پڑے اور ابرار کی کہی ایک ایک بات دہرانے لگے۔

رشیدہ ان کی بات سن کر سفید پڑ گئی تھیں' وہ زوردار تھپڑ اور عظمت خلیل کا شدید ترین غصہ کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا جو کچھ انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے سنا تھا اسے سننے کے بعد ہر چیز ثانوی حیثیت اختیار کرگئی تھی۔

آج سے کئی سال پہلے جب وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی تھیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس وہیل چیئر کی محتاج ہوگئی تھیں۔

تب انہیں لگا تھا کہ زندگی میں اس سے بڑا نقصان اور کوئی نہیں ہوسکتا' اب آئندہ زندگی میں جتنے مسائل آئیں وہ سب اس ایک سانحہ کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوں گے۔

مگر آج اتنے سال بعد ان کی سوچ نے کروٹ لی تھی' آج جو صدمہ انہیں پہنچا تھا اس کے سامنے انہیں اپنی طویل عرصے کی اپاہج کی زندگی بھی کچھ نہیں لگ رہی تھی۔

پہلی بار عظمت خلیل کے چیخنے اور بگڑنے کا ان پر اثر نہیں ہو رہا تھا' بلکہ وہ سن ہی نہیں رہی تھیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں' ان کی آنکھوں کے سامنے اپنی بیٹی جو ان کی کل کائنات تھی اس کا چہرہ گھوم رہا تھا اور وہ بت بنی اسے دیکھ رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

وہ بت بنی اسے دیکھ رہی تھی اور رومیلہ اس کی کیفیت کو محسوس کرکے مسکرائے جا رہی تھی۔ آخر جب سنبل کچھ بولنے کی بجائے اسے دیکھے ہی گئی تب رومیلہ کو ٹوکنا پڑا۔

"اب واپس بھی آجاؤ' کب تک مراقبے میں رہوگی۔"

"کیا خرم نے خود تم سے یہ سب کہا تھا۔" وہ بے یقینی سے بولی۔

"تو پوری کہانی سننے کے بعد تم پوچھ رہی ہو کہ زلیخا مرد تھی یا عورت۔" رومیلہ نے سر پیٹنے والے انداز میں کہا' پھر قدرے شوخ ہوتے ہوئے بولی۔

"میں نے تو اسی وقت تمہیں فون کیا تھا۔ مگر موصوفہ اپنا موبائل چارج کیے بغیر کہیں رکھ کر بھول گئیں' تب مجھے آنٹی (سنبل کی والدہ) کو فون کرنا پڑا۔

اب ان سے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ جس کے ڈر سے سنبل یونیورسٹی سے چھٹی کیے بیٹھی ہے اس لڑکے نے سنبل سے شادی کی خواہش ظاہر کی ہے۔ چنانچہ بس اتنا کہا کہ اس سے کہیں ضروری اسائنمنٹ ہے' کل چھٹی نہ کرے' بلکہ ہوسکے تو مجھے فون کرلے۔

لیکن تم تو بازار کے لیے نکلی ہو تو گھر آنا ہی بھول جاتی ہو' میں سمجھ ہی گئی تھی تم اپنی کزنز کے ساتھ گئی ہوگی اور

وہاں سے اتنی دیر میں واپسی ہوئی ہوگی کہ مجھے فون نہیں کر سکیں' اسی لیے جب صبح تمہارا فون آیا تو میں نے سوچا اب سب کچھ تمہیں روبرو ہی بتاؤں گی۔

اللہ کا شکر ہے کہ تم اپنے خوف پر قابو پا کر آگئیں۔" رومیلہ کہتی چلی گئی۔

"میں نے کوئی قابو وابو نہیں پایا ہے' امی نے زبردستی بھیج دیا کہ بہت چھٹیاں کرنے لگی ہو رومیلہ نے کسی ضروری اسائنمنٹ کا ذکر کیا ہے' تمہیں جانا پڑے گا۔

اور تب مجھے پتا چلا کہ تم کتنی بہادر ہو' تم نے کہا تھا کہ میں جا رہی ہوں اور تم واقعی چلی بھی گئیں۔ مجھے تو لگ رہا تھا تم اپنا ارادہ بدل لوگی' خیر وہ سب چھوڑو۔

یہ بتاؤ کیا خرم نے واقعی یہ ہی الفاظ کہے تھے جو تم نے بتائے ہیں۔" سنبل ابھی تک بے یقین تھی۔

"کیا ہو گیا بھئی' سب کچھ لفظ بہ لفظ بتا تو دیا ہے۔ حیرت تو مجھے بھی ہوئی تھی' لیکن پھر لگا کہ یہ بات تو میں نے بہت پہلے ہی نوٹ کرلی تھی۔" رومیلہ مسکرائی' اسے مطمئن دیکھ کر سنبل بھی شاک سے باہر آنے لگی۔ اچانک ہی چھم سے خرم اور نمل ایک ساتھ کھڑے اس کے ذہن میں آگئے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

"ہوں کپل تو واقعی اچھا ہے' کافی سوٹ کر رہے ہیں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ۔"

"دھیرج میری بہن دھیرج۔ اتنا تیز دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے' کیا پتا نمل مانتی بھی ہے یا نہیں۔" رومیلہ نے تسلی دینے والے انداز میں سرہلایا۔

"کیوں اسے کیا اعتراض ہوگا' اتنا تو چارمنگ ہے خرم۔ بس ایک بات پر غصہ تھا کہ اس نے نمل کے پیسے چرائے تھے تو وہ بھی اس نے کب کے واپس کر دیے۔"

"اب بغیر کسی تصدیق کے یہ یقین کرلینا کہ خرم نے ہی اس غنڈے کو بھیجا تھا' یہ تو ٹھیک نہیں ہے نا۔ ایسی بدتمیزی تو کوئی بھی کر سکتا ہے نا۔" سنبل جرح کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں وہ تو ہے' چلو کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔" رومیلہ کے اچانک کہنے پر سنبل چونک گئی' وہ دونوں اس وقت ڈیپارٹمنٹ کے باہر ایک چبوترے پر بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا' خیریت۔" سنبل نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہاں جو لڑکے کھڑے ہیں' وہ ہمیں دیکھ کر باتیں کر رہے ہیں۔" رومیلہ نے سنبل کی پشت کی طرف اشارہ کیا تو سنبل نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا۔

وہ کسی دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے لڑکے تھے۔ مگر ان کی نظریں یہیں مرکوز تھیں اور انداز ایسے تھے جیسے ان دونوں کے متعلق ہی بات کر رہے ہوں۔

سنبل اور رومیلہ دونوں ایک ساتھ کھڑی ہو گئیں اور اپنے ڈیپارٹمنٹ میں چلی گئیں' لیکن بہت جلد انہیں احساس ہوا کہ وہ جہاں سے بھی گزر رہی ہیں لوگ انہیں بغور دیکھنے لگتے ہیں اور کچھ لوگ تو فوراً "کھسر پھسر" بھی شروع کر دیتے ہیں۔

"یہ کیا ماجرا ہے۔" سنبل نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا تو رومیلہ لاعلمی کے اظہار کے طور پر محض کندھے اچکا کر رہ گئی۔

مگر کچھ ہی دیر میں ان پر سارا ماجرا کھل گیا' جب وہ پیریڈ اٹینڈ کرنے اپنی کلاس میں داخل ہوئیں تو کلاس کی لڑکیاں انہیں دیکھتے ہی ان کے اردگرد جمع ہو گئیں۔

"تم لوگوں کے ساتھ آج نمل نظر نہیں آرہی۔" ان کے انداز میں اتنا تجسس اور اشتیاق دیکھ کر وہ دونوں

ٹھٹک گئیں۔

"کیا اس نے بھی خرم کی طرح چھٹی کرلی۔" ایک لڑکی نے کہا تو سب ہنس پڑیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتیں ایک لڑکی بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"تم سب کا چہرہ تو کلیئر پہچاننے میں آرہا ہے' مگر وہ لڑکا کون ہے۔ جس نے نمل کو چھیڑا تھا' جس سے بھی بات کرو کوئی بھی اسے نہیں جانتا' وہ اس یونیورسٹی کا ہے بھی یا نہیں۔"

"پتا نہیں یار میں نے تو آج ہی اس ویڈیو کے بارے میں سنا ہے' دیکھی تو ہے نہیں' جو کچھ بتا سکوں۔" ایک لڑکی بولی۔

"اور میں تو پتا نہیں کب دیکھ سکوں' میرے گھر میں تو کمپیوٹر ہے ہی نہیں۔" ایک اور نے یاسیت سے کہا۔

سنبل اور رومیلہ ہونق بنی ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ جبکہ وہ سب ایک سا بولے جا رہی تھیں۔

"ویسے نمل نے خرم کو تھپڑ مار کر اچھا نہیں کیا۔"

"ہاں وہ تو ہے۔"

"ارے اس نے مارا سو مارا' لیکن یہ مووی کس نے بنالی اور فیس بک میں بھی ڈال دی۔" اب تو رومیلہ اور سنبل کی حالت بری ہوگئی تھی' آخر رومیلہ نے ہی خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ... کیا باتیں کر رہی ہو ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ کون سی مووی' کیسی مووی۔"

"کمال ہے تم لوگوں کو کچھ پتا ہی نہیں یہاں تو کل شام سے تمام اسٹوڈنٹس کے آپس میں میسجز گھوم رہے ہیں تو یوں سمجھ لو ہمارے علاوہ دوسرے ڈیپارٹمنٹ تک یہ بات پہنچ چکی ہے۔" ایک حیرانی سے بولی۔

"جی ہاں رات کے ایک بجے جب میں نے کمپیوٹر لگایا ہے تب تک پچاس سے زیادہ اسٹوڈنٹس اس پر کمنٹس دے چکے ہیں۔" دوسری نے مطلع کرنا ضروری سمجھا۔

مگر رومیلہ اور سنبل کو بدستور ہونق بنا دیکھ کر آخر انہوں نے پوری بات شروع سے انہیں سمجھائی۔

جسے سننے کے بعد ان دونوں کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

خرم پر شدید قسم کی بوریت سوار تھی وہ زندگی میں کبھی اس طرح منہ چھپا کر نہیں بیٹھا تھا۔

مگر اب جو صورت حال تھی اس میں وہ کسی کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے اپنا موبائل مستقل آف کر رکھا تھا تو نادر اور ہارون اس کے گھر آگئے اس سے ملنے کے لیے۔

انہوں نے اسے بتایا' اس واقعے کے بارے میں پوری یونیورسٹی کو پتا چل چکا ہے پہلے دن تو سب بیٹھے اسی موضوع پر بات کرتے رہے ہیں۔

لیکن خرم کی طرح نمل بھی تب سے نہیں آرہی اس کی دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ ملک سے باہر گئی ہوئی ہے۔ مگر یونیورسٹی میں اس بات پر کسی نے بھی یقین نہیں کیا ہے' سب کا خیال ہے کہ وہ گھر میں منہ چھپائے بیٹھی ہے خرم کی طرح۔

یہ بات خرم کو کسی کاری ضرب کی طرح لگی تھی مگر وہ کر ہی کیا سکتا تھا اپنے ارادوں کے بارے میں اس نے تب بھی انہیں کچھ نہیں بتایا۔

وکی اور حمید بھی تیسرے دن اس سے ملنے آئے اور آکر خوب سنائی بقول ان کے وہ اس کی سوئی ہوئی غیرت کو جگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ان کے خیال میں خرم کو نمل سے بڑا سنگین قسم کا بدلہ لینا چاہیے تھا۔

ایک لمحے کو تو واقعی خرم کا بھی دل چاہا کہ ایسا ہی کوئی قدم اٹھالے کیا وہ شرافت سے بیٹھا اس کے ماں باپ کے جواب کا انتظار کر رہا ہے کہیں ڈیڈ کے کہے کی طرح ان لوگوں نے جواب دینے میں مہینوں لگا دیے تو یونیورسٹی میں تو سب کو ایسا ہی لگے گا کہ اس نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں اور کیا پتا اتنے انتظار کے بعد اس کے گھر والے انکار ہی کردیں اور وہ اپنی ہی نظر میں بالکل احمق بن کر رہ جائے۔

لیکن پہلے حمید اور وکی وغیرہ کے اکسانے پر وہ ایسا کر بھی گزرتا مگر اب جبکہ سب ہی اس تھپڑ کے بارے میں جان گئے تھے بلکہ live telecast دیکھ چکے تھے تو اب کوئی انتہائی قدم اٹھا کر بھی اس کا کھویا ہوا مقام نہیں مل سکتا تھا۔

نمل کی زندگی تباہ کردینے کے باوجود وہ اس داغ کو نہیں دھو سکتا تھا کہ ایک لڑکی نے اسے اس بری طرح دھتکار دیا۔

اب تو اسے ان سارے لوگوں کے سامنے کچھ ایسا کرنا تھا کہ اس کا وقار بحال ہو جائے۔

اور اس کی واحد صورت اس کے نزدیک یہی تھی کہ نمل کے ساتھ اس کی شادی ہو جائے مگر یہ سب اس کی خواہش کے مطابق ایک دن میں نہیں ہو سکتا تھا بلکہ قاعدے قانون کے مطابق کئی ہفتوں یا مہینوں میں ہونا تھا اور یہی چیز خرم کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

وکی اور حمید نے گھر آکر اس کا موڈ اور بھی خراب کردیا تھا لہٰذا اسے ڈانٹ کر انہیں گھر سے نکالنا پڑا تھا وہ دونوں تو تھے ہی بیدا کشی ڈھیٹ وہ بھی یہ کہتے اٹھ گئے۔

"نمل نے تھپڑ مار دیا ہے تو ہم پر کیوں غصہ نکال رہے ہو چلو حمید چلتے ہیں۔

جا رہے ہیں ہم مگر زیادہ خوش مت ہونا کل پھر آئیں گے تمہاری جان نہیں چھوڑیں گے۔" وکی تپانے والے انداز میں کہتا حمید کے ساتھ چلا گیا۔

خرم بھنایا ہوا سا فرقان حسن کے سامنے پہنچ گیا جو اسی وقت آفس سے آئے تھے اور خاصے تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔

"ڈیڈ عظمت خلیل نے کیا جواب دیا؟"

"کیا ہو گیا ہے خرم؟ ابھی دو دن پہلے ہی تو ہم ان کے گھر گئے ہیں تمہیں سمجھایا بھی تھا کہ ایسے معاملوں..."

"مجھے نہیں سننا ایسے معاملوں میں کیا ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے۔

مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ آپ انہیں روز فون کر کے جواب مانگیں گے تو وہ اس رشتے پر غور کریں گے۔"

خرم نے ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی درمیان میں کاٹ دی۔

"تم اتنے گرے پڑے نہیں ہو کہ ہمیں روز فون کر کے انہیں یاد دلانا پڑے۔

عظمت خلیل کو جب مناسب لگے گا وہ فون کر کے تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کریں گے جو بھی فیصلہ ہوگا تم سے ملنے کے بعد ہی ہوگا نا۔" فرقان حسن دانت پیس کر بولے۔

پہلے ہی وہ ان کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا مگر اس معاملے میں اس کی اتنی بے قراری انہیں جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی انہیں خرم سے اتنی جذباتیت اور بچکانہ رویے کی توقع نہیں تھی۔

"تو چلیں میں ابھی چل کر ان سے مل لیتا ہوں۔" خرم کا جواب انہیں سر تا پا سلگا گیا تھا اور یہ بات ان کے چہرے سے صاف ظاہر بھی ہو گئی تھی اسی لیے اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے مسز فرقان بیچ میں آگئیں۔

"آپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں بیٹھ جائیں۔ میں خرم سے بات کرتی ہوں۔

"دیکھو بیٹے تمہارا اس طرح پہنچ جانا تو کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ ہاں اگر تمہیں اتنی ہی جلدی ہے تو عظمت خلیل سے فون پر بات کی جاسکتی ہے ہمارے اصرار پر تو انہیں خوشی ہوگی کہ ہم ان کی بیٹی کو اتنے شوق اور مان سے مانگ رہے ہیں۔" انہوں نے خرم سے نہیں بلکہ فرقان حسن سے کہا تھا مگر فرقان حسن کا موڈ دیکھتے ہوئے انہوں نے نظریں خرم کے چہرے پر رکھی ہوئی تھیں۔

مگر فرقان حسن بھی کوئی بے وقوف نہیں تھے۔ انہوں نے بیوی کو خرم کا حمایتی دیکھ کر قدرے مناسب لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"ایسی باتیں عورتیں کرتی ہوئی زیادہ اچھی لگتی ہیں تم نمل کی مدر کو فون کرلو۔"

"نہیں۔" مسز فرقان فوراً" بولیں۔

"وہ تو مجھے بہت ہی مغرور لگی ہیں بھئی ہم پہلی دفعہ ان کے گھر گئے تھے اور ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگ رہے تھے انہیں کچھ میزبانی کے تقاضے پورے کرنے چاہیے تھے مگر وہ تو بات تک کرنے کی روادار نہیں تھیں۔" ان کے صاف انکار پر خرم، فرقان حسن کی شکل دیکھنے لگا جو کچھ بے بس سے نظر آرہے تھے مگر خرم نے ذرا مروت نہیں برتی بلکہ ہنوز انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا تو وہ انکار کرسکے نہ اقرار بلکہ بیچ کی راہ ہموار کرتے ہوئے بولے۔

"اچھا اچھا کرلوں گا کم از کم ایک دو دن تو گزرنے دو پھر میں فون کرلوں گا بلکہ دوبارہ ان کے گھر چلے چلیں گے نمل سے بھی تو نہیں ملے ہیں۔" وہ خرم کی بے چینی کو صرف اس کے دل کا معاملہ سمجھ رہے تھے جبکہ یہ اس کے لیے انا کا مسئلہ تھا۔

تبھی وہ ان کے منہ سے ایک دو دن والی بات سن کر اپنی ناراضی ظاہر کرتا اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

فرقان حسن اس کی ضدی فطرت سے واقف تھے اسے جب کسی چیز کی جلدی ہوتی تو وہ کچھ نہیں سنتا تھا مگر یہ کوئی بازار میں رکھا اس کی پسند کا کھلونا نہیں تھا جو وہ ضروری میٹنگز کینسل کرکے اسے دلانے لے جاتے۔

یہاں معاملہ اس کی شادی کا تھا کسی کی بیٹی کی زندگی کا تھا۔ وہ سوچنے اور فیصلہ کرنے میں جتنا ٹائم لینا چاہتے انہیں دینا چاہیے تھا اور ابھی وقت ہی کتنا گزرا تھا محض دو دن۔

اسی لیے خرم کے خفا ہونے کے باوجود وہ اپنی بات پر قائم رہے بلکہ اسے پلٹتا دیکھ کر اسے قائل کرنے کے لیے بولے۔

"میں چاہ رہا ہوں، ہم لوگ شفٹنگ جلدی کرلیں بلال اختر نے تو گھر خالی بھی کردیا ہے۔

وہاں جاکر دیکھنا ہے کہاں مینٹننس (مرمت) ہے کون کون سی نئی چیزیں خریدنی ہیں پرانے سامان میں کیا کیا لے کر جانا ہے۔

ابھی اتنا کام پڑا ہے پہلے ان سب چیزوں سے فارغ ہوجانا چاہیے شادی بیاہ کے معاملات تو سکون سے بیٹھ کر طے کیے جاتے ہیں۔" فرقان حسن کہتے چلے گئے مگر خرم رکے بغیر آگے بڑھتا رہا اور لاؤنج سے نکل کر کوریڈور میں مڑ گیا۔

فرقان حسن ایک نظر اپنی بیوی کو دیکھ کر رہ گئے جن کے چہرے پر ممتا بھری مسکراہٹ ابھری ہوئی تھی اپنے جوان جہان بیٹے کو چھوٹے سے بچے کی طرح منہ پھلائے دیکھ کر وہ صرف پیار بھرے انداز میں سرہلا کر رہ گئی تھیں

مگر کھانے کی میز پر یہ ممتا بھرا انداز تفکر میں بدل گیا جب ملازم نے آکر کہا۔

"خرم صاحب نے کھانے سے انکار کردیا اور بڑی سختی سے کہا ہے کوئی انہیں تنگ نہ کرے۔" وہ فوراً" اپنی جگہ سے اٹھنے لگیں تو فرقان حسن نے روک دیا۔

"ابھی اس کے پاس مت جائیں اسے اور غصہ آجائے گا کل صبح بات کرلیجیے گا ابھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔" مسز فرقان زہر مار کرکے کھانا کھانے لگیں خود فرقان حسن کو خرم سے اتنی محبت تھی کہ اس کی ناراضی کا سوچ کر ان کے حلق سے بھی نوالہ نہیں اتر رہا تھا اس لیے جب صبح بھی اس نے ناشتے کی میز پر ملازم کے ہاتھ یہی جواب بھجوادیا تو فرقان حسن اٹھ کر اس کے کمرے میں آگئے۔ مسز فرقان بھی ان کے پیچھے پیچھے تھیں۔

خرم بستر پر آڑا ترچھا پڑا تھا انہیں دیکھ کر بھی اس کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا فرقان حسن نے بھی کوئی بات کرنے کی بجائے موبائل نکالا اور کال ملا کر بات کرنے لگے۔

"السلام علیکم عظمت صاحب۔" خرم ایک دم بستر پر اٹھ بیٹھا اور بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگا جو بڑی شرمندگی سے کہہ رہے تھے۔

"میں معذرت چاہتا ہوں اتنی صبح صبح آپ کو پریشان کیا۔ لیکن کیا کریں صبر ہی نہیں ہو رہا تھا آپ نے تو ہماری جان سولی پر اٹکا رکھی ہے۔" وہ کہہ کر دوسری طرف کی بات سننے لگے۔

خرم اور مسز فرقان بغور ان کے چہرے کو دیکھ رہے تھے جہاں ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

"کیا؟" وہ تقریباً" چیخنے والے انداز میں بولے تو خرم بستر سے اتر کر ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔

فرقان حسن کے چہرے پر شدید حیرت کے تاثرات تھے جیسے دوسری طرف سے وہ جو کچھ سن رہے ہوں انہیں اس پر یقین نہ آرہا ہو۔

مسز فرقان پریشان ہوکر ان کا بازو ہلانے لگیں تو وہ انہیں ہاتھ سے "صبر کرو" کا اشارہ کرکے دوسری طرف کی بات سنتے رہے پھر بہت سوچتے ہوئے اٹک اٹک کر بولے۔

"آں۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا میں آپ کو کیا جواب دوں۔۔۔ اصل میں۔۔۔ آں۔۔۔ اچھا میں آپ سے تھوڑی دیر بعد بات کرتا ہوں۔"

"اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے آپ لوگ خود اپنی خوشی سے رشتہ لے کر آئے تھے پھر اب اگر میں فوراً" شادی کی بات کر رہا ہوں تو اس میں پریشانی کیا ہے۔" عظمت خلیل کا لہجہ بڑا سنجیدہ سا تھا اور کیوں نہ ہوتا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو انہوں نے ابرار سے بات کی تھی۔

جو کچھ ابرار نے کہا تھا وہ کسی بھی غیرت مند باپ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

عظمت خلیل بیوی اور بیٹی کے معاملے میں تو انتہائی درجے کے غیرت مند تھے اور پھر اس پر ان کی خود سر اور انا پرست، ضدی فطرت!

بھلا ایک چھٹر رشیدہ کو مارنے سے ان کی ان تمام عادتوں کا مداوا ہوسکتا تھا۔

بلکہ انہیں تو لگ رہا تھا وہ رشیدہ پر ابھی ٹھیک طرح سے برسے بھی نہیں۔ ابھی تو ان کی بھڑاس بھی نہیں نکلی تھی کہ فرقان حسن نے صبح ہی صبح انہیں فون کرلیا۔

ان کی آواز سنتے ہی جیسے عظمت خلیل کے ہیجان کو ایک رخ مل گیا انہوں نے بغیر خرم سے ملے بغیر اسے جانے اور اس کے بارے میں کوئی معلومات کرائے بغیر ہی ایک پل میں فیصلہ کرلیا۔

نمل کی شادی کرکے اس کے فرض سے سبکدوش ہونے کا نہیں! بلکہ اسے فوراً" گھر سے چلتا کرکے اس کے بوجھ سے چھٹکارا پانے کا۔

وہ اگر رومیلہ کے لیے اتنی دور جاکر لڑکا دیکھ سکتی ہے تو اپنے لیے اس طرح اچانک کی شادی کے لیے کبھی تیار نہیں ہوگی مگر اس کی کمزوری ان کے ہاتھ میں تھی۔

رشیدہ کو اذیت دے کر وہ نمل کو کسی کام کے لیے بھی مجبور کر سکتے تھے اور اس طرح اسے مجبور کر کے اس کی شادی کر کے تو انہیں بے پناہ سکون ملنے والا تھا ایک طرح سے حشام والے معاملے کا بدلہ بھی پورا ہو جاتا تھا گویا یک نہ شد دو شد۔

وہ یہ سب سوچ کر ہی اتنے پر سکون ہوئے تھے کہ انہوں نے تمام قائدے قانون ایک طرف رکھ کر فرقان حسن کی بات چھیڑنے پر بڑی بے تابی سے کہا۔

"آپ کو اتنی صبح صبح فون کرنے پر کسی شرمندگی کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں ایسی گفتگو تو غیروں میں ہوتی ہے اور ہم تو سمدھیانے ہیں۔

ہمیں یہ رشتہ منظور ہے آپ ایسا کریں اگلے ہفتے بارات لے آئیں۔" عظمت خلیل کی بات پر دوسری طرف فرقان حسن حیرت کی زیادتی سے چیخ پڑے تھے۔

ان کی چیخ نے عظمت خلیل کو احساس دلایا تھا کہ انہوں نے کچھ زیادہ ہی جلد بازی کا مظاہرہ کر دیا کہیں فرقان حسن کے گھر والے مشکوک ہو کر رشتہ کرنے سے انکار ہی نہ کر دیں۔

اسی لیے انہوں نے اپنے لہجے کو شگفتہ بناتے ہوئے زبردستی ہنس کر کہا۔

"بھئی میں مذاق کر رہا ہوں اگلے ہفتے نہ سہی جب آپ مناسب سمجھیں تب کی تاریخ رکھ لیتے ہیں میرے کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہمیں رشتہ منظور ہے اور ہم لوگ چاہتے ہیں کہ یہ شادی فوراً ہو۔" عظمت خلیل آخری جملے تک پہنچتے پہنچتے دوبارہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔

کیونکہ رشیدہ جواب تک کسی شاک میں گھری دنیا و مافیہا سے بے خبر تھیں عظمت خلیل کے اچانک ہنسنے پر چونک کر انہیں دیکھنے لگیں اور جب انہوں نے ان کی باتوں پر غور کرنا شروع کیا تو ان کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔

وہ یہ تو نہیں سمجھی تھیں کہ عظمت خلیل کس سے باتیں کر رہے ہیں مگر رشتے سے متعلق بات سوائے نمل کے اور کس کی ہو سکتی تھی فوری طور پر ان کا ذہن فرقان حسن کی فیملی کی طرف نہیں گیا تھا انہیں تو بس یہ لگتا تھا کہ عظمت خلیل ان کی بیٹی سے انتقام لینے کے لیے کوئی فیصلہ کر رہے ہیں۔

وہ جس طرح پریشان ہو کر انہیں دیکھنے لگی تھیں وہ عظمت خلیل کو سلگا گیا تھا تبھی دوسری طرف سے فرقان حسن کا ہچکچاتا لہجہ انہیں سپاٹ انداز میں یہ بولنے پر مجبور کر گیا تھا کہ۔

"اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے؟" ان کی بات سن کر فرقان حسن کو کہنا پڑا۔

"نہیں پریشان تو نہیں ہوں بھلا پریشانی کیسی! یہ تو خوشی کی بات ہے مگر اس طرح اچانک..... آپ تو ابھی خرم سے ملے بھی نہیں ہیں اسے دیکھے بغیر آپ کا اتنی جلدی ہامی بھر لینا بلکہ جلد شادی پر اصرار کرنا مجھے حیران کر گیا ہے۔" خرم اور مسز فرقان جو پوری طرح سے فرقان حسن کی طرف متوجہ تھے ان کی بات سن کر حیران رہ گئے۔

مسز فرقان کی حیرت میں ایک تجسس تھا کہ دوسری طرف عظمت خلیل کیا کہہ رہے ہیں جبکہ خرم کی حیرت میں بے پناہ خوشی نمایاں تھی۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا جو اس نے چاہا تھا وہ اتنی آسانی سے ہو گیا وہ بولنا چاہ رہا تھا کہ اگر وہ شادی کے لیے تیار ہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے آپ فوراً "ہاں" کر دیں۔

مگر فرقان حسن پوری طرح سے عظمت خلیل کی طرف متوجہ تھے اس وقت اگر خرم انہیں ٹوکتا تو وہ چڑ جاتے لہٰذا خرم نے بمشکل اپنے اوپر ضبط کرتے ہوئے خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا اور دیکھنے لگا کہ وہ خود کیا کہتے ہیں مگر وہ دوسری طرف کی بات سننے میں مصروف تھے جہاں عظمت خلیل کہہ رہے تھے۔

"خرم سے خاص طور پر مجھے ملنے کی ضرورت نہیں ہے جو باتیں مجھے اس کے بارے میں معلوم کرنی تھیں وہ

معلومات میں کرا چکا ہوں۔

بھئی قدرتی سی بات ہے اپنی بیٹی اپنے لخت جگر کو کسی کو سونپنے سے پہلے انسان سو طرح سے پرکھتا ہے پھر فیصلہ کرتا ہے اور میری تو ایک ہی اولاد ہے۔

لیکن میں ایک اولاد کو اپنے لیے ہوا نہیں بناؤں گا اگر صحیح وقت پر اس کا مناسب رشتہ آرہا ہے تو میری کوشش ہو گی فوراً" اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں ورنہ دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ اسے خود سے کبھی جدا نہ کروں۔" باتیں بنانے میں تو عظمت خلیل کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

فرقان حسن جو تھوڑی دیر پہلے ان کی بات سن کر الجھ گئے تھے اب ان کی "اعلا سوچ" کے متعلق جان کر قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولے۔

"بات تو آپ کی بالکل برحق ہے مگر آپ نے فوراً" شادی کے لیے اس طرح کہا کہ میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔ اصل میں خرم بھی تو ہماری ایک ہی اولاد ہے ہمارے تو بہت ارمان ہیں اور پھر اگلے کچھ دنوں میں ہم اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے والے ہیں اس میں اتنی مصروفیت ہو گی کہ....."

"ارے نہیں بھئی میرا یہ مطلب تھوڑی تھا کہ آپ واقعی اگلے ہفتے بارات لے آئیں یہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا لیکن یہ میں ضرور چاہوں گا کہ شادی جلد سے جلد ہو۔" عظمت خلیل نے بات سنبھالتے ہوئے ضرورت سے زیادہ خوشگوار لہجے میں کہا۔

رشیدہ ابھی تک ہراساں انداز میں انہیں دیکھ رہی تھیں یہاں تک کہ انہوں نے مبارک باد کے بھرپور تبادلوں کے بعد فون بند کر کے ان کی طرف دیکھے بغیر کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے اور وہ اپنی جگہ ششدر سی جمی رہیں۔

دوسری طرف جب فرقان حسن نے ایک خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ فون بند کیا تو ان پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔

"کیا ہوا؟"

"عظمت خلیل نے رشتہ قبول کر لیا؟"

"مگر وہ تو خرم سے ملے بھی نہیں۔"

"کیا کہہ رہے تھے وہ کب شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

مسز فرقان اپنی عادت کے مطابق شروع ہو چکی تھیں اور فرقان حسن کو بولنے کا موقع دیے بغیر پوچھے جا رہی تھیں کہ خرم کے ایک سوال نے ان کی زبان کو بریک لگا دیے۔

"اگر وہ فوراً" شادی کے لیے کہہ رہے تھے تو آپ نے انکار کیوں کیا؟ آپ کو ہامی بھر لینی چاہیے تھی۔" فرقان حسن اور مسز فرقان ایسے اسے دیکھنے لگے جیسے اس کی دماغی حالت پر شک ہو رہا ہو۔

"What Happened Dad" میں ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں آپ شادی کے لیے ہاں کر دیں اور کوئی بھی نزدیک کی تاریخ رکھ لیں اگر اسی مہینے شادی ہو جاتی ہے تو Thats Great شفٹنگ کا کیا ہے ہم بعد میں کر لیں گے۔" خرم نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تو فرقان حسن نہایت سپاٹ لہجے میں چبا چبا کر بولے۔

"برخوردار پہلے کچھ بن تو جاؤ" اس قابل تو ہو جاؤ کہ اپنی کمائی سے اپنی بیوی کو دو وقت کی روٹی کھلا سکو۔ پھر شادی کی بات کرنا۔"

رشتہ تم کر رہے ہو ایک اتنے امیر گھرانے کی لڑکی سے اور خود کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔

اس کے تو شوق ہی بہت مہنگے ہوں گے اور چلو شوق کو چھوڑ بھی دیں تو تم ابھی اس کی ضرورتیں بھی پوری نہیں کر سکتے سچ پوچھو تو دوران تعلیم میں منگنی کے بھی خلاف ہوں کیونکہ اس طرح انسان کی توجہ اور یکسوئی متاثر ہوتی

ہے۔ مگر تمہیں پریشان دیکھ کر میں نے اس کے والدین سے ملنے کا فیصلہ کیا تاکہ تم اس طرف سے مطمئن ہو کے تو اپنے کیریئر پر دھیان دو گے۔

لیکن ایک بار تمہاری شادی اس لڑکی کے ساتھ ہو گئی تو پھر تو تمہارا کیریئر یہیں ختم ہو جائے گا کم از کم کچھ سالوں کے لیے تو تم پڑھائی وغیرہ سب بھول ہی جاؤ گے اور کچھ سالوں بعد جب تمہیں عقل آئے گی تب تک تم اس لڑکی کے دل میں اپنے لیے عزت و احترام سب کھو چکے ہو گے۔

کیونکہ باپ کے پیسے پر عیش کرنے والے شوہر کی بیوی کے دل میں کوئی قدر نہیں ہوتی۔" فرقان حسن اتنی سنجیدگی اور گمبھیرتا سے بول رہے تھے کہ خرم کچھ کہہ ہی نہ سکا حالانکہ وہ ایک زوردار بحث کے موڈ میں تھا مگر ایک تو مسز فرقان اس کا ارادہ سمجھتے ہوئے اسے تنبیہی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

دوسرے اسے لگ رہا تھا اس وقت فرقان حسن کو ناراض کرنا کسی بھی طرح اس کے حق میں بہتر نہیں۔ وہ ابھی منگنی کے لیے تیار تھے فی الحال یہی بہت تھا زیادہ کے لالچ میں کہیں جو ہے اس سے بھی ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔

☼ ☼ ☼

گھر میں داخل ہوتے ہی نمل کی نظریں بے چینی سے رشیدہ کو ڈھونڈنے لگیں حالانکہ اسے معلوم تھا اس وقت وہ عموماً اپنے کمرے میں ہوتی ہیں پھر بھی نمل ان کے کمرے کے دروازے تک پہنچنے تک اس طرح چاروں طرف دیکھ رہی تھی جیسے وہ یہیں کہیں موجود ہوں لیکن ان کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی جیسے ہی وہ اپنی وہیل چیئر پر کمرے کے وسط میں موجود نظر آئیں نمل دوڑ کر ان کے پاس پہنچ گئی اور ان کے پاس زمین پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بے اختیار ان کی گود میں سر رکھ دیا۔

کچھ پل کے لیے اس کا دل ہر فکر ہر پریشانی سے آزاد ہو گیا بلکہ وہ یہ بھول ہی گئی کہ سارے راستے وہ کس قدر ذہنی اذیت سے گزر کر آ رہی ہے پچھلے دنوں کی تمام ذہنی و جسمانی تھکن جیسے لحہ بھر میں ایک ساتھ دور ہو گئی۔

وہ جانے کب تک بغیر کچھ بولے آنکھیں موندے ان کی گود میں سر رکھے لیٹی رہتی اور ان پر کیف لمحوں سے لطف اندوز ہوتی رہتی کہ اپنے چہرے پر گرنے والے پانی کے قطرے نے اسے فوراً سر اٹھا کر ان کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بے آواز رو رہی تھیں نمل کو متوجہ دیکھ کر بھی ان کے زار و قطار بہتے آنسوؤں میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ اور شدت آگئی کہ ان کی ہچکی سی بندھ گئی۔

نمل نے کچھ دیر تو انہیں رونے دیا مگر ان کے آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے لہٰذا جب اس سے برداشت نہیں ہوا تو وہ ان کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے زبردستی کے شوخ لہجے میں کہنے لگی۔

"امی ہم بلاوجہ اتنے پریشان تھے گلفام بھائی تو اتنے اچھے ہیں کہ ان کے ساتھ پر ہمیشہ نازاں رہے گی۔ میں ان کے آفس میں ان سے ملنے گئی تھی بہت اچھی جاب پر ہیں وہ اور اس کے علاوہ شکل و صورت اور بات چیت میں بھی بہت گریس فل ہیں میں ابھی رومیلہ کے گھر جا کر اسے ہمارے بیچ ہوئی پوری گفتگو الف سے ے تک سناؤں گی۔ مگر اس سے پہلے مجھے کچھ کھانے کو دے دیں بہت سخت بھوک لگ رہی ہے پلین میں تو مجھ سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا۔

ویسے تو مجھے نیند بھی بہت آ رہی ہے مگر رومیلہ سے ملے بغیر تو بالکل نہیں سو سکتی۔" نمل نان اسٹاپ بولے جا رہی تھی اس کے لہجے کی تازگی اور چہرے پر کھلی شگفتگی دیکھ کر رشیدہ کے بہتے آنسو تھم گئے۔ وہ کھوجتی نظروں سے یک ٹک اسے دیکھے گئیں اور یہی تو نمل چاہتی تھی۔

اسے اپنی زبان سے صفائی میں کچھ کہنا ہی نہ پڑے اس کی ماں تو اس کا چہرہ پڑھ سکتی تھی وہ تو اس کی شکل دیکھتے ہی سارے وہم اور تفکرات جھٹک دے گی۔

مگر یہ بات اتنی معمولی نہیں تھی کہ رشیدہ اتنی آسانی سے جھٹک دیتیں دل کو بھلے ہی تھوڑا آرام آگیا تھا مگر جو سکون غارت ہو چکا تھا وہ شاید اب کبھی میسر نہیں آنے والا تھا۔

"تم..... تم ٹھیک ہو نا۔" اس ایک جملے میں کتنے خدشات تیر رہے تھے یہ ان کے کانپتے لہجے سے از خود واضح ہو گیا تھا۔

"بالکل الحمدللہ! کیا میں آپ کو ٹھیک نہیں لگ رہی۔" نمل نے براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے پوچھا تو کچھ دیر تو وہ اس کی شکل دیکھتی رہیں پھر بے اختیار اسے بھینچتے ہوئے وہ بری طرح رو دیں۔

"میں جانتی ہوں ابرار بھائی نے آپ لوگوں سے کیا کہا ہے مگر وہ سب صرف اور صرف جعفر بھائی کی بیوی کا ذہنی فتور تھا۔

میں نے اگر اپنے طور پر چند حماقتیں کی بھی تھیں تب بھی میرے اللہ نے مجھے بچا لیا اور میرا واسطہ ایسے شریف اور نیک انسان سے پڑا کہ میری حماقت پر پردہ پڑ گیا لیکن اس سب کے دوران آپ کو جو تکلیف اٹھانی پڑی ہے اس کے لیے میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔" نمل کی آواز ہلکی سی رندھ گئی تو رشیدہ ایک بار پھر بری طرح رو دیں۔

"ابو آپ کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آئے ہوں گے نا۔" نمل ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے انہیں تاسف بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اس کی مجھے کوئی پروا نہیں تم ٹھیک ہو میرے لیے بس یہی کافی ہے۔" رشیدہ ہچکیوں کے درمیان بولیں۔

نمل کے اپنے گلے میں آنسوؤں کا گولہ بننے لگا تھا مگر وہ ان کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی اسی لیے اس نے انہیں چپ کرانے کی کوشش کرنے کی بجائے کینیڈا میں اپنی اور گلفام کی ملاقات کا احوال پوری جزئیات کے ساتھ سنانا شروع کر دیا۔

رشیدہ اس کا جوش و خروش دیکھ کر بظاہر اس کی بات بڑی توجہ سے سننے لگیں لیکن ان کا ذہن اب بھی کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔

بار بار ان کی زبان تک ایک ہی جملہ آ رہا تھا مگر وہ اسے ادا نہیں کر پا رہی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے بتائیں کہ عظمت خلیل نے نا صرف اس کا رشتہ طے کر دیا ہے بلکہ کچھ ہی دنوں میں بڑی دھوم دھام سے اس کی منگنی کرنے والے ہیں۔

نمل پوری کتھا سنا کر ان کے کمرے سے چلی بھی گئی اور وہ کچھ کہہ ہی نہ سکیں۔

نمل نے کمرے میں جاتے ہی رومیلہ کا نمبر ملایا اور اس کے فون اٹھانے کا انتظار کرنے لگی گزشتہ چار پانچ دنوں سے وہ جس ذہنی کوفت سے گزر رہی تھی اپنے گھر واپس آتے ہی اور رشیدہ سے ملتے ہی وہ ایسے غائب ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو چنانچہ اب وہ گلفام سے کی گئی ملاقات کو بڑے خوشگوار انداز میں محسوس کر رہی تھی۔

وہ خوشی جو وہ اس وقت اپنی پریشانیوں کے باعث حاصل نہیں ہو سکی تھی وہ اسے اب مکمل طور پر آسودہ کر گئی تھی بلکہ وہاں سے نکلتے وقت جو خدشات گلفام کے لیے اس کے دل میں تھے وہ بھی پاکستان آکر ختم ہو گئے تھے۔ جیسے یہ کہ اگر وہ پہلے سے شادی شدہ ہو یا وہاں کے ماحول کے مطابق اگر اس کی ایک دو ——— گرل فرینڈز ہو گئیں تو۔

اب تو یہاں کا ماحول بھی ایسا کچھ صاف ستھرا نہیں رہا تھا جوائنٹ فیملیز میں رہنے کے باوجود یہاں کے لوگوں

کی بھی ایسی سرگرمیاں تھیں تو گلفام کے بارے میں یہ سوچنا کیونکہ وہ ایک آزاد ماحول میں تنہا رہتا ہے تو اس کا کردار ایسا ہی ہوگا خوامخواہ کی بدگمانی تھی جو اگر اس کے لاشعور کے کسی کونے میں موجود بھی تھی تب بھی ان کا تذکرہ رومیلہ سے کرنا رومیلہ کے ساتھ سخت زیادتی تھی۔

اسی لیے جب دوسری طرف رومیلہ نے فون ریسیو کیا تو نمل بڑی چہکتی آواز میں بولی۔

"السلام علیکم کیا حال چال ہیں؟" دوسری طرف رومیلہ اس کے لہجے کی کھنک سن کر کچھ مسرور سی ہو گئی۔

وہ یقیناً "اسے پاکستان واپس آنے کے بعد فون کر رہی تھی اس کا ساتھ خیریت کے واپس آجانا ہی اپنے آپ میں ڈھیروں اطمینان کا حامل تھا اس پر نمل کا شوخ لہجہ بغیر بتائے ہی اس کے کامیاب ٹرپ کی نشاندہی کر رہا تھا پھر بھی رومیلہ نے اس کا سلام تک نظرانداز کر دیا اور بے چینی سے بولی۔

"پہلے تم سناؤ۔ کب لوٹیں؟ کیسا رہا تمہارا جانا؟"

"اوہو بڑی جلدی ہے سب جاننے کی۔" نمل معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے بے ساختہ ہنس دی تو رومیلہ جو اس کی خیریت وغیرہ جاننے کے لیے یہ سب پوچھ رہی تھی اپنی بات کا کچھ اور مطلب نکلتا دیکھ کر ریڈ ہو کر بولی۔

"جی نہیں، مجھے کچھ جاننے کی جلدی نہیں ہے۔ میں تو تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ تمہارے پیچھے گھر کے کیا حالات رہے ماموں کا رویہ......"

"ابو سب جان چکے ہیں اور یہ تو مجھے جانے سے پہلے ہی پتا تھا کہ انہیں پتا چل ہی جائے گا مگر کیونکہ وہ ابھی گھر پر نہیں ہیں اس لیے میرا موڈ بہت اچھا ہے۔

وہ جب آئیں گے تھوڑا سا چیخیں گے وقتی طور پر مجھے بھی برا لگے گا پھر میں نارمل ہو جاؤں گی۔" نمل نے عام سے انداز میں کہا پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے اس نے اپنے پلین میں چڑھنے سے لے کر پلین سے اترنے تک کی پوری روداد اسے سنا ڈالی۔

رومیلہ منہ کھولے سکتے کے عالم میں اسے سنتی رہی۔

ابرار بھائی نے گھر میں ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی ویسے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی وہ گھر والوں سے وابستہ کسی بات کا ذکر گھر والوں سے کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے تو یہ تو پھر بھی ان کے ماموں کے گھر کی بات تھی اور بات بھی ایسی تھی کہ اچھا ہی ہوا جو انہوں نے بھابھی یا بابا جانی کے سامنے نہیں دہرائی۔

"یہ تو بہت برا ہوا نمل۔ تمہارے بارے میں اس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں اور تم اتنی مطمئن ہو۔" رومیلہ افسوس کرتے ہوئے بولی تو نمل چونک اٹھی۔

"کمال کرتی ہو تم بھی میں تمہیں گلفام بھائی کے بارے میں بتا رہی ہوں اور تم ہو کہ یہ فضول باتیں سوچ رہی ہو۔

یہ سب تو میں نے تمہیں اس لیے بتا دیا کہ ایک تو تم سے کوئی بات کہے بغیر میں رہ نہیں سکتی دوسرے یہ کہ اگر کل کو ابرار بھائی میرے جیسی گرے ہوئے کردار کی لڑکی سے ہر تعلق قطع کرنے کو کہیں تو تم شاک میں نہ آجاؤ بلکہ ذہنی طور پر تیار رہو۔"

"اللہ نہ کرے نمل کیسی باتیں کر رہی ہو۔" رومیلہ دہل کر بولی تو نمل تلخ سے انداز میں ہنس دی۔

"خالی خولی باتیں نہیں کر رہی سچائی بتا رہی ہوں۔ ایک داغ تو لگ ہی گیا ہے نا میرے ساتھ اور داغ کبھی مٹتے تھوڑی ہیں۔"

"یہ...... یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے کاش میں تمہیں جانے سے روک لیتی۔" رومیلہ بری طرح پچھتا رہی تھی۔

"چھوڑو نا کیا فضول باتیں سوچ رہی ہو جو کچھ ہوا ہے اس کا ذکر ابرار بھائی اور ابو کسی اور سے تو کریں گے نہیں اور اگر یہ دو لوگ میرے بارے میں کچھ غلط سمجھ بھی رہے ہیں تو ان دونوں کے سوچنے سمجھنے کی مجھے پرواہی نہیں، باقی بچیں امی یا تم، تو تم دونوں تو مجھے جانتی ہو۔

تم یہ بتاؤ گلفام بھائی کا جو نقشہ میں نے کھینچا ہے اسے سننے کے بعد ذہن میں کوئی تصویر بنی یا نہیں۔

ویسے تو میں نے ان سے بہت کہا ہے اپنی ایک تصویر دے دیں میں اپنا ای میل ایڈریس بھی دے آئی ہوں مگر مجھے ان کی طرف سے زیادہ امید نہیں ہے کسی اچھے رسپانس کی۔

خیر کوئی بات نہیں اب شادی میں دن ہی کتنے ہیں بہت جلد تم انہیں روبرو دیکھ لوگی۔" نمل شوخی سے کہتی چلی گئی۔

اس کے انداز پر رومیلہ کے چہرے پر ایک جھینپی ہوئی مسکراہٹ ابھر کر غائب ہو گئی سارے احساسات اپنی جگہ مگر جو کچھ نمل نے اپنے بارے میں بتایا تھا وہ اتنا معمولی بھی نہیں تھا کہ رومیلہ اتنی آسانی سے اس دھچکے سے نکل سکتی۔

اس نے تو آج یونیورسٹی میں جو کچھ سنا تھا اسے سننے کے بعد سے اس کا ذہن منتشر ہو رہا تھا وہ تو سوچ رہی تھی نمل کو اس مووی کے بارے میں کیسے بتائے جسے تمام طالب علموں نے دیکھ لیا ہے اور جس کا چرچا ہر عام و خاص کی زبان پر ہے۔

جب نمل اس کے بارے میں سنے گی اور جب اسے فیس بک پر دیکھے گی تب اس کا کیا ردعمل ہوگا۔ رومیلہ کے لیے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔

☆ ☆ ☆

الیان نے جب ریاض غفار سے بریرہ اور حامد کے رشتے کی بات کی تو وہ ذرا بھی نہیں چونکے۔

گویا شگفتہ غفار نے پہلے ہی ان سے ماموں کے ارادے کا ذکر کر دیا تھا لیکن ان کے لہجے میں کوئی خاص جوش و خروش بھی نہیں تھا چنانچہ الیان کو ان سے کھل کر پوچھنا پڑا تھا۔

"کیا بات ہے ڈیڈی آپ چپ کیوں ہو گئے کیا آپ کو یہ رشتہ منظور نہیں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں بریرہ اس ماحول میں ایڈجسٹ ہو سکے گی یا نہیں۔" ریاض غفار کا انداز واقعی سوچتا ہوا سا تھا ویسے بھی پچھلے کچھ دنوں سے وہ کافی چپ چپ تھے۔

حالانکہ الیان کو ان کے ساتھ بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔

جب سے وہ گاؤں سے واپس آیا تھا اتنا مصروف تھا کہ دو چار رسمی جملوں کے علاوہ اور کوئی بات کرنے کا وقت نہیں نکال سکا تھا۔

مگر ان کے چہرے پر سوچوں کا جال وہ دس منٹ میں ناشتا ختم کرنے کے دوران بھی بخوبی دیکھ لیا کرتا تھا اور اس کے پیچھے کیا وجہ تھی اس کا بھی اسے کچھ کچھ اندازہ تھا اس لیے وہ لاشعوری طور پر اس موضوع سے پہلوتہی کرتے ہوئے ان کے خاموش خاموش سے انداز کو نظرانداز کر دیتا۔

تبھی انہیں سوچ میں گم دیکھ کر بھی الیان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال سے بریرہ ایڈجسٹ ہو جائے گی، حامد بھی ہر لحاظ سے بہت اچھا ہے مجھے نہیں لگتا کہ ہمیں انکار کرنا چاہیے۔" الیان کے صاف لفظوں میں ہامی بھرنے پر ریاض غفار غور سے اس کی شکل دیکھنے لگے۔

"ہوں بظاہر تو انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے لیکن پتا نہیں کیوں دل نہیں مان رہا شگفتہ نے بھی ذکر کیا تھا وہ تو کافی

خوش بھی لگ رہی ہے بلکہ ایسا لگ رہا ہے وہ تو پہلے ہی تمہارے ماموں سے ہاں کیے بیٹھی ہے۔ اس کی اتنی خوشی دیکھ کر میں نے بھی سوچا کیا حرج ہے ہاں کرنے میں۔ لیکن جانے کیوں فیصلہ ہو نہیں پا رہا۔"

"کیوں؟" الیان انہیں الجھن میں دیکھ کر بولا۔

"پتا نہیں۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ لوگ رشتہ کرتے ہی شادی کی تاریخ مانگیں گے اور بریرہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔" ان کے کہنے پر الیان بے ساختہ مسکرا دیا۔

بریرہ ان کی ایک ہی بیٹی تھی وہ بھی بہت زیادہ لاڈلی۔ اسے خود سے اتنا دور بھیجنے کے خیال سے ہی وہ اس رشتے کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہو رہے تھے تبھی شادی کی عمر کو پہنچتی اپنی بیٹی بھی انہیں اتنی چھوٹی لگ رہی تھی اور وہ اس بودے سے بہانے کا سہارا لے کر اسے کچھ دن اور اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔

"یہ یقین تو مجھے بھی ہے کہ وہ فوراً "شادی کا مطالبہ کریں گے لیکن جو کام کل کرنا ہے اسے آج کر لینے میں کیا حرج ہے خوامخواہ کی ٹال مٹول کا کیا فائدہ۔" الیان نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"تمہاری بات بھی صحیح ہے لیکن اس رشتے میں اتنی بھی خوبیاں نہیں ہیں کہ ہم اتنی جلد بازی کا مظاہرہ کریں۔ ایک تو ان کی رہائش گاؤں میں ہے بریرہ شہر میں رہنے کی عادی ہے پھر وہ جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں بریرہ کو اکیلے رہنے کی عادت ہے۔

اور سب سے بڑھ کر بریرہ کو حامد سے اچھا لڑکا بھی مل سکتا ہے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔"

"لیکن حامد میں کیا برائی ہے۔" الیان کو ان کے آخری والے اعتراض پر قدرے حیرت ہوئی تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔

"برائی نہیں ہے لیکن..... اب جیسے خود کو دیکھ لو تم صرف ریاض غفار کے بیٹے نہیں ہو بلکہ اپنے نام سے جانے جاتے ہو۔ بے شک تمہیں باپ دادا کی طرف سے بہت کچھ ملا ہے مگر تم نے اپنی محنت سے اسے بہت آگے بڑھایا ہے یہ کہنا بالکل بے جا نہیں ہوگا کہ آج لوگ مجھے تمہارے نام سے جانتے ہیں اور یہ سب صرف ہمارے بزنس کے سرکل میں نہیں ہے، جو لوگ ہماری فیلڈ میں ہیں بھی نہیں وہ بھی تمہارے نام سے واقف ہیں۔

جبکہ حامد کی ایسی کوئی پہچان نہیں وہ بہت ذہین لڑکا ہے آئندہ زندگی میں بہت ترقی کرے گا مگر فی الحال وہ ایسی کسی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کر رہا ہے کہ ہم فوراً "اپنی بیٹی کا ہاتھ اسے دے دیں۔" ریاض غفار کی باتیں گو کہ غلط نہیں تھیں مگر الیان کو ان کا حامد کا اس سے موازنہ کرنا بڑا عجیب لگا تھا۔

"ڈیڈی میرا نہیں خیال کہ ہمیں میری شہرت اور نام کی وجہ سے بریرہ کے لیے آئے اتنے اچھے رشتے کو ریجیکٹ کرنا چاہیے۔

حامد ہر لحاظ سے بہت اچھا لڑکا ہے آپ اسے میرے ساتھ کیوں کمپیئر کر رہے ہیں۔" الیان قائل نہ ہوتے ہوئے بولا۔

"کمپیئر نہیں کر رہا۔ بس ایسے ہی دل میں خیال آیا تھا لیکن میرے خیال سے تم اس رشتے پر بہت خوش ہو۔" وہ جیسے کوئی معقول دلیل نہ دے سکے تو الٹا اسی سے پوچھنے لگے۔

"ہاں۔ وہ لوگ تھوڑے پرانے خیالات اور رہن سہن کے حامل ضرور ہیں۔ لیکن لوگ اچھے ہیں اور حامد بریرہ کے لیے ہر لحاظ سے بہت مناسب ہے۔" الیان نے بلا جھجک کہا تو ریاض غفار کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد مسکرا دیے۔

"تمہارا ووٹ بھی اگر تمہاری ماں کی طرح اس کے حق میں ہے تو پھر تو واقعی اس میں کوئی نہ کوئی خاص بات تو ضرور ہوگی اور پھر جس میں سب کی خوشی اسی میں میری خوشی۔" ریاض غفار نے رضامندانہ انداز میں کندھے

اچکائے تو الیان بھی انہیں دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

نمل نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا اور شام سے ہی بستر پر پڑ کر سو گئی رشیدہ نے اسے جگانے کی کوشش بھی نہیں کی ایک تو وہ جانتی تھیں کہ وہ بہت تھکی ہوئی ہے دوسرے وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ عظمت خلیل سے اس کا سامنا ہو۔

حالانکہ عظمت خلیل کے انداز سے ظاہر تھا وہ اسے زیادہ کچھ سنانے کے موڈ میں نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے اس کی بابت پوچھا تک نہیں تھا وہ خود ہی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر رات کو کھانے کی میز پر اس کے لوٹ آنے کی اطلاع دینے لگیں۔

نوالہ منہ کی طرف لے جاتے ہوئے لمحہ بھر کو ان کا ہاتھ رکا اور وہ پھر ایسے بن گئے جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو پھر بھی رشیدہ جو ہر وقت ان کے غصے سے خوفزدہ رہتی تھیں دل کڑا کر کے بولیں۔

"ابرار کے دوست کی بیوی نے خوامخواہ ہی بات کا بتنگڑ بنا دیا نمل مجھے بتا رہی تھی ابرار کا دوست بہت شریف آدمی تھا وہ اسے فوری طور پر اپنے گھر ضرور لے گیا تھا مگر بعد میں نمل ہوٹل میں ہی ٹھہری تھی اور....."

"مجھے اس ٹاپک میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" عظمت خلیل نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے سرد سے لہجے میں کہا۔ رشیدہ کے لیے ویسے ہی بولنا مشکل تھا وہ تو صرف بیٹی کی صفائی دینے کے لیے اتنا کچھ کہہ بھی گئی تھیں مگر عظمت خلیل کو لاتعلق بنا دیکھ کر جہاں ان کے دل میں ایک ہوک اٹھی تھی وہیں تھوڑا اطمینان بھی ہوا تھا کہ کم از کم وہ نمل کے منہ پر کھڑے ہو کر اسے ذلیل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

ورنہ تو انہیں یقین تھا کہ جب نمل واپس آئے گی عظمت خلیل اس کے ساتھ بہت بری طرح پیش آئیں گے۔

مگر وہ تو اس کا رشتہ طے کر کے اتنے مطمئن ہو گئے تھے جیسے ان کی زندگی کا مقصد ہی اس کا بوجھ اتار کر پھینک دینا ہو یا وہ یہ جتانا چاہتے تھے کہ نمل چاہے جتنی بھی من مانی کر لے اس کی زندگی کی باگ ڈور ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔

تب ہی اس کی زندگی کا فیصلہ کر کے ان کی انا کو تسکین مل گئی تھی اور اب وہ اس موضوع پر کچھ کہنے سننے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

رشیدہ انہیں اچھی طرح جانتی تھیں اس لیے خاموش ہو کر رہ گئیں۔

جانتی تو نمل بھی انہیں بہت اچھی طرح تھی لیکن وہ کیونکہ پورے حالات سے واقف نہیں تھی اس لیے ان کے رویے پر حیران تھی۔

صبح اس کی آنکھ معمول سے ذرا دیر سے کھلی تھی اور اسے یہ جان کر شدید حیرت ہوئی تھی عظمت خلیل اس کے جاگنے سے پہلے ہی گھر سے نکل گئے۔

اس کا تو خیال تھا گھر آتے ہی اس کی عظمت خلیل کے سامنے پیشی ہوگی وہ رشیدہ کو بھیج کر اسے سوتے میں سے جگا کر بلا لیں گے مگر انہوں نے اس کی شکل تک دیکھنا پسند نہیں کیا۔

لیکن بھلا نمل کو اس بات سے کیا فرق پڑنا تھا وہ تو یہ سوچ کر پر سکون ہو گئی تھی کہ عظمت خلیل کے ساتھ کوئی تلخ کلامی ہونے سے رہ گئی رشیدہ کی بھی کچھ بتانے کی ہمت نہ ہوئی۔

البتہ اسے یونیورسٹی کے لیے تیار دیکھ کر انہوں نے اسے ایک دن آرام کرنے کا مشورہ ضرور دیا تھا وہ نہیں چاہتی
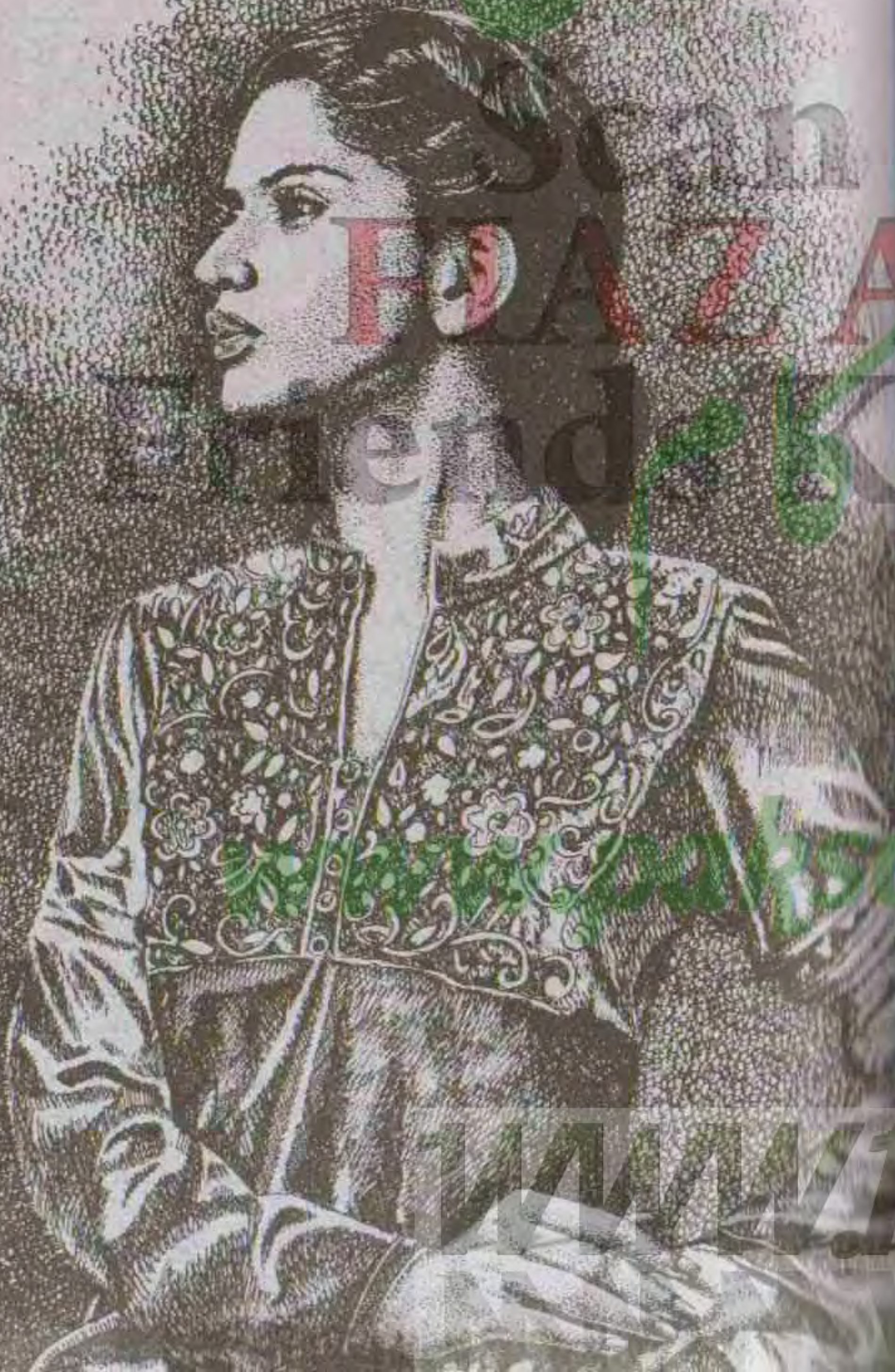
تھیں کہ اپنی زندگی سے متعلق اتنا اہم فیصلہ اسے دوسروں کے منہ سے سننا پڑے۔

کیونکہ خرم اس کی یونیورسٹی میں تھا اور اتنے دنوں کے بعد نمل کے جانے پر اس کے پاس آکر اسے اپنے اور اس کے رشتے کے طے ہونے اور کچھ دنوں بعد ہونے والی منگنی کی مبارک باد ضرور دیتا۔

پتا نہیں نمل کو یہ سب سن کر کیسا لگنے والا تھا۔ ان میں خود سے بتانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اگر انہیں کل اندازہ ہوتا۔ کہ وہ صبح اٹھتے ہی یونیورسٹی کے لیے تیار ہو جائے گی تو شاید وہ اسے کچھ اشارہ ہی دے دیتیں اب اسے گھر سے نکلتا دیکھ کر ان سے کوئی بات ہی نہیں بن رہی تھی چنانچہ وہ اسے "ایک دن چھٹی کر لیتیں" ہی کہہ سکیں جس پر نمل اطمینان سے کہتی باہر نکل گئی۔

"چھٹیاں تو پہلے ہی بہت ہو گئی ہیں اور اب تو گھر آگئی ہوں آرام بھی ہو تا رہے گا فی الحال تو میرا جانا ضروری ہے۔

پڑھائی کا بھی حرج ہو رہا ہے اور رومیلہ اور سنبل سے ملنے کا دل بھی بہت چاہ رہا ہے او کے اللہ حافظ امی۔"

رشیدہ محض اس کی پشت پر لہراتی چٹیا کو دیکھ کر رہ گئیں۔

جانے کیوں انہیں یقین تھا کہ نمل کو اس رشتے کے متعلق سن کر کوئی خاص خوشی نہیں ہوگی۔

ایک تو وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں کہ نمل کسی لڑکے میں انوالو نہیں ہے بھلے ہی وہ لڑکا اس کی یونیورسٹی کا ہے مگر نمل کی اس کے ساتھ کوئی کمٹ منٹ نہیں ہوگی اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ انہیں بتا چکی ہوتی۔

دوسرے یہ کہ انہیں یہ بھی پتا تھا کہ نمل کو عظمت خلیل کا حکمیہ انداز قطعی پسند نہیں جب وہ رومیلہ سے اس کی رائے پوچھے بغیر طے کی جانے والی شادی کے خلاف تھی تو اپنے ساتھ ٹھیک اسی فعل کو کیسے برداشت کر لیتی جبکہ اپنے معاملے میں تو اسے یہ بھی یقین تھا کہ عظمت خلیل نے جلد بازی میں اس کا رشتہ طے کر کے صرف اپنا غصہ نکالا ہے۔

اسی لیے انہیں یقین تھا کہ اپنی شادی کا پتا چلتے ہی نمل کا رد عمل بڑا شدید ہو گا حالانکہ دل سے وہ یہ ہی چاہ رہی تھیں کہ نمل شادی کے لیے خوشی خوشی مان جائے۔

کیونکہ خرم کو انہیں نے بھلے ہی نہیں دیکھا تھا مگر اس کے والدین انہیں بہت سلجھے ہوئے اچھے خاندانی لوگ لگے تھے۔

اور پھر جو بہتان نمل پر لگا تھا بھلے ہی نمل کے منہ سے سچ سننے کے بعد ان کا دل صاف ہو گیا تھا مگر ابرار اور اس کے گھر میں تاثر تو اب بھی یہی تھا کہ نمل کوئی گل کھلا کر آئی ہے۔

ابرار اگر باہر کہیں ذکر نہیں بھی کرتا ہے تب بھی اس کی بیوی سے انہیں کوئی زیادہ اچھی امید نہیں تھی ایسے حالات میں وہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ نمل جلد سے جلد اپنے گھر کی ہو جائے کیونکہ شریف لوگوں کے لیے تو الزام لگ جانا ہی ڈوب مرنے کے لیے کافی ہوتا ہے بھلے ہی اس الزام میں کوئی سچائی ہو یا نہ ہو۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

"تئیس جوڑے کپڑوں کے' دو تولے سونا اور صرف چھ سیٹ بستروں کے.... اوں ہوں! یہ تو بہت کم ہے اماں! یہ سارے آئٹمز تو میرے جہیز میں بھی تھے لیکن امبرین کی دفعہ سامان کچھ بڑھا دیں۔" اماں کے منہ سے سامان کی تفصیل سننے کے بعد نوشین نے غیر تسلی بخش انداز سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"خدا کو مانیں آپا! پیٹی منہ تک لبالب بھر چکی ہے اب تو سوئی گھسیڑنے کی جگہ بھی نہیں بچی اس میں اور آپ کو یہ سب کچھ کم لگ رہا ہے۔"

قریبی چارپائی پہ بیٹھی اسکول کے بچوں کی کاپیاں چیک کرتی امبرین نے ماں و بہن کی گفتگو سنتے ہوئے نکتہ اعتراض اٹھایا تھا۔

کوئی چار سال قبل ابا کے برادر نسبتی کے بیٹے ارسلان سے اس کی بات پکی ہوئی تھی۔ ان چار سالوں میں اماں نے کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے کافی کچھ جوڑ لیا تھا۔ لیکن ہر سنڈے نوشین آپا آکر "ڈو مور" کا سلوگن بجاتے ہوئے اماں کو اس کے جہیز کو زیادہ' خوبصورت اور بڑھیا بنانے کی تاکید کر جاتیں تاکہ ایسا جہیز خاندان بھر کے لیے قابل رشک اور' قابل مثال ثابت ہو۔ اماں جو پہلے ہی آپا کی فہم و فراست اور دور اندیشی کی قائل تھیں۔ ان کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہنا کبھی نہ بھولتیں۔

اور ان چار سالوں میں پیٹی پہ کیا موقوف' دونوں کمرے اسٹور حتی کہ گائے باندھنے والے چھپر میں بھی کپڑوں میں لپٹی اس کی واشنگ مشین رکھی ہوئی تھی۔ ادھر کمرے میں کوئی بچہ گھستا ادھر اماں ہانک لگاتیں۔

"ارے دھیان رکھو! الماری کے قریب امبرین کا ایک سو پانچ پیس والا ماربل کا ڈنر سیٹ رکھا ہے کہیں ٹھوکر لگنے سے کوئی برتن ٹوٹ نہ جائے؟"

گائے' کھولنے اور باندھنے کے اوقات میں اماں شاہین کو ابا کے ہمراہ کر دیتیں کہ کہیں گائے مستی میں آکر مشین کو ٹھوکر نہ رسید کر دے۔ ڈینٹ پڑنے سے ہزاروں روپوں پر پانی پھر جائے گا۔

چار سالوں کی مسلسل ایک ہی روٹین نے گھر بھر کو چڑا کر رکھ دیا تھا۔

"نہ جانے کب وہ دن آئے گا جب باجی پیا دیس سدھاریں گی۔ قسم سے تنگ آگئے ہیں یہ روز کی روک ٹوک سے۔ جھاڑو آہستہ لگاؤ' بہن کی الماری پہ دھول بیٹھ جائے گی۔ اب بندہ گھر کی ڈسٹنگ کرتا تو ہے ہی پر ان کی چیزوں کی بھی روز جھاڑ پونچھ کرنی پڑتی ہے۔ آدھا دن تو نکل جاتا ہے مفت کی بیگار میں۔"

رامین کا لہجہ ازحد بیزاری لیے ہوتا۔ وہ خود کون سا خوش تھی یہ مینا بازار سجانے سے۔ اماں کا بوجھ بٹانے اور کچھ وقت کا بہترین مصرف ڈھونڈتے ہوئے اس نے اچھی شہرت کے حامل ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ اسٹارٹ کر دی تھی۔ اسکول میں پڑھانے کے بعد گھر پہ جو فارغ وقت ملا۔ اس میں محلے کی بچیوں کو ٹیوشن پڑھا دیا کرتی۔ ہر ماہ کے آخر پر اس کے پاس معقول رقم آجاتی تھی۔ جو وہ اماں کی ہتھیلی پہ رکھ دیتی تھی۔

اور جب انہی پیسوں سے اماں اس کے جہیز میں رکھنے کے لیے کوئی بیش قیمت کپڑوں کا جوڑا' کوئی نفیس سا برتنوں کا سیٹ لے آتیں۔ تو اس کا دل جل کر راکھ ہو جاتا۔ اپنی محنت کی کمائی کو یوں فضول چیزوں پر خرچ ہوتا دیکھ کر اسے حقیقتاً" بہت دکھ ہوتا تھا۔

"اماں! میں نے وہاں جا کر نہ کوئی کراکری کی دکان کھولنی ہے نہ ہی کپڑوں کی بوتیک آپ فضول چیزوں کا انبار لگائے جا رہی ہیں۔ جب کہ انہیں پیسوں سے آپ باتھ روم کا ٹائل ٹھیک کروا سکتی تھیں۔"

وہ بھی اپنے دل کی بات اونچے سروں میں کہنے کی عادی تھی۔ لیکن آپا کے سامنے اس کا سارا واویلا نقار خانے میں طوطی کی آواز سنے جانے کے مترادف ہوتا۔

"ارے اماں! چھوڑیں اس کوئی سیٹ تو کمال کا لائی ہیں آپ۔ ہاتھوں سے پھسلا جا رہا ہے۔" آپا توصیفی لہجے میں اماں کی کارکردگی کی داد دیتیں۔

"جب ایسا ہی ہاتھوں سے پھسلا جا رہا ہے تو لینے کی کیا ضرورت تھی۔ خوامخواہ شوکیس میں سجا رہے گا۔

اب گھر' دکان میں کوئی تو فرق ہونا چاہیے نا۔" وہ جل کر بولتی۔

"تم تو عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتی ہو۔ بلقیس پھپھو کی ماریہ کا جہیز تو خود تم نے آنکھوں سے دیکھا تھا کتنا خوبصورت اور بڑھیا تھا اب اگر ہماری طرف سے کوئی کمی بیشی رہ گئی تو دیکھنا خاندان والے کتنی بھد اڑائیں گے۔" آپا کو اس کی کم عقلی پہ گویا افسوس ہو رہا تھا۔

"ہاں بیٹا' لاکھ جائے پر ساکھ نہ جائے والا معاملہ ہوتا ہے۔ بچی کو بیاہتے وقت زمانے کے دستور کے مطابق چلنا تو پڑتا ہے۔" دھلے ہوئے خشک کپڑوں کو تہ لگاتے ہوئے اماں رسانیت سے بولیں۔

"لیکن اماں! خاندان والوں کی واہ واہ سمیٹنے کے لیے ابا کی انتہائی محنت اور فرض شناسی سے کمائی گئی روزی اس قسم کے اسراف کی ہرگز متحمل نہیں ہو سکتی' لوگوں کی زبانوں پہ کون قفل ڈال سکا ہے۔ ابا بے چارے کی کمر چار بیٹیوں کے بوجھ سے دہری ہو چکی' بجائے اس بوجھ کو سبک کرنے کے اسے بڑھا رہی ہیں۔" وہ ابھی تک اپنے موقف پہ ڈٹی ہوئی تھی۔

اسے واقعی نمود و نمائش سے سخت نفرت تھی۔ اس کی باتوں سے لے کر پہناوے تک سادگی ہی اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ اپنے جہیز کے بارے میں بھی وہ چند ضرورت کی چیزوں تک ہی قائل تھی' لیکن مقابل اماں اور آپا تھیں جو اس کی بات سمجھنا تو درکنار سننے کی بھی روادار نہ تھیں۔

"امبر! اس کٹ حجتی کا کوئی فائدہ ہے' مجھے بھی علم ہے کہ ماسٹر صاحب کن دقتوں سے گھر کی گاڑی کھینچ رہے ہیں۔ اب تجھ بقراطن کی باتوں میں آکر اپنا ٹھینگا بجوا لوں کیا؟" اماں ناراضی سے بولیں۔

یارب یہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے ان کو دل اور' یا مجھ کو زباں اور

وہ بے بسی سے ایک لمبا سانس کھینچتے ہوئے کاپیاں سمیٹنے لگی۔

✡ ✡ ✡

بی اے میں اے پلس گریڈ لانے کی خوشی اس وقت اکارت چلی گئی جب اماں نے اسے ماسٹرز ان اکنامکس کے لیے اکیڈمی جوائن کرنے سے صاف منع کر دیا۔

"مگر کیوں اماں! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ اکنامکس میں ایم اے کرنا میرا اس وقت سے خواب ہے جب مجھے ماسٹرز کی ڈگری کی سمجھ بھی نہیں تھی۔ بس ٹیچرز میری میتھ کو سراہتے ہوئے صلاح دیا کرتیں کہ آپ نے ایم اے اکنامکس میں کرنا ہے۔ اب یہ تو لب جو آکر تشنہ رہ جانے والی بات ہوئی۔" وہ رو نکھی ہو رہی تھی۔ چہرے پہ "چھن سے جو ٹوٹے کوئی سپنا" والے پر درد اور مایوسی والے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔

"بالکل نہیں۔ اب اکنامکس گھر بیٹھ کر پڑھ سکتی ہے تو ٹھیک ورنہ — آرٹس کا کوئی آسان سا مضمون رکھ لے۔ اکیڈمی تو اللہ میاں کے پچھواڑے واقع ہے۔ اب میں تمہیں اتنا لمبا بازار کراس کر کے وہاں جانے کی اجازت تو بالکل نہیں دے سکتی۔ اکیلی جوان جہاں لڑکی روز مردوں کی بھیڑ پھلانگ کر پڑھنے جائے۔ نہ بھیا! ایسی پڑھائی ہمیں منظور نہیں۔" اماں نے تو بات ہی ختم کر دی تھی۔

"اکیلی کیوں' ساتھ میں نادیہ بھی تو ہے میرے ساتھ' محمودہ خالہ نے تو بیٹی کو برضا و خوشی آگے پڑھنے کی اجازت دے دی ہے۔ جب کہ آپ اپنی بیٹی کی اتنی سی بھی خواہش پوری نہیں کر سکتیں۔"

اماں کو قائل ہوتا نہ دیکھ کر اب کے اس نے جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کوشش الٹی آنتیں گلے پڑنے کے مترادف ثابت ہوئی تھی۔ اماں بری طرح بھڑک اٹھیں۔

"ارے اس محمودہ کا نام مت لو میرے سامنے۔ ویسے تو بڑی بی حجن بنی پھرتی ہے سب کے سامنے۔ لیکن سفید چونڈے کو کالے پتھر سے رنگ کر بہو' بیٹیوں کی یونیاں سوئیاں لگا کر اسے ذرا لاج نہیں آتی کہ یوں سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے سے خاندان بھر کی لومت و لائم حاصل کر بیٹھتی ہے۔ اس

چھمک چھلو کو ویسے کون سی حیا ہے۔ جو بیٹی پہ کوئی قدغن لگائے گی۔" اماں تو جیسے خالہ محمودہ پہ ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ اماں کی ہم عمر خالہ محمودہ کو بننے سنورنے کا شوق کافی زیادہ تھا۔ لیکن یہ قابل گرفت بات تو نہیں تھی۔ وہ تو کہہ کر پچھتائی۔

"اماں! پلیز اپنے فیصلے پہ نظرثانی کرلیں۔ میں آرٹس کے کسی بھی سبجیکٹ میں ایم اے کرکے اپنا ریکارڈ نہیں خراب کرسکتی۔ ایسے سبجیکٹ تو نالائق اور کند ذہن پڑھتی ہیں۔" وہ قریب بیٹھتے ہوئے ملتجیانہ انداز میں بولی۔ گلا رندھ سا گیا تھا۔

"تو پڑھ کے تو نے کرنا ہی کیا ہے۔ گھر بیٹھ کے گھر داری سیکھو۔ کیا فائدہ ایسی تعلیم کا جو لڑکی کو دال بگھارنا نہ سکھا سکے۔" جواب ٹی وی پہ نظریں جمائے ہی دیا گیا۔

اماں کی بات بھی ٹھیک تھی۔ گھریلو کاموں میں وہ برائے نام ہی دلچسپی لیتی تھی۔ روٹی اس سے گول کے علاوہ ہر شکل کی بنتی تھی۔ لیکن اس کے لیے قابل اطمینان بات یہ تھی کہ اس کے منگیتر ارسلان نے شادی کے لیے بطور خاص اس کا نام لینے کی وجہ اس کی تعلیم بتائی تھی۔ اماں کے خدشات اسے اسی وجہ سے بے بنیاد لگتے تھے۔

"پرامس، میں ایک ماہ کے اندر اندر تمام کاموں میں یوں ماہر بن کر دکھاؤں گی کہ آپ مجھے مراۃ العروس کی اصغری کہنے پر مجبور ہوجائیں گی۔ بس صرف دو سال کے لیے اکیڈمی جوائن کرنے دیں۔"

جواب ندارد۔ چہرے پہ کبھی غصے تو کبھی رنجیدگی کے رنگ جھلک دکھلائی دیتے۔

امبرین نے کوفت سے ٹی وی پہ چلتے سین کو دیکھا ڈری، سہمی، گھبراہٹ سے ہاتھ ملتی ہیروئن کے گرد زرد و سرخ زرتار ساڑیوں میں لپٹی خرانٹ اور مکر و فریب کے جال بنتی ناریوں کا جمگھٹا اور بیک گراؤنڈ میں مخصوص انڈین سوپ کا دھائیں ڈھائیں والا میوزک۔

اماں کی لاتعلقی اور بے توجہی اسے بری طرح کھلی تھی۔ یعنی میرے مستقبل کے خواب سے زیادہ ان کے لیے یہ غیر حقیقی اور فضول سا ڈرامہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اسے اماں پہ شدید غصہ آیا تھا۔ وہ ان کے کان کے قریب منہ لے جاکر زور سے چلائی تھی۔

"ٹھیک ہے، اگر آپ کا کہا نقش الحجر کی حیثیت رکھتا ہے تو میں بھی اس شرط پر اپنی خواہش سے دستبردار ہوتی ہوں کہ کل سے نہ تو میں اسکول پڑھانے جاؤں گی اور نہ کوئی لڑکی مجھ سے یہاں پڑھنے آئے گی۔"

اماں کا ارتکاز یکلخت ٹوٹا۔

"آگ لگے ایسی تعلیم کو جو ماں سے بات کرنے کی تمیز بھی چھین لے۔" اماں کو اس پہ بے طرح غصہ آیا تھا، اچھے بھلے ڈرامہ کا مزا کرکرا کرکے رکھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہر گل کی جبین پر شکن ہے
کشمیر لٹا ہوا چمن ہے
جلتے ہوئے گھر جھنے ہوئے کھیت
ہر شخص وطن میں بے وطن ہے

"کشمیر، جنت نظیر جس کی برف پوش چوٹیوں کے دامن میں شفاف پانی کی جھیلوں میں نیلے امبر کا عکس نظر آتا ہے۔ گنگناتے جھرنوں کو دیکھ کر یوں گماں ہوتا ہے کہ گویا پانی نہیں بلکہ شیشہ بہے چلا جارہا ہے۔ تہہ در تہہ جنگل اور میلوں پھیلے گلیشیرز قدرت کی صناعی کے ایسے شاہکار کہ جسے دیکھ کر انسان مبہوت رہ جائے۔ بے ساختہ قدرت کی کاری گری کی داد دینے پر مجبور ہوجائے۔

اس پارہ جنت بریں کے ہر گوشے، ہر شہر پر گزشتہ چھ دہائیوں سے خوف کا موسم بسیرا کیے ہوئے ہے۔ اس مرغزار سے امن و آشتی کے پکھیرو کوچ کرکے نجانے کس دیس سدھار گئے ہیں۔

نظام انصاف کا فقدان، شکنجہ اغیار کے ہاتھوں دم توڑتی امن کی فاختاؤں کے سبب اس شکستہ و ویران وادی کا حسن گہنا چکا ہے۔"

یوم یکجہتی کشمیر کے حوالے سے ٹی وی پہ ایک دستاویزی فلم جاری تھی۔ لب بھینچے نم آنکھوں سے نذر آتش کیے گئے مکانوں، سینہ کوبی کرتی برہنہ سر عورتوں اور نہتے و بے گناہ کشمیری نوجوانوں پہ بھارتی فورسز کے بہیمانہ ظلم و تشدد کو دیکھتے ہوئے اسے لگا اس کے غم سے بوجھل دل کسی بھی لمحے شق ہوجائے گا۔

"جب ایسے مناظر دیکھنے کا یارا نہیں تو دیکھتی کیوں ہیں۔ اسی لیے تو میں بھولے سے بھی کبھی نیوز چینل نہیں لگاتی۔" یونی فارم استری کرنے کی خاطر کھیس کارپٹ پہ بچھاتے ہوئے شاہین اس کے ستے ہوئے چہرے پہ اضطراب کی لہریں ابھرتی دیکھ کر بولی۔

"پتا ہے بیٹا! میری کلاس کے بچوں کو علم تک نہیں کشمیر بھی کوئی مسئلہ ہے جو ہنوز حل طلب ہے اور اس کے سلگتے چناروں میں بسنے والے بدقسمت باسیوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لیے عام تعطیل منائی جارہی ہے۔" آنسو پیتے ہوئے وہ دلگرفتی سے بولی۔

"ہماری نئی پود کو سرے سے ادراک ہی نہیں کہ بھارت نے محض ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی سے کشمیر کو تریسٹھ برسوں سے ظلم و استبداد کی دہکتی آگ میں دھکیل رکھا ہے میں نے کشمیر ایشو کی بنیادی وجوہ اور کشمیریوں کی لہو رنگ داستان سنائی تو پتا ہے بچوں نے کیا کہا؟" ٹی وی آف کرکے وہ شاہین کی طرف رخ کرکے بیٹھ گئی۔

"ہوں! کیا کہا؟" قمیص کو جما جما کر انتہائی توجہ سے استری کرتی ہوئے شاہین نے سر اٹھائے بغیر بے توجہی سے پوچھا۔

"یہی کہ کشمیریوں کی حق خودارادیت کے لیے کی جانے والی کوشش بے ثمر ہے۔ ان کی لاکھوں قیمتی جانوں کی قربانی اور املاک کا نقصان رائیگاں چلا گیا ہے انہیں پاکستان سے الحاق کی خواہش ترک کردینی چاہیے۔ بھلا پاکستان کے پاس ہے کیا۔ سوائے مہنگائی، غربت اور بے روزگاری کے۔ انڈیا تو ایک مستحکم ریاست ہے۔ جو بخوبی اضافی خطے کا بوجھ سنبھال سکتا ہے جب کہ پاکستان تو خود اپنے وجود کی بقاء کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اپنا کاروبار ریاست چلانے کے لیے اغیار کا دست نگر ہے۔۔۔ یہ ہمارا کل کا سرمایہ ہیں۔ انہی بچوں نے بڑے ہو کر ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے یہی معمار ملک کو بے بال و پر بنانے کی باتیں کررہے ہیں۔ انہیں احساس ہی نہیں ہے کہ اپنی شہہ رگ اپنے ہاتھوں سے کاٹنے کے بعد جسم و روح کا رابطہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہوجاتا ہے۔ بس ایک بے جان لاشہ دھرا رہ جاتا ہے۔"

وہ دکھ سے بوجھل آواز میں کہتے ہوئے بلاوجہ قالین کے ڈیزائن پر ہاتھ پھیرنے لگی تھی۔

شاہین جواب میں کچھ نہ بولی، کسی فلم، ڈرامے یا شوبز سے متعلقہ چٹ پٹی خبر ہوتی تو وہ بے تکان امبرین سے ڈسکس کرلیتی۔ اب امبرین جس نئی پود کی بے حسی اور کم عملی کا رونا رو رہی تھی۔ شاہین بھی تو اسی پود کا ایک حصہ تھی۔ نویں کلاس کی طالبہ جس کے ننھے دل و دماغ اتنے گمبھیر و نازک موضوع کا بوجھ اٹھانے کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ یونی فارم کھونٹی پہ ٹانگنے کے بعد وہ ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کرکے چینل سرچ کرنے لگی۔

"ارے آج تو پانچ فروری ہے۔ یعنی ابھیشک بچن کا برتھ ڈے۔" شاہین کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"یقیناً" آج "بلف ماسٹر" لگے گی۔ چھٹی کا تو مزا آگیا۔"

بوجھل قدموں سے باہر نکلتے ہوئے اس نے شاہین کی مگن و خوشگوار آواز سنی تھی۔

☆ ☆ ☆
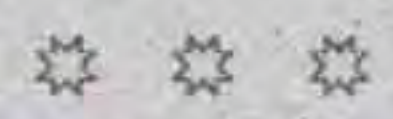
امبرین ایسی لڑکی تھی، جس کا ہر عمل اس کی پاکیزہ سوچ کی غمازی کرتا۔ شفاف و پاکیزہ ندی کے پانی طرح چمکیلے اور خوب صورت تصورات اسے زندگی کو اس ڈھب پہ گزارنے کا عندیہ دیتے کہ جس پر عمل کرنا ہر مسلمان کے لیے واجب ہوتا ہے۔ یعنی اعلا کردار،

بہترین چال چلن، متوازی سوچ مذہب و قوم سے بے انتہا لگاؤ اور دین پر جی جان سے عمل......

اس کی شخصیت پہ اس کے والد ماسٹر نذر محمد کی تربیت کے اثرات کافی گہرے تھے۔ ماسٹر نذر محمد ایک با اصول، محنتی اور کسب حلال کے تمام اصولوں پہ عمل کرنے والے معلم تھے۔ جنہوں نے شعبہ تدریس کا انتخاب سراسر اپنے گاؤں کے بچوں کو ایک با عمل مسلمان بنانے کے ساتھ ایک محب وطن بنانے کے لیے کیا تھا۔ اور اپنے اسی مشن کے لیے وہ ہمیشہ تن دہی سے کوشاں رہتے۔

وہ اپنے طالب علموں کو تشکیل پاکستان کی کٹھنائیوں سے آگاہ کرانے کے ساتھ ساتھ تکمیل پاکستان کی ذمہ داری ان کے سر رکھ دیتے۔ اپنے اسلاف کی قربانیوں، جدوجہد، ایثار، حب الوطنی کے اسباق ازبر کرانے کا فریضہ انتہائی لگن سے سرانجام دیتے رہتے۔

امبرین کا زیادہ تر وقت اپنے باپ کی صحبت میں گزرتا اور ان کی پند و نصائح سے فیض یاب ہوتے گزرتا۔ تبھی تو محض دو وقت صبح اور دوپہر کی بھوک ہڑتال کے بعد شام کو اس نے ابا سے اکیڈمی جانے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔

"تشنگان علم تو بڑی سے بڑی مسافت کو خاطر میں نہیں لاتے یہ چند فرلانگ کی دوری چہ معنی دارد؟" ابا نے انتہائی کمال شفقت و فراخدلی سے اسے نا صرف آگے بڑھنے کی اجازت دے دی بلکہ خود اکیڈمی جا کر پروفیسر صاحبان سے پڑھائی کے شیڈول کے متعلق معلومات لے آئے تھے۔ جہاں وہ خوشی سے ناچتی رہ گئی وہاں اماں اندر ہی اندر بیسیوں بل کھا چکی تھیں۔

"آخر ضرورت کیا ہے اتنی سندیں سمیٹنے کی نوکری تو ہم غریبوں کو ملنے کی نہیں۔ خوامخواہ کا خرچہ ہے یہ تو۔ اب میری نوشین بھی تو بارہ پڑھی تھی۔ کیا اتنا کافی نہیں ہوتا۔"

"اوہو اماں! نوشین آپا اپنی مرضی سے آگے تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ جبکہ میرے خیال میں تعلیم شخصیت کی تکمیل کا نام ہے۔ آپا ٹرک بھر کر جہیز لے گئی تھیں، کیا یہ لازمی ہے کہ تعلیم کی طرح جہیز میں بھی میں آپا پہ مکھی پہ مکھی ماروں۔ اور نوکری ملنے کی خوب کہی۔ تعلیم تو بذات خود ہی اتنا بڑا خزانہ ہے کہ اسے روزی کمانے کا ذریعہ بنانا کچھ اتنا ضروری نہیں۔ جس شخص کا دامن علم و فضل کے موتیوں سے بھرا ہوا سے بھلا دنیاوی دولت کی کیا پروا؟" وہ مدبرانہ انداز میں فلسفہ جھاڑتی۔

مذہب سے خصوصی لگاؤ کی نسبت ان کے گھر کو خاندان بھر میں انتہائی محبت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ ابا تو تھے ہی پابند شریعت، اماں بھی صوم و صلوٰۃ کی پابند ہونے کے ساتھ دینی عقائد پر سختی سے عمل پیرا ہونے والی یہی وجہ تھی کہ گھر کے ماحول میں رچی مذہبی کیفیت نے گھر کے ہر فرد کو نماز کا پابند بنا ڈالا تھا۔ رمضان کے علاوہ قضا روزوں کا بھی اہتمام کرتیں۔ بس اسے ماں بہنوں کا انڈین پروگرامز اور ڈراموں سے حد درجہ شغف بالکل نہیں بھاتا تھا۔

شام چار بجے سے رات گئے تک جاری ڈراموں کی سیریز کو اماں نماز کی طرح قضا کرنا کبھی نہ بھولتیں۔

"آخر ان بکواس ڈراموں میں ایسا ہوتا کیا ہے کہ آپ لوگ ضروری کاموں کو بھی التوا میں ڈال کر ٹی وی کی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ بھاری بھر کم ملبوسات و زیورات سے لدی، میک اپ میں لتھڑی یہ اسٹار پلس کی ایکٹرز تفریح کے نام پر محض دھوکا دہی، چالیں چلنے اور ہندوانہ رسومات کے فروغ کے سوا اور کر ہی کیا رہی ہیں۔ اسٹوری تو ان میں نام تک کی بھی نہیں ہوتی۔"

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کیسے وہ گھر والوں کو ان سوپ سیریلز کی آڑ میں بھارتی ثقافتی یلغار اور پروپیگنڈا مہم سے روشناس و متنفر کرائے۔ اماں کے پاس اس دلچسپی کی ٹھوس وجہ موجود ہوتی۔

"ارے تو نہیں سمجھے گی۔ جب کسی بے بس و مجبور بہو کو چنڈال نندوں اور پھاپھا کٹنی ساس کے چنگل میں گھرا دیکھتی ہوں تو اپنا وقت یاد آجاتا ہے۔ تیری دادی اور پھپھیوں نے جو ظلم مجھ یتیم پہ ڈھائے تھے۔ وہ

میں بھول نہیں سکتی۔ بس اب اس قسمت ماری "گوپی" کو ہی دیکھ لو۔ بدنصیب اپنی جان تک جلا کر سارے کام نبٹاتی ہے لیکن پھر بھی اس کالے پہاڑ "کوکیلا" کے منہ سے ایک لفظ تعریف کا بھی پھوٹ جائے۔ ڈائن نہ ہو تو۔" اماں نے اسکرین پہ نظریں جمائے یوں دانت پیسے تھے کہ گویا چہرے پہ ہوائیاں اڑاتی۔ منمناتے ہوئے اپنے کسی ناکردہ گناہ کی وضاحت دیتی گوپی خود اماں ہو تو تیوریاں چڑھائے، الزامات کی بوچھاڑ کرتی سخت چتونوں والی کوکیلا اماں کی ساس مرحومہ ہوں جنہوں نے نہ جانے اماں پہ کیسے کیسے ستم ڈھائے تھے کہ اسٹار پلس کی ہر فرماں بردار، وفا شعار دکھی اور سسرالی رشتوں کے ہاتھوں عاجز بہو کو دیکھ کر ان کا دل بھر آتا تھا۔

سرحدی محاذ پر منہ کی کھانے کے بعد انڈیا نے اپنی اسٹریٹجی تبدیل کرتے ہوئے۔

"کلچرل وار" شروع کر دی جس کے وار یقیناً "خطا نہیں گئے تھے۔

سونیا گاندھی نے دو دہائیوں قبل کہا تھا کہ "پاکستان کا بچہ بچہ ہندوستانی تہذیب کا دلدادہ ہے۔" ان کے اس دعوے کی تصدیق بدقسمتی سے حرف بہ حرف ہو چکی ہے۔ فکری افلاس اور ذہنی بے راہ روی کی بدولت نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ نام نہاد روشن خیال گھرانوں میں شادی بیاہ کے موقع پر بھارتی گانوں پہ ناچ کے بغیر فنکشن ادھورا تصور کیا جاتا ہے۔

گھروں، بازاروں، گلی کوچوں کی درودیوار سے لے کر کمپیوٹر کے اسکرین سیورز، وال پیپرز، موبائل کے کلپس، طلبہ کے فائل کورز سمیت ہر چیز پر بھارتی فلم اسٹارز چمکتے دمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ماتھے پر تلک، پاؤں میں گھنگھرو گلے اور ہاتھوں میں قسمت کے پتھروں کی موجودگی عید جیسے اسلامی تہوار پر عام رواج بن گیا ہے۔

بھارت جس نے روز اول سے ہی پاکستان کے وجود سے انکار کر دیا اب اپنی ثقافتی یلغار اور پروپیگنڈا مہم کی آڑ میں امن کی آشا کا پیام.... جسے برسراقتدار اور وسیع دل و دماغ کے افراد نے کھلے دل سے نا صرف قبول کیا بلکہ تشہیر میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ ڈالا۔

اس فریب زدہ امن کی آشا نے پاکستانیوں کو ان کی روایات اور اقدار سے محروم کرنے کے علاوہ پاکستانیوں کے ملی و قومی شعور کو بھی بے جان کر کے رکھ دیا ہے۔

انتہائی غصے میں زور سے گیلے کپڑے جھٹکتے ہوئے اس نے تار پہ ڈالے۔

"کیا کہہ رہی ہو، کس نے کس پہ ظلم ڈھا دیا۔"

سبزی بناتی اماں نے اچنبھے سے دریافت کیا کیوں کہ صحن میں ان کے علاوہ کوئی اور موجود نہ تھا، سمجھیں مخاطب وہ ہی ہیں۔

"ارے کوئی ایک ظلم ہو تو بتاؤں، اب تازہ اطلاع ملی ہے کہ سوات و دیر میں آپریشن کے بعد بھارتی ساختہ ہتھیار ملے ہیں جس میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ شمالی علاقوں میں دہشت گردانہ کارروائیوں کے پیچھے انڈین ایجنسیوں کا ہی ہاتھ ہے۔" چبا چبا کر بولتے ہوئے اس نے بالٹی کا پانی کچے صحن میں ڈال دیا۔

"لو، میں پتا نہیں کیا سمجھی، اللہ پوچھے ماسٹر صاحب سے۔ بچی کے دماغ میں نہ جانے کیا گھسا ڈالا ہے کہ ہر وقت پاکستان پاکستان جپتی رہتی ہے۔" اماں نے گویا جیسے افسوس سے سر ہلایا تھا۔

وہ ایسی تھی، اپنے ملک سے ٹوٹ کر محبت کرنے والی۔ سچی و مخلص پاکستانی، جسے پاکستان کی ہر چیز سے پیار تھا۔ پاکستان کا دشمن اسے اپنا دشمن لگتا۔ رامین اس کی حب الوطنی کو دیکھتے ہوئے ازراہ تفنن کہتی۔

"بچپن میں اماں نے امبرین باجی کو شاید لوری میں "سوہنی دھرتی" اور "روشن درخشاں" سنائی ہوں گی تبھی تو ہر وقت ان پہ حب الوطنی کا دورہ پڑا رہتا ہے۔"

"گھریلو جھگڑوں اور ساس بہو کی سازش والے ڈرامے دیکھتے وقت ہمارے پیش نظر صرف حصول تفریح ہوتا ہے قطع نظر اس کے یہ چینل پاکستانی ہے یا انڈین۔" رامین نے بہت آرام سے اپنا دفاع کیا۔

"یہ لچرپن، بے حیائی اور فحاشی کو تم لوگ تفریح کا

نام دیتی ہو۔ ارے ڈرامے تو پی ٹی وی کے ہوا کرتے تھے انتہائی صاف ستھرے' مہذب اور بامقصد' اماں ہم بہنوں کو جلدی ہوم ورک کرنے کا کہتیں کہ شام کا ڈرامہ سب مل کر دیکھیں گے۔" وہ ابھی اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔ بہنوں سے نظریاتی اختلاف بڑھتے جارہے تھے۔

"او کے بھئی ڈن' آج سے ہم صرف پاکستانی ڈرامے دیکھیں گے۔ انڈین سوپس کا ایک ہفتے کے لیے ناغہ۔" شاہین گویا ہر وقت کی تو تو میں میں سے اکتا گئی تھی۔ لیکن چند دن پاکستانی چینل دیکھنے کے بعد اس کے وہی اعتراضات شروع ہوگئے۔

"اف میرے خدایا! یہ کسی مسلم نظریاتی ملک کا میڈیا ہے۔ بنا آستین کھلے گلے اور کھلی پشت والے ملبوسات والی خواتین' مغربی طور طریقے غیر مردوں سے رومانی تعلقات لڑکیوں کا گھر سے بھاگ جانا... یہ سب کس معاشرے کی عکاسی کر رہے ہیں۔" حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ سی گئی تھیں۔

"جی جناب دیکھ لیا اپنے پاکستانی ڈراموں کا حال۔ Kissing' Huggining تو بہت عام سی بات بن گئے ہیں۔" رامین کا انداز جتاتا ہوا تھا سامنے اسکرین پہ چلتے ڈرامے میں ہیرو نے ہیروئن کو خوشی کے عالم میں جھنجھوڑنے کے بعد یوں اٹھا کر کئی چکروے ڈالے تھے کہ اس نے گھبرا کر نظریں ہی ٹی وی سے ہٹالیں۔

"پتا نہیں ہمارا معاشرہ کس طرف جارہا ہے۔ ہم اپنی نوجوان نسل کو کیا سبق دے رہے ہیں۔ کسی کو احساس ہی نہیں ہے کہ میڈیا کوئی مصنوعات ساز فیکٹری نہیں بلکہ مصلح اور مشن کا درجہ رکھتا ہے مگر آج یہ معاشرے کی رگوں میں زہر انڈیلنے کا سبب بنا ہوا ہی اور بس۔" وہ انتہائی دکھ سے بولی۔

رامین نے سکھ کا سانس لیا تھا یعنی اب بغیر کسی تنقید اور اعتراض کے وہ اپنے من پسند پروگرام دیکھ سکیں گی۔ لیکن یہ اس کی خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔

"پہلے انڈین چینل برے تھے اور اب... پاکستانی پروگرام آپ کے معیار پر پورا نہیں اتر رہے اب آپ کے ذوق کی چیز نہ جانے کہاں نشر ہوگی۔" قمیص پہ موتی ٹانکتے ہوئے شاہین نے ایک لمبا سانس کھینچا۔

"ہاں تو میں کوئی غلط کہہ رہی ہوں۔ اب دیکھو اس میزبان کو' محترمہ دوپٹہ شاید اپنی گاڑی کے ڈیش بورڈ پر بھول آئی ہیں۔ یا گھر سے لینا یاد نہیں رہا۔ کسی مسلم میڈیا کی نمائندہ لگ رہی ہیں بھلا۔" وہ وضاحتی انداز میں بولی۔

"اساتذہ' دانشوروں' پروفیسر حضرات' ادیبوں شاعروں سے ان کے فن کے متعلق نہیں بلکہ ان کی پسندیدہ ایکٹرز کے نام دریافت کیے جاتے ہیں۔"

"ہاں تو اپنی فیورٹ شخصیت کی پسند ناپسند اور زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں ناظرین جاننا چاہتے ہیں۔ تبھی تو اینکرز ان کی ذاتی زندگی پہ زیادہ ڈسکس کرتے ہیں۔"

رامین کو یہ اعتراض سراسر بے بنیاد ہی لگا۔

"بھلا پروگرام کی کامیابی ان فضول اور غیر شائستہ سوالوں اور طریقوں کی مرہون منت ہوتی ہے۔" وہ اب "حالت جنگ" میں آچکی تھی (نظریاتی طور پر)

"تو آپ کیا چاہتی ہیں ہم سرے سے ٹی وی دیکھیں ہی نا' اب یہ تو ناممکن ہے۔" رامین گویا پسپا ہو کر بولی۔

"ہاں! پتا نہیں میں کیا چاہتی ہوں۔" وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی۔

اسے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی اشیا میں بے ترتیبی نظر آئی تو بلاوجہ وہ اٹھ کر کریموں کے ڈھکن کھول کر خوشبو سونگھنے لگی تھی۔

شاہین' امبرین کی خاموشی کو غنیمت جانتے ہوئے چپکے سے بگ باس دیکھنے لگی۔ جہاں وینا ملک بے حیائی کے ریکارڈ توڑ رہی تھی یا بنا رہی تھی۔

"اندر کمرے میں جو گھستی ہو پھر تم بہنوں کو باہر کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ دن چڑھ آیا ہے بکری دھوپ میں بندھی بے چاری نہ جانے کس گناہ کی پاداش میں جل رہی ہے۔ اتنا نہیں ہوا کہ اس کی خطا معاف کر کے اسے چھپر تلے ہی باندھ دیتیں۔" پسینے سے گردن پہ چپکے بالوں کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے اماں لان کے پسینے میں بھیگے کرتے کو گلے سے پکڑ کر جھٹکنے لگیں۔ وہ ابھی روٹی پکا کر آئی تھیں۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"ہاں تو ٹیچرز! انڈی پینڈنس سیلبریشن کی تیاریاں کہاں تک پہنچیں۔؟" میڈم ندرت نے ریوالونگ چیئر کی بیک سے ٹیک لگانے کے بعد قدرے جھولتے ہوئے اسٹاف ممبرز سے دریافت کیا۔

"جی میڈم! میری کلاس نیشنل سونگز کی روز ریہرسل کرتی ہے۔ آپ ایک دن ان کی پرفارمنس جج کرلیں تو بہتر رہے گا۔" مس عقیلہ نے مودب ہو کر اپنی کلاس کی کارکردگی کا مختصراً" احوال سنایا۔

"گڈ' میں چاہتی ہوں کہ اس بار چودہ اگست کے دن ہمارے اسکول کا فنکشن اتنا آؤٹ اسٹینڈنگ اور پرفیکٹ ہو کہ ایم پی اے جو اس دن چیف گیسٹ ہوں گے۔ متاثر ہوئے بنا رہ نہ پائیں۔ ان کے ہاتھوں سے کیش پرائز اس بار ہمارے ہی اسکول نے لینا ہے پچھلی بار یہ کم بخت "فیوچر لائٹ" والے نمبر لے گئے تھے۔"

میڈم ندرت نے غصے سے دانت پیستے ہوئے اسی ایریے کے دوسرے پرائیویٹ اسکول کو کوسا۔ جس نے محض سال کے اندر ان کے آدھے بچوں کی تعداد ہتھیالی تھی۔

یوم آزادی کے حوالے سے ٹیچرز کو فنکشن کی تیاری کی ذمہ داریاں تفویض کرتے ہوئے پروفیشنل جیلسی سے مغلوب میڈم ندرت نے ٹیچرز کو بارہا تاکید کی تھی کہ ساتھ والے اسکول کو ہر حال میں اس بار Beat کرنا ہے۔ اور پرائز ملنے کی صورت میں ٹیچرز کی تنخواہ میں اضافے کا مژدہ بھی سنایا تھا۔

"میڈم! آپ میری کلاس کی رحمہ کی آواز سنیں تو بالکل "رونا لیلیٰ" کی طرح خوش گلو ہے۔ اور جواد کے گلے میں اللہ تعالیٰ نے ایسی مدھر تار رکھی ہے کہ یہ تو "احسن" اور "روز" کو با آسانی پیچھے چھوڑ سکتا ہے۔

بس قسمت کی بات ہے ورنہ ہمارے اسکول کے بچے انڈیا جاتے تو یقیناً "چھوٹے استاد" کا میدان مار لیتے۔" مس عقیلہ کے لہجے میں حسرت اور فخر بیک وقت موجود تھے۔

"واقعی' ہمارے بچوں کے ٹیلنٹ پہ تو کوئی شبہ نہیں انڈیا کو چھوڑو ملکی لیول پہ بھی اگر بچوں کو اپنا ٹیلنٹ دکھانے کا موقع مل جائے تو کوئی بات نہیں کہ یہ گائیکی کے میدان میں سرخرو نہ ہوں۔"

میڈم ندرت نے توصیفی لہجے میں سراہا تو مس عقیلہ نے مطمئن انداز میں کولیگز پر نظر ڈالی تھی۔ میڈم کی تعریف سننے کے لیے انہیں کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے یہ وہی جانتی تھیں۔ صرف مس عقیلہ پر ہی کیا موقوف سارا اسٹاف سوائے امبرین نذر کے روغن قاز ملنے میں جتا رہتا اگر جو میڈم کے منہ سے تعریف کا کوئی ایک آدھ لفظ برآمد بھی ہوجاتا تو ساری محنت گویا ٹھکانے لگ جاتی تھی۔

"مس امبرین! اسپیچ سیکشن میں نے آپ کے حوالے کیا تھا۔ آپ بتائیں آپ کی تیاری کہاں تک ہوئی ہے؟" روئے سخن اب اس کی طرف مڑ گیا تھا۔

"سوری میڈم! میں بچوں کو تقریریں نہیں تیار کرواسکی۔ آپ یہ اسائنمنٹ کسی اور ٹیچر کو دے دیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"مگر کیوں؟" میڈم ندرت تو ایک لمحے کو بھونچکا رہ گئیں۔ اتنا واضح انکار تو انہیں آج تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ بالالفاظ دیگر کسی میں اتنی جرات ہی نہ تھی کہ ان کا کہا ٹالا جائے۔

حیرانی تو پورے اسٹاف کو بھی ہوئی تھی کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ صرف یوم آزادی ہی نہیں ہر تقریب کی تقریروں کی تیاری امبرین کے ذمہ ہوتی تھی۔ بہترین الفاظ کے چناؤ کے ساتھ ساتھ ـــــ ان الفاظ کی بھرپور ادائیگی میں اسے کمال حاصل تھا۔

وہ ان کے انداز بیان میں جوش اور ولولے کی ایسی روح پھونکتی کہ سننے والے داد دیے بنا رہ نہ پاتے تھے۔

"میں بچوں کو محض چند لفظ نہیں رٹوا سکتی۔ رٹو طوطے کی طرح الفاظ کے معنی و مفہوم کو سمجھے بغیر وہ زور خطابت سے انعام کے حق دار تو بن سکتے ہیں۔ لیکن میرے فرائض میں بحیثیت صرف اتنا ہی شامل نہیں ہے کہ وہ دھواں دھار انداز میں وطن سے محبت کے بلند و بانگ دعوے کریں۔ وطن عزیز کو دشمنوں کے فریب سے چھٹکارہ دلانے کا عزم کیا جائے بانیان وطن کی خدمتوں اور قربانیوں کا صلہ پیش کرنے کی خاطر اقوام عالم کے ساتھ ہم قدم ہونے کے لیے وہ تعلیمی میدان میں کامیابی کے جھنڈے تو گاڑ سکتے ہیں مگر نہ تو انہیں اپنے دینی ورثے کی کچھ خبر ہے نہ تاریخی ورثے کا پتا۔ تہذیبی سرمایے پر فخر کرنے کی بجائے ہم اس حد تک ذہنی گداگر بن چکے ہیں کہ ہمارے سر کی چوٹی سے پاؤں تک ہر نقش ادھار اور مستعار لگتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟" دھیمے اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولتے ہوئے وہ ذرا بھر کو رکی اور ایک نظر اسٹاف ممبرز پہ ڈالی۔

"پاکستان کی اساس بجز اسلام کے کچھ بھی تو نہیں۔ ایک ایسا خطہ جس کا تانا بانا اسلام سے ترتیب دیا گیا ہو کیا ہم ایمان سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم بچوں کو حب الوطنی کا جو سبق پڑھا رہے ہیں اس کے ماخذ اول یعنی ہمارے مذہب کو کس حد تک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے بچوں کو یہ تو پتا ہے کہ رتھک روشن اور باربرا موری کا افیر آج کل زوروں پہ ہے۔

گریڈ تھری کی بچی کو اتنا معلوم تو ہے کہ سشمیتا سین نے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کرانے کا ارادہ کرلیا ہے لیکن فاطمہ جناح اور بیگم رعنا لیاقت کو تحریک پاکستان کے دوران کتنی کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا یہ معلوم نہیں ہے۔"

"ہاں تو گرائمر اسکول اور مکتب کی پڑھائی میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے نا۔ ہم اسی لیے تو ترقی نہیں کرسکتے کہ لکیر کے فقیر بنے پرانی روایتوں کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں۔ یہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہمیں کچھ نہیں دینے کی۔" مس عائشہ نے منہ بناتے ہوئے امبرین کی بات کاٹی جو اپنے اسمارٹ فگر اور آنکھوں میں ہمہ وقت لگے نیلے لینسز کی بنا پر خود کو عائشہ کی بجائے ایش کہلوانا زیادہ پسند کرتی تھیں کیونکہ ایشوریہ رائے سے مشابہت اور حد درجہ عقیدت کا یہی تو تقاضا تھا۔

"تو ترقی کرنے سے یہ مراد تو نہیں کہ ہم اپنے اسلاف کی قربانیاں بھلا دیں۔ مٹی' زبان' ثقافت سے محبت کو رسم کہن سمجھ کر ترک کردیں۔

ہم ایک طرف تو انڈیا کو کوستے ہیں کہ وہ ہر وقت پاکستان کو نگلنے پہ تیار ہے لیکن ہم اپنے بچوں کا موازنہ ان نو دولتیے اور تیجی باز پاکستانیوں کے بچوں سے کرا دیتے ہیں جنہیں بھارت یاترا کی سعادت نصیب ہوئی ایک تہذیب و لحاظ سے عاری محترمہ اپنی بچیوں سے ایک ہندو لڑکے کو راکھی بندھوا رہی ہیں تو ایک احساس کمتری کے مارے صاحب پھوٹ پھوٹ کر رو دیے کہ انہیں اپنی خوش نصیبی پہ یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ ہندوستان کی سرزمین پہ سرسنگیت کے شہنشاہوں کے سامنے کھڑے ان کے دیدار سے فیض حاصل کررہے ہیں۔ اور محض ایک اوسط درجے کی گلوکارہ کو دیکھنا ان کے لیے عمرے جیسے عظیم مذہبی فریضے کے برابر ہو گیا۔" اس نے شدت جذبات سے اونچا بولتے ہوئے غصے میں مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ اس نے جب سے "چھوٹے استاد" کو دیکھا تھا اس وقت سے اس کا خون کھولا ہوا تھا۔ اوپر سے مس عقیلہ کی تعریف نے تو جلتی پہ تیل کا کام کیا تھا۔

"اور تو اور ہمارا جھوٹ اور سراسر افواہوں کی بنیاد پہ چلنے والا میڈیا انہیں سر آنکھوں پر بٹھا رہا ہے۔ ان کے سلیبرٹی کے طور پر بھارت یاترا کی سیر کے تاثرات پوچھے جارہے ہیں اور ساتھ میں ان کی خوش نصیبی پر رشک کرکے وطن کے باقی نونہالان کو یہ سبق دینے کی کوشش کی جارہی ہے کہ تم لوگوں کی منزل تو بس انڈیا تک ہے۔ اپنے گلے کا جادو جگاؤ یا اداکاری کے جوہر دکھاؤ۔"

"مس امبرین! آپ مبالغے سے کام لے رہی ہیں۔ تعصب سے ہٹ کر اگر کسی چیز کو سراہا جائے چاہے وہ غیر کی ہو تو اس میں احساس کمتری کا پہلو کہاں سے نکلتا ہے۔" مس عقیلہ ناگواری سے بولیں۔

"بات تنگ ذہنی کی نہیں ہم اپنے بچوں کو یہ کیوں باور کرانے پر تلے ہوئے ہیں کہ صرف انڈیا کو شوبز کی حد تک ہی فالو کیا جاسکتا ہے سائنس' ٹیکنالوجی' دفاع دوسرے بہت سے شعبے ہیں جن میں فقید المثال کامیابیاں سمیٹی ہیں جن سے ہم بدقسمتی سے محروم ہیں۔"

ہمارا تعلیمی نظام وژن سے خالی ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

ساٹھ برس پہلے دیکھا جانے والا خواب ابھی تشنہ تعبیر ہے اور بردہ ذہن پر ابھرنے والا خاکہ محتاج تکمیل ہے۔ تشکیل پاکستان کا معرکہ تو سر ہوچکا ہے۔ مگر تکمیل پاکستان کا مرحلہ ابھی باقی ہے اور اسے ہم سب نے مل کر ہی طے کرنا ہے۔"

اس نے گویا بات ختم کردی تھی۔

☆ ☆ ☆

صحن میں پکوڑوں کے تلنے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ رامین اور شاہین روزے کی افطاری کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ رامین نے پڑھائی جبکہ شاہین نے بی پی لو ہونے کا بہانہ کرکے روزے رکھنے سے معذرت کرلی تھی۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح پورے روزے انتہائی ذوق و شوق سے رکھتی آرہی تھی۔

"امبرین باجی! یہ ڈنڈے میں پرچم تو پرو دیں۔ مجھ سے نہیں ہورہا ہے۔" ساتھ والوں کا عادل برآمدے کے شیڈ پہ چڑھا چھوٹی چھوٹی جھنڈیوں پہ لئی لگا رہا تھا اور اس کی بہن سویرا جھنڈیاں شیڈ کے کنارے سے چپکاتی جارہی تھی۔ دیوار سے لگی حمیرا اسے منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"ہاں ادھر دو میں ڈال دیتی ہوں ڈنڈے میں پرچم۔" وہ تسبیح برآمدے کی شیلف پر رکھ کر دیوار کی سمت چلی آئی۔

"کیا بات ہے؟ آپ نے اس بار گھر کو کیوں نہیں سجایا۔ ہمیشہ تو پہل آپ ہی کرتی تھیں۔ عادل کہہ رہا تھا کہ اس بار یکم اگست سے ہی گھر کو سجانا شروع کردوں گا ہر بار امبرین باجی جیت جاتی ہیں۔" حمیرا مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

واقعی وہ بازار سے کئی بنڈلز سبز جھنڈیوں کے منگوالیتی تھی اور اگست آتے ہی کیا برآمدہ کیا کمروں کے دروازے، باہر گلی تک سبز ہلالی جھنڈیوں سے اٹ جاتے تھے۔ مین گیٹ پر ایک بڑا پرچم لہرا رہا ہوتا۔ پتا نہیں اس کا دل کیوں سیر نہ ہوپاتا۔ ایک پرچم وہ ٹی وی انٹینا سے بھی باندھ دیتی تھی۔ اس کی بچپن سے یہی روٹین تھی۔ محلے میں جتنی اس کی سہیلیاں ہوتیں ان سب کے درمیان گھر کو سجانے کا ایک مقابلہ سا لگ جاتا تھا۔ اماں اس کی دیوانگی پہ ٹوکتی رہ جاتیں۔

"کم عقل لڑکی! سارا گھر جھنڈیوں سے پٹا پڑا ہے۔ اب باتھ روم کے دروازے پہ بھی چپکانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ضرورت ہے اماں! پتا ہے پچھلی بار شاہدہ نے صرف گھر کے اندر جھنڈیاں لگائی تھیں۔ باہر گلی ویسے خالی چھوڑدی تھی تو سب نے کیا کہا تھا کہ شاہدہ کو اپنے وطن سے تھوڑا پیار ہے تبھی تو جھنڈیاں چھوٹی لگائی ہیں۔" وہ مدبرانہ انداز میں اپنا نقطہ نظر واضح کرتی۔

بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے جوانی کی حدود میں داخل ہوتے ہوتے چودہ اگست کو انتہائی جوش و خروش سے منانے کا اس کا جذبہ بڑھتا چلا گیا۔

اس بار بھی اس نے جھنڈیاں اور پرچم منگوائے تھے۔ نہ جانے کیوں وہ انہیں درودیوار پر سجا نہ سکی۔

رامین شرارت سے کہتی۔

"روزوں کی سختی اور گرمی کی شدت سے امبرین کے حب الوطنی کے دوروں میں واضح کمی آئی ہے۔"

لیکن صرف وہی جانتی تھی کہ اس کے جذبہ حب الوطنی میں کمی نہیں البتہ جوش و خروش میں کمی آئی ہے۔

"ایک انگلش میڈیم اسکول میں اسامیوں کے لیے اس نے اور سمعیہ نے ایک ساتھ اپلائی کیا تھا۔ سمعیہ کا اپائنمنٹ لیٹر آگیا تھا۔ اور وہ اپنے نمایاں تعلیمی ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ سمعیہ جو ہمیشہ سے اوسط درجے کی طالبہ رہی ہے۔ صرف اس بنا پر نوکری کی اہل قرار پائی کہ اس کے باپ کے مضبوط سیاسی جماعت سے گہرے تعلقات ہیں۔ اس کے آباؤ اجداد نے زمین سے غداری کرتے ہوئے انگریز سرکار سے لمبی چوڑی جاگیریں حاصل کی تھیں اور بس۔

احساس محرومی اور حوصلہ شکنی نے اسے اس حد تک مایوس اور خفت زدہ کردیا تھا کہ اماں جو پہلے ہی اس کی تعلیم کے خلاف تھیں اس ناانصافی پہ تبسم کے ساتھ ساتھ اس کے بھی لتے لے ڈالے تھے۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح "علم ایک دولت" کا بیس صفحات کا مضمون پڑھ کر انہیں قائل نہیں کرسکتی تھی۔

"کیا اس لیے جشن آزادی کی آمد میرے اندر ہلچل نہیں مچاسکی کہ نوکری جو میرا اولین خواب ہے وہ ہنوز تشنہ تعبیر ہے۔" وہ خود سے سوال کرتی۔

پرچم ڈنڈے میں لگ چکا تھا۔ اس نے حمیرا کے حوالے کیا۔

"حمیرا باجی! جھنڈیاں کم پڑگئی ہیں اب کیا کریں؟"

عادل پوچھ رہا تھا۔

"تو بازار سے اور منگوالیتے ہیں۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔"

"مگر میں تو پچھلے چار ہفتوں کا جیب خرچ بس یہی جھنڈیاں خریدنے میں خرچ کرچکا ہوں۔ ابا اور پیسے تو نہیں دیں گے۔" عادل پریشانی سے بولا۔

"افوہ! تو میں تمہیں پیسے دے دیتی ہوں۔ ابا سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے سلائی کے پیسے ملے ہیں تم بتاؤ اندازا" کتنے روپوں کی ضرورت ہے۔" حمیرا بھائی کی پریشان صورت دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"مگر باجی! آپ تو کہہ رہی تھیں اس بار سلائی سے آپ اپنی چارپائی لیں گی۔ چارپائی کے دو پائے ٹوٹنے سے آپ رات کو کس قدر بے آرامی سے سوتی ہیں۔

بے شک پایوں کے ساتھ اینٹوں کو کھڑا کر رکھا ہے مگر ساری رات یہ دھڑکا تو لگا رہتا ہے کہ ادھر کروٹ بدلی اور ادھر آپ گئیں زمین پر۔" سویرا نے گویا یاددہانی کرائی تھی۔

حمیرا کے ساتھ ساتھ وہ بھی ہنس پڑی۔

"ارے چندا! سلائیوں کا کیا ہے آتی رہتی ہیں اور خبردار جو میرے شاہی تخت کے بارے میں گستاخانہ الفاظ نکالے تو۔ پچھلے دو مہینوں سے اسی چارپائی پہ سو رہی ہوں۔ مجال ہے جو کبھی دغا دیا ہو۔ میرے پیسوں کا صحیح مصرف یہ جھنڈیاں ہی ہیں۔" حمیرا مسکراتے ہوئے دیوار سے اتر گئی۔

دن بھر کی گرمی کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ سائے مغرب کی طرف اکٹھے ہورہے تھے۔ ایک حبس، پرتپش اور انتہائی سخت گرم دن کا اختتام ہونے والا تھا کیونکہ دن کی سفیدی سمٹتی جارہی تھی۔

"امبرین باجی! اگر آپ کا ارادہ جھنڈیاں لگانے کا نہیں ہے تو فی الحال آپ اپنی جھنڈیاں مجھے دے دیں اپنا گھر پورا کرکے میں آپ کی چھت پہ بھی لگادوں گا۔" عادل نے پرخلوص آفر کی تو وہ فوراً" نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"تم سے کس نے کہا ہے کہ میں اپنے گھر کو سجائے بغیر ہی جشن آزادی منالوں گی۔ مہندی اور چوڑی کے بغیر جس طرح عید بے مزا اور پھیکی لگتی ہے اس طرح سبز ہلالی پرچم کو لہرائے بغیر اور رات کو چراغاں کیے بغیر یوم آزادی منانے کا تصور ہی میرے لیے محال ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھنے لگی۔

"دھرتی ماں کی طرح ہوتی ہے۔ جس طرح ماں سے بے غرض ہوکر محبت کی جاتی ہے دھرتی بھی ایسی ہی پاکیزہ اور خالص محبت کی حق دار ہوتی ہے۔

اماں ابھی تو مجھے بعض اوقات ڈانٹ دیتی ہیں۔ تو اس سے کیا یہ پہلو نکلتا ہے کہ وہ مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔

محض چند ہزار روپوں کی جاب نہ ملنے سے میں اتنی خود غرض کیسے ہوئی کہ اب اپنے وطن سے محبت کرنا مجھ پر واجب نہیں تدریس کا شوق تو ویسے ہی میں پورا کررہی ہوں۔ مجھ سے تو یہ حمیرا لوگ اچھے رہے جن کا غریب باپ برف کے گولے بیچ کر اپنے بچوں کے لیے سامان زیست اکٹھا کرنے میں لگا رہتا ہے تو غربت اور تنگ دستی کو جواز بنا کر انہوں نے اپنے ملک سے محبت میں کمی کیوں نہیں آنے دی۔"

مایوسی کے حبس میں اسے چند دن پہلے سانس لینا محال لگ رہا تھا۔ مگر اب ایسے لگتا تھا کہ جیسے پورب سے ایسی پروا چلی ہے جس سے سارا حبس چھٹ گیا ہو۔

شکستہ پا ہوں ملال سفر کی بات سنو
مسافرہ صحرائے ظلمت شب سے
رب التفات نگار سحر کی بات سنو
سحر کی بات، امید سحر کی بات سنو

وہ شاپر میں رکھے جھنڈیوں کے بنڈل کو تیزی سے کھولنے لگی۔ وہ رات کی تاریکی چھانے سے پہلے پہلے گھر کو جھنڈیوں سے سجا دینا چاہتی تھی کیونکہ کل تو چودہ اگست تھی۔

☼ ☼

نایاب جیلانی

اودے سپنا

"نہ فیفانہ زوباریہ۔" وہ حریم کا دل بہلانے کے خیال سے نہیں کہہ رہی تھی۔ زمیلہ کو دل رکھنا یا دل بہلانا کہاں آتا تھا۔ وہ اسے "سچ" بتا رہی تھی۔

"بھائی تو آپ سے منسوب تھے۔ چھ سات سال پہلے باقاعدہ منگنی ہوئی تھی مگر ہم تو اس سے پہلے بھی جانتے تھے کہ بھائی اور آپ ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ ابو نے بہت پہلے امی سمیت سب کو باور کروا دیا تھا کہ وہ بھائی کا رشتہ اپنے دوست کی بیٹی سے طے کر چکے ہیں۔ ورنہ امی فیفا کو ضرور بہو بنا لیتیں۔ وہ اتنی

مکمل ناول

خوبصورت نہیں تھی نا جبکہ آپ تو چندے مہتاب ہیں۔ امی آپ کی خوبصورتی سے خار کھاتی تھیں ان کے خیال میں خوش شکل لڑکیاں ذرا جلدی شوہروں کو دام میں پھنسا لیتی ہیں۔ اسی لیے وہ آپ کو کچھ ناپسند کرتی تھیں تاہم ابو اور خود بھائی کا ووٹ ہمیشہ آپ کے حق میں رہا تھا۔ اسی لیے آپ یہاں نظر آرہی ہیں۔

بھائی نے ببانگ دہل اعلان کر دیا تھا کہ وہ آپ سے ہی شادی کریں گے۔" زمیلہ اپنی بات مکمل کر کے رکی نہیں تھی۔ اٹھلاتی' کھلکھلاتی باہر نکل گئی تھی۔ گویا وہ اسے یہ رام کہانی سنانے کے لیے ہی رکی تھی۔

حریم کے زرد چہرے پر پھر سے رونق بکھر گئی تھی۔ جو کانٹا کچھ دیر پہلے چبھن دینے لگا تھا خود بخود نکل گیا۔ اسے کبھی بھی ماہیر کے رویے سے کسی "کھوٹ" کی بو نہیں آئی تھی۔ فیفا سے اسے اول روز سے ہی رقابت

اور جلن محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ حریم کے لیے قطعاً "بے ضرر" تھی۔ اور زوباریہ اس کے لیے اجنبی تھی۔ نہ جانے وہ تھی کون؟ اس وقت کہاں تھی؟ اور اب اس کے دل میں کیا تھا؟ حریم کو بھلا ان واہموں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ نہ شوق تھا اور نہ ہی کسی بھی قسم کی دلچسپی تھی ماضی میں اگر ماہیر عالم کو کوئی لڑکی پسند کرتی بھی تھی تو اس کا حریم جمال سے بھلا کیا تعلق۔ سو وہ پہلے کی طرح مطمئن ہو چکی تھی۔ اس کے دل میں بال برابر شک نہیں تھا۔ رقابت نہیں تھی۔ حسد نہیں تھا۔ سچے موتیوں جیسے دل رکھنے والے اپنے حال میں مست اور مگن رہتے ہیں۔ وہ پہلے کی طرح کچن کا کام سمیٹ کر استری کرنے والے کپڑے اٹھا کر اوپر چلی آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ ابھی تک سو رہے ہیں؟" اس نے کپڑوں کی گٹھری قالین پر رکھی اور لائٹس کو کھٹا کھٹ آن کیا۔ کمرے میں آ کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ ماہیر ابھی تک سو رہا تھا اور رات کے تقریباً گیارہ بجنے والے تھے۔

"سونے دو نا یار۔" ماہیر نے کروٹ بدل لی۔

"رات کو کیا پہرہ دینا ہے۔" اس نے ماہیر کا کندھا ہلا کر جگانے کی کوشش کی۔

"اٹھ بھی جائیے۔"

"حریم! حلیم۔ سونے دو سونے دو یار۔" وہ تکیے میں منہ گھیڑنے لگا۔

"تمہارا کیا جاتا ہے۔ میں دو چار منٹ اور

سولوں۔"

"میرا نقصان بس اتنا ہوگا کہ اپنی نیند پوری کرلینے کے بعد باقی ماندہ رات آپ نہ خود سوئیں گے نہ مجھے سونے دیں گے اور میں صبح پھر سے لیٹ اٹھ کر امی سے ڈانٹ سننا نہیں چاہتی۔"

"میری خاطر سن لینا۔" اس کی بھاری سی آواز سنائی دی۔

"آپ کی خاطر نہ جانے کیا کچھ سنتی ہوں ماہیر! صرف آپ کی خاطر" وہ محض سوچ کر رہ گئی۔

"میں آپ پر پانی گرانے لگی ہوں۔" اس کا انداز دھمکانے والا تھا۔ اور وہ جگ اٹھانے کا ارادہ بھی رکھتی تھی۔

"اٹھ رہا ہوں یار!" وہ کمبل ہٹا کر بیٹھ گیا۔

"تم نے مجھے جگا کر "ہیر" سنانی تھی۔"

"سنانا تو بہت کچھ ہے۔ اگر آپ سننے کے لیے تیار ہوں تو۔" حریم نے مسکراہٹ لبوں کی تراش میں چھپالی۔

"کیا؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ نیند کے خمار سے بوجھل گلابی ڈوروں سے سجی آنکھیں سچ ہی تھا زوبار یہ اور فیفا گرفتار محبت تھیں اور خود اس کا اپنا حال کسی سے کم تھا کیا؟

"فی الحال تو بابا کی طرف لے جائیں۔ عین نوازش ہوگی۔" وہ ملتجیانہ بولی۔

"بابا کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ حانی کا فون آیا تھا۔"

"ابھی۔" ماہیر نے کلاک کی طرف دیکھا۔ کچھ سوچا اور پھر بولا۔

"چلو پھر ابھی چلتے ہیں میں ذرا منہ پر پانی کے دو چھپاکے مارلوں۔" وہ اٹھ کر بالکونی کی طرف بڑھ گیا۔ حریم نے گٹھری بیڈ کے نیچے کھسکا دی تھی۔ وہ آگے پیچھے نیچے اترے تھے۔ خلاف توقع راحت بیگم کمرے کی بجائے تخت پر بیٹھی تھیں۔

"امی! میں ذرا حریم کو لے کر جارہا ہوں۔ انکل کی طبیعت خراب ہے۔"

"کیا ابھی فون آیا ہے۔" خلاف توقع انہوں نے کچھ نرمی سے پوچھا۔

"ہوں۔" ماہیر نے محض ہنکارا بھرا۔ امی نے سرہلا کر گویا اجازت دے دی تھی۔ بغیر جرح کیے، بحث کیے۔ حریم مشکور سی ماہیر کے پیچھے چل پڑی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی حانی سے ٹاکرا ہوا تھا۔ اور حانی اسے دیکھ کر خوشی سے چیخ پڑی۔

"ہمیشہ اسی وقت آتی ہو۔" اس نے بے ساختہ شکوہ کیا۔

"دن کو آنے کی اجازت نہیں ملتی۔"

"اسی کو غنیمت جانو سنا۔" وہ ہنس دی۔

"بابا کہاں ہیں؟" خلاف توقع لاؤنج خاموش تھا۔ شطرنج کی بساط پر مہرے جوں کے توں پڑے تھے۔ جنت بوا بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔

"اپنے کمرے میں ہیں۔" حانی افسردگی سے بتانے لگی۔

"رات کو پھر سے تکلیف ہوگئی تھی بابا کو۔ میں تو ایک دم گھبرا اٹھی۔ جنت بوا کو بھی بخار تھا۔ اللہ کا شکر ہے ذرجان بھیا آگئے تھے۔ ورنہ میں تو بس روتی جارہی تھی۔" حریم بھاگ کر بابا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ان کی بوڑھی آنکھیں حریم کو دیکھ کر چمکنے لگیں۔ اسے دیکھ کر وہ کھل اٹھے تھے۔ بیماری، تکلیف سب بھول بھال گئی۔

"ماہیر کہاں ہے۔؟" وہ اسے تنہا دیکھ کر بے ساختہ پوچھنے لگے۔

"اس وقت اکیلی آئی ہو۔" ان کے لہجے میں واضح فکرمندی تھی۔

"ایسا تو اسی وقت ممکن ہوگا جب میں اس دنیا سے گزر جاؤں گا۔ میں نہ رہا۔ تبھی یہ اکیلی آسکتی ہے۔ میرے ہوتے ہوئے تو کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔" ماہیر کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے بابا کی چند ایک باتیں سن لی تھیں۔

"اللہ نہ کرے۔" وہ دہل کر سینے پر ہاتھ رکھے رکھے بولی۔

"فضول مت بولا کریں۔" کچھ ایسی کیفیت بابا کی بھی تھی۔ ان کے چہرے کی رنگت بھی متغیر ہوگئی تھی۔

"ایسا کیوں کہا بیٹے! اللہ ہماری بھی عمر تمہیں لگے۔"

"جانا تو سبھی نے ہے جلد یا بدیر۔" ماہیر کا انداز لاپروا قسم کا تھا۔

"نہ بچے! ہم کس لیے بیٹھے ہیں۔ آئندہ ایسی بات منہ سے مت نکالنا۔" جنت بوا ٹرالی گھسیٹتی آگئی تھیں۔ ان کے پیچھے حانی کی اشک بھی نظر آرہی تھی۔

"آپ نے کیوں تکلف کیا ہے؟" ماہیر لدی پھندی ٹرالی کو دیکھ کر خفگی سے بولا۔

"پچھلی دفعہ بھی کھانا نہیں کھایا تھا سوکھی چائے پی کر چلے گئے تھے۔" جنت بوا کو گویا سوکھی چائے پلانے کا ابھی تک ملال تھا۔

"نہیں تو بٹو سے بہت لڑی تھی۔ اس نے مجھے جگایا نہیں تھا۔ اور حریم مجھ سے ملے بغیر چلی گئی۔" وہ ناراضی سے گویا ہوئیں۔

"آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔ بٹو! مجھے جگانا مت، سونے جارہی ہوں۔ اگر وزیراعظم آئے تب بھی نہیں۔" بٹو اس الزام پر تڑپ اٹھی تھی۔ حریم نے بابا کو پورج کا باؤل پکڑانے کے بعد ماہیر کے لیے سالن پلیٹ میں نکالا۔ وہ سادہ روٹی شوق سے کھاتا تھا۔ حانی تازہ پھلکے بنا کر لائی تھی۔

"ہم نے بھی ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔" جنت بوا نرگسی کباب اور قیمہ بھرے ٹماٹر پلیٹ میں نکالے بیٹھی تھیں۔

"تیسری مرتبہ کھا رہی ہیں بوا آپ!" حانی سے خاموش رہنا محال تھا۔

"وہ تو شام کو کھایا تھا۔ اب تو رات ہوچکی ہے۔" جنت بوا مگن سی بولیں۔

"ماہیر بھائی! بوا سب سے پہلے ہمارے ساتھ بریک فاسٹ کرتی ہیں۔ گیارہ بجے اچار پراٹھے کا "ناشتا" کرتی ہیں۔ ایک بجے دوپہر کا کھانا کھالیتی ہیں۔ دو بجے ہمارے ساتھ لنچ میں شریک ہوتی ہیں پھر سہ پہر کی چائے سوکھی پیتی ہیں۔ سوکھی سے مراد ساتھ روٹی نہیں ہوتی۔ باقی سارے لوازمات ہوتے ہیں۔ شام کا کھانا مغرب سے پہلے اور رات کا کھانا عشاء کی نماز کے بعد۔"

"بری بات حانی بیٹے! یوں کھایا پیا نہیں گنتے۔" بابا کی آواز میں تنبیہہ تھی۔ حانی کی چلتی زبان رک گئی۔

"دیکھ رہے ہو احمد! اسی لیے میں کمزور ہوتی جارہی ہوں۔" جنت بوا نے شکایتاً کہا۔ اور ان کے خود کو "کمزور" کہنے پر ماہیر بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

"ماہیر بھائی! یہ ٹرائی کیجیے۔" وہ کھانا کھا چکا تو حانی نے نفیس سا شیشے کا ڈونگہ، کشمش، ناریل، بادام اور پستے سے سجا ماہیر کے سامنے کیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"نجانے نام کیا ہے اس میٹھے کا۔ مگر ہے بہت لذیذ۔" جنت بوا کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔

"کوکونٹ کی کھیر ہے۔" حانی نے مزے سے بتایا۔

"بابا! آپ کو بھی دوں۔" حریم نے پیالی میں کھیر نکالتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بیٹے! میں صرف چائے پیوں گا۔" وہ کچھ تھکے تھکے لگ رہے تھے۔

"کیسی ہے ماہیر بھائی۔" حانی اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"بہت مزے کی ہے۔" جنت بوا کو بغیر کھائے کھیر کی لذت کا پتا تھا۔ وہ سب بے ساختہ ہنس پڑے۔

"کاش زندگی کی ہر رات ایسی ہو بے فکر سی، ہر ٹینشن سے آزاد۔" وہ بے اختیار سوچے چلی گئی۔

"ٹیسٹ بہت اچھا ہے۔" ماہیر کی تعریف حانی کو مسرت سے ہمکنار کر گئی۔

"شکریہ۔!" وہ خوشی سے چہکی۔

"ذر جان بھیا کو بھی میرے ہاتھ سے بنی کوکونٹ کھیر بہت پسند ہے۔"

حریم کے ہاتھ میں موجود چمچہ گرنے لگا تھا۔ حانی کی ہر بات کی تان ذر جان بھیا پر آکر ٹوٹتی تھی۔ وہ ٹرالی میں خالی برتن رکھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی جب سہج سہج چلتی حانی بھی چلی آئی۔

"آج رات یہیں رک جاؤ نا حریم۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"مہمانوں کی طرح ہاتھ لگانے آتی ہو۔"

"ماہیر کو صبح دفتر جانا ہے۔ انہیں ناشتا کون دے گا۔" وہ فکرمندی سے کہنے لگی۔

"کیوں ماں اور بہن ہجرت کر کے دیار غیر چلی گئی ہیں۔ ایک صبح کا ناشتا نہیں بنا سکتیں وہ۔" حانی ضدی لہجے میں گویا ہوئی۔

"امی سے کچن کا کام نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی وہ سورج نکلنے تک عبادت میں مصروف رہتی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"زمیلہ کی کیا "مصروفیت" ہے۔ سوائے فیشن کرنے اور ٹی وی دیکھنے کے۔" حانی کا انداز جلا کٹا سا تھا۔

"وہ نو بجے تک اٹھتی ہے۔" اس کی آواز دبی سی تھی۔

"اللہ کرے اسے اپنی ماں جیسی ساس ملے۔" حانی اس کی محبت میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی تھی۔

"یہ تو بہت اچھی دعا ہے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ زمیلہ کو اپنی ماں جیسی محبت کرنے والی، خیال رکھنے والی ساس ملے۔" حریم نے خلوص دل سے کہا تھا جبکہ حانی چڑ سی گئی۔

"میرا مطلب ہے۔ تمہاری ساس جیسی ساس ملے۔ سخت، خشک اور بد مزاج۔"

"مائی گاڈ!" حریم نے دہل کر کہا۔

"یوں تو نہ کہو حانی! میری ایک ہی تو بے چاری سی نند ہے۔"

"تمہاری بے چاری سی نند کی میں چٹنی نہ بنا دوں۔ بھائی کا ناشتا بھی نہیں بنا سکتی۔" حانی روہانسی ہو کر چلا اٹھی۔

"ٹھیک ہے حانی! میں ماہیر سے بات کرتی ہوں۔" اس کا دل حانی کی محبت اور اصرار سے بے ساختہ پسیج گیا۔ حالانکہ وہ خود رہنا چاہتی تھی مگر راحت بیگم کا ہوا سر پر سوار تھا۔

"او، میری پیاری حریم!" وہ حریم سے لپٹ گئی۔ "رات کو اتنے دنوں کی جمع شدہ ڈھیروں باتیں کریں گے۔"

حریم نے جانے کتنی دقتوں کے بعد ماہیر سے ایک رات رہنے کی اجازت طلب کی تھی۔

ماہیر نے شادی کے فوراً" بعد ہی اس سے وعدہ لینے کی کوشش کی تھی۔ بار بار جتایا تھا کہ وہ اسے میکے ملوانے کے لیے لے کر جایا کرے گا مگر رات رہنے کی وہ ہرگز کوشش نہ کرے۔ وہ اسے رات تو ہرگز نہیں رہنے دے گا۔ بقول ماہیر کے اسے حریم کے بغیر سونے کی عادت نہیں رہی تھی۔ اس وقت بھی کچھ پل کے لیے وہ بالکل چپ ہو گیا تھا۔

"حانی اصرار کر رہی ہے ماہیر!" وہ آس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"حانی تو بچی ہے۔ اسے شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریوں کی کیا خبر۔ تم خود سمجھدار ہو۔ صبح مجھے دفتر جانا ہے۔ شاید کپڑے بھی پریس کرنے والے ہیں۔" ماہیر کا لہجہ آن کی آن میں کیسا اجنبی اور کٹھور ہوتا چلا گیا۔

"انکل کی طبیعت اب بہتر ہے۔ حانی سے بھی ملاقات ہو چکی۔ اب خود فیصلہ کر لو۔"

"کیا فیصلہ!" وہ غائب دماغی سے پوچھنے لگی۔ ایک رات باپ کے گھر رکنے کے لیے شادی کے بعد ایسے کئی طرح کے پل صراط سے گزرنا پڑے گا یہ تو حریم نے سوچا نہیں تھا۔

"امی بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔ مولی کی الگ سے ذمہ داری۔ زمیلہ بے چاری کیسے سنبھالے گی۔"

"صبح ہوتے ہی آجاؤں گی۔" وہ کہنا چاہتی تھی کہ پہلے بھی تو بے چاری زمیلہ سب کچھ سنبھالتی تھی۔ مگر منہ سے کچھ اور برآمد ہوا۔

"بابا کی صحت اتنی بھی بہتر نہیں۔ مجھے دیکھ کر اتنی بشاشت کا اظہار کر رہے تھے۔ ورنہ پہلے سے بھی زیادہ نحیف ہو گئے ہیں۔"

"جیسے کہو تمہارا اپنا دل چاہ رہا ہے۔" ماہیر کا موڈ بگڑ گیا۔

"چلتا ہوں۔ دروازہ بند کر لو۔" وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ اس کا مزاج اتنا برہم ہوا تھا۔ ورنہ حریم نے تو اس کا ہمیشہ ایک ہی روپ دیکھا تھا۔ محبت لٹاتا روپ، چاہتیں بکھیرتا۔

حریم اس کے پیچھے گیٹ تک آئی تھی مگر وہ بغیر دیکھے بائیک اسٹارٹ کر کے چلا گیا تھا۔ حریم کے قدم گویا بہت بوجھل ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کی جوت بجھ سی گئی تھی۔ البتہ وہ حانی کی خوشی ملیامیٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سو اسی لیے اس نے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کیے رکھا۔

"شادی کے بعد پہلی مرتبہ ماہیر بھائی کے بغیر رات رہو گی۔ کیا فیلنگز ہیں تمہاری۔" حانی کی شوخیاں اور کھلکھلاہٹیں عروج پر تھیں۔ اس نے کبھی اپنی معذوری کی وجہ سے خود پر یاسیت طاری نہیں کی تھی۔

"بکو نہیں حانی۔" اس کے دل میں ایک احساس نے چٹکی سی بھری۔

"ذر جان بھیا سویڈن سے ـــــ آگئے ہیں۔ میرے

لیے ڈھیر ساری سویٹس اور چاکلیٹس لائے تھے اور تمہارے لیے کچھ بھی نہیں۔ میرے پوچھنے پر کہنے لگے۔ وہ کون سا میرے دیئے تحائف کو استعمال کرنا پسند کرتی ہے۔ اٹھا کر کسی نہ کسی کے ہاتھ تھما دیتی ہے یا پھر یوں ہی میرے گفٹس کسی نہ کسی کونے میں پڑے اپنی ناقدری پر نوحہ کناں ہوتے ہیں۔ بھیا کہہ رہے تھے حانی! ـــــ تمہاری بہن میرے ساتھ کوئی ایک بھی رشتہ استوار رکھنا نہیں چاہتی۔" حانی کو اچانک کچھ یاد آیا تو نان اسٹاپ شروع ہو گئی۔ حریم کے چہرے کے تاثرات ـــ سپاٹ ہو گئے تھے۔ اس نے جان بوجھ کر موضوع ہی بدل دیا۔

"حانی! کچن کے راشن کو سوچ سمجھ کر استعمال کیا کرو۔ بابا کی پینشن میں نا صرف گھر چلانا بلکہ ان کی دوائیں وغیرہ بھی ہر ہفتے منگوانا ہوتی ہیں۔" اس کا انداز ناصحانہ تھا۔

"اللہ نے اگر بھرم رکھا ہوا ہے تو سدا اس بھرم کے قائم رہنے کی دعا کیا کرو۔" حریم کی آواز بھرا سی گئی۔ اکثر لوگ ان کی دو منزلہ، شاندار، وسیع و عریض کوٹھی کو دیکھ کر غلط فہمی کا شکار ہو جاتے تھے۔

"کوکنگ کا شوق مجھے اور تمہیں امی سے وراثت میں ملا ہے۔ بابا بھی یہی بات اکثر مجھے بتاتے ہیں اور رہی اس شوق کی تکمیل کے لیے پیسوں کی بات تو آپ کی لاڈلی حانی اب اچھا خاصا کمانے لگی ہے۔" حانی کے انکشاف نے حریم کو حیران ہی تو کر دیا تھا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"کالونی کے بچے میرے پاس ٹیوشن پڑھنے آنے لگے ہیں۔ اس مصروفیت سے بابا اور میں دونوں ہی خوش ہیں۔ عصر کے وقت تو یہاں میلہ لگا ہوتا ہے۔ زر جان بھیا بھی کہہ رہے تھے۔ حانی! تم نے اچھی مصروفیت ڈھونڈلی ہے۔" حانی نے مزے سے بتایا تو حریم بھی مطمئن سی ہو گئی۔ پھر اٹھ کر بابا کے کمرے میں جھانکنے لگی۔ وہ ابھی تک جاگ رہے تھے اور کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔

"حریم! اندر آجاؤ بیٹے۔" انہوں نے عینک اور کتاب دونوں چیزیں اسے دیکھ کر ایک طرف رکھ دیں۔

"ابھی تک سوئی نہیں۔"

"حانی بھلا سونے دے گی۔" وہ خوشدلی سے بولی۔

"تمہارے بغیر ہم دونوں ہی اداس ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی، کسی دن، مہینے میں دو، تین مرتبہ چکر لگا لیا کرو بیٹی! حانی تمہیں بہت مس کرتی ہے۔ ابھی بچی ہے، تمہاری ذمہ داریوں کو نہیں سمجھتی۔" وہ محبت سے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگے۔

"کوشش کروں گی۔" حریم نے بمشکل بشاشت سے کہا۔

"تم خوش تو ہو نا۔" انہوں نے فکر مندی سے پوچھا تھا پھر خود ہی کہنے لگے۔

"ماہیر کتنا اچھا ہے نا۔ مجھے تو اس وقت سے اچھا لگتا ہے جب اپنے باپ کی انگلی تھامے آیا کرتا تھا۔ کبھی ماہیر کو دیکھ کر اولاد نرینہ کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ عالم نے تو بہت چھوٹی عمر میں ماہیر کو میرا بیٹا بنا دیا تھا۔ سلجھا ہوا، شریف، نیک اور محبت کرنے والا فرماں بردار بچہ ہمیشہ والدین سے اچھی دعا لیتا ہے۔ عالم اپنے بیٹے سے خوش اس دنیا سے گیا ہے۔ یہ والدین کی خوش بختی ہوتی ہے۔ کہ اولاد نیک اور فرماں بردار ہو۔ چاہے بیٹیاں ہوں، چاہے بیٹے۔" ان کی آنکھوں میں ماہیر کے لیے محبت ہی محبت تھی۔

"میں نے تمہارے لیے بہترین فیصلہ کیا ہے حریم! اور سب سے اچھے لڑکے کو منتخب کیا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔" وہ نہ جانے کیسی یقین دہانی چاہتے تھے۔

"جی بابا۔" اس نے بابا کے یقین پر مہر لگائی تھی۔

"روپیہ پیسہ آنے جانے والی چیز ہے۔ آج میرے پاس تو کل کسی اور کے پاس۔ ایسی چیز کے پیچھے رشتوں، مان اور محبت کو توڑنا عقلمندی نہیں۔ عالم نے جب ماہیر کے لیے تمہیں مانگا تو میں نے کسی چیز کی طرف توجہ نہیں کی تھی سوائے محبت کے۔ مجھے یوں لگا تھا کہ میری اجلی سوچوں کی حامل بیٹی ہر دنیاوی شے کے بغیر رہ سکتی ہے مگر محبت اور عزت کے بغیر نہیں۔ سو میں نے عالم کو ہاں کر دی تھی۔ ہر خدشے سے آزاد ہو کر، کیونکہ مجھے تمہارے لیے محبت اور عزت، قدر کرنے والے لوگوں کی چاہ تھی۔ دولت، جائیداد کچھ بھی نہیں سوائے دھوکے اور فریب کے۔"

"جی بابا! آپ نے سچ کہا۔" حریم کے لہجے میں سچائی کی مضبوطی تھی۔

"عالم کو اللہ نے مہلت نہیں دی تھی۔ ماہیر کی خوشیاں دیکھنے کی۔ اگر وہ ہوتا تو شاید۔" دوست کی دائمی جدائی کا تصور اکثر انہیں رنجیدہ کر دیتا تھا۔

"ماہیر اچھا ہے نا۔" وہ نہ جانے کیسی یقین دہانی چاہتے تھے۔

"جی بابا! ماہیر اتنے اچھے ہیں کہ لفظوں میں بتانا ممکن نہیں۔" اس کی آنکھوں میں دیئے ٹمٹمانے لگے تھے۔

"ہوں۔" وہ ایک دم ترو تازہ نظر آنے لگے۔

"راحت بھابھی، زمیلہ وغیرہ۔"

"امی اور زمیلہ بہت خیال رکھتی ہیں۔" اس نے نظر جھکالی تھی۔

"مجھے صرف تمہارے لیے قدر دان لوگ ہی چاہیے تھے۔ جو تمہیں عزت دیں، محبت دیں۔" بابا دھیمے سے مسکرائے۔ کیسی اطمینان بھری مسکراہٹ تھی۔ بیٹی کو خوشحال دیکھ کر۔

"فائدہ مند عورت وہ ہی ہوتی ہے۔ جو اپنا چین، راحت، سکون اور آرام تج کر اپنے سے وابستہ لوگوں کو خوش رکھے۔ اس گھر میں تمہاری قدر ہے۔ یہ خبر ہی میرے سکھ اور سکون کے لیے کافی ہے۔" ان کی آنکھوں میں خوشی اترنے لگی۔

"جی بابا۔" وہ بھیگے انداز میں بولی۔

"زر جان آتا رہتا ہے۔ حانی کے لیے نہ جانے کیا کچھ اٹھا لاتا ہے۔ وہ بھی فرمائشیں کرنے سے باز نہیں آتی۔ بہت خیال رکھتا ہے۔ ہمارا۔ زر جان بہت اچھا ہے اللہ اسے ہر سکھ سے نوازے۔ جمشید کی اولاد میں سب سے مختلف، منفرد۔" انہوں نے دوا کھا رکھی تھی تبھی آواز پر نیند غلبہ پانے لگی۔ جب وہ سو چکے تو حریم منتظر بیٹھی حانی کے پاس آگئی جو کہ اس کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح ہوتے ہی اس پر واپس جانے کی دھن سوار ہو چکی تھی۔ جنت بوا کے ہزار اصرار کے باوجود اس نے ڈھنگ سے ناشتا بھی نہیں کیا تھا حالانکہ آج اتنے بے حساب دنوں بعد وہ نرم گرم بستر میں تھی جب صبح کی چائے اور گرما گرم ناشتے کی ٹرے سجی آگئی تھی۔ مگر اس سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا۔ پوری کچوری، بھنے ہوئے چنے، سوجی کا سنہرا پھولا پھولا حلوہ۔ گرما گرم بھاپ اڑاتا چائے کا مگ۔ سجی سجائی ٹرے جوں کی توں پڑی رہ گئی تھی اور وہ چائے پی کر شال اوڑھے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

"ماہیر بھائی کو فون کر دو۔ شام کو واپسی پر تمہیں لیتے جائیں گے۔" حانی کو مزید پھیلتا دیکھ کر وہ بابا سے ملنے کے بعد جنت بوا سے دعائیں لیتی گیٹ کی طرف بھاگی تھی۔ جنت بوا اس کے پیچھے آرہی تھیں۔ انہیں سبزی لینے بازار جانا تھا اور وہ حریم کو گھر تک چھوڑنے کے بعد بازار جانا چاہتی تھیں۔ روڈ سے رکشا باآسانی مل گیا تھا۔ رکشا گیٹ کے قریب رکا تو حریم نے اترتے ہوئے رکشے میں بیٹھی بوا سے کہا۔

"بوا! اندر آیئے نا۔"

"نہ بٹو! مجھے بازار سے دیر ہو جاوے گی۔ حانی نے شملہ مرچ، گاجر، مٹر اور آلو کے پکوان بنانا ہیں۔ جان کھا مارے گی میری۔" رکشا پھٹ پھٹ کرتا آگے بڑھ گیا تھا اور حریم مختلف سوچوں میں گم گیٹ کھولے اندر آگئی تھی۔ اپنے دھیان میں گم اس نے غور نہیں کیا تھا کہ خلاف معمول گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو امی تخت پر لیٹی تھیں۔ زمیلہ ان کا سر دبا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بے حد سرخ اور سوجی سوجی تھیں۔ حریم کو کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔

"السلام علیکم امی!" اس نے سہما سہما سلام پیش کیا

تھا۔ جواب دونوں طرف سے نہیں ملا تھا۔ حریم سمجھ گئی تھی مطلع ابر آلود ہے۔ گرج چمک کے امکان بھی نظر آرہے تھے۔

"امی! چائے لادوں؟ ایک رس تو کھالیں۔ رات سے کچھ بھی نہیں کھایا۔" زمیلہ نے سوں سوں کرتے ہوئے ماں سے کہا۔

"ہاں لادو۔" امی کی نقاہت زدہ آواز ابھری۔

"میں بنالاتی ہوں۔" زمیلہ کو اٹھتے دیکھ کر حریم جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ کچن میں داخل ہو کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ ایک رات میں پورا کچن تلپٹ ہوچکا تھا۔ اس نے چائے بنا کر امی کو دی پھر موبی کے کمرے میں جھانکا۔ وہ صرف دودھ کا گلاس سامنے رکھے بیٹھا تھا۔

"موبی! تم نے ناشتا کیا ہے؟" حریم اندر آگئی تھی۔

"تم کہاں گئی تھیں بھابھی۔" وہ اس کا سوال یکسر نظر انداز کر کے بے قراری سے بولا۔ نظریں حریم پر گویا جم گئی تھیں۔

"میں اپنے بابا سے ملنے گئی تھی۔" حریم نے مختصر بتایا۔

"اچھا۔" موبی نے گویا سمجھ کر سر ہلایا۔

"کچھ کھاؤ گے۔" وہ مصروف سے انداز میں کھڑے کھڑے پوچھنے لگی۔

"پتا نہیں۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

"امی اور زمیلہ نے بھی کچھ نہیں کھایا۔" وہ اداسی سے کہنے لگا۔

"کیوں؟"

"امی رات بیمار ہوگئی تھیں نا۔ ماہیر بھائی ہسپتال لے گئے تھے امی کو گاڑی میں ڈال کر۔ صبح واپس آئے ہیں۔ اذان کے وقت۔" اس وقت موبی بہت فکر مند اور ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ لہجے میں لکنت نہیں روانی تھی۔ ورنہ پورا جملہ بولتے ہوئے وہ کئی مرتبہ اٹکتا تھا۔

"امی کو کیا ہوا تھا؟" حریم بے حد فکر مندسی ہوگئی۔

"سر میں درد تھا نا۔ پھر سوگئی تھیں۔ منہ پر پانی ڈالا پھر بھی نہیں اٹھیں۔ ناک دبائی پھر بھی نہیں اٹھیں۔" امی شاید بلڈ پریشر ہائی ہوجانے کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی تھیں۔ موبی اپنی سمجھ کے مطابق جواب دے رہا تھا۔

"میں ڈر گیا تھا بھابھی! ابو کے ساتھ بھی ایسے ہوا تھا۔ انہیں درد ہوا۔ پھر وہ سوگئے، دوبارہ اٹھے ہی نہیں۔ ماہیر بھائی انہیں مٹی میں دبا آئے۔ ڈھیر سارے لوگ بھی تھے۔ میں بھی ساتھ گیا تھا۔" موبی کی آنکھوں کے سامنے گویا باپ کی وفات کی فلم چل رہی تھی۔

"میں نے دعا کی اللہ سے امی اٹھ جائیں، سوتی نہ رہیں۔ دیکھونا، امی اٹھ بھی گئیں۔ گھر بھی آگئیں۔ میں نے سمجھا، ماہیر بھائی امی کو بھی مٹی میں دبانے چلے گئے ہیں۔ میں اکیلا روتا رہا۔ روتا رہا، تمہیں آوازیں دیتا رہا۔" موبی نے خوفزدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب تو نہیں جاؤ گی نا۔" موبی یقین دہانی چاہ رہا تھا۔

"نہیں۔" وہ نرمی سے بولی۔

"ماہیر بھائی بھی یہی کہہ رہے تھے۔" موبی بے ساختہ خوش ہو کر بولا۔

"کیا۔؟" اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔

"کہ بھابھی کو اب نہیں جانے دیں گے۔ بس دن کو جایا کرے گی۔ رات کو نہیں۔"

"ہوں۔" وہ ہولے سے مسکرادی۔

"تم اب کارٹون دیکھو یا گیم کھیل لو۔ میں تمہارے لیے ناشتا لاتی ہوں۔" حریم کمرے سے باہر نکلی اور سیدھی امی کے قریب چلی آئی۔ وہ ان سے طبیعت کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر جھجک اور خوف کی وجہ سے یوں ہی کھڑی رہی۔ امی نے کب گھر میں بے تکلفی کی فضا قائم رکھی تھی۔ ایک تکلیف، جھجک اور خوف ہی پردے کی طرح حائل رہا تھا ہمیشہ۔

"امی! آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟" بہت دیر سوچنے کے بعد وہ آہستگی سے پوچھنے لگی۔

"تمہاری بگڑتی طبیعت سے کیا لینا دینا تمہیں۔ ہم تو تمہارے لیے غیر ہیں۔ باپ کی بیماری کا سن کر تو بھاگی

چلی گئی تھی۔ میں رات بھر ہسپتال میں تڑپتی رہی ہوں۔ بچے میرے تنہا پریشان ہوتے رہے۔ بہورانی بغیر پوچھے بتائے رات میکے میں گزار آئیں۔ آج کل کی لڑکیوں میں لحاظ کہاں۔ کسی بزرگ سے اجازت لینا، پوچھنا، بتانا اپنی توہین سمجھتی ہیں۔ پہلے سے ارادہ تھا تو کم از کم بتا کر تو جاتیں کہ رات باپ کے گھر رہو گی۔" انہوں نے ایک ہی سانس میں اس کے چودہ طبق روشن کردیے تھے۔ ان کے ہر الزام پر وہ تڑپ تڑپ گئی۔

"امی! بس جانی اور بابا کی وجہ سے۔" اس سے بات بھی بن نہیں پائی تھی۔ ہونٹ کچلتی خاموش ہوگئی۔ یہ تو سراسر اتفاق تھا کہ رات کو ہی راحت بیگم کی طبیعت اس حد تک بگڑی کہ انہیں ہسپتال لے جانا پڑا تھا۔ ماہیر نے اسے بتایا بھی نہیں تھا ورنہ وہ رات کو ہی آجاتی۔

"میرے بعد تو یہ گھر تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ سوچا تھا سمجھدار لڑکی ہے گھر بنانا، سنوارنا جانتی ہے۔ میرے نادان بچوں کو سنبھال لے گی۔" ان کا اشارہ شاید موبی کی طرف تھا۔

"رات بھر زمیلہ اور ماہیر میرے ساتھ رہے ہیں۔ میرا پاگل غیب تنہا کمرے میں دکا رات بھر روتا رہا ہے۔ گھر میں تم ہوتیں تو ایک دلاسا تو رہتا تھا کہ موبی اکیلا نہیں۔ اس پاگل، دیوانے کی میرے بعد نہ جانے کیا حالت ہوگی۔ تل تل کر مرجائے گا۔ کسی نے پوچھنا تک نہیں۔ پاگل خانے پھینک آئیں گے لوگ۔ ایسے ہوش و حواس سے عاری سب پر بوجھ ہی ہوتے ہیں۔ عالم نے تو کبھی موبی کو "پاگل" کہنے نہیں دیا تھا مگر سب کے دل ایک سے تو نہیں ہوتے۔ میرے سامنے دنیا سے پردہ پوش ہوجائے، میری تو بس یہی آرزو ہے۔ سکون سے مر تو سکوں گی۔" انہوں نے دھواں دھار رونا شروع کردیا تھا۔ حریم بوکھلا کر سر جھکائے کمرے میں کھڑی رہی۔

"زمیلہ رات بھر کی جاگی ہوئی ہے۔ اب میرے سر پر کیوں سوار ہو۔ کچن کو دیکھ لو، کپڑوں کے ڈھیر کو استری کرلو۔"

"جی بہتر۔" وہ انہی قدموں پر پلٹ گئی۔ ابھی چولہے پر جمی کائی وہ مانجھ رہی تھی جب ماہیر کی تھکی تھکی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر بعد وہ کچن کے چوکھٹے میں آکھڑا ہوا تھا۔ حریم نے مڑ کر دیکھا۔

"میں تمہیں لینے کے لیے گیا تھا۔ جانی نے بتایا تم بوا کے ساتھ جاچکی ہو۔"

"جی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"ناشتا بناؤں؟"

"نوازش ہوگی۔" وہ پلٹ رہا تھا۔

"ناشتا کمرے میں لے آنا۔" جاتے جاتے تاکید بھی کی تھی۔

حریم موبی کو ناشتا دے کر پراٹھا اور آملیٹ بنائے اوپر آگئی تھی۔

"آپ نے مجھے امی کی خرابی طبیعت کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔" وہ پائنتی کی طرف بیٹھ گئی تھی۔

"بتانے کا وقت ہی نہیں ملا فجر کے وقت تو واپسی ہوئی تھی۔" ماہیر جلدی جلدی ناشتا کر رہا تھا۔ نیند سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ وہ جمائی روکتے ہوئے ٹرے کھسکا کر لیٹ گیا۔

"آپ دفتر نہیں جائیں گے۔"

"نہیں۔" اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیے تھے۔

"پردے برابر کر کے لائٹ آف کردینا۔" ساتھ ہدایت بھی کی گئی۔

"اچھا۔" حریم نے اٹھ کر کھڑکی بھی بند کردی تھی۔

"ماہیر!" وہ اس کے قریب کھڑی آہستگی سے بولی۔

"ہوں۔" اس پر غنودگی بھی طاری ہونے لگی تھی۔

"آپ مجھ سے خفا تو نہیں۔"

"نہیں۔" ماہیر بھاری آواز میں بولا۔

"سچ بتائیں۔"

"میں کیوں جھوٹ بولوں گا۔ میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ خفا ہو نہیں سکتا۔ خفا ہونے کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔" وہ نیم غنودگی میں بول رہا تھا۔ حریم ہولے سے

مسکرادی۔ وہ ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح جلدی نیچے آنے اور سیڑھیاں تیز تیز پھلانگنے کے چکر میں اس کا پاؤں رپٹ گیا تھا اور دوسرے ہی لمحے وہ کئی سیڑھیوں سے پھسلتی ہوئی زمین بوس ہو چکی تھی۔ اپنی بے ساختہ چیخوں پر اس کا کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔

ٹائی کی ناٹ لگاتا ماہیر لمحہ بھر کو چونکا اور پھر دوسرے ہی پل آندھی طوفان کی طرح سیڑھیاں پھلانگتا۔ تڑپتی بلکتی حریم کے پاس دو زانو بیٹھا اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

"حریم! ٹھیک تو ہو نا۔ کہاں چوٹ لگی ہے؟" وہ سیڑھیوں سے گری تھی۔ اور نہ جانے اسے کہاں کہاں چوٹ آئی تھی۔ وہ گھبرا سا گیا۔ حریم کے لبوں سے گھٹی گھٹی چیخیں برآمد ہو رہی تھیں۔ وہ پاؤں پکڑے بے آواز رو رہی تھی۔ ماہیر گویا سمجھ گیا تھا۔ پھر سرعت سے جیب میں سے موبائل نکال کر اس نے کسی بخاری انکل سے رابطہ کیا تھا۔ دوسرے ہی پل وہ حریم کو بانہوں میں اٹھائے باہر کی طرف نکل گیا۔ راحت بیگم اور زمیلہ فکرمندی اور پریشانی ظاہر کرنے کی غرض سے گیٹ تک آئی تھیں۔ البتہ دلاسے کے طور پر ان کے لبوں سے چند الفاظ بھی نہیں نکل سکے تھے۔

اللہ کا شکر تھا پیر کی ہڈی فریکچر ہونے سے بچ گئی تھی۔ البتہ اس کے گھٹنے کہنیاں اور بازو بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ دائیں پاؤں کا ناخن ٹوٹ گیا تھا جس میں سے درد کی ٹیسیں ابھی تک اٹھ رہی تھیں۔ پاؤں بری طرح سوج کر پھولا پھولا لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے پین روکنے کے انجکشن، دوائیاں اور مالش کرنے کے لیے الگ سے دوائی لکھ دی تھی۔

ماہیر اسے بازو کے حصار میں لیے، سہج سہج چلاتا ہوا تخت پر بٹھا کر دوائیاں لینے چلا گیا تھا۔

"دیر سے اٹھنے کے بعد دیکھ لیا، اپنی "پھرتیوں" کا انجام۔" ذرا سی تاخیر نے پچھلی ریاضتوں پر بھی پانی پھیر دیا تھا۔

"رات کو مرہم لگانے سے پہلے نیم گرم پانی کی ٹکور کر لینا۔ سوزش اتر جائے گی۔ پاؤں پر دباؤ آنے کی وجہ سے سوج چڑھ گئی ہے۔" اسی تکلیف سے اگر زمیلہ کو گزرنا پڑتا تو نہ جانے ان کا رویہ کیسے ہوتا۔ وہ آنسو حلق میں اتارتے ہوئے درد کی شدت کو دبانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔ اس کی اپنی ماں بہت بچپن میں فرقت کے عذاب انہیں سونپ گئی تھی۔ وہ کیا جانتی تھی ماں کی ممتا اور اس کی محبت کو۔ نہ کوئی ماں بنی تھی نہ کسی نے ماں جیسی محبت دینے کی کوشش کی۔

حریم کبھی کبھی سوچتی تھی کہ شاید اسی میں کوئی کمی ہے جو وہ انہیں اپنا نہیں بنا سکی۔ وہ ان کی زمیلہ جیسی نہیں بن سکی تھی۔ ماہیر آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دوائیوں کے شاپر کے علاوہ فروٹس، جوسز اور دودھ کے ڈبوں کا بڑا سا بھاری شاپر بھی تھا۔

"ڈاکٹر نے بتایا ہے یہ بہت ویک ہے۔ اپنی خوراک پر توجہ نہیں دیتی۔"

"ہم نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔ جب سے آئی ہے، کچن اسی کو سونپ کر میں تو الگ ہو چکی ہوں۔ زمیلہ بھی کم کم باورچی خانے میں گھستی ہے سب کچھ کھلا پڑا ہے۔ جو دل کرے کھائے۔" وہ بات کو اپنے رنگ میں لے کر قدرے رکھائی سے بولیں۔ ماہیر نے ان کے بدلتے لہجے پر توجہ نہیں دی تھی۔

"سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ ضرور پی لیا کرو۔ یہ جوس اور فروٹ بھی کھانے پینے کے لیے ہیں۔ دیکھنے کے لیے نہیں۔" حریم چپ چاپ اس کی ہدایات سنتی رہی تھی۔ وہ اسے بتا نہیں سکی تھی کہ جو دودھ گوالا دے کر جاتا تھا وہ صرف مولی، زمیلہ اور راحت بیگم کے لیے کافی ہوتا تھا۔ جو بچ جاتا، اس کی چائے بنالی جاتی تھی۔ اور پھل وغیرہ کا بھی یہی حال تھا۔ اگر فروٹس ذرا جلدی زمیلہ کی مہربانی سے ختم ہو جاتے تو راحت بیگم کی ترچھی نظروں کی تاب کون لاتا۔

"ناشتا کیا کرو گی؟ بریڈ یا انڈا وغیرہ ابال دوں۔" ماہیر پوچھ رہا تھا۔

"آپ۔" وہ کچھ گھبرا کر ماہیر کو دیکھنے لگی۔

"آپ کیسے بنائیں گے۔"

"میں چائے اور انڈا تو بوائل کر سکتا ہوں۔" ماہیر نرمی سے بولا۔

"تمہیں دفتر سے دیر نہیں ہو رہی۔" راحت بیگم نخوت سے سر جھٹکنے لگیں۔

"دفتر تمہارے باوا کا نہیں ماہیر!"

"آفس سے میں آل ریڈی لیٹ ہو چکا ہوں۔ زوار صاحب سے بات کر لی ہے۔ انہوں نے دو گھنٹے کی مزید عنایت کر دی ہے۔" ماہیر نے شاید اپنے باس کو لیٹ ہو جانے کی وجہ بتادی تھی۔ تبھی وہ مطمئن تھا۔

"اب تم زنانیوں کے کام کرو گے۔؟" ماہیر کو کچن کی طرف بڑھتا دیکھ کر راحت بیگم تلملا اٹھیں۔

"ایسی زن مریدی کی توقع تو نہیں تھی۔" انہوں نے محض پاس بیٹھی حریم کو سنایا تھا۔ پھر اٹھ کر شر پٹر کرتی باورچی خانے میں چلی گئیں۔ ماہیر نے انڈا بوائل کر لیا تھا اور انہوں نے کمال مہربانی سے چائے بنادی۔ ماہیر اسے کرک رس، انڈا اور چائے دے کر خود بغیر ناشتا کے دفتر چلا گیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے حریم کو دوا کھانے کی تاکید بھی کی تھی۔ اس محبت پر حریم کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"ایسے بر تو نصیبوں والیوں کو ملتے ہیں۔" راحت بیگم کی آواز سنائی دی تھی۔

"اللہ سب کی بیٹیوں کو میرے ماہیر جیسا شوہر عطا کرے۔" ان کا لہجہ جلا کٹا سا تھا۔

ابھی اس کے پاؤں کی تکلیف تو کم نہیں ہوئی تھی البتہ سوزش اتر چکی تھی۔ انگوٹھے کا زخم بھی پہلے سے بہتر تھا مگر ابھی حریم بہت تیز نہیں چل سکتی تھی۔ احتیاط سے سیڑھیاں اترنا اور چڑھنا پڑتا تھا۔ آج صبح سے اس کے پاؤں میں اکڑن سی محسوس ہو رہی تھی۔ تبھی معمول کا کام نبٹاتی وہ دن بھر ملگجے سے حلیے میں پھرتی رہی۔ روز ماہیر کی آمد سے پہلے وہ نہا دھو کر سنور کر اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اسی حساب سے کام بھی جلد از جلد ختم کر لیتی۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ ماہیر کے آفس سے آنے کے بعد وہ زیادہ دیر اس کے آس پاس رہے۔

ماہیر آفس سے آنے کے بعد امی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرے دن چھٹی تھی۔ سو وہ ماں کے ساتھ نہ جانے کون سے مسئلے سلجھانے میں مصروف تھا۔ ان کی دبی دبی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ وہ اپنے ملگجے سے حلیے کو دیکھ کر پہلے کپڑے تبدیل کرنے کی غرض سے اوپر جانے لگی تھی جب اندر سے آتی آوازوں کو بے پروائی سے سننے کے بعد اپنے کمرے میں آگئی۔ امی اور ماہیر، زمیلہ کے رشتے کے سلسلے میں بات چیت کر رہے تھے۔ وہ اچھا سا سوٹ زیب تن کر کے بال سلجھانے لگی تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ نہا کر واش روم سے نکلی تھی۔ سورج کب کا غروب ہو چکا تھا۔ شدید سردی کے باعث اس کے دانت بجنے لگے تھے۔ امی کو اس کے بے وقت کے نہانے پر بھی غصہ آتا تھا۔ سو وہ بال اچھی طرح خشک کر کے ہی نیچے اتری تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو زمیلہ نے کافی تیکھی نظروں سے اس کے کھلے کھلے شگفتہ سراپے کو دیکھا تھا۔ البتہ راحت بیگم اس کی طرف متوجہ نہیں تھیں وہ کسی گہری سوچ میں گم تھیں جبکہ ماہیر نے بڑے شوق اور بڑی چاہ سے حریم کو سرتاپا دیکھا تھا۔ زمیلہ اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ حریم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ماہیر کے برابر، صوفے پر بیٹھ گئی۔

"حریم!" ماہیر کی آواز میں بہت خوشگواریت تھی۔ بہت کھنک تھی۔

"کل زمیلہ کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔ تم کھانے پر زبردست سا اہتمام کرنا۔"

"یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے۔" حریم نے دل سے کہا۔

"میں کھانا بنا لوں گی۔ بس مینیو امی بتادیں۔"

"پاؤں میں تکلیف تو نہیں۔" وہ حریم کی فرماں برداری پر بے ساختہ کھل اٹھا۔

"ذرا کالونی کا ایک راؤنڈ لے کر آتے ہیں۔"

"اس وقت۔" راحت بیگم نے گھڑی کی طرف

دیکھا۔

"مجھے تم سے کچھ اور باتیں ڈسکس کرنا ہیں۔ کالونی کے چکر پھر کسی اور دن لگالینا۔"

حریم کا دل بری طرح اچاٹ ہوگیا تھا۔ معمولی سی تفریح بھی راحت بیگم کی نظروں میں کھٹکتی تھی۔ وہ کون سا شہر کی سڑکیں ناپنے یا ڈنر کرنے جارہے تھے۔ کھلی فضا میں دو پل حریم کا گزارنا بھی راحت بیگم سے کہاں برداشت ہوتا تھا۔

حریم کچھ دیر مزید بیٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی جبکہ ماہیر امی کی ضروری باتیں سننے کے لیے بیٹھ چکا تھا۔

وہ ننانوے فیصد لڑکیوں کی طرح اپنے سسرالی ماحول سے سمجھوتہ کرچکی تھی۔ اس کے سنگ ماہیر کی بے تحاشا محبت اور توجہ تھی۔ اسے سلگتے، تپتے وقت سے اور بہتی رواں زندگی سے اور کیا چاہیے تھا؟

وہ انہی سوچوں میں گم تھی جب ماہیر نہ جانے کس سے فون پر بات کرتے ہوئے اندر آیا۔

"حانی کا فون ہے۔" موبائل اب حریم کے ہاتھ میں منتقل ہوچکا تھا۔ حریم نے اسے اپنے سیڑھیوں سے گرنے کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ وہ بابا اور حانی کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"کب آؤ گی۔؟" حانی کے پاس صرف ایک ہی محبت سے لبریز شکوہ موجود تھا۔

"تم تو سچ مچ ماہیر بھائی کو پیاری ہوچکی ہو۔ تمہیں بیاہ کر تو حانی پچھتائی۔" حانی کے مصنوعی تاسف نے اسے کھلکھلانے پر مجبور کردیا تھا۔

"بابا کی صحت کیسی ہے؟ بوا سے "جنگ" تو نہیں کرتی ہو۔"

"بابا کی صحت دھوپ، چھاؤں کی طرح ہے البتہ بوا سے "جنگ" کیے بغیر حانی رہ سکتی ہے۔" اس کے لہجے میں واضح شرارت تھی۔

"بری بات حانی۔" حریم نے بے ساختہ ٹوکا۔

"نہیں تنگ مت کیا کرو۔"

"میرا دن کیسے گزرے حریم! جب تک بوا سے کٹی

میٹھی لڑائی نہ ہو، میرے پیٹ میں بلیاں ناچتی رہتی ہیں پھر جب فضول باتوں میں ان سے بحث کرتی ہوں تو یہ بلیاں غڑاپ سے باہر نکلی کر بوا کو اور تنگ کرتی ہیں۔"

حانی ہنس ہنس کر بے حال ہورہی تھی۔ فون بند ہوا تو حریم، ماہیر کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس کا دھیان ان کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔ وہ صوفے پر لیٹا نہ جانے کس سوچ کے زیر اثر تھا۔ ماتھے پر تفکر کی لکیریں تھیں حریم کچھ پریشان سی اس کے قریب چلی آئی۔

"خیریت! آپ کچھ پریشان ہیں۔"

"نہیں تو۔" صاف ظاہر ہورہا تھا وہ محض اس بہلانے کی غرض سے مکر گیا تھا۔

"میں کیوں پریشان ہونے لگا۔ تم پاس ہو تو کم از کم پریشانیاں میرے قریب پھٹک نہیں سکتیں۔" اس کا لہجہ خود بخود خوشگوار ہوتا چلا گیا۔

"بہلا میں مت۔" وہ خفا ہوئی۔

"میں کب سے دیکھ رہی ہوں۔ نہ جانے کس سوچ میں گم ہیں۔"

"اتنا مت دیکھا کرو مجھے۔ نظر بھی لگ سکتی ہے۔"

ماہیر نے اس کی چھوٹی سی ناک دبائی۔

"دیکھیے نہیں۔" حریم جھینپ کر مسکرائی۔

"کام کی بات کرنے نہیں دیتے۔"

"کام کی باتیں تو شروع کرنے والا ہوں۔ زمیلہ کا سلسلہ کسی خوشگوار انجام سے دوچار ہوجائے تو پھر ہم وزٹ ویزے پر دوبئی چلیں گے۔"

"اچھا۔" وہ بہت خوش نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے لگتا تھا کہ دل کبھی بھی پوری خوشی سے ہمکنار نہیں ہوگا۔ وہ اپنے وہم کو اکثر جھٹلاتی رہتی تھی۔

"دعا کرو۔ کل آنے والے مہمان خوشخبری کا سندیسہ دیں۔ ویسے ہماری ان سے کافی پرانی جان پہچان ہے۔ امی کے رشتے دار ہیں، شاید خالہ کی جیٹھانی ہیں۔ اپنے بیٹے کے لیے آئیں گی۔" وہ بہن کے سلسلے میں فکر مند تھا۔ بہت حساس ہورہا تھا۔

"ان شاء اللہ ایسے ہی ہوگا۔ زمیلہ میں کیا کمی

ہے۔" اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ویسے بھی گوری چٹی، قدرے فربہی مائل تیکھے نقوش والی زمیلہ نظرانداز نہیں کی جاسکتی تھی۔

"تم نے میڈیسن لے لیں۔ دودھ پیا ہے۔؟" وہ بہت فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں، ہاں، ابھی لیتی ہوں۔" حریم نے قدرے بوکھلا کر کہا۔

"دوا کھا کر جلدی آنا۔ آج ذرا دیر تک جاگنے کا پروگرام ہے۔" وہ بڑی مخمور نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ حریم مصنوعی خفگی سے ماہیر کو دیکھنے لگی تھی۔ پھر بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆ ☆ ☆

اگرچہ پوری طرح اس کا پاؤں ٹھیک نہیں ہوا تھا تاہم گھر میں آنے والے مہمانوں کی وجہ سے حریم کافی الرٹ ہوچکی تھی۔ ماہیر امی کی بتائی کچھ اور ضروری اشیا لینے بازار چلا گیا تھا۔ زمیلہ کی پھرتیاں بھی دیکھنے والی تھیں۔ حسن نکھارنے کے علاوہ اسے کچھ دبلا ہونے کا شوق بھی چڑھ گیا تھا تاہم اتنے کم وقت میں اسمارٹ ہونا ناممکن سی بات تھی۔

امی کی ڈشنز کے نام گنوا گنوا کر بھی نیت نہیں بھر رہی تھی۔ حریم خاموشی سے سنتی رہی۔ کہا کچھ بھی نہیں کھانا پکانا اس کے لیے کبھی مسئلہ نہیں رہا تھا۔

زمیلہ مختلف سبزیاں کاٹ چکی تھی۔ گوشت بھی اس نے دھو دیا تھا۔ اگرچہ مچھلی دھوتے ہوئے اس نے کافی ناک بھوں چڑھائی تھی تاہم تھوڑی بہت ہیلپ کروانے کے بعد وہ صفائی ستھرائی میں جت گئی تھی۔

زمیلہ کے اس احسان پر حریم کا رواں رواں شکر گزار ہوگیا۔ امی صاحبہ حسب معمول بوکھلا چکی تھیں اور اسے بھی بوکھلا دینا چاہتی تھیں۔

"اتنی ڈشنز نہ جانے بن پائیں گی یا نہیں۔" وہ اندر، باہر آتے جاتے کچھ نہ کچھ ضرور ارشاد فرماتیں۔

"میری آپا بہت سلیقہ مند خاتون ہیں۔ ہر چیز خوش ذائقہ بنانا۔"

وہ امی کو تسلی دینا چاہتی تھی مگر پھر بیچ میں فطری سی جھجک آن کھڑی ہوئی۔

ماہیر بازار سے لوٹا تو کئی قسم کے شاپر تھام رکھے تھے۔ امی نے اس دعوت پر اچھا بھلا خرچہ کردیا تھا۔ حریم کو کچھ کچھ ماہیر کی پریشانی کی وجہ سمجھ آرہی تھی۔ سوئے اتفاق یہ دن بھی مہینے کے آخری تھے ماہیر کی جیب ایک مرتبہ پھر ہلکی ہوچکی تھی۔

دوپہر میں حریم کی مصروفیت دیکھ کر سب نے کینو اور فریش جوس پی کر صبر شکر کرلیا تھا۔ آج تو امی بھی بھوک، بھوک، چلانے سے پرہیز کررہی تھیں۔ شاید بیٹی کے "معاملے" میں سبھی اسی طرح کاری ایکٹ کرتے ہیں۔

چھ بجے تک اگرچہ امی کی پسند کے مد نظر ڈنر تو ریڈی ہوچکا تھا البتہ حریم کا روم روم تھکن سے نڈھال ہوگیا۔ امی اور زمیلہ میز پر برتن سجارہی تھیں۔ جب وہ کچن سے باہر آئی۔

"تم بھی کپڑے پہن کر اپنی حالت درست کر آؤ۔" نہ جانے کس احساس کے تحت امی نے کافی نرمی سے کہا تھا۔

"ابھی ان لوگوں کے آنے میں کافی وقت ہے۔ تم آرام کرلو، اتنی دیر تک۔" حریم نے اپنے پیچھے امی کی آواز سنی۔ وہ واقعی بہت تھک چکی تھی۔ تبھی بستر پر لیٹتے ہی ڈھے گئی۔ اور بے سدھ نیند میں گم ہوگئی۔ اور پھر نجانے کتنی دیر تک سوتی رہی۔

"حریم! حریم جانو، اٹھ بھی چکو۔ نیچے مہمان آچکے ہیں۔" ماہیر کی آواز گویا بہت دور سے سنائی دے رہی تھی۔ اس نے مندی مندی آنکھیں کھول کر کچھ سوچنے کی کوشش کی تھی پھر کمبل ہٹا کر اٹھ بیٹھی۔

"اتنا وقت گزر گیا، میں بے سدھ سوتی رہی ہوں، آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔"

"نیت تو بہت مرتبہ خراب ہوئی تھی تمہیں سوتا دیکھ کر، تاہم اتنی میٹھی نیند میں تھیں تم، بس ترس آگیا تھا۔" وہ خوش دلی سے کہتا ہوا اسے ہاتھ سے پکڑ کر

اٹھانے لگا۔

"دس منٹ میں ریڈی ہو کر نیچے آجاؤ۔"

"میں دس تو کیا پانچ منٹ میں آرہی ہوں۔" وہ کپڑے اٹھا کر واش روم کی طرف بھاگی۔ امی نے اصرار سے زیور پہننے کے لیے کہا تھا۔ شاید مہمان خواتین پر کچھ جتانا یا باور کروانا مقصود تھا۔

وہ ادھر کی چھ چوڑیاں اور گلے میں موجود مالا کے علاوہ ہلکے پھلکے ایئر رنگ پہن کر نیچے آئی تو زمیلہ میز پر کھانا لگا چکی تھی۔ ماہیر، مہمان مرد حضرات کے پاس بیٹھا تھا۔

"یہ حریم ہے، راحت کی بہو، ماہیر کی دلہن۔" ماہیر کی خالہ نے تعارف کی رسم نبھائی۔

وہ تین خواتین تھیں، تینوں نے بہت محبت سے اس کا حال احوال پوچھا تھا۔ حریم بھی ان سے بہت اخلاق سے ملی۔ ایک تو راحت بیگم کی بہن صباحت تھیں۔ دوسری لڑکے کی والدہ اور تیسری ان دونوں کی ساس محترمہ۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک تھی بیٹی!" خالہ کی ساس کچھ زیادہ ہی حریم پر فریفتہ ہو چکی تھیں۔

"اس وقت سو رہی تھیں۔" ظاہر ہے یہ نامناسب سا وقت تھا۔ حریم کو کچھ پشیمانی ہوئی۔ وہ انہیں اپنی دن بھر کی کارگزاری بتانے سے قاصر تھی۔

"جی خالہ بی!" راحت بیگم دفعتاً" نرمی سے بولیں۔

"اس کی صحت کچھ اچھی نہیں۔ اس کے باوجود کچن میں دن بھر مصروف رہی ہے۔ تھکاوٹ کی وجہ سے شاید بے وقت کی نیند آگئی۔" ان کے لہجے میں سچائی تھی۔ محسوس کی جانے والی نرمی تھی۔ حریم کو گویا حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ اپنا سارا "اخلاق" مہمانوں کے سامنے شاید ظاہر کر دینا چاہتی تھیں۔ حریم کو یہ منافقت ایک آنکھ نہیں بھائی۔

میز یہاں سے لے کر وہاں تک لوازمات سے بھری تھی۔ چکن روسٹ، فش پلاؤ، کوفتے انڈے، قیمہ بھرے کریلے، کچے قیمے کے کباب، گوشت کے قتلے، دو طرح کے سلاد، میٹھے میں کیک اور کسٹرڈ، سویوں کا زردہ۔ بہترین کانچ کے نفیس برتنوں میں خوش ذائقہ کھانے بہار دکھا رہے تھے۔ زمیلہ نے حریم کے جہیز کا سب سے قیمتی ڈنر سیٹ بند ڈبے سے نکالا تھا۔ خواتین کے ساتھ آئے دو مرد کچھ فاصلے پر موجود تھے۔ ماہیر انہیں لے کر میز تک آیا۔

"آؤ بیٹی! تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔" صباحت کی ساس خالہ بی نے محبت سے کہا تھا، وہ چپ چاپ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"اتنا تکلف کیوں کیا ہے راحت! ہم کوئی مہمان تھوڑی ہیں۔" صباحت کی جیٹھانی کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھیں۔ بھری بھری میز کو دیکھ کر خفگی سے گویا ہوئیں۔

"تمہاری بچی کو خوامخواہ صبح سے مصروف رکھا ہو گا۔" ان کی نظریں زمیلہ کے سفید گلابی چہرے پر تھیں۔ کیونکہ اس کے سفید ہاتھ میز پر رکھے تھے۔ لڑکے کی ماں کی آنکھوں میں واضح پسندیدگی تھی۔

"یہ سارا اہتمام زمیلہ نے نہیں حریم نے کیا ہے۔ بہت ذائقہ ہے میری بہو کے ہاتھ میں۔" راحت بیگم کے الفاظ نے حریم کو حق دق ہی تو کر دیا تھا۔ اسے پوری امید تھی اس دعوت کا تمام تر کریڈٹ زمیلہ کے حصے میں چلا جائے گا۔ مگر راحت بیگم کے انکشاف نے مہمان خواتین کو بھی حیران کیا۔

"زمیلہ کو اتنی اچھی کوکنگ کرنا کہاں آتی ہے۔" راحت بیگم نے سچ بتانے میں جھجک محسوس نہیں کی تھی، جس طرح اور معاملوں میں وہ قطعاً" دل کی بات کہنے سے نہیں ہچکچاتی تھیں۔ حریم نے دیکھا۔ زمیلہ کے چہرے کے رنگ کچھ پھیکے پڑ گئے تھے۔ جبکہ ماہیر کی آنکھوں میں جلتی قندیلیں دیکھ کر اس کا دل کسی اور سُر کے ساتھ تیز تیز دھڑکنے لگا۔ حریم کی تعریف وہ بھی اپنی ماں کے منہ سے سن کر اس کا چہرہ کس قدر روشن روشن ہو گیا تھا۔ لبوں کی تراش میں وہ ہی دل افروز سحر طاری کر دینے والی مسکان سج گئی۔

"کوئی بات نہیں، آہستہ آہستہ سیکھ جائے گی

زمیلہ!" صباحت کی جیٹھانی نبیل کی ماں فرحت نے نرمی سے کہا۔ زمیلہ کے چہرے کی رونق بحال ہو چکی تھی۔

"یہ کریلے بہت مزے دار ہیں بیٹی۔" خالہ بی نے حلاوت سے کہا۔

"قیمہ بھرے کریلے بنانا سب کے بس کی بات نہیں۔ کریلوں کی کڑواہٹ تو ذرا بھی محسوس نہیں ہوئی۔ بہت اچھا کھانا پکایا ہے تم نے۔" حریم کا دل خوشی سے سرشار ہو گیا تھا۔ آج تو نہ جانے کیوں حیرتوں کے جھٹکے لگ رہے تھے۔ خلاف توقع راحت بیگم بھی کافی مسرور تھیں۔ شاید زمیلہ کی بات بن جانے کی خوشبو وہ مہمانوں کے رویوں سے پا چکی تھیں۔

"چائے زمیلہ بنا لے گی۔ تم صرف برتن سمیٹ کر بچا ہوا کھانا محفوظ کر لو۔" راحت بیگم نے دبی آواز میں حریم سے کہا تھا۔ وہ جی بہتر کہہ کر برتن اٹھانے لگی۔ امی جان مکمل مہربانی کا اظہار کر چکی تھیں۔ شاید بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں وہ کسی بھی قسم کی رکاوٹ یا بدمزگی گوارا نہیں کر سکتی تھیں۔ جو بھی تھا اتنے دنوں میں پہلی خوش گوار رات کا اختتام ہوا تھا۔ حریم کی خوشی کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ امی جان اس کے اہتمام اور قرینے، سلیقے سے چند گھڑیوں کے لیے ہی سہی خوش ضرور ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

زمیلہ کو پسندیدگی کی سند مل چکی تھی۔ راحت بیگم کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ یہ پرپوزل ہر لحاظ سے زمیلہ کے لیے بہترین تھا۔ نبیل سعودی عرب کے شہر جدہ میں کسی باہر کی کمپنی میں بہت اچھی پوسٹ پر فائز تھا۔ اگرچہ نبیل اس قدر خوش شکل نہیں تھا۔ تاہم اونچے قد کا اچھا نوجوان تھا۔ ذہین اور محنتی بھی۔ ماہیر کو ہر لحاظ سے نبیل پسند آیا تھا۔

زمیلہ خوش تھی بلکہ بہت ہی خوش تھی۔ راحت بیگم بیٹی کو خوش دیکھ کر مسرور ہوتی رہتی تھیں۔ ان دنوں حریم پر بے جا تنقید بھی نہیں کی جا رہی تھی۔ جلی کٹی سنانے سے بھی پرہیز کیا جا رہا تھا۔ ان کا موڈ بہت ہی خوش گوار تھا۔ آج کل وہ لڑکے والوں کی طرف جانے کے لیے تیاریاں کر رہی تھیں۔ یہ تیاریاں کچھ خفیہ انداز میں کی جا رہی تھیں۔ حریم سے ہر طرح کی رازداری برتی جا رہی تھی۔ انہوں نے ایک، دو چکر چپکے چپکے بازار کے بھی لگا لیے تھے۔ گھر آکر وہ زمیلہ سے کہہ رہی تھیں۔

"ماہیر سے کہہ دوں گی، مہینے کے شروع میں نفیسہ (پھوپھی) کے پیسے لوٹا دے۔ پنشن کی رقم تو بہت سنبھال سنبھال کر رکھتی ہے۔" یقیناً" نفیسہ پھوپھو سے ادھار پیسے پکڑ کر وہ خریداری کرتی رہی تھیں۔ وہ ماؤں کی اس قسم میں سے تھیں جو بیٹوں پر بیٹیوں کو فوقیت دیتی ہیں۔ اس برتری کے چکر میں بیٹے کے ساتھ کتنی ہی ناانصافی کیوں نہ ہو اس بات کا انہیں قطعاً" احساس نہیں ہوتا وہ ہر صورت بیٹی کی سسرال میں اپنی بڑائی اور شو شاد کھانا چاہتی تھیں۔

حالانکہ وہ صرف رسمی طور پر لڑکا دیکھنے گئے تھے۔ اتنا کچھ لے جانے کی ضرورت ہرگز نہیں تھی۔ حریم نے دیکھا نفیسہ پھوپھو کے چہرے پر بھی کچھ ناپسندیدگی تھی۔ انہیں بھی یہ بے جا اسراف پسند نہیں آیا تھا۔ تاہم ان کی اہمیت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ سو وہ بھی حریم کی طرح خاموش تماشائی بنی رہیں۔ اپنی بھابھی سے کچھ کہنے کی ان کی بھی جرات نہیں تھی۔

مٹھائی، کیک، پھل اور تین بہترین موسم کے مطابق قیمتی سوٹ ایک صباحت خالہ کے لیے، دوسرا نبیل کی ماں اور تیسرا دادی کے لیے۔ اپنی وضع داری دکھانے کے شوق میں ماہیر کی جیب کی طرف انہوں نے دھیان دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ ابھی تک اپنے ماضی جیسے حالات میں جی رہی تھیں۔ جب روپے، پیسے کی ریل پیل تھی اور وہ رشتہ داروں پر دل کھول کر پیسہ لٹاتی تھیں محض اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر، دکھاوے کی خاطر۔

لڑکے والوں نے بھی بہت اہتمام کیا تھا۔ واپسی پر خالہ بی نے حریم کو اور ماہیر کو بہت خوب صورت سوٹ

دیے تھے۔ چونکہ دونوں گھرانے رضامند تھے اسی لیے بات طے کردی گئی تھی۔

"ایک ہی تو میری بیٹی ہے' خوب دھوم دھام سے شادی کروں گی۔" انہوں نے حریم اور ماہیر دونوں پر نہ جانے کیا جتانے کی کوشش کی تھی۔ ماہیر ٹی وی کی طرف متوجہ تھا' البتہ حریم ان کے لہجے کے اتار چڑھاؤ پر غور کرتی رہ گئی۔

اس کے دن کچھ چڑھ گئے تو راحت بیگم چونکی ہوگئیں۔ وہ معمول کے کام نبٹا کر فارغ ہوئی تو انہوں نے اسے چادر لانے کو کہا۔ اس کی بوجھل بوجھل طبیعت سے وہ کچھ اندازے تو قائم کرچکی تھیں۔ تاہم ڈاکٹر سے تصدیق کروانا بھی ضروری تھا۔ حریم کچھ حیران پریشان ان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ امی نے اس کا الٹرا ساؤنڈ کروایا۔ مختلف ٹیسٹ کروائے' رپورٹس پازیٹو تھیں۔ حریم نے دیکھا وہ رات کی نسبت بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ حالانکہ رات کو اچھی خاصی گھر کی فضا مکدر ہوگئی تھی۔ حریم معمول کے مطابق امی کو چائے دینے کے لیے گئی تو اچانک یاد آنے پر انہوں نے حریم سے کہا۔

"وہ سوٹ کہاں رکھا ہے جو خالہ بی نے تمہیں دیا تھا۔"

"یہیں نیچے اسٹور میں رکھ دیا تھا۔" حریم ناسمجھی کے عالم میں بتانے لگی۔

"جاؤ لے کر آؤ۔" انہوں نے تحکم سے کہا۔ حریم، خاموشی سے اسٹور میں چلی گئی۔ پھر اپیچی کیس میں سے سوٹ والا شاپر نکال لائی۔ اس نے تو ابھی تک سوٹ کو شاپر میں سے نکال کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ آتے ہی تو وہ کاموں میں جت گئی تھی۔ اس سوٹ کا تو اسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ زمیلہ نے سوٹ شاپر میں سے نکالا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ سوٹ واقعی بہت خوب صورت اور قیمتی تھا۔ کم از کم تین ساڑھے تین ہزار کا تو ہوگا ہی۔ اس قدر نفیس اور ہلکا سا کپڑا تھا۔ ریشمی اور نرم و ملائم سا' زمیلہ نے کئی مرتبہ ہاتھوں سے چھو کر دیکھا۔

"میری الماری میں رکھ دو۔ لین دین کے کام آجائے گا۔" امی بیٹی کی پسندیدگی جان کر لاپروائی سے کہنے لگی تھیں۔

"تمہارے تو ابھی تک بری کے کپڑے ڈبوں میں بند پڑے ہیں۔"

"جی اچھا۔" حریم نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اسی اثناء میں نفیسہ پھوپھو آگئیں۔ ان کی نظروں نے حریم کے ہاتھ تک باآسانی سفر کیا تھا۔ سوٹ وہ دیکھ چکی تھیں' اسی لیے پرسکون انداز میں بولیں۔

"حریم! یہ سوٹ مجھے دے دو' ساتھ اپنا ناپ بھی دے دینا' میں تمہیں سلائی کردوں گی۔ تمہارے پاس کپڑے سلائی کرنے کا کہاں وقت ہوگا۔"

"جی پھوپھو۔" وہ تذبذب کا شکار خاموش کھڑی رہ گئی۔ اس کی نظریں راحت بیگم کے رنگ بدلتے چہرے پر تھیں۔

"لاؤ نہ بیٹا! جھجک کیسی' میں فارغ تو ہوتی ہوں پورا دن' اسی بہانے مصروف رہوں گی۔" انہوں نے خود ہی آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے سوٹ پکڑ لیا تھا۔ حریم خوف کے مارے زرد پڑگئی۔ راحت بیگم کے چہرے کے تاثرات سخت کٹیلے تھے۔ زمیلہ پاؤں پٹختی باہر نکل گئی تھی۔ پھوپھو جانے سے پہلے زبردستی ناپ اور سوٹ اٹھا کر چلی گئی تھیں جبکہ امی ماہیر کے آنے تک سخت مشتعل رہی تھیں۔ ان کی بڑبڑاہٹیں سیسے کی مانند اس کی سماعتوں میں اترتی رہی تھیں۔

صبح تک ان کا موڈ بگڑا بگڑا رہا۔ حریم کو الٹیاں کرتے دیکھ کر وہ کچھ چونکی تھکی تھیں۔ پھر اسے اپنے ساتھ ڈاکٹر کے کلینک لے گئیں۔ ڈاکٹر نے خوش خبری کی تصدیق کردی تھی۔ راحت بیگم خوشی سے بے حال ہوگئیں۔

گھر آکر انہوں نے زمیلہ کو فوراً بتایا تھا' پھر ماہیر کے دفتر فون کھڑکا دیا۔ ان سے یہ خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ حریم ان کے رویے سے کچھ حیران اور کچھ پریشان بھی تھی۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ

انہوں نے ڈھنگ سے حریم سے بات کی تھی۔

"دیکھو زمیلہ! اب کچھ کام تو تمہیں کرنا پڑے گا۔ ماسی کو اضافی پیسے دے کر کپڑے دھلوا لوں گی' البتہ استری تم کرلینا' اوپر والے کمرے بھی ماسی سے صاف کروالیں گے۔" وہ اپنے سابقہ جوشیلے انداز میں بولیں۔ پہلے اوپر والے کمروں کی صفائی حریم کے ذمے تھی۔ ماسی صرف نیچے کی صفائی ستھرائی کرتی تھی۔ مگر اب راحت بیگم کو محسوس ہو رہا تھا کہ حریم پر کاموں کا بوجھ ان دنوں ہلکا ہونا چاہیے۔ یہ عنایت' یہ مہربانی اس وجود کی وجہ سے تھی جو اس کے وجود میں سانس لے رہا تھا۔ زندگی پا رہا تھا' مہک رہا تھا۔ یہ بخشش' یہ کرم' یہ نوازش اپنے سود کی وجہ سے کر رہی تھیں وہ۔ جو بھی تھا حریم کا دل خوشی سے جھوم جھوم رہا تھا۔ وہ بادلوں کے سنگ محو رقص تھی۔ گھوم رہی تھی' جھوم رہی تھی۔

"حریم صرف کچن کا کرے گی۔ ماہیر کو ماسی کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں آئے گا۔ مجھے تو ہانڈی پکانا ہی بھول چکا ہے اور زمیلہ کو بھی کھانا پکانا کہاں آتا ہے۔ اب خوش ذائقہ کھانوں کی عادت سی ہوگئی ہے۔" انہوں نے کھڑے کھڑے کاموں کی تقسیم کردی تھی۔

"دودھ والا بشیر آئے تو بتانا ایک کلو دودھ اضافی لیا کروں گی۔ پھل وغیرہ بھی پہلے کی نسبت زیادہ مقدار میں لاؤں گی۔ ان دنوں عورت کو خوراک پر دھیان دینا چاہیے۔ بچہ صحت مند اور سرخ و سفید ہوتا ہے۔ ماں پر جائے یا باپ پر پوتا تو میرا بہت ہی خوب صورت ہوگا۔"

"اگر پوتی ہوگی تو پھر۔" ماہیر ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا تھا۔ وہ معمول سے کچھ پہلے آفس سے اٹھ آیا تھا۔ شاید اس نئی خبر نے ماہیر کو بھی سرشار کردیا تھا۔ حریم کی طرح' راحت بیگم کی طرح۔

"تو کیا ہوا' زمیلہ کی جگہ پر ہوگی۔" وہ واقعی خوش تھیں۔ حریم کو یقین آچکا تھا۔ زمیلہ نے بھی مبارکباد دی تھی۔ حریم نے کچھ پل کے لیے سوچا اور حیران رہ گئی۔ یہ دھوپ' چھاؤں' یہ بادل' بارش' یہ آندھی' طوفان' یہ گرج اور چمک سب زندگی کا حصہ تھے۔ کبھی غم' کبھی خوشی' کبھی دکھ' کبھی سکھ۔ کبھی ہنسنا' کبھی رونا... خوشی اور غم کی اس سنگت میں' زنجیر میں زندگی کے ماہ و سال بیت جاتے ہیں۔ پھر دکھ کس بات کا؟ ماہیر کا ردعمل راحت بیگم کی بے ساختہ خوشی جیسا تھا۔ پرجوش اور والہانہ۔

"کب آئے گا؟ کتنے دنوں بعد آئے گا؟" ماہیر خوشی سے بے ربط بولتا چلا گیا۔

"ابھی کہاں۔" حریم جھینپ کر مسکرادی۔

"اتنے ڈھیر سارے دن مہینے پڑے ہیں۔"

"اچھا..." وہ بے ساختہ چونکا اور پھر مسکرا دیا۔

"بہرحال اچھی خبر ہے۔ امی کو دیکھا تھا کس قدر پرجوش ہو رہی تھیں۔ اسے کہتے ہیں اصل سے زیادہ سود پیارا۔"

"ہوں..." وہ چمکتی آنکھوں سے کھلکھلا دی۔

"امی کے رویے نے مجھے بھی حیران کیا ہے۔"

"امی دل کی بری نہیں ہیں۔ بس ان کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے۔ کبھی نرم اور کبھی گرم' اگر کچھ کہہ دیں تو میری ماں سمجھ کر در گزر کردینا۔" ماہیر نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر گویا درخواست کی تھی۔

"میں امی کے رویے سے سمجھوتہ کرچکی ہوں۔ وہ میری بھی ماں ہیں۔" اس نے ماں کی طرح نہیں ماں کہا تھا۔ ماہیر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ان میں ستاروں کی روشنی بھر گئی تھی۔ حریم کو ان آنکھوں کی اس چمک سے والہانہ عشق تھا۔

"اب تم ہم تین ہوجائیں گے' ضروریات بڑھ جائیں گی۔" ماہیر پرسوچ انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس سوچ میں بھی خوشی کا عکس نمایاں تھا۔

"آپ فکر نہ کریں' میں اپنی اور بچے کی ضروریات کو ہمیشہ محدود رکھوں گی۔ جب تک آپ اپنی ذمہ داریوں سے آزاد نہیں ہوجاتے۔" حریم نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر یقین سے کہا تھا۔ اس یقین میں محبتوں کا مان بول رہا تھا۔ پریشانیوں اور ذمہ داریاں شیئر کرنے کا اظہار واضح تھا۔

"تم اتنی اچھی کیوں ہو حریم؟" ماہیر نے اس کے

دونوں ہاتھ لبوں سے لگا لیے۔

"میں دنیا کا خوش قسمت مرد ہوں۔ مجھے یقین کیوں نہیں آتا ایک عقل مند' دانش مند' سمجھ دار اور دانا عورت اللہ نے میرے نصیب میں لکھ دی ہے۔"

"آپ کچھ دیر اپنی خوش قسمتی پر ناز کریں۔ اتنی دیر میں صبح کے لیے آپ کے کپڑے پریس کر لیتی ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے اٹھ گئی تھی۔

"رہنے دو یار!" ماہیر نے اس کا بازو کھینچ کر دوبارہ اپنے پاس بٹھالیا۔

"اس رومانٹک ماحول میں کپڑوں کے ڈھیر کو نہ اٹھا لانا۔"

"مگر....." وہ کچھ کہنا چاہتی تھی جب ماہیر نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

امی کی مہربانیوں کا دائرہ وسیع ہوتے ہی بجٹ ماہیر کے کنٹرول سے باہر ہوتا چلا گیا۔ یوں کہ مہینے کے ابتدائی دنوں میں ہی اس کی جیب خالی ہو چکی تھی۔ وہ پریشان بھی تھا اور کچھ حیران بھی۔ یکم تاریخ کو گوالے نے دروازے پر دستک دے کر حساب کلیئر کروانا چاہا۔ زمیلہ کے سلسلے میں ہونے والی دعوت کے لیے بھی سات کلو اضافی دودھ لیا گیا تھا اور پچھلے مہینے سے معمول کے ڈھائی کلو میں ایک کلو مزید دودھ کا اضافہ ہونے لگا تھا۔ ٹوٹل بل سامنے آیا تو ماہیر کی پیشانی پر تفکر کی سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ پانچ ہزار چھ سو روپے گوالے کو پکڑا کر وہ دفتر جانے لگا تو ماسی بھی جھپاک سے سامنے آگئی۔

"بیٹی کی شادی کرنی ہے' اس مہینے کی تنخواہ دیں اور اگلے پورے سال کی بھی ایڈوانس تنخواہ چاہیے۔"

ماہیر نے کچھ سوچ کر پندرہ سو والٹ میں سے نکال کر ماسی کی طرف بڑھائے تو ماسی نہ جانے کیوں تذبذب کا شکار ہو گئی۔

"میں کپڑے اور اوپر والے کمروں کی صفائی پچھلے مہینے سے کر رہی ہوں۔ دو ہزار اور دیں' اتنے پیسے میں ہر کام کے پورے محلے سے لیتی ہوں۔" ماسی نے اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔

"دو ہزار اور....." ماہیر حیران ہی تو رہ گیا تھا۔ پیچھے سے امی جان کی آواز آئی۔

"حریم کی صحت ٹھیک نہیں۔ ماسی کپڑے دھوتی ہے اور صفائی بھی کرتی ہے۔ کام کا معاوضہ اتنا ہی بنتا ہے۔ سارے محلے کے گھروں سے اتنے پیسے لیتی ہے۔" ماہیر نے دو ہزار اور نکال کر ماسی کو پکڑائے تھے۔ پھر اس کے ایڈوانس رقم کے مطالبے پر غور کیے بغیر باہر نکل گیا۔

ادھر زمیلہ کے سسرال والے ڈیٹ فکس کرنے آنا چاہ رہے تھے۔ راحت بیگم پھر سے بوکھلا چکی تھیں۔ ایک مرتبہ پھر نفیسہ پھوپھو سے ادھار لے کر چپکے سے بازار چلی گئی تھیں۔ مہمان خواتین کے لیے گرم سوٹ اور مردوں کے لیے گرم شالیں لے کر آئی تھیں۔

زمیلہ نے پہلی دعوت کی طرح آج ذرا بھر مدد نہیں کروائی تھی۔ اسے ٹیلی فون رابطے کے ذریعے پتا چلا تھا کہ نبیل بھی ساتھ آرہا ہے سو اسی حساب سے زمیلہ کو اپنی تیاریاں ادھوری لگ رہی تھیں۔ وہ ایک چکر پارلر کا بھی لگا آئی تھی۔ تازہ تازہ مہندی کے حسین نقش و نگار زمیلہ کے ہاتھوں پر کتنے خوب صورت دکھائی دے رہے تھے۔ حریم کی نظر اپنے سادہ' سفید بے داغ ہاتھوں پر ٹھہر سی گئی۔ مہندی کا کوئی رنگ ان ہتھیلیوں پر چمک نہیں رہا تھا۔ اس دفعہ پہلے سے بھی زیادہ اہتمام کیا جانا تھا۔ راحت بیگم کا اکلوتا ہونے والا داماد پہلی مرتبہ آرہا تھا۔ اسی حساب سے مینیو ترتیب دیا جارہا تھا' ماہیر نے ماں سے کہا۔

"امی! میں روسٹ' کباب' رول اور مچھلی کے کوفتے بازار سے لے آتا ہوں۔ حریم رات تک اتنا کچھ کیسے بنائے گی۔" وہ تھکی تھکی اور بے زار دکھائی دے رہی تھی۔ ماہیر اس کی خرابی طبیعت کے پیش نظر کہہ رہا تھا۔ حریم کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہونے لگیں۔ اس کی کمر میں روزانہ ہی درد کی ٹیسیں اٹھتی تھیں' آج کچھ زیادہ تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

"تم چائنیز پلاؤ' بریانی' مٹن' قورمہ اور دو پیازہ' جھینگا سالن سب بازار سے لے آؤ' کیا سوچیں گے وہ لوگ' اتنی ہی ان کی آمد بھاری تھی۔ گھر میں کچھ نہ بن سکا۔ رشتہ طے ہوتے ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔" راحت بیگم نے روکھے پن سے کہا۔

"ماسی کو روک لیتی ہوں' ہاتھ بٹا دے گی۔"

"رہنے دیں امی!" دفعتاً حریم کمزور سے لہجے میں بولی۔

"میں کر لوں گی' کام ہی کتنا ہے۔" ماسی کو روکنا اور اس سے چند گھنٹے مزید کام لینا کون سا آسان تھا۔ ماسی کی فرمائشیں اور پھر اضافی رقم بھی جاتے وقت اسے تھمانا پڑتی' حریم جانتی تھی۔ بجلی کے بل' موبی کی دوائیاں اور دعوتوں کے سلسلے ماہیر کی جیب کا کباڑہ کر چکے تھے۔ کم از کم اپنی ذات سے وہ ماہیر کو سکھ دینا چاہتی تھی۔ آرام پہنچانا چاہتی تھی۔

"حریم کرلے گی' صرف کھانا ہی تو پکانا ہے۔" راحت بیگم بے ساختہ خوش ہو گئیں۔ ان کے لیے یہ دعوت شیراز تیار کرنا' اس کا اہتمام کرنا' معمولی سی بات تھی۔ حریم بغیر کچھ کہے کاموں میں جت گئی۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھن کا شکار تھا۔ اسی پل زمیلہ کی آواز آئی۔

"بھابھی! آپ کا فون....." حریم دو پیازہ بنا رہی تھی۔ مچھلی کا گوشت بغیر ہڈی کے منگوایا تھا۔ گوشت نرم بہت تھا۔ احتیاط سے پکانا تھا۔ دوسرے چولہے پر بریانی کے لیے مٹن بھون رہی تھی۔ ساتھ ساتھ سبزیاں بھی کاٹ رہی تھی۔ فروٹ کاٹ کر لیموں نچوڑ دیا تھا۔ حریم کے پاس فون سننے کی فرصت بھلا کہاں تھی۔ کاموں میں الجھ کر اسے یہ پوچھنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا کہ فون ہے کس کا۔ کچھ دیر بعد ماہیر موبائل لے کر آگیا۔

"حریم! حانی کا فون آرہا ہے' سن لو۔"

"ادھر رکھ دیں' بریانی کو دم دے لوں۔" وہ مصروف سے انداز میں بولی۔ ماہیر واپس چلا گیا تھا۔ موبائل فریج کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ مگر حریم کے پاس موبائل کی بجتی ٹون کی طرف دھیان دینے کا بھی وقت نہیں تھا۔

گھی میں رائی کو فرائی کرنے کے بعد لہسن' پیاز' نمک' مرچ ڈال کر بھوننے کے بعد جھینگے بھی ڈال کر وہ آنچ دھیمی کیے فون کی طرف متوجہ ہوئی تھی جو کہ بج بج کر خاموش ہو چکا تھا۔ اب وہ ناریل اور املی کا پانی سالن میں ڈال کر موبائل ہاتھ میں لیے گھر کا نمبر پریس کر رہی تھی۔ حانی شاید فون ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ پہلی بیل پر اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔

"ہیلو حریم! کہاں ہو؟"

"کیا مطلب کہاں ہوں؟ میں نے کہاں جانا ہے۔ اس وقت کچن میں ہوں۔ زمیلہ کے سلسلے میں مہمان آنے والے ہیں۔" حریم آنچ دھیمی کر کے مصروف انداز میں بولی۔ ایک ہاتھ سے وہ فروٹ دھونے کے لیے ٹوکری میں ڈال رہی تھی۔

"حریم! تم جلدی سے آجاؤ۔" حانی کی بھرائی آواز ایئر پیس میں ابھری۔

"خیریت؟ کیا ہوا ہے؟" وہ ایک دم ٹھٹک کر ساکت ہو گئی۔

"بابا..... حریم! بابا کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔" حانی بے اختیار رونے لگی۔

"بابا کہاں ہیں؟" حریم ایک دم ڈھے سی گئی۔

"بابا کو زرجان بھیا اسپتال لے گئے ہیں۔ میں نے انہیں فون کر کے بلوایا تھا۔ میں گھر میں ہوں' بوا بھی میرے ساتھ ہیں۔ تم بابا کے پاس اسپتال چلی جاؤ۔ آج تو چھٹی ہے نا' ماہیر بھائی بھی گھر میں ہیں۔" حانی بے قراری سے کہنے لگی۔

"حانی! میں..... کیسے؟" وہ گم سم ہو کر پورے کچن میں پھیلے پھیلاوے کو دیکھنے لگی۔ رگ جان پر ایک دم ہی تھکن نے حملہ کر دیا تھا۔ وہ ساکت سی بے دم ہو کر بیٹھ گئی۔

"حریم! جلدی سے آجاؤ نا' میرا دل بہت گھبرا رہا

ہے' بابا بھی تمہیں یاد کررہے تھے۔ نہ جانے ان کی طبیعت کیسی ہوگی۔ زر جان بھیا کا کوئی فون نہیں آیا۔" حانی ابھی تک رو رہی تھی اور اس کے دل پر آنسوؤں کی برسات ہونے لگی تھی۔ وہ بمشکل آنسو پینے کی کوشش میں اور بھی نڈھال ہوگئی۔ فون بند ہوگیا تھا اور حریم خالی الذہنی سے کچن کی چھت کو گھور رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

سیل فون پر نہ جانے کس کی کال آرہی تھی۔ حریم نے گویا غائب دماغی سے فون کی طرف دیکھا اور پھر بے خیالی میں دیکھتی چلی گئی۔ ماہیر شاید فون کی آواز سن کر کچن میں آیا تھا۔

"حریم! کیا ہوا ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔" وہ ایک دم پریشان سا ہو کر گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"تم ٹھیک ہو؟" ماہیر نے اس کا سرد ہاتھ تھاما۔ "تھک گئی ہو؟"

"ماہیر!" اس کے لبوں سے آہ برآمد ہوئی۔

"حانی کا فون تھا' بابا بیمار ہیں' اسپتال میں ہیں۔"

"او...." ماہیر کی پیشانی پر تفکر کی سلوٹیں نمودار ہوگئیں۔

اس کے آنسو قطرہ قطرہ گرنے لگے تھے۔ ماہیر گہری سوچ میں گم ہوگیا۔ مہمان بس آنے ہی والے تھے۔ آج ڈیٹ فکس نہ کرنی ہوتی تب بھی الگ بات تھی۔ وہ مہمانوں سے بغیر ملے ہی چلا جاتا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ نبیل پہلی مرتبہ آرہا تھا۔ ماہیر گھر کا سربراہ تھا۔ واحد مرد تھا۔ اس کی غیر موجودگی کئی سوالیہ نشان چھوڑ سکتی تھی۔ بہن کی سسرال کا معاملہ تھا۔ ادھر سسر بیمار تھے۔ اسپتال میں تھے۔ وہ اک گہری کشمکش کے گرداب میں پھنس چکا تھا۔ اسی پریشانی میں وہ حریم کو تسلی کے دو بول بھی نہیں کہہ سکا۔

"ماہیر! میں صرف ایک نظر بابا کو دیکھ کر آجاؤں گی۔" وہ بھرائی آواز میں کہہ رہی تھی۔ بڑی آس بھری نظروں سے شوہر کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اسے گویا یقین تھا کہ ماہیر کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لے گا۔ اسی پل گیٹ کے قریب گاڑیاں رکنے کی آواز آئی۔ ماہیر ماں کی آواز سن کر باہر چلا گیا تھا۔ حریم کی رہی سہی ہمتیں بھی بکھر گئیں۔ وہ بے جان قدموں سے اٹھی اور دھیرے دھیرے سلاد کاٹنے لگی۔ سارے آنسو' سارے غم دل نے اپنے اندر سمیٹ لیے تھے۔

ماہیر اس کا محبوب ضرور تھا' شوہر ضرور تھا' مگر پہلے وہ راحت بیگم کا بیٹا تھا۔ زمیلہ کا بھائی تھا۔ وہ کیسے حریم کو ان پر فوقیت دے سکتا تھا۔ اسے بیمار باپ کا چہرہ دکھانے کیسے لے کر جاتا' آج تو اس کی بہن کے اعزاز میں تقریب ہونا تھی۔ شگن کی رسم ہونا تھی۔ وہ اتنا اہم کام کیسے چھوڑ سکتا تھا' محض بیوی کے بیمار باپ کے لیے۔ جس کی اپنی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اور وہ آج کسی اور کے سہارے اسپتال کے بستر پر پڑا تھا۔ حریم کو لگا اس کا دل قطرہ قطرہ پگھل جائے گا۔ تب ہی زمیلہ افتاں خیزاں کچن میں چلی آئی۔

"بھابھی! کولڈ ڈرنکس کہاں رکھی ہیں؟" پھر خود ہی پیپسی' اسپرائٹ اور ڈیو کی بوتلیں اٹھا کر لے گئی۔ گلاس پہلے سے میز پر رکھے تھے۔ آج تو زمیلہ کی سج دھج نرالی تھی۔ نبیل کی آنکھوں میں پسندیدگی دیکھ کر وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

مہمان پہلے کی نسبت زیادہ تھے۔ زمیلہ کے تین دیور' ایک نند' ساس' دادی ساس' خالہ' ان کے دو بیٹے' شوہر' چچا اور بہو' ہنسی' قہقہے' مسکراہٹیں' آوازیں' حریم کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔

"بھابھی! آپ کو نبیل کی دادی بلا رہی ہیں۔ نہ جانے کیسا جادو کیا ہے آپ نے ان پر۔ وہ تو لگتا ہے آپ کی عاشق ہو چکی ہیں۔" زمیلہ کی کھنکتی آواز سنائی دی۔ حریم نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ کھیر کے باؤل پر میوے کاٹ کر ڈال رہی تھی۔

"ذرا جلدی آجائیے گا' اور ہاں اپنا حلیہ بھی ذرا بہتر کرلیں۔" واپس جانے سے پہلے وہ تنبیہہ کرنا نہیں بھولی تھی۔ حریم نے کھیر کا باؤل اٹھا کر فریج میں رکھا اور تھکے قدموں سے چلتی اوپر چلی گئی۔ اس کا دل خوب بھرا ہوا تھا اور وہ تنہائی میں رونا چاہتی تھی۔ مگر اس گھر میں چپکے چپکے رونا بھی کہاں آسان ہے۔ اگر کسی کو بھنک پڑ جاتی تو ایک طوفان کھڑا ہو جاتا۔ راحت بیگم نے تو اعلان کردینا تھا کہ ان کی بیٹی کی خوشی اور مسرت کی تقریب میں حریم رو کر نحوست پھیلا رہی ہے۔ وہ واش روم میں گھس کے روتی رہی' یہاں تک کہ دل کا بوجھ قدرے کم ہوگیا۔ وہ دل پر صبر کی بھاری سل لیے کپڑے بدل کر نیچے آگئی تھی۔ اس کا رواں رواں اپنے باپ کی صحت مندی کے لیے دعاگو تھا۔ بیٹیاں اور کر بھی کیا سکتی ہیں اور اس جیسی مجبور اور بے بس بیٹیوں کے پاس صرف آنسو اور دعائیں ہوتی ہیں۔ وہ میز پر کھانا لگا رہی تھی۔ جب صباحت خالہ کی بہو آگئی۔ وہ بڑی خوش اخلاق سی لڑکی تھی۔ انوشہ نام تھا۔ حریم کی اور اس کی شادی میں بس کچھ دنوں کا فرق تھا۔

"بہت تعریف سنی تھی آپ کی۔ ملنے کا شوق تھا سو پورا ہوگیا۔"

"پھر کیسا پایا' سوچوں سے برعکس۔" حریم کو خوشدلی کا مظاہرہ کرنا پڑا تھا۔ حالانکہ دل اور ذہن تو اسپتال کی طرف محو پرواز تھے۔

"ہرگز نہیں' جو سنا تھا وہ ہی دیکھا۔ آپ ماشاءاللہ بہت حسین ہیں۔ اس سادگی میں بھی غضب ڈھا رہی ہیں۔" انوشہ نے سادگی سے اسے بغور دیکھتے ہوئے سراہا۔

"شکریہ۔" وہ پھیکی آواز میں بولی۔

"ویسے مبارک ہو' امی (صباحت) نے مجھے بتایا ہے۔ بہت خوشی کی خبر ہے۔" وہ کس طرف اشارہ کررہی تھی' حریم سمجھ کر ہولے سے اخلاقاً" مسکرا دی۔

"آپ کی اسکن تو بہت فریش اور شائن کررہی ہے۔ اکثر پریگننسی میں عورتوں کے چہرے پر چھائیاں پڑ جاتی ہیں۔"

"ہوں' شاید۔" حریم نے کچھ تو کہنا ہی تھا۔

"آئیے نا حریم!" انوشہ اسے ڈرائنگ روم میں لے جانا چاہتی تھی۔

"ابھی آتی ہوں۔" وہ سلام تو سب کو ایک دفعہ کر ہی چکی تھی۔ میز پر کھانا بھی لگا دیا تھا۔ اب کچھ دیر لیٹنا چاہتی تھی۔ صبح سے ایک پل کے لیے بھی بیٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ سوچوں کے گرداب میکے کے آنگن میں لے گئے تھے۔ جسم میں چبھتی سوئیوں کا احساس کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ اسے شاید اونگھ آگئی تھی۔ ماہیر نے اس کا کندھا ہلایا۔ وہ شاید اسے ڈھونڈتا ہوا ادھر آنکلا تھا۔

"اٹھو' کھانا کھالو۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس کی آواز بھاری اور نم نم تھی۔

"تھوڑا سا کھالو' خالی معدہ رکھنا اس حالت میں بہتر نہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ اس کا بازو حریم کی کمر کے گرد حمائل تھا۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"جوس لا دوں۔"

"نہیں....."

"پھر دودھ پی لو۔" ماہیر کے لہجے میں بلا کی نرمی تھی۔

"کہہ رہی ہوں کچھ نہیں چاہیے۔" وہ خفگی سے بولی۔

"کچھ کھالو' پھر چلتے ہیں۔"

"کہاں؟" وہ غائب دماغی سے پوچھنے لگی۔

"اسپتال۔"

"مگر مہمان..... ابھی تاریخ بھی طے نہیں ہوئی۔" وہ الجھی۔

"وہ سب ہوتا رہے گا۔ یہ لوگ ابھی ادھر ہیں۔ ایک' دو بجے تک رہیں گے۔ اتنی دیر میں ہم واپس بھی آجائیں گے' تم اٹھو تو سہی۔" ماہیر نے زبردستی اسے اٹھایا۔

"امی....." وہ خوف زدہ سی ماہیر کو دیکھ کر رہ گئی۔

"امی سے بات کرلی ہے میں نے۔ تم کچھ کھالو پھر چلتے ہیں۔"

"آپ جائیں، میں آتی ہوں۔" وہ بال سمیٹتے اٹھ گئی تھی۔

ماہیر اسے سیدھا اسپتال لے کر آیا تھا، مگر ریسپشن سے پتا چلا جمال احمد کو نو بجے ڈسچارج کردیا گیا تھا۔

"حانی سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔" ماہیر نے سنجیدگی سے کہا۔ اب وہ حریم کے میکے چلے آئے تھے۔

"بابا!" حریم بھاگتے ہوئے ان سے لپٹ گئی تھی۔ گویا ضبط کی تمام تر طنابیں چھوٹ گئی تھیں۔

"میری حریم آئی ہے۔" بابا نے اس کی پیشانی چومی۔

"ٹھیک تو ہو تم؟"

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میں تو ٹھیک ہوں، ایک دم فریش۔" وہ نقاہت سے مسکرائے۔

"بابا! آپ اپنا خیال نہیں رکھتے نا۔"

"خیال رکھنے والی بیٹی تو چلی گئی ہے۔ یہ حانی تو بس لڑنے مرنے کے لیے تیار رہتی ہے۔" وہ صوفے پر بیٹھی حانی کو دیکھ کر محض ماحول پر چھائی افسردگی کم کرنے کی غرض سے بولے۔

"ماہیر! حانی کے لیے ایک پنجرہ نہ بنوالیں۔" وہ حانی کو چھیڑ رہے تھے۔

"یہ طوطی بہت چونچیں لڑاتی ہے، کبھی بوا کے ساتھ، کبھی میرے ساتھ، پھر جب زیادہ غصہ آتا ہے تو میری حریم کو فون کھڑکا کر اسے ڈسٹرب کردیتی ہے۔" وہ جانتے تھے حانی نے ان کے منع کرنے کے باوجود حریم کو اطلاع دے دی تھی۔

"معمولی سی تکلیف تھی سر میں، حانی نے گھبرا کر زرجان کو بلوالیا۔ اللہ اسے سکھی رکھے، بہت نیک بچہ ہے۔" بابا دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔ کمرے میں ٹی وی آن تھا۔ حانی اور ماہیر کسی بحث میں الجھ گئے تھے۔

"میری بہن پر بھارت کی طرح زبردستی قبضہ جمالیا ہے۔ جیسے بھارتی فوجیوں نے کشمیر پر ناجائز تسلط قائم کر رکھا ہے۔" حانی کو ہمیشہ اونگیاں بونگیاں مارنے کی عادت تھی۔

"ناجائز تسلط۔" ماہیر اس الزام پر تڑپ اٹھا۔ حریم، حانی کو گھورنے لگی تھی جواب قل قل ہنسنے لگی تھی۔ حانی، بابا کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ اب انہیں ٹھیک ٹھاک دیکھ کر بہت ہلکی پھلکی ہوچکی تھی۔ اسی لیے ماہیر سے گلے شکوے کرتی رہی۔

"کھانے کے لیے کچھ لاؤں؟"

"اپنی بہن کے لیے کچھ نہیں، بہت کچھ لاتا۔ اس نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔" حریم کے بولنے سے پہلے ماہیر، حانی سے کہنے لگا۔ حانی اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔ حریم بابا کے پاس بیٹھی رہی۔ بوا ٹرے میں سادہ روٹی اور بھنی ہوئی مرغی کے ساتھ فرنی کا باؤل لائی تھیں۔

"ماہیر بیٹے! تم بھی کھاؤ نا۔" بوا نے محبت بھرا اصرار کیا۔

"میں کھانا کھا کر آرہا ہوں۔" ماہیر انہیں زمیلہ کے سسرالیوں کی آمد کا مقصد بتانے لگا تھا۔ بابا سن کر خفا ہوئے۔

"صبح آجانا تھا بیٹے! ابھی مہمانوں کو چھوڑ کر آنا کس قدر غیر مناسب بات تھی۔" بابا نے حریم کو نرمی سے ٹوکا۔

"تمہیں اس وقت نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"میری رات کیسے گزرتی۔" حریم کی آواز بھرا گئی تھی۔

"رات بھر کیا روتی رہتی۔"

"بیٹی! سسرالی معاملات کو بھی دیکھنا پڑتا ہے۔" بابا کا انداز ناصحانہ تھا۔

"کیا پتا، راحت بھابھی کو تمہارا تقریب چھوڑ کر آنا ناگوار گزرے۔"

"نہیں کب کوئی بات ناگوار نہیں گزرتی۔" وہ محض سوچ کر رہ گئی تھی۔

"حریم! چلیں۔" ماہیر ریموٹ رکھ کر کھڑا ہوگیا۔

"کچھ دیر تو بیٹھو۔" حانی مچل کر بولی۔ ابھی تو اس نے حریم کے ساتھ کوئی ڈھنگ کی بات بھی نہیں کی تھی۔

"جانے دو حانی!" بابا نرمی سے مسکرائے۔

"رات گہری ہو رہی ہے، جانے والوں کو روکتے نہیں، خیر سے جائیں، دھند بھی تو بہت ہے، کچھ سجھائی نہیں دیتا۔" ان کی آواز پر افسردگی غالب آگئی۔ حریم کا دل بھر آیا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر بابا سے لپٹ گئی۔ بابا نے اس کے سر پر نرم سا بوسہ دیا تھا۔ حانی اور بوا سے مل کر وہ باہر نکلتی چلی گئی تھی۔

گھر آئے تو مہمان جاچکے تھے۔ امی کا منہ پھولا ہوا تھا۔ کچن کی لائٹ آف تھی۔ حریم امی کو سلام کرکے سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔ جب ان کی روکھی سی آواز سنائی دی۔

"برتن دھولو، باورچی خانہ مچھلی بازار بنا ہوا ہے۔ صبح تم ہی کو کام میں دقت ہوگی۔" "نہیں شاید حریم کے تقریب چھوڑ کر جانے کا غصہ تھا۔

"زمیلہ تھک گئی تھی۔ اب سو چکی ہے، میں تم دونوں کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ بھائی صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟" ان کا انداز لٹھ مار قسم کا تھا۔

"زمیلہ باتیں بنا بنا کر تھک گئی ہے۔" حریم سوچتی رہ گئی۔ بابا کی طبیعت کا بھی نہ جانے کیسے پوچھ لیا تھا۔

"اب بہتر ہیں۔" وہ تھکی تھکی آواز میں بولی، وہ جو سوچ رہی تھی، جاتے ساتھ ہی بستر پر ڈھے جائے گی، مگر امی کے حکم نامے کو سن کر وہ خاموش ہوگئی تھی اور پھر اسی خاموشی کے ساتھ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ لائٹ آن کی تو اسے جھٹکا لگا۔ کھانے کے جھوٹے برتن بے ترتیبی سے سنک، فرش اور سلیب پر پڑے تھے۔ اسے ایک دم ڈھیروں رونا آگیا۔ نہ جانے کیسے کتنی دیر میں کتنی مشکل سے وہ برتن دھو کر اوپر آئی تھی۔ ماہیر بے خبر سو رہا تھا۔ اس کی ہموار سانسوں کا ہلکا سا شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ شاید وہ تھک چکا تھا۔ حریم بھی بہت تھکی ہوئی تھی۔ اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔

"تمہاری خاطر ماہیر! صرف تمہاری خاطر خود کو صبر کی آخری حد تک آزمالوں گی۔ اپنی ہستی کو تیاگ دوں گی۔ جتنا ایثار مانگیں گے تمہارے گھر والے
اس سے بڑھ کر دوں گی۔
جتنی محبت طلب کریں گے۔ خود کو فنا کرکے لٹاؤں گی۔ صرف تمہاری خاطر ماہیر!
تم شوہر ہو میرے، محبوب ہو، سائبان ہو، تم میرے دل کے جزیرے پر اترنے والے پہلے شخص ہو، تمہاری خاطر ہر زہر خاموشی سے پی لوں گی ماہیر!

✲ ✲ ✲

شادی کی ڈیٹ حریم کی ڈلیوری کے بعد کی رکھی گئی تھی۔ حریم دل ہی دل میں ساس صاحبہ کی مشکور ہوگئی۔ وہ اکلوتی اور بڑی بھابھی تھی۔ اپنی ذمہ داری کو سمجھتی تھی۔ اس حالت میں اس کا کام کرنا، بھاگ دوڑ کرنا بہت مشکل تھا۔ اب وہ کچھ پرسکون ہوگئی تھی۔

اگر وہ ان کے لیے اتنی محترم، قابل قدر اور اہمیت کے لائق ہستی تو نہیں تھی۔ تاہم راحت بیگم جانتی تھیں کہ ان سے تنہا سارا گھر نہیں سنبھلے گا۔

اپنے مفاد، ضرورت، اور گھریلو مجبوریوں کو مدِ نظر رکھ کر ہی انہوں نے شادی کی ڈیٹ فکس کی تھی۔

اس صبح ماہیر کا موڈ بہت خوش گوار تھا۔ وہ عموماً بہت خوش باش ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھی مالی بحران کی وجہ سے اس کی پیشانی شکن آلود ہوتی تھی۔ تاہم یہ پریشانی نئے مہینے کی پہلی تاریخ کو خود بخود ختم ہوجاتی۔

وہ ناشتا کرنے کچن میں آگیا تھا۔ بلیک ٹو پیس میں، بال سنوارے، تازہ تازہ شیو کی نیلاہٹیں لیے وہ بہت اچھا بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ حریم کو نظر بھر کے ماہیر کی طرف دیکھنا گویا بہت مشکل ہوگیا۔ پہلے وہ کبھی اوپر یا پھر لاؤنج میں ناشتا کرتا تھا۔ آج خلاف معمول اسے باورچی خانے میں دیکھ کر حریم حیران رہ گئی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا پہلی دفعہ دیکھا ہے۔"

ماہیر نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرائے۔
"نظر لگانا چاہتی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی۔
"تمہاری نظر نہیں لگ سکتی، جتنا مرضی دیکھ لو۔" ماہیر موڑھا گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔
"ناشتا نہیں کریں گے۔"
"ہاں، تمہارے آس پاس رہنے کو دل کرتا ہے، صبح کے وقت ہاتھ نہیں آتی ہو۔" وہ بوتل کا ڈھکن کھول کر پانی پینے لگا۔
"اتنے ڈھیر سارے تو کام ہوتے ہیں۔" حریم اس کا شکوہ سن کر دھیمے سے مسکرائی۔
"سب سے بڑا کام شوہر کی خدمت کرنا ہے، سیوا کرنا ہے۔" وہ کرڈ کا ڈبا کھولے سونگھنے کے بعد بولا۔
"ڈیٹ ایکسپائر تو نہیں، پھر بھی ذائقہ عجیب سا ہے۔"
"آپ نہ کھائیں، دوسرا کھول لیں۔" حریم نے مشورہ دیا۔
"نہیں، رہنے دو۔" وہ پراٹھے اور آملیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"یہ بتاؤ اپنی ڈائٹ کا خیال تو رکھتی ہو نا۔ چہرہ تو فریش لگتا ہے، کھایا پیا کرو، بچہ خوب تگڑا ہونا چاہیے۔"
"کھاتی ہوں۔" حریم جھینپ کر مسکرا دی۔ صبح صبح ماہیر کی اس توجہ نے اسے پھول کی طرح مہکا دیا تھا۔
"چڑیا جتنی خوراک ہے تمہاری۔"
"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" وہ ہنسی
"ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ ذرا یہ پورا پراٹھا کھا کر تو دکھاؤ۔" ماہیر نے چیلنج کرنے والی نظر سے اسے دیکھا۔
"آدھا کھا لوں گی۔" وہ خوف زدہ سی بولی۔
"تمہیں تو کم از کم دو پراٹھے کھانے چاہئیں، ایک تمہارا اور دوسرا....."
"پلیز ماہیر!" حریم شرم سے لال ٹماٹر ہو گئی۔
"فضول مت بولیے نا۔"
"تو میں نے کیا غلط بات کی ہے۔" ماہیر حیران ہوا۔
"صرف اتنا تو کہا ہے ایک پراٹھا تمہارا، دوسرا میرے بچے کے حصے کا۔" وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑ رہا تھا۔
"آپ کو دفتر سے دیر نہیں ہو رہی۔" حریم نے مصنوعی خفگی دکھائی۔
"نہیں....." وہ مزے سے بولا۔
"تو جائیے اپنا کام کیجیے۔" حریم امی اور زمیلہ کے لیے آملیٹ بناتے ہوئے کہنے لگی۔
"اپنا کام تو کر رہا ہوں۔" اس کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں۔
"بھلا کون سا؟" وہ جان کر انجان بنی۔
"تمہیں دیکھنے کا۔"
"دیکھ تو لیا ہے اور کتنا دیکھیں گے۔" حریم ناز سے مسکرائی۔
"زندگی بھر دیکھنا چاہوں گا، آخری سانس تک، جب مروں تو صرف تمہارا چہرہ آنکھوں کے سامنے ہو۔" ماہیر کی آواز بوجھل ہو گئی تھی۔
"اللہ نہ کرے۔" حریم بے ساختہ بولی۔
"صبح صبح فضول باتیں..... میری جان نکال کر رکھ دیتے ہیں۔" وہ سچ مچ ناراض ہو گئی تھی۔
"اچھا..... خفا تو نہ ہو۔" ماہیر نے اسے بازوؤں سے تھاما۔
"صرف ایک بات تو کی ہے، چلو سوری کر لیتا ہوں۔" وہ اس کے دونوں ہاتھ پکڑے کھڑا تھا۔
"کوئی آجائے گا ماہیر!" حریم خوف زدہ ہوئی۔
"تو آجانے دو۔" اسے گویا کسی کی پروا نہیں تھی۔
"پلیز ماہیر!" وہ روہانسی ہو گئی۔
"چھوڑیے بھی۔" اس نے زبردستی اس کے بازو اپنے شانوں پر سے ہٹائے۔
"امی اگر آجاتیں تو۔" اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔
"تو کیا ہونا تھا۔" ماہیر نے اس کی سرخ بے حد سرخ ناک دبائی۔
"زیادہ سے زیادہ بے حیا، بے شرم کہہ کر پلٹ ہی جانا تھا۔"

"یہ اتنی سی بات ہے۔" وہ خفا ہوئی۔
"آپ کو کہاں کسی بات کی پروا ہوتی ہے؟"
"ہر کوئی تمہاری طرح پہروں کڑھنا شروع کر دے تو پھر ہو چکا گزارا۔" وہ غیر سنجیدہ لہجے میں بڑی سنجیدہ بات کر رہا تھا۔
"سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہماری اپنی ذات ہوتی ہے۔" ماہیر کا انداز ناصحانہ تھا۔
"ہر ایک کی اپنی سوچ اور زاویہ نظر ہوتا ہے۔" وہ اداسی سے بولی۔
"رویے سوچ کا آئینہ ہوتے ہیں۔ شاید میں ان کے دل کے مقام تک ابھی نہیں پہنچ سکی۔ نہ جانے کتنی مدت درکار ہو گی، انہیں اپنا بنانے کے لیے۔" وہ محض سوچتی رہ گئی۔
"چلتا ہوں۔" ماہیر نے اس کے گال پر چٹکی بھری۔
"اللہ حافظ بول دو، زاد راہ کے لیے کافی ہے اللہ نے چاہا تو رات کو ملیں گے۔"
"اللہ حافظ۔" وہ محبت کی چاشنی لفظوں میں سموئے کچن کی چوکھٹ میں آکھڑی ہوئی۔
"یاد آیا۔" ماہیر پلٹ کر دوبارہ اس کے قریب آیا تھا۔
"کچن سے فارغ ہو کر بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولنا، تمہارا قرض رکھا ہے۔"
"کون سا قرض۔" حریم واقعی بھول چکی تھی۔
"تم سوچتی رہو، میں چلتا ہوں۔" وہ سرعت سے پلٹ گیا تھا۔ حریم ابلتی چائے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اس کا ذہن ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ ماہیر کے جاتے ہی راحت بیگم بولے کے جن کی طرح کچن میں داخل ہوئیں۔
"ماہیر کے کان بھر رہی تھیں نا۔" وہ ان کے الزام پر تڑپ اٹھی تھی۔ اب نہ جانے کون سا کیس دائر ہو گیا تھا۔
"کیا مطلب؟"
"زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں۔" ان کا منہ غصے سے پھول گیا۔
"ابھی سے بھول چکا ہے، بتا تو رہی تھیں کام اتنے ڈھیر سارے ہوتے ہیں بھلا مردوں کو گھریلو کاموں کی تفصیل بتانے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ شاید ان کی کچھ باتیں سن چکی تھیں، اور انہوں نے مرضی کے معنی بھی پہنا لیے تھے۔
"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔" حریم بری طرح پریشان ہو گئی۔
"جان چکی ہوں سب کچھ۔" دفعتاً وہ گرج کر بولیں۔
"کچھ دن خوشامد کر کے واہ واہ سمیٹ لی اور اب اپنے اصل رنگ ڈھنگ دکھانا چاہتی ہو، میں سارے لچھن جانتی ہوں۔ پہلے دکھاوے کی خدمتیں کر کے میاں کو قابو کیا ہے، اب اسے مظلوم بن کر دکھا رہی ہو، تاکہ ماں، بہن پر دو حرف پھینک کر الگ ہو جائے۔"
"امی! پلیز۔" وہ ان کے الزام در الزام سن کر بے تحاشا خوف زدہ ہو گئی۔
"ایسا کچھ بھی نہیں، میں نے تو محض ان کی بات کے جواب میں۔" حریم لب بھینچے خاموش ہو گئی تھی۔ آنسوؤں کے گولے نے حلق میں اٹک کر مزید صفائی دینے سے روک دیا۔
"شکل اتنی بھولی، اور کرتوت دیکھو، میرے بچے کو میرے خلاف کر رہی تھی۔ تمہاری بات کا تو یہ ہی مطلب تھا۔ ڈھیروں کام تم ہی کو کرنا پڑتے ہیں۔ ساس، نند پلنگ توڑتی ہیں۔" ان کے دماغ کی سوئی بس ایک جگہ اٹک کر رہ گئی تھی۔ حریم گویا بری طرح پھنس گئی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ امی کی بدگمانی کیسے دور کرے۔
"میں سدا کی بیمار..... بیٹی صرف کچھ دنوں کی مہمان ہے۔ بھلا اس سے کیا کام کرواؤں، کون سی اچھی یادیں لے کر جائے گی وہ بھائی کے گھر سے۔ بھاوج بھی اکلوتی، دوسرا بیٹا نہ ہونے کے برابر ہے۔ جسے اپنا ہوش نہیں، ہم دونوں کہاں جائیں گی، اگر تم نے بھڑکا کر ماہیر کو ہمارے خلاف کر دیا۔" اب انہوں نے رونا شروع کر دیا تھا۔ زمیلہ بھی ماں کی آواز سن کر

دوڑی دوڑی چلی آئی۔
"امی! کیا ہوا ہے؟ کیوں رو رہی ہیں؟"
"اپنے نصیبوں کو رو رہی ہیں؟" بیٹی کو دیکھ کر ان کے آنسوؤں میں اور بھی روانی آگئی۔
"ہمیں نہ آئی منافقت دو رخ چہروں سے اللہ بچائے۔ ماہیر کو درپردہ بتا رہی تھی کہ ہم اس پر ظلم ڈھاتے ہیں کاموں کا بوجھ لاد رکھا ہے۔" وہ پھپکنے لگیں۔
"بھابھی!" زمیلہ کی صدمے میں ڈوبی آواز ابھری۔
"آپ نے ایسا کہا ہم کیا ظالم ہیں آپ کو کولہوں کے بیل کی طرح جوتے رکھتے ہیں۔"
"ماہیر پر اتنا بوجھ پڑ گیا ہے ماسی کو بھی اضافی پیسے دے کر صفائی کرواتی ہوں پھر بھی بہو رانی خوش نہیں۔ چہرے پر مظلومیت طاری کیے رکھتی ہے۔ کبھی مسکراہٹ نہ دیکھی میں نے اس کے چہرے پر۔" ان کے اپنے ہی بے حساب گلے شکوے تھے۔ حریم سر جھکائے مجرموں کی طرح گویا کٹہرے میں کھڑی تھی۔
"تو اور کیا؟" زمیلہ نے فوراً "ہاں" سے اتفاق کیا۔
"میں نے بھی یہ بات کئی مرتبہ سوچی ہے۔ ہمیں ان کی نیت کی کیا خبر۔ بھائی کو ہمارے سے بے زار کرنے کے لیے پوز کرتی ہیں۔ اور میں پاگل دیوانی ہر ایک کے سامنے اپنی اتنی اچھی بھابھی کی تعریفوں کے پل باندھنے لگتی ہوں۔ مجھے کیا پتا یہ محض ڈرامہ ہے۔ میری سہیلیاں نبیل کی بہنیں کزنز خوامخواہ بے وجہ ہی میری قسمت پر رشک کرتی ہیں کہ مجھے کتنی اچھی بھابھی خوش نصیبی سے مل گئی ہے۔ ہنہ کبھی چہروں پر پڑے نقاب ہٹا کر کوئی دیکھے تو سہی۔" زمیلہ نے ہو بہو ماں کے انداز میں کہتے ہوئے امی کا ہاتھ پکڑا۔
"آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں امی! ہمارے نصیب ہی ایسے ہیں ایک بھائی کی دیوانگی کا غم اور دوسرے کی متوقع جدائی کے خدشے۔ بھائی شادیوں کے بعد پرائے کیوں ہو جاتے ہیں۔" زمیلہ کے آنسو بھی ٹپ ٹپ گرنے لگے حریم کی جان تو گویا شکنجے میں پھنس گئی تھی۔
"سب جانتی ہوں میں۔" اب نہ جانے کون سا انکشاف ہونے والا تھا۔
"جب سے تمہاری ڈیٹ فکس ہوئی ہے بس اسی وقت سے حریم کا مزاج برہم ہے ظاہر ہے ہماری کون سا جائیدادیں رکھی ہیں یا بینک بیلنس محفوظ ہیں کرنا تو سب ماہیر نے ہے اسی لیے بہو کے تیور بدل رہے ہیں۔ اکلوتی نند کو کچھ دینا دلانا نہ پڑے۔" امی جلے بھنے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ حریم رونکھی سی انہیں پاؤں پٹخ کر جاتا دیکھتی رہی۔ صرف لمحہ بھر میں اس کا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا۔ وہ بے دم سی موڑھے پر بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

دوپہر تک امی بھول بھال چکی تھیں کہ ان کے تیر جیسے لفظوں نے کیسے حریم کے دل کو چھلنی کیا تھا۔ ہمیشہ ایسے ہی تو ہوتا تھا — اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال لینے کے بعد پھر سے ٹھیک ٹھاک ہو جاتی تھیں۔ برہم مزاج خود بخود بدل جاتا۔ پہلے کی طرح فرمائشیں کر کرکے کھانے پکواتیں۔ ذرا موسم ابر آلود ہوتا تو فوراً" پکوڑوں کی اور پھلکیوں کی فرمائش ہونے لگتی۔ کبھی فرماتیں شکر قندی کا حلوہ بنا دو۔ کبھی بادام کا حلوہ کھانے کا موڈ بن جاتا کبھی بیسن کے حلوے کا ذائقہ چکھنے کو دل کرنے لگتا۔
موسم سرما میں تین مرتبہ سوہن حلوہ بنا کر امی کو دیا تھا۔ سب سے وقت طلب اور وقت مانگنے والا مشکل ترین کام حلوے کی ابتدائی تیاری میں اور بھون بھون کر سرخ کرنے کے چکر میں حریم کے پٹھے کھنچنے لگتے تھے۔ بازوؤں میں گلٹیاں بن جاتیں۔ کمر درد سے اکڑنے لگتی اور امی صاحبہ آرام سے فرما دیتیں۔
"حلوہ بنانا کون سا مشکل ہے۔ چٹکی بجاتے میں بن جاتا ہے کون سا تندور میں روٹیاں لگائی ہیں اپلے تھاپے ہیں۔"

ان کے لیے یہ عام سا معمولی کام تھا۔ صرف باتیں بنانے کی حد تک اگر چائے بنانی بھی پڑ جاتی تو پورا گھر سر پر اٹھا لیتی تھیں۔ خود سے تو اٹھ کر پانی بھی نہیں پیا جاتا تھا۔
"سوچا تھا بہو آئے گی تو ہم بھی دو گھڑی آرام کر لیں گے مگر ہمارے نصیبوں میں آرام کہاں۔" عصر سے کچھ پہلے وہ اور زمیلہ کسی دیرینہ سہیلی کی عیادت کے لیے چلی گئی تھیں۔ حریم نے موقع غنیمت جان کر کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے کی طرف رخ کیا۔ یوں ہی خیال آنے پر اس نے دراز کھولا تو کافی سارے روپے دیکھ کر اسے ماہیر کی صبح والی بات یاد آگئی۔ کافی مہینے پہلے لیا جانے والا قرض چکایا گیا تھا۔ شام کو ماہیر آیا تو حریم نے ناراضی کے اظہار کے طور پر چائے خاموشی سے اس کے سامنے رکھ دی۔
"خیریت!" وہ بھی اس کا پورا مزاج آشنا تھا۔ لمحوں میں اس کی خاموشی میں چھپی ناراضی کو بھانپ گیا۔
"یہ قرض ضرور چکانا تھا۔" اس نے مٹھی بھر پیسے ماہیر کے سامنے کیے۔
"میں اور آپ کوئی دو تو نہیں۔"
"قرض میری جان! قرض ہی ہوتا ہے آپ نے سنا نہیں قرض شہید کو بھی معاف نہیں کیا جائے گا میں نے آپ سے رقم بطور ادھار لی تھی۔" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔
"یہ رکھ لیں۔" حریم نے ٹیبل پر رکھے والٹ میں آرام سے تمام رقم رکھ دی۔
"پلیز حریم!" وہ احتجاجاً" بولا۔
"یہ روپے تمہارے ہیں ان پر میرا کوئی حق نہیں۔"
"غیر سمجھتے ہیں مجھے۔" حریم نے جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا لیا۔
"جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب آپ کا ہے ماہیر! اسی طرح میں بھی آپ کی ہر شے پر پورا استحقاق رکھتی ہوں۔"
"پیاری حریم! فی الحال تو میری ذات کے سوا خود بھی میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں کبھی کبھی دل اس سوچ سے بہت رنجیدہ ہوتا ہے میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں دیا۔ ابھی تک نہیں دے سکا۔"
"دینے کا ارادہ تو ہے نا امید تو ہے اور مجھے آپ کے علاوہ کسی مادی چیز کی قطعاً" آرزو نہیں۔ میرے لیے صرف آپ کی ذات اہمیت رکھتی ہے باقی ہر شے قطعاً" بے کار ہے نری فضول۔" اس نے محبت سے ماہیر کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔
"ایسا سچا موتیوں جیسا قیمتی دل کہاں سے لیا ہے۔ ایسی فقیرانہ سوچ اس قدر قناعت۔" ماہیر کی نظروں کی بے باکانہ ستائش نے اس کے عارضوں پر گلابیاں بکھیر دی تھیں۔
"تم عیوق کی مانند ہو ایک روشن سرخ ستارے جیسی رات کے پہلے پہر جس نے میرے دریچے میں سے جھانک کر میری خوش بختی پر ناز کیا تھا۔ یہ زینت دیا ہوا زیبائش کیا ہوا سجا سجایا تمہارا دل کسم کے پھول جیسا ہے۔ تمہارا دل پھولوں کا مکٹ ہے۔ جس نے میرے دل کی سرزمین پر پھولوں کی ایک ایک پتی کو بارش کی بوند بوند کی طرح برسایا ہے۔ یا سفید درختوں سے چھن چھن کر بکھرنے والی چاندنی ہو بہت درخشاں بہت تاباں بہت منور ہو گل بن پر اترنے والی اوس ہو شبنم ہو حوض میں تیرتا کوئی کنول ہو تم کیا ہو حریم جمال! سراپا حسن سراپا محبت سراپا جمال ستاروں کے جھرمٹ تاروں کے جھنڈ میں نور برساتا اکلوتا چاند تم ماہیر عالم کے دل کے ایوان پر حکومت کرنے والی پہلی فاتح ہو فتح مند ہو جیتی ہوئی ہو۔
یہ دل جو بہت ہی عام سے مزدور آدمی کا ہے جو یونانی دیوتاؤں جیسا حسن نہیں رکھتا۔ مصر کے شہنشاہوں جیسا دولت مند بھی نہیں۔ بہت اعلا اور ارفع خوبیاں رکھنے والا کوئی عالم دین بھی نہیں۔ ہاں اسے پارسائی کا دعوا ہے۔ بے کردار نہیں کسی کے دل سے نہیں کھیلا میں بے کھوٹ کا آدمی ہوں ذرہ بھر ملاوٹ نہیں اس دل میں۔ یہ ہی سچائی پاکیزگی پارسائی اور اچھائی ہمیشہ تم میں دیکھنے کا آرزومند رہوں گا۔ اور

کیا کہوں، شاعر بھی نہیں، کوئی اک آدھ دیوان لکھ ڈالتا نہ مصور ہوں نہ مصنف ہوں، اک عام سا معمولی سا مزدور ہوں۔ عزت، نسب، خاندان، نسل کی بقا اور وقار پر جان دینے والا۔" وہ موتیوں سے سجا محبتوں کا اتنا قیمتی اتنا اعلا تاج تو اسے پہنا چکا تھا بھلا حریم جمال اس سے اور کیا طلب کرتی۔ اس کا انگ انگ رب رحیم کا شکر گزار تھا۔ اسے نارسائیوں کے عذاب سے بچالیا گیا تھا۔ اسے ہجر کے دوزخ میں جلنے نہیں دیا گیا تھا۔

اسے ماہیر عالم عطا کردیا گیا تھا۔ حریم کا قناعت پسند دل کسی اور شے کا متمنی نہیں تھا۔ وہ بادلوں کے رتھ پر سوار بہت دور، بہت دور ستاروں کے ساتھ محو کلام تھی۔ خوشبو کے، عنبر کے سارے ہار اس کے وجود سے لپٹ گئے تھے۔ نس نس میں سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ کیسا سرور تھا، یہ کیسا نشہ یہ کیسی مستی بھری خماری طاری ہونے لگی تھی۔ وہ اس گھر سے، اس ماحول سے چند لمحوں کے لیے بالکل کٹ چکی تھی۔ اس نے خوابوں کے ایک جزیرے پر گویا قدم رکھ لیے تھے۔

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں ماہیر!" حریم کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

"بحیرہ قلزم سے کوئی سیپ لاکر دوں، پھر یقین کروگی۔" وہ ہنس دیا تھا۔ بہت دلکشی کے ساتھ، بہت دلفریبی کے ساتھ۔

"سچی۔۔۔" اس کے پیروں کے نیچے گویا گل لالہ کی، نرم پتیاں شان سے بکھر گئی تھیں۔

"نہ کاتب ہوں، نہ محرر ہوں، نہ بہت خوش نویس ہوں، ورنہ پکی روشنائی سے جلی حروف میں لکھ دیتا، مجھے تم سے محبت ہے۔" وہ اس کے کانوں میں گنگنایا۔

رشتے، تعلق، قربت، قرابت سے، اظہار سے، محبت سے واضح ہوتے ہیں، ابھرتے ہیں، انفرادیت پاتے ہیں، توجہ، احساس اور خیال ہی زندگی کا اصل حسن ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر ہر رنگ پھیکا اور بے جان ہوتا ہے۔ اپنی دلکشی اور حسن کھو دیتا ہے۔ اچھے رویے زندگی میں لگن، جذبے، چاہت، پیار، ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ورنہ رشتوں کو گھن لگ جاتا ہے، گرہن لگ جاتا ہے۔ رشتوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں، درمیان میں دوریاں آجاتی ہیں۔

وہ راحت بیگم سے اپنے احساسات شیئر نہیں کرسکتی تھی۔ ہر شے کی انتہا ہوتی ہے، آخری حد ہوتی ہے، اور وہ برداشت اور صبر کی آخری حد آزما لینا چاہتی تھی۔ اس دن بھی ماہیر ذرا جلدی آگیا تھا۔ خلاف معمول بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"حریم! ذرا بات سننا۔" راحت بیگم کو آتے ہی بیٹے کا حریم حریم کرنا پسند نہیں آیا تھا۔ انہوں نے ماتھے پر بل ڈال لیے تھے۔ تاہم لبوں سے کچھ کہا نہیں تھا۔

"جی۔۔۔" حریم اسٹور روم میں تھی۔ ماہیر بھی ادھر ہی چلا آیا۔

"حریم! مجھے ایک ہفتے کی چھٹی مل گئی ہے۔ تمہاری خالہ کے پاس اسلام آباد چلتے ہیں۔"

"کیا سچ؟" حریم کھل اٹھی۔

"ہوں، بالکل سچ، والٹ بھی بھرا بھرا ہے، کام بن جائے گا۔" ماہیر اسے خوش دیکھ کر خود بھی مسرور ہوگیا۔

"کب جائیں گے؟" وہ کپکپاتی آواز میں پوچھنے لگی۔ مسرت کے دیے اس کی آنکھوں میں روشن ہوگئے تھے۔

"کل شام۔۔۔" ماہیر نے پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔

"کہاں جانا ہے۔" راحت بیگم سے مزید صبر نہیں ہوسکا تھا۔ کچھ کچھ باتوں کی تو انہیں سمجھ آگئی تھی۔ تاہم تفصیل پوچھنا بھی ضروری تھا۔

"امی! پیاری امی، میں کل اسلام آباد جا رہا ہوں۔ دفتر کا کام بھی ہے۔ میں نے سوچا حریم کو بھی اس کی خالہ سے ملوا لاؤں گا۔" وہ اسے آنکھیں دکھا کر کچھ ردوبدل کے بعد بولا۔

"اس حالت میں یہ اسلام آباد جائے گی۔" راحت بیگم کچھ دیر تو بول ہی نہ سکیں۔ بیٹے سے کم ہی بحث مباحثہ کرتی تھیں۔ مگر اعتراض کا نقطہ انہوں نے ڈھونڈ ہی نکالا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔" ماہیر لاپروائی سے بولا۔

"کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو پھر، وقت بھی کم رہ گیا ہے۔ یہ ہی ڈھائی، تین مہینے۔" وہ انگلیوں پر حساب کتاب کرنے لگی تھیں۔

"فارغ ہوگی تو پھر لے جانا۔"

"خوامخواہ کے وہم۔" ماہیر نے توجہ نہیں دی تھی۔

"لوگ بیرون ملک سفر کرتے ہیں، یہ پھر پانچ، چھ گھنٹے کا سفر ہے۔"

"سیر و سیاحت کے بغیر گزارا نہیں ہوسکتا۔" وہ تنک کر بولیں۔

"ہمارے وقتوں میں یہ چونچلے نہیں تھے۔"

"اسی لیے ناران، کاغان، استور کی وادیاں، داریل کی وادیاں اور تانگیر کے مرغزار دیکھ رکھے ہیں۔" ماہیر انہیں چھیڑ رہا تھا۔

"تو تم لوگوں کو بھی ساتھ لے کر گئے تھے، تنہا تھوڑی گئے تھے۔" انہوں نے ناراضی سے کہا۔

"پرسکون صبح کی سرزمین کوریا میں تو تنہا ہی گئے تھے۔" زمیلہ نے ہنس کر جتایا۔

"اس وقت تم تینوں کہاں تھے۔ تمہارے ابو نے کپڑا خریدنا تھا۔ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔" ان دنوں کی یاد نے امی کے چہرے پر مسرت بکھیر دی تھی۔ تاہم ان کا پورا دھیان حالیہ مسئلے کی طرف تھا۔

"ماں سے فضول بولتے شرم نہیں آرہی۔" انہوں نے ماہیر اور زمیلہ دونوں کو بیک وقت لتاڑا۔

"حریم کو رہنے دو، ابھی اس کا جانا مناسب نہیں۔" انہیں اندازہ تھا کہ گھر حریم کے بغیر سنبھالنا کس قدر مشکل ہوگا، سو وہ ہر صورت اسے روکنا چاہتی تھیں۔

"اتنا غیر مناسب بھی نہیں۔" وہ حریم کو نظروں کے حصار میں لے کر غیر سنجیدہ انداز میں بولا۔

"بہرحال میں نے کہہ دیا ہے، حریم تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔"

"فری میں ٹکٹ ملا ہے، اور سیٹ بھی کنفرم کروالی ہے۔ اب روک کر کیا کریں گی۔" وہ ماں کی گود میں سر رکھے آنکھیں موند گیا۔ راحت بیگم کو مزید اصرار کرنا بات گنوا دینے کے مترادف لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح آفس جانے سے پہلے ماہیر اسے میکے چھوڑ گیا تھا۔ حانی اسے دیکھ کر خوشی سے چلا اٹھی۔

"بے وفا! اس دفعہ جلدی چکر لگالیا ہے۔"

"تمہاری یاد ستانے لگی تھی۔" حریم شرارتاً بولی۔

"مہربانی، نوازش۔" حانی نے سر تسلیم خم کیا۔

"بابا کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں ہیں۔ ابھی ابھی دوا کھا کر سوئے ہیں۔" حانی نے بوا کو آواز دے کر اسے بتایا۔ بوا بھی شاید اونگھنے لگی تھیں۔ حریم نے اشارے سے اسے منع کیا تھا کہ ان کی نیند خراب نہ کرے۔ وہ دونوں نرم گرم دھوپ کا مزا لینے کے لیے برآمدے میں رکھی کین کی کرسیوں پر بیٹھ گئی تھیں۔

"میں اور ماہیر اسلام آباد جا رہے ہیں۔"

"صد شکر۔۔۔ تم نے بھی کوئی ڈھنگ کی بات سوچی ہے۔" حانی نے بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہاتھ بلند کیے۔

"جا کب رہے ہو؟"

"آج شام کو۔"

"اور تم یہاں آگئیں"

"جانے سے پہلے سوچا بابا کو اک نظر دیکھ آؤں، ابھی پیکنگ بھی کرنی ہے۔" سنہری دھوپ کی تمازت، حرارت، بہت دنوں بعد محسوس کی تھی۔ اک گونا سکون پورے وجود میں سرایت کر گیا تھا۔

"تم کون سا سال کے لیے جا رہی ہو، ایک بیگ ہی تو تیار کرنا ہے۔" حانی وہیل چیئر دھکیل کر اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگی۔

"گاجر کا حلوہ اور چائے لے کر آتی ہوں۔"

"ضرور۔۔۔" حریم نے خوشدلی سے کہا تھا۔ اس کا مزاج بہت خوش گوار تھا۔ وہ خود کو بہت شگفتہ اور

Recipe Card

رِدا آفتاب کی ڈبل تڑکا دال

اجزاء:

ماش کی دال .... ½ پاؤ
چنے کی دال .... ½ پاؤ
پیاز .... 1 عدد
ٹماٹر .... 6 عدد
نمک .... 1 چائے کا چمچہ
ہلدی .... 1 چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ .... 2 چائے کے چمچے
ادرک لہسن کا پیسٹ .... 2 چائے کے چمچے
تیل .... 4 کھانے کے چمچے
کنور چکن کیوب .... 1 عدد

تڑکا بنانے کے اجزاء:

لہسن کے جوے .... 6 عدد
کڑی پتے .... 6 عدد
ثابت گول مرچ .... 6 عدد
ہری مرچ .... 6 عدد
باریک کٹی ادرک .... 1 ٹکڑا
ہرا دھنیا .... ½ گٹھی
مکھن .... 100 گرام
زیرہ .... 1 چائے کا چمچہ

ترکیب:

پہلے ½ پاؤ ماش کی دال اور ½ پاؤ چنے کی دال کو ایک گھنٹے کے لئے بھگو دیں۔ اب پتیلی میں 4 کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے 1 عدد پیاز براؤن کریں۔ پھر اس میں 6 عدد ٹماٹر، 1 عدد کنور چکن کیوب، 2 چائے کے چمچے پسی لال مرچ، 1 چائے کا چمچہ نمک، 1 چائے کا چمچہ ہلدی اور 2 چائے کے چمچے ادرک لہسن کا پیسٹ شامل کر کے مصالحہ بھون لیں۔

اب اس میں بھیگی ہوئی دالیں اور تین گلاس پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر آدھے گھنٹے پکنے دیں۔ دالیں گلنے کے بعد انہیں اچھی طرح گھوٹیں اور چولہا بند کر دیں۔ اب ایک پین میں 100 گرام مکھن کو گرم کر کے 1 چائے کا چمچہ زیرہ، 6 عدد لہسن کے جوے، 6 عدد کڑی پتے اور 6 عدد ثابت گول مرچ ڈال کر فرائی کریں اور تیار دال پر تڑکا لگائیں۔
آخر میں اوپر سے ½ گٹھی ہرا دھنیا، 6 عدد ہری مرچ اور 1 ٹکڑا باریک کٹی ادرک ڈال کر سرو کریں۔

(Rida Aftab)

رفشانہ محسوس کر رہی تھی۔ سورج کی کرنیں' شعاعیں بھی گویا اس کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔ ہونٹوں پر دبی دبی مسکان لیے وہ کسی اور جہان میں گم تھی۔ کھو رہی تھی' بھٹک رہی تھی' سرسبز شاداب' ہری رنگت والے' نرم و نازک بہت سے پتے درختوں کی شاخوں پر جھول رہے تھے۔ خواب کے اس سفر میں خوشبوئیں تھیں' نغمے تھے۔ گیتوں کی دھنیں سنائی دے رہی تھیں۔ سریلی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ پائل چھنک رہی تھی' چوڑی کھنک رہی تھی۔

دفعتاً" سیاہ گیٹ کے اس پار لمبی سی چمکتی گاڑی کے ٹائر چرچرائے۔ سیاہ پینٹ' سیاہ شرٹ میں ملبوس' قیمتی گلاسز گھنے ریشمی بالوں والے سر پر ٹکائے دھیمے نپے تلے' پروقار قدموں سے چلتا ہوا وہ ناک کی سیدھ میں اندر جا رہا تھا' جب برآمدے میں موجود کین کی کرسی پر بیٹھی نہ جانے کس جہان میں گم حریم کو دیکھ کر ٹھٹک گیا' رک گیا' تھم گیا۔

ہمیشہ کی طرح ٹھاٹھ باٹ' شان و شوکت' آن بان لیے وہ اس کے مقابل کھڑا تھا' نظر چرائے' سر جھکائے کچھ سوچتا ہوا۔ خاموش' اداس' بحیثیت' بااختیار' ہر طرح کے جاہ جلال' حشمت دولت کے باوجود عجیب سی لاتعلقی' بے نیازی اس کی شخصیت میں جھلکتی تھی۔ گویا اس دھن دولت سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس عزت' مرتبے' روپے پیسے نے اسے کچھ بھی نہ دیا تھا۔ اپنی ذات میں گم' اصول پسند' باانصاف' شفیق' حلیم' مہربان' رحم دل' صابر اور قانع تھا' وہ زرجان عباس تھا۔ محترمہ فلک ناز کا تیسرا بیٹا۔ اولاد کی محبت کے معاملے میں بڑی جنونی عورت تھی۔ بچوں کو اپنی سب سے قیمتی پراپرٹی سمجھنے والی۔

"کیسی ہیں حریم!" سنہری دھوپ کا تمام تر حسن زرجان عباس کی آنکھوں میں' چہرے پر بکھر گیا تھا۔ حریم چونکی' جھجکی اور پھر گرم شال کو لپیٹ کر کچھ سمٹ کر بیٹھ گئی۔

"ٹھیک ہوں' آپ؟" وہ بات مکمل نہیں کر سکی تھی۔ جھجک نے اس کے لبوں سے الفاظ چھین لیے تھے۔ آج تک اتنے بے شمار سالوں میں صرف چند پل کے لیے بھی کبھی ان دونوں نے ایک دوسرے کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ بس خاموشی بولتی تھی' باتیں کرتی تھی' کچھ کہتی تھی' کچھ سنتی تھی۔

"میں بھی خیریت سے ہوں' ماہیر ٹھیک ہے؟"

"جی۔" وہ لب کچلنے لگی۔

"بابا اپنے کمرے میں ہوں گے۔"

"جی۔"

"چلتا ہوں' اک نظر دیکھنے کے لیے آیا تھا۔" دھیما' بوجھل' اداس لہجہ۔

"سارے کام چھوڑ کر۔" خاموش لبوں نے حیرانی سے پوچھا۔

"پگلی! کام تم سے' تمہیں سوچنے سے' تم سے وابستہ رشتوں سے زیادہ اہم تو نہیں۔"

"پھر بھی!" خاموشی خفا ہوئی۔

"کیوں چھوڑ کر آئے ہو سارے کام' ضروری فون' فائلیں' میٹنگز' بیرون ملک کے دورے۔"

"صرف تمہارے لیے۔"

"مگر کیوں؟" خاموشی کو غصہ آگیا۔

"مجھ سے کیوں پوچھتی ہو' کیا تم نہیں جانتیں؟"

"نہیں۔" خاموشی کو اور بھی غصہ آیا۔

"تم جاننے کی' سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتیں۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے۔" خاموشی تنک اٹھی۔

"کیا چاہتے ہو تم؟"

"تمہیں خوش و خرم دیکھنا' شاداں فرحاں' پرمسرت دیکھنا۔"

"میں بہت خوش ہوں۔"

"میرے لیے مقام مسرت ہے۔ تم خوش رہو' سکھی رہو' صرف یہی دعا ہے میری۔"

"مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے' دعا بھی نہیں۔"

"تمہاری مرضی' میں تو مجبور ہوں' میرا دل اس معاملے میں بے بس ہے۔"

"کیوں آجاتے ہو میرے راستوں میں۔"

"کب' کہاں؟" وہ تڑپ اٹھا۔

"جھوٹے! اب مکرتے ہو۔" وہ ناراض ہوئی۔

"میں تو ایک طرف کھڑا ہوں' ایک کونے میں' خاموش' الگ' پھر بھی گلہ؟"

"جاؤ' یہاں سے۔"

"جا نہیں سکتا' جس جگہ قیام کرلیا ہے' ٹھہر گیا ہوں' پڑاؤ ڈال لیا ہے۔ بسیرا کرلیا ہے' کیسے؟ کس طرح؟ کسی نگر کسی اور نگر' کسی اور بستی کی اور دیس' کسی اور براعظم کا رخ کروں؟ کسی اور دل کا در کیسے کھٹکھٹاؤں؟"

"اب کیا ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں۔"

"رخ موڑے کیا سوچتے ہو؟"

"تمہاری شبیہ' تمہاری صورت' تمہاری صورت کے علاوہ کیا سوچنا ہے۔"

"یہ باتیں میرے لیے اہمیت نہیں رکھتیں۔"

"تمہارے لیے تو پورا زرجان کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔" وہ آزردگی سے بولا۔

"اے حریم! ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"زہر کا تریاق ہوتا ہے۔"

"مجھے کیا خبر۔" وہ انجان بنی۔

"چلو نہ بتاؤ۔"

"بھیا! زرجان بھیا! آپ کب آئے؟" حانی کی پرمسرت چیخ نے ان دونوں کو اپنی اپنی سوچوں کے بھنور میں سے کھینچ نکالا۔

"ابھی' کچھ دیر پہلے۔" وہ دھیمے سے مسکرایا۔ افسردہ' پھیکی سی' بے جان مسکراہٹ' سنہری دھوپ کی تپش نے زرجان کے گورے رنگ کو دہکا دیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو گڑیا۔"

"فرسٹ کلاس ہوں بھیا۔" حانی خوشی سے چور آواز میں بولی۔

"میرا دل کہہ رہا تھا آج آپ ضرور آئیں گے۔"

"تمہارے دل کی خوشی کا احساس لے آتا ہے یہاں' ورنہ۔"

"ورنہ یہاں رکھا ہی کیا ہے' زرجان عباس کے لیے۔" خاموشی لپکتی ہوئی پھر سے آن موجود ہوئی۔

"شکریہ بھیا۔" حانی چہکی۔

"یہ لیجیے' چائے اور گاجر کے حلوے سے لطف اندوز ہوں۔"

"پھر کبھی سہی۔" وہ جانے کے لیے مڑنے لگا تھا۔

"بھیا!" حانی نے خفگی سے وہیل چیئر کا رخ موڑا۔

"ایسے تو نہیں جانے دوں گی۔"

"ضد نہیں کرو گڑیا۔" وہ نرمی سے اس کا سر تھپتھپا کر بولا۔

"پھر آؤں گا۔"

"نہیں' چائے تو آپ کو پینا پڑے گی۔ ورنہ۔۔۔۔" حانی ضدی لہجے میں گویا ہوئی۔ وہ خاموشی سے بیٹھا رہا تھا۔ سنہری دھوپ نے چپکے سے نگاہ چرالی تھی۔ بادل کے پردے نے سورج کو اوٹ میں کرلیا تھا۔ زرجان عباس نے دیکھا' بدلیاں تیزی سے ادھر ادھر تیرنے لگی تھیں۔ کرنیں ناراض ہو کر اپنے پروں کو سمیٹ چکی تھیں۔ حریم جھلس اٹھ کر تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندرونی حصے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ زرجان چپ چاپ شرمندہ اور خجالت لیے حانی کو دیکھ کر نظر چرا گیا تھا۔ بولتی خاموشی تمسخرانہ ہنسنے لگی تھی۔

"حریم کا دل تو کسی اور کا اسیر ہے زرجان عباس! کیوں زیست جیسی قیمتی متاع لٹا رہے ہو۔"

☼ ☼ ☼

"زرجان! مما کی جان' کہاں ہو۔" فلک ناز ساڑھی کا پلو سنبھالے ایک ہاتھ سے کھٹاکھٹ لائٹس آن کرتی مسلسل بولتے ہوئے بیڈ روم میں داخل ہوئیں۔

"جی مما۔" وہ ماں کی پہلی آواز پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"بے وقت کا سونا۔" فلک ناز حیران ہوئیں۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے زرجان۔" وہ اس کے پیشانی پر بکھرے بال نرمی سے سمیٹ کر پوچھنے لگیں۔

"سر میں درد تھا۔" وہ بھاری آواز میں بولا۔

"مجھے پتا چلا کہ تم میٹنگ ادھوری چھوڑ کر آ گئے ہو۔ میں بھی فائلیں بھاڑ میں جھونک کر آ گئی ہوں۔ پریشانی سے برا حال تھا۔" فلک ناز محبت سے گویا ہوئیں۔

"ممّا! آئی ہیو ناٹ بین فیلنگ ویل فار دی لاسٹ ون منتھ۔" اس کے لہجے میں بے پناہ تھکن تھی۔

"واٹ ہیپنڈ؟" وہ سچ مچ گھبرا گئیں۔

"کسی ڈاکٹر سے کنسلٹ کیا ہے؟"

"ممّا! یوں لگتا ہے مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں، کسی دوا کی ضرورت نہیں۔" اس کا سر فلک ناز کی گود میں تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" انہوں نے خفگی سے کہا۔

"تم بہت کیئرلیس ہوتے جا رہے ہو زرجان۔"

"مماز! میں فزیکلی فٹ ہوں۔" وہ آنکھیں ہولے ہولے دباتا بہت آہستگی سے بولا تھا۔ وہ اسی طرح بولتا تھا بہت نرم اور بہت ہی دھیما۔

"میری روح زخمی ہے ممّا، میرا دل زخمی ہے۔ اسے کسی بھی میڈیکل ٹریٹمنٹ کی ضرورت نہیں۔"

"پلیز زرجان!" انہوں نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"نکل آؤ اس غم کے فیز سے۔"

"ممّا! میں ایک بہت بڑے ٹرائل سے گزرا ہوں۔ گزر رہا ہوں، یہ امتحان کیوں طویل ہے، اس آزمائش کا کوئی خاتمہ نہیں ہے۔" اس کے دل سے درد کی ٹیسیں ابھرنے لگیں۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں۔" فلک ناز نے کہنا شروع کیا۔

"پتا ہے، میں کیا سوچتی ہوں۔" وہ جھک کر زرجان کی سیاہ چمکیلی آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔

"کیا؟" وہ حیران سا ماں کے چہرے کی طرف دیکھے گیا۔

"ایک جادوگر ہو، جو جادو کے زور پر تمہیں سرتاپا بدل دے۔ کیا ایسا ممکن ہے، پہلے جیسا ہنستا، مسکراتا زرجان میرے سامنے آ کھڑا ہو۔"

"میں جو ہوں، جیسا ہوں، اسی طرح رہوں گا۔ میرے دل کی کیفیت بدلنے کا کسی اور کے پاس اختیار نہیں، ممّا، مجھے ڈبل فیسڈ لوگوں سے نفرت ہے، میں مصنوعی مسکراہٹ سجا کر کسی کو دھوکے میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔" اس کی آواز میں ذرا بھر لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔

"تم اپنی زندگی کے ساتھ اچھا نہیں کر رہے زرجان! وہ لڑکی۔" انہوں نے ایک موٹی سی گالی سے حریم کو دل ہی دل میں نوازا۔

"وہ لڑکی اپنا گھر بسا چکی ہے۔ مطمئن ہے، خوش ہے تو پھر۔" وہ لب بھینچے خاموش ہو گئیں۔

"تو میں کب گھر بسانے سے انکار کر رہا ہوں۔"

"رئیلی زرجان! تم شادی کے لیے تیار ہو۔" فلک ناز خوشی سے چیخ اٹھیں۔

"ہاں، شرط صرف اتنی ہے، کوئی اس جیسی ڈھونڈ لیں، وہ بے شک نہ ہو، مگر اس جیسی تو ہو، اس کا پرتو۔" وہ کسی حسین تصور میں لمحہ بھر کے لیے کھو گیا۔

"زرجان!" ان کی ساری خوشی ملیامیٹ ہو کر رہ گئی تھی، پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے بولیں۔

"بنیامین ـــــ پارٹی ارینج کر رہا ہے، یاور کے اعزاز میں، تم چلو گے؟" انہوں نے اپنے کزن کا نام لیا۔

"سوری ممّا!" وہ بے زاری سے بولا۔

"میرا موڈ نہیں، ہنگاموں سے نہ جانے کیوں طبیعت اوب گئی ہے۔"

"تمہارے لیے کیا لاؤں؟" دفعتاً خیال آنے پر وہ نرمی سے پوچھنے لگیں۔ کہ اس سے کچھ بھی کہنا سننا بے کار تھا۔

"واٹ ایور (کچھ بھی)۔"

"کافی، شیک، جوس، کیا منگواؤں؟"

"تو، ان میں سے کچھ بھی نہیں۔" اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"پھر کیا؟" فلک ناز نے تحمل سے پوچھا۔

"سویٹ میٹ میں کچھ بھی ہو۔"

"فرائی ایپلز۔"

"چلیں گے۔" وہ تکیے پر سر رکھے لیٹ گیا۔

"اوکے، اونلی دس منٹ ویٹ کرو، میں بہروز (شیف) سے کہتی ہوں، بلکہ خود بنا کر لاتی ہوں۔ بہت دن ہوئے تمہارے لیے اپنے ہاتھ سے ایک بھی ڈش نہیں بنائی۔"

"تھینکس ممّا!" وہ ماں کی محبت محسوس کرتا ایک دفعہ پھر نیند کی دیوی کو بلانا چاہ رہا تھا۔ جو یادوں کو سمیٹ کر لوری دے کے اسے گہری نیند سلا جاتی۔

☼ ☼ ☼

"ابھی نہیں، میری جان! میری گڑیا، کچھ اور انتظار کرو۔ صرف دو تین سال اور۔" فلک ناز اپنے شاندار آفس میں بیٹھی تھیں۔ وسیع و عریض گلاس ٹیبل پر لیپ ٹاپ، فائلیں، دو تین ٹیلی فون سیٹ، ان کا موبائل فون، پیپر، لگژری گاڑی کی چابیاں اور چائے کا مگ رکھا تھا۔ ٹھنڈی اور بے مزا چائے کا مگ۔ کچھ دیر پہلے انہیں چائے کی بہت طلب محسوس ہو رہی تھی مگر اس وقت انہیں مگ کو لبوں سے لگانا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ سیل فون پر مصروف تھیں۔ وہ لفظوں سے کھیل رہی تھیں۔ انہیں لفظوں سے کھیلنا خوب آتا تھا۔ بزنس کی فیلڈ میں وہ ایک اس "گر" کو بھی اچھی طرح سے سیکھ گئی تھیں۔ بے شمار سال ہو گئے تھے انہیں اپنے باپ اور شوہر کے بزنس کو سنبھالتے ہوئے۔ سپروائز کرتے ہوئے۔ دو کو چار بناتے ہوئے۔ اثاثے جمع کرتے، جائیدادیں بناتے۔ جمع، تفریق کرتے۔ ماہ و سال بس اسی گردش میں گزر گئے تھے۔ عمر رواں کا جوشیلا دریا اب پرسکون ہو رہا تھا۔ سبک خرام لہریں وقت کے بہت آگے چلے جانے سے آگاہ کرتی رہتی تھیں۔ جذباتیت، جوش، اور غصے کی جگہ۔ تحمل، بردباری اور تدبر نے باآسانی لے لی تھی۔ زندگی کے بہتے دریا میں اب روانی آ گئی تھی۔

فلک ناز کے باپ کے بزنس کو تینوں بیٹے اچھی طرح سنبھال چکے تھے۔ زمان، ذیشان اور زرجان نے بہت اچھی طرح اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔

وہ اپنے شوہر کی پراپرٹی اور بزنس کو سپروائز کرتی تھیں۔ یہ کمپنی، دو فیکٹریاں، شوگر مل ان کی اکلوتی بیٹی کے نام قانونی طور پر منتقل ہو چکی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے واپس آنے تک یہاں کا انتظام سنبھالے ہوئے تھیں۔ ان کی بیٹی بزنس ایڈمنسٹریشن میں کئی اعزازی ڈگریاں لے چکی تھی۔

اب ماں کے مجبور کرنے پر لندن کی برانچ کی ایڈمنسٹریٹر تھی۔

"ابھی اسے مزید اسٹیبلش ہونے میں دو تین سال لگ جائیں گے۔ تھوڑا سا اور انتظار کر لو۔" اب وہ الوداعی کلمات کہنے کے بعد فون بند کر چکی تھیں۔ ان کے چہرے پر تفکرات کا جال بنا تھا۔ دل کی عجیب کیفیت تھی۔ بھرا بھرا سا۔ بے حد بے زار۔ نجانے کیوں، کچھ پل کے لیے انہیں ہر شے سے اپنا دل اچاٹ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ اسٹیٹس، جائیداد کسی چیز میں چارم محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی آواز، اس کا لہجہ، اس کے آنسو، ہنسی سب سماعتوں میں اتر رہے تھے۔ بہت کامیاب، ویل منرڈ، ویل آف ایجوکیٹڈ، بہت اسٹرونگ، بے حد مضبوط، بالکل فولاد کی طرح محترمہ فلک ناز خود کو بھربھری ریت کی ایک ڈھیری محسوس کر رہی تھیں۔ ریت کی بکھری بکھری سی ڈھیری۔

☼ ☼ ☼
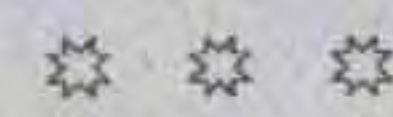
"یہ سب مجھے اپنے باپ کی وراثت سے ملا ہے۔ بھوکے ننگوں پر نہیں لٹاؤں گی اپنی وراثتی دولت کو، جب جی چاہا جوائنٹ اکاؤنٹ سے رقم نکلوالی۔" وہ فون کان سے لگائے گرج برس رہی تھیں۔

"مگر بیگم صاحبہ، سائن تو چیک پر آپ نے کیے تھے۔" ایئرپیس سے مینجر کی منمناتی آواز آئی۔

"ہنہ! مجھے کیا خبر تھی وہ کمینہ بڈھا جناح ہسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ اور میرے احمق بیٹے کو دونوں طرف سے "لوٹا" جا رہا ہے۔" وہ دانت پیس کر

پھنکاریں۔ عموماً" وہ زرجان کے معاملات میں دخل نہیں دیتی تھیں تاہم کچھ دنوں سے وہ نوٹ کر رہی تھیں کہ زرجان کی روٹین پھر سے ڈسٹرب ہے۔ شاید انہوں نے دھیان ہی اب دیا تھا۔ روٹین تو اس کی بہت پہلے سے ڈسٹرب ہو چکی تھی۔ جب دل کی دھڑکنوں نے اودھم مچایا تھا۔ ان کے خیال میں حریم کی شادی کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو چکا تھا مگر ان کے یہ خیالات اس وقت منہ چڑھانے لگے تھے جب انہیں خبر ہوئی کہ تمام دن زرجان اس بڈھے کے ساتھ ہسپتال میں برباد کر کے گھر آیا ہے۔

فون پٹخ کر وہ سیڑھیاں اترتی سیدھی زرجان کے کمرے میں چلی آئیں۔ وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ ماں کو دیکھ کر نرمی سے مسکرایا۔

"مما! آپ کچھ کہنا ہے۔"

"کچھ نہیں، بہت کچھ کہنا ہے مگر کیا کروں، بیٹے ہو، اولاد ہو میری۔ بے بس ہو جاتی ہوں۔" انہوں نے بھرائی آواز میں کہا۔

"جانتے ہو کب کب میں نے خود کو بے بس محسوس کیا ہے۔"

"مما۔" ٹائی کی ناٹ لگاتے زرجان کے ہاتھ لحہ بھر کو رکے۔

"اس بات کو بھول جائیں۔"

"تم حریم کو بھول جاؤ۔" وہ تلخ لہجے میں بولیں۔

"ایسا ممکن نہیں۔" زرجان بے بسی سے قدرے رخ موڑ گیا۔

"تو میں کیسے اپنی انسلٹ بھول جاؤں۔ جو صرف تمہاری وجہ سے ہوئی۔" وہ چیخ پڑیں۔

"میری خاطر یہ زہر پی لیں۔" وہ نظریں چرا گیا۔

"اتنی پرانی بات تو نہیں۔ میں کیسے بھولوں، جب جب تمہیں حریم یاد آئے گی۔ ٹھیک اسی وقت، اسی گھڑی، اسی لمحے مجھے اپنی تمام تر بے عزتی پوری جزئیات سے یاد آنے لگے گی۔ فلم چل جائے گی آنکھوں کے سامنے۔" فلک ناز تڑخ کر بولیں۔

دفعتاً" ان کا لہجہ بدل گیا تھا۔

"کیوں نہ ایک ڈیل طے کر لیں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"کیسی ڈیل۔" زرجان چونکا۔

"تم حریم کو بھول جاؤ۔ یوں سمجھو، اس نام کی کسی لڑکی کو جانتے تک نہیں۔ میں بھی سب بھلا دوں گی۔ اپنی اہانت کو، اس ذلت کو، بے تحاشا ذلت کو۔ رد کیے جانے کے احساس کو۔"

"مما!" وہ ایک دم گھوم کر ان کی طرف پلٹا تھا۔

"آپ چاہتی ہیں۔ زرجان خود کو بھول جائے۔" اس کی آنکھوں میں سرخیاں اترنے لگیں۔

"آپ چاہتی ہیں، زرجان کا دل رک رک کر چلے یا پھر یکدم رک جائے۔ اس میں زندگی باقی نہ رہے۔ سانسوں کی یہ ڈور ٹوٹ جائے۔ زیست سے رابطہ نہ رہے۔ زرجان یکدم مر جائے۔ مٹی ہو جائے۔ اس کا دل دھڑکنا بھول جائے۔"

"زرجان!" فلک ناز دہل اٹھیں۔

"اللہ تم کو میری بھی عمر لگائے۔ کیوں جان نکالنا چاہتے ہو۔" وہ اپنی اولاد کے معاملے میں اسی طرح حساس تھیں۔ اور زرجان سے تو انہیں بڑے دونوں بیٹوں سے زیادہ محبت تھی۔

"مجھ سے ہر موضوع پر بات کیا کریں۔ سوائے اس ایک ٹاپک کے۔ میں آپ کی ہر بات سنوں گا۔ سنتا رہوں گا۔ جب تک آپ کہیں گی۔ مگر مما! مجھے یوں مجبور مت کریں۔ یادوں کا چراغاں نہ چھینیں مجھ سے میں سسک کر مر جاؤں گا۔ یہ یادیں میرے لیے روشنی ہیں۔ اجالا ہیں۔ ان میں امید کے دیے روشن ہیں۔ ان یادوں کے گلستان کے بغیر میرا دل ویران ہو جائے گا۔ اجڑ جائے گا۔ برباد ہو جائے گا۔ اور ان یادوں میں بھلا ہے ہی کیا۔ نہ پریت نہ سنگیت نہ کوئی وعدہ، نہ قسم۔ بس ایک صورت بچی ہے دل کے قصر میں جس کی موجودگی میری آتی جاتی سانسوں کی ضمانت ہے اور بس۔" اب وہ نرمی سے حلاوت سے مسکرا رہا تھا۔ اور اس مسکراہٹ کی روشنی نے زرجان کے چہرے کو تابناکی بخش دی تھی۔ فلک ناز نے نظریں

چرائی تھیں۔ انہیں خوف سا محسوس ہوا تھا۔ زرجان کو ان کی اپنی نظر نہ لگ جائے۔

"اتنی محبت تھی تمہیں اس عام سی لڑکی سے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں پوچھنے لگیں۔

"وہ عام نہیں تھی مما۔" زرجان نرمی سے بولا۔

"وہ بہت خاص ہے۔ بہت منفرد ہے۔ اگر اس جیسی کوئی ایک بھی اور ہوتی تو زرجان جیسا قناعت پسند اسی پر راضی ہو جاتا مگر یہ دل نجانے کیوں صرف اسی کا اسیر ہے۔" بے بسی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔

"اور اگر میں اس کے پیر پکڑ کر ہاتھ باندھے کھڑی ہو جاتی تو شاید۔"

"مما!" زرجان گویا پوری جان سے کانپ گیا۔

"ایسا سوچا بھی کیوں آپ نے؟" وہ سرخ آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"آپ میری ماں ہیں۔ میرے لیے سب سے بلند، اعلا، ارفع۔ میں آپ کو جھکا سکتا ہوں۔ کبھی نہیں ہرگز نہیں۔ اور پھر دل کے رشتے دل کی مرضی سے جوڑے جائیں تو حقیقی خوشی میسر آتی ہے۔ اس کا دل روز سے ہی میری طرف مائل نہیں تھا یہ تو میں ہی بس۔" وہ لب بھینچے گویا خود پر ضبط کے پہرے بٹھا رہا تھا۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں مٹی ڈالو اس حریم پر۔ ایک سے بڑھ ایک لڑکی ہمارے سرکل میں موجود ہے۔" فلک ناز پھر سے پرجوش ہو گئی تھیں۔

"پارٹی کیسی رہی۔؟" اس نے بات کا رخ بدل دیا تھا۔ فلک ناز سمجھ گئی تھیں کہ زرجان مزید اس موضوع پر نہیں بولنا چاہتا۔

"فرسٹ کلاس۔" وہ خوشدلی سے بولیں۔

"بنیامین، بہت جینیرس ہے۔ اس کی طرف سے دی گئی اعزازی پارٹیز مدتوں یاد رہنے والی ہوتی ہیں۔"

"جینیرس۔" زرجان تلخی سے مسکرایا۔

"کون سی سخاوت اور فیاضی دیکھ لی ہے آپ نے انکل میں، کسی یتیم کے سر پر دست شفقت رکھا ہے؟ کسی بیوہ کی کفالت کر رہے ہیں؟ کسی غریب کے گھر کا چولہا ان کے دم سے جلتا ہے؟ دولت کے دکھاوے کو "سخاوت" کا نام تو مت دیں۔"

"ہر کوئی تمہاری طرح سادہ دل نہیں ہوتا۔" انہوں نے "احمق" کہنے سے بمشکل خود کو روکا تھا۔

"اپنی محنت کی کمائی ادھر ادھر لٹاتا کہاں کی عقلمندی ہے۔" انہوں نے بہت اطمینان سے زرجان کو کچھ "جتانے" کی کوشش کی تھی۔

"کب تک جائیں گی آفس۔" وہ بالوں میں برش کر کے پرفیوم اسپرے کر چکا تھا۔ بریف کیس میں فائلیں چیک کر کے وہ ایک دم اٹھا۔

"اتنی جلدی۔ ابھی تو ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔" فلک ناز نے بے ساختہ کلاک کی طرف دیکھا۔

"مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ ڈرائیور سے کہیں گاڑی نکالے۔"

"کہاں جانا ہے۔؟" وہ پوچھنا چاہتی تھیں مگر لب بھینچے خاموش ہو گئیں۔ وہ بغیر ناشتا کیے چلا گیا تھا۔ فلک ناز غصے سے تلملاتے ہوئے خود بھی گاڑی سمیت باہر آ گئیں۔ روڈ پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے ان کی سوچیں بے حد منتشر تھیں۔ ان کا رخ زمان کے گھر کی طرف تھا۔ بڑے دونوں بیٹے شادی کے بعد الگ رہتے تھے۔ ان دونوں کی شادیاں فلک ناز نے اپنے جیسے خاندان میں کی تھیں۔ دونوں بہویں ان کی پسند سے آئی تھیں۔

چوکیدار نے گاڑی دیکھ کر ہی گیٹ کے دونوں پٹ وا کر دیے تھے۔ کچھ سوچ کر وہ گاڑی سے اتر کر باہر نکل آئیں۔ پورچ میں زمان کی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ڈرائیور تندہی سے کار کو چمکانے میں مصروف تھا۔

زمان اور اس کی بیوی اپنا مما کو صبح صبح آتے دیکھ کر چونک گئے۔

"مما! خیریت، مجھے بلوا لیا ہوتا۔" زمان نے فوراً" اٹھ کر ماں کے گرد اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے لاڈ سے کہا۔ اینا نے بھی کچھ اسی قسم کے لاڈ کو جتایا تھا۔ جواباً" انہوں نے بھی مصنوعی محبت کا پرجوش مظاہرہ کیا۔

"تم سے کچھ کام تھا۔" وہ اینا کی طرف دیکھ کر مدھم آواز میں بولیں۔
"کیسا کام؟" زمان نے اینا کو جانے کا اشارہ کیا۔
"زرجان کی ان دنوں کیا مصروفیات ہیں۔"
"میں سمجھا نہیں۔" زمان واقعی حیران ہوا۔
"آفس میں اس کی کیا مصروفیات ہیں۔"
"آفس میں ہے۔" زمان کچھ سوچتا ہوا بولا تھا۔ اگرچہ ان کا بزنس کمبائن تھا مگر تین حصوں پر مشتمل تھا۔ عموماً" وہ تینوں بھائی ایک دوسرے کے معاملات میں انٹرفیئر نہیں کرتے تھے۔ اسے ماں کا سوال الجھا گیا تھا۔
"کام کے علاوہ اور کیا مصروفیت ہوگی۔ ویسے بھی آپ تو جانتی ہیں آفس اور گھر کے علاوہ اس کی تیسری مصروفیت کیا ہے؟ میرا خیال ہے وہ آفس ورک جس محنت، لگن اور ایمانداری سے کرتا ہے اسی طرح "ان" لوگوں سے اس کے مراسم بھی پہلے کی طرح ہیں۔"
"میں یہ سب نہیں چاہتی۔" انہوں نے ترشی سے کہا۔
"آپ کے نہ چاہنے سے کیا فرق پڑے گا۔ وہ "با اختیار" ہے ہم اسے مجبور نہیں کر سکتے۔" زمان کا انداز ناصحانہ تھا۔
"مما! آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ اس کی وجہ سے ٹینس مت ہوا کریں۔"
"وہ خود کو تباہ کرے اور میں خاموشی سے اسے تباہ ہوتا دیکھتی رہوں۔" ان کی ممتا تڑپ اٹھی۔
"زرجان بچہ نہیں۔ اپنے لیے درست فیصلہ کر سکتا ہے۔"
"تم دونوں اس کے بڑے بھائی ہو۔ سمجھاتے کیوں نہیں اسے۔" فلک ناز نے تلخی سے کہا۔
"سب اپنے لیے سوچتے ہیں۔"
"ہمارے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نہ ہی وہ ہماری بات کو کوئی اہمیت دے گا۔" زمان سچ کہہ رہا تھا وہ نخوت سے سر جھٹکتے ہوئے گاڑی میں آکر بیٹھ گئیں۔

پھر سیل فون کو کان سے لگا کر کلائی میں موجود نفیس سی رسٹ واچ پر وقت دیکھنے لگیں۔ ساڑھے دس بج چکے تھے۔ دوسری طرف پہلی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔
"یس میڈم!"
"گلباز! صاحب آفس جانے سے پہلے کہاں گئے تھے۔؟" ان کے لہجے میں واضح ترشی تھی۔
"سوری میڈم! میں آپ کو بتانے کا پابند نہیں۔" گلباز کا انداز محتاط اور مودب تھا۔
"جسٹ شٹ اپ!" وہ یکدم دھاڑیں۔
"آئم سوری میڈم! آپ صاحب سے خود پوچھ لیجیے۔" گلباز خوفزدہ لہجے میں بولا۔ یقیناً" اسے سختی سے تاکید کی گئی تھی۔ اور وہ زرجان کا ڈرائیور تھا۔
"ہوں۔" انہوں نے ہنکارا بھرا۔
"تم نہیں بتاؤ گے۔؟"
"میڈم" وہ منمنایا تھا۔
"صاحب غصہ کریں گے۔"
"اوکے۔" ان کے لہجے میں واضح پھنکار تھی۔ گلباز اس دھمکی کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔
"میڈم! صاحب حریم بی بی کے والد کو چیک اپ کروانے لے کر گئے تھے۔" گلباز نے ڈرتے ڈرتے بتادیا۔
"ہوں۔" فلک ناز نے سیل فون کان سے ہٹالیا تھا۔ اب وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو چکی تھیں۔ ان کی پیشانی ناگوار سلوٹوں سے لحہ بہ لحہ سج رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم نے ہمیشہ میرا دل دکھایا ہے زرجان۔"
"مما!" زرجان اس الزام پر ششدر رہ گیا تھا۔
"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"
"میں نے تمہاری ہر بات مانی تھی۔ تمہاری خواہش کو مد نظر رکھ کر اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ جہاں سے نکلتے ہوئے قسم کھائی تھی میں نے کبھی پلٹ کر نہیں آؤں گی۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گی مگر۔ صرف

تمہاری خوشی کے لیے۔ تمہاری "چاہ" کے لیے۔" وہ بہت بکھری بکھری لگ رہی تھیں۔
"میں وہاں گئی۔ تمہارے لیے اپنی جھولی پھیلائی۔ خود کو اپنے معیار سے نیچے کر لیا۔"
"میں مانتا ہوں مما!" زرجان کی آنکھیں جھک گئیں۔
"یہ سب نصیبوں کے کھیل ہیں۔"
"میں نے تمہاری ہر غلطی کو نظر انداز کیا۔ درگزر سے کام لیتی رہی۔ تم جمشید سے ملتے رہے تھے۔ اس کے مرنے سے پہلے کئی مرتبہ اس سے ملنے کے لیے مجھ سے پوچھے بغیر جاتے رہے۔ تم نے یہ نہ سوچا' اس آدمی نے تمہاری ماں کو ٹھکرایا تھا۔ دھتکار دیا تھا۔ توہین کی تھی میری۔ مجھ پر ایک کم ذات کو فوقیت دی۔ تم میرے دل کی پروا کیے بغیر باپ سے ملتے رہے۔ شکر ہے جان چھوٹ گئی' مر گیا وہ۔ اور مجھے بھی سکون کی گھڑیاں نصیب ہوئیں۔ ورنہ یہ دل جل جل کر سیاہ ہوتا تھا کہ میرا زرجان اس بے غیرت آدمی کے پاس بیٹھے گا۔ اس کے سینے سے لگے گا۔ اسے اپنا قرب بخشے گا۔ اس کے دل کو نزع کی آخری گھڑیوں میں سکون میسر آئے یہ میرے دل کو گوارا نہیں تھا۔ مگر میں نے تمہیں نہیں روکا۔" وہ شاید غصہ یا آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ کچھ پل کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔ زرجان کا سر ابھی تک جھکا ہوا تھا۔
"وہ دو ٹکے کا آدمی' جس سے میرے باپ نے زبردستی شادی کروا دی تھی۔ بہت احسان فراموش نکلا۔ مجھے دھتکارتا رہا۔ اذیت دیتا رہا۔ تم تینوں کو میری دہلیز پر پھینک کر چلا گیا۔ کیا وہ اس قابل تھا کہ اس کے جنازے کو تمہارے جیسے بیٹے کاندھا دیتے۔ اس کی سزا تو یہی تھی کہ آخری وقت میں تڑپ تڑپ کر تنہا ہی مرجاتا مگر تم نے ایسا نہیں ہونے دیا۔" ان کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔
"مما! وہ کوئی غیر نہیں تھے۔ خون کا تعلق تھا ہمارا ان کے ساتھ۔ انہوں نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا تھا وہ ان کا عمل تھا۔ جو میں نے کیا وہ میرا فرض تھا۔ وہ

اپنے حصے کے کچھ دن' کچھ گھڑیاں' کچھ لمحے' کچھ ساعتیں اللہ سے مانگ رہے تھے۔ وہ اپنے کسی ایک بیٹے کا آخری دیدار کرنا چاہتے تھے۔ اسے سینے سے لگانا چاہتے تھے۔ اپنی روح کو تقویت دینا چاہتے تھے۔ میں نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی تھی۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا مما! آپ کو کیا خبر' ان کا آخری بوسہ میرے ماتھے پر' میری پیشانی پر اپنی حرارت چھوڑ گیا تھا۔ ابھی تک اس محبت کی تپش' زماہٹ اور گرمی اپنی پیشانی پر محسوس کرتا ہوں۔ میری محرومیوں کا سفر ان کے بیمار' بوڑھے وجود کو دیکھ کر ختم ہو گیا تھا مما! آپ کو بھلا کیا خبر؟" وہ محض سوچتا رہ گیا۔
"اس کی خدمت کرتے رہے۔ وہ مر گیا تو اسے اپنے ہاتھوں سے غسل دیا۔ اسے خود دفنا کر آئے۔ ابھی تک اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتے ہو گلاب کے پھول ڈال کر آتے ہو۔ کیا وہ اسی قابل تھا؟" وہ نہ جانے کتنے سالوں کا جوار بھاٹا نکال دینا چاہتی تھیں۔
"وہ آپ کے مجرم تھے ہمارے مجرم تھے۔ میں مانتا ہوں مگر وہ ہماری پہچان بھی تو تھے۔"
"کیسی پہچان۔" وہ غصے سے چیخ پڑیں۔
"یہ پہچان' یہ نام' یہ مرتبے ...... میرے باپ کے طفیل تمہیں ملے ہیں۔ اس میں جمشید کا ذرہ بھر دخل نہیں وہ تو خود بے نام و نشان تھا۔ جسے شاید اس کے محلے والے بھی نہ جانتے ہوں گے۔" ان کے لفظ لفظ میں تلخی کی بو رچی تھی۔
"ایک عورت کے عشق میں ہاتھ آئی نعمتوں کو ٹھکراتا رہا تھا بدبخت۔"
"پلیز مما!" زرجان نے دونوں ہاتھ اٹھا کر تلخ لہجے میں کہا۔
"ایک شخص جو اس دنیا میں نہیں رہا۔ کم از کم اس کے بارے میں اتنے ترش الفاظ مت کہیں۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"
"بہت نفرت کرتی رہی ہوں میں اس آدمی سے۔ ابھی تک میرے دل میں اس کے لیے اور اس سے وابستہ رشتوں کے لیے نفرت موجود ہے۔ اگر کوئی

میرے اور میرے بچوں کی محبت کے درمیان آیا تو اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔"

"ممّا! ایک بات آپ تسلیم کیوں نہیں کرلیتیں۔" نجانے کیوں زرجان کے لبوں پر مسکراہٹ نے جھلک دکھائی تھی۔

"کیسی بات۔" وہ کچھ حیران ہوئیں۔

"یہی کہ آپ کی اس محبت کو اور بھی بہت سے لوگوں نے شیئر کرلیا ہے۔ آپ کی "توجہ" اور "سوچ" وہاں تک سفر نہیں کرتی، مقام حیرت۔" زرجان اب کھل کر مسکرا رہا تھا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔"

"زمان بھائی کے بیوی بچے، ذیشان بھائی کی فیملی۔"

"وہ میرے بچوں کے بچے ہیں۔ خدانا خواستہ میں کیوں ان کے بارے میں ایسا سوچوں گی۔ تم بھی نا زرجان۔" وہ کافی خفگی سے کہہ رہی تھیں۔

"اینا اور سومی کو میں اپنی پسند سے لائی ہوں۔"

"میں کلب جارہا ہوں۔ کیا پروگرام ہے آپ کا۔ ڈنر اکٹھے نہ کرلیا جائے۔" وہ جان بوجھ کر بات بدل کر جاگرز کسنے لگا تھا۔

"وائے ناٹ۔" وہ کھل اٹھیں۔

"آٹھ بجے تک ریڈی ہوجایئے گا۔ ڈریسنگ شاندار ہونی چاہیے۔" وہ پلٹ کر شرارت سے بولا۔

"او کے۔" وہ ایک پلان ذہن میں ترتیب دیتے ہوئے مسکرائی تھیں۔ ان کا ذہن تیزی سے مصروف عمل تھا۔

☼ ☼ ☼

پیکنگ تقریباً مکمل ہوچکی تھی۔ اس نے کپڑے بھی چینج کرلیے تھے۔ اب صرف ماہیر کا انتظار کرنا باقی تھا۔ وہ رات کے لیے کھانا بھی بناچکی تھی۔ کپڑے بھی پریس کردیئے تھے۔ کچھ دیر بعد ماہیر آگیا۔ وہ دونوں اکٹھے نیچے آئے تھے۔ راحت بیگم کا موڈ قدرے برہم تھا۔

کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ پھر وہ امی کو اللہ حافظ کہہ کر باہر آگئے تھے۔ ٹیکسی منتظر کھڑی تھی۔ امی نے صرف اتنا کہا۔

"ساتھ خیریت سے واپس آؤ۔"

ماہیر کے ہمراہ حریم کا یہ پہلا طویل سفر تھا۔ اور وہ بہت خوش تھی۔ بہت سرشار تھی۔ امی کے رویے پر جلنے کڑھنے کی بجائے ماہیر کی ہمراہی کو محسوس کررہی تھی۔ خالہ کو جانی نے اطلاع کردی تھی۔ وہ ان کی منتظر تھیں۔ ان کے بچے بھی بہت پرجوش تھے۔ ان کا جوش، خوشی چہروں سے رویوں سے صاف دکھائی دے رہی تھی۔

اس قدر والہانہ اور پرجوش استقبال کی تو ماہیر کو بھی شاید امید نہیں تھی۔ خالہ کا گھر آبی ٹین ٹو میں تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں انہیں لینے آئی تھیں۔ بڑا بیٹا محسن ساتھ تھا۔ گھر میں مہک اور محب ان کے منتظر تھے۔ خالو کا پچھلے سال انتقال ہوگیا تھا۔ خالہ ایک مقامی کالج میں لیکچرار تھیں۔ ڈبل اسٹوری چھوٹا سا خوب صورت مکان خالہ کی محنتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

محب اور مہک نے سرخ گلابوں کا گلدستہ انہیں تھمایا تھا۔ اس محبت اور اپنائیت نے حریم کی آنکھوں کو بھگوڈالا۔

"یہ میری کاوشوں کا نتیجہ ہے۔" محب اس کے کان میں گھسا جارہا تھا۔

"جھوٹا، بے ایمان۔ سارا کریڈٹ، ساری تعریف خود بٹورنے لگا ہے۔" مہک اسے سرگوشی کرتے دیکھ کر چیخی۔

"میں نے جو پھول توڑتے ہوئے اتنے کانٹے چبھوئے ہیں۔ یہ دیکھیے میرے ہاتھ۔" اس نے دونوں ہاتھ حریم کے سامنے پھیلادیئے۔

"کیوں اتنا تردد کیا ہے۔ اگر زیادہ زخم ہوجاتے تو پھر۔"

"آپی! زخم اس خوشی سے بڑے نہیں ہیں۔ جو آپ کو دیکھ کر ہمارے دل محسوس کررہے ہیں۔" مہک نے اس سے لپٹ کر کہا۔

"تو اور کیا۔ ہم نے آپ کا اتنا انتظار کیا تھا۔ اتنا اتنا۔" محب نے دونوں بازو پھیلا کر بتایا۔ محسن، محب اور مہک بالترتیب یونی ورسٹی، کالج اور اسکول میں زیر تعلیم تھے۔

"امی نے ہمیں بتایا تھا آپ سب سے پہلے ہمارے گھر آئیں گی۔ اس وقت سے آپ کا انتظار کررہے ہیں۔" محب نے خوشی سے چہکتے ہوئے بتایا۔

"باتیں ہوتی رہیں گی۔ یہ بچے تو تمہارا دماغ چاٹ لیں گے حریم! پہلے فریش ہوکر کھانا کھالو۔" خالہ کفگیر پکڑے کچن سے باہر آئیں۔ مہک نے لپک جھپک برتن میز پر لگادیئے تھے۔

"آپ نہالیں۔" حریم، ماہیر کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ جو کہ محسن سے باتوں میں مصروف تھا۔

"کپڑے نکال دو۔" وہ اٹھ کر مہک کے پیچھے چلا گیا تھا۔ حریم نے بھی ان کی پیروی کی۔ محب اور محسن کچن سے ڈشز میں مختلف چیزیں نکال نکال کر میز پر سجا رہے تھے۔

بچوں کی نوک جھونک کے درمیان بہت خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا تھا۔ اتنے عرصے بعد گھریلو پرسکون ماحول میسر آیا تھا۔ اور یہی خوشگواریت ماہیر کے پورے وجود میں سرائیت کرگئی تھی۔ رات کو نرم گرم بستر پر لیٹتے ہی حریم کو نیند کے میٹھے جھونکوں نے آن دبوچا۔

"حریم! حریم۔" ماہیر اسے بہت قریب سے پکار رہا تھا۔

"جی۔" وہ غنودگی میں بولی تھی۔ محض ہونٹ "ہوں" کے انداز میں پھڑپھڑا کر رہ گئے تھے۔

"حریم جان! ذرا آنکھیں کھول کر بات تو سنو۔" وہ اس کے گال نرمی سے تھپتھپاتا بول رہا تھا۔

"سن رہی ہوں۔" اس نے آنکھیں موندے موندے جواب دیا۔

"اٹھو نا یار!" ماہیر نے زبردستی اسے اٹھا کر بٹھادیا تھا۔

"فرمایئے۔" وہ بال سمیٹتے ہوئے جماہی روکنے لگی۔

"یہاں سونے کے لیے آئی ہو۔"

"تو۔" حریم حیران ہوئی۔

"سونا ہی تھا تو گھر میں رہ لیتیں۔"

"گھر میں نیند کہاں پوری ہوتی ہے۔" وہ تکیے پر سر رکھے لیٹ گئی۔

"یہاں جی بھر کر نیند پوری کرلو۔ اسی مقصد کے لیے تمہیں لایا ہوں۔" ماہیر نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"ذرا شرم کا دامن بھی تھام لیا کریں۔"

"یہ شعبہ تو تم سنبھالے ہوئے ہو۔ ابھی تک لال ٹماٹر ہوجاتی ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"کتنا سکون ہے یہاں۔"

"سکون "دل" میں ہوتا ہے۔ خوشی بھی دل محسوس کرتا ہے۔ اندر کا موسم خوشگوار ہو تو باہر کے سارے موسم دلفریب لگتے ہیں۔" حریم نے اس کے

بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا دل اس وقت کیا محسوس کر رہا ہے۔" وہ دونوں ہاتھ اوپر کیے اس کے چہرے کو تھامے نرمی سے شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

"میرا دل۔" حریم نے ہنسی دبائی۔

"میرا دل میرے پاس کہاں ہے۔"

"تو پھر کہاں ہے۔؟"

"آپ کے پاس۔" حریم نے اس کی پیشانی پر ٹھوڑی ٹکا کر کہا۔

"ہوں۔" ماہیر نے اپنے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا۔

"یہاں ہے تو محفوظ ہے۔ اسے یہیں رہنے دو۔ ہمیشہ کے لیے مطمئن اور پر سکون رہے گا۔"

"اور ساتھ آپ کے دل کو بھی پر سکون رکھے گا۔ تنہا بے چارا گھبرا رہا تھا نا۔ اسی لیے میں نے اپنا دل بھی آپ کو دے دیا ہے۔"

"تھینکس۔" وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے دباتے ہوئے بولا۔

"تھینکس اگین۔"

"کس بات کا۔" حریم حیران ہوئی۔

"ہمارے بے چارے مسکین غریب اور تنہا سے دل کے احساس کرنے کا۔" اس کی آنکھوں میں شرارت مچل رہی تھی۔

"آپ کے تھینکس کا تھینکس۔" حریم کے روم روم سے سرشاری پھوٹنے لگی تھی اوس میں بھیگی رات بھی چپکے سے خاموشی سے مسکرا دی۔

اگلی صبح اور بھی چمکیلی اور روشن تھی۔ کم از کم حریم کو اس صبح کے حسن نے مدہوش کر دیا تھا۔

"ماہیر! دیکھیں نا، کتنی حسین صبح منتظر ہے۔" وہ پردے گلاس ونڈو سے ہٹا کر ماہیر تک آئی تھی۔

"کس کی منتظر ہے۔" وہ بھاری آواز میں بولا۔

"آپ کے ایک نظر دیکھ لینے کی۔" وہ اس کا کندھا ہلاتے ہوئے جگانے کی کوشش کرنے لگی۔

"میری صبح میرے پاس ہے، مجھے ان آتی جاتی صبحوں سے کیا لینا دینا۔" وہ تکیے میں منہ گھسیڑنے لگا۔

"ماہیر! اٹھیے نا، بچے بھی انتظار کر رہے ہوں گے۔ محب تو دو مرتبہ جگانے کی کوشش کر کے ناکام لوٹ گیا ہے۔" اس نے کمبل کھینچ کرتے کرنا شروع کر دیا تھا۔

"سونے دو یار!" ماہیر نے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے کمبل کھینچ لیا تھا۔

"بلکہ تم بھی کمبل کے ساتھ ہی آجاؤ۔" اس کا دوسرا ہاتھ ماہیر نے تھام کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

"آٹھ بج چکے ہیں۔" حریم کی نظریں کلاک پر تھیں۔

"روزانہ ہی بجتے ہیں۔"

"سوتے رہیں۔" اسے غصہ آگیا۔

"نا۔۔۔ نا، بھئی! ناراض نہیں ہونا۔" وہ کمبل ہٹا کر اٹھ بیٹھا۔

"تمہاری ناراضی کی گٹھری بھلا میں اٹھا سکتا ہوں۔"

"میرے سر پر رکھ دیجیے گا ماہیر بھائی! میں ناراضی کی گٹھری بخوشی اٹھا لوں گا۔ آپ ذرا ناشتے کی میز تک آجائیے۔" محسن ناک کر کے اندر منہ گھسا کے بولا تھا۔

"دھت تیرے کی۔" ماہیر کو اٹھنا ہی پڑا۔

"آتا ہوں یار۔"

"آپ کی بیگم کو لے کر جاؤں گا تب ہی آپ باہر تشریف لائیں گے، چلیے حریم آپی۔" محسن نے کمبل سمیٹتی حریم کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"آپ کے اعزاز میں کالج سے چھٹی ماری ہے، آج کا پورا دن آپ کے نام۔"

"اس احسان عظیم کا گٹھرا بھی میں اور حریم اٹھا نہیں پائیں گے۔" ماہیر شرارت بھرے انداز میں بولا۔

"اس گٹھرے کو بھی میرے ناتواں کندھے اٹھائیں گے۔ آپ دس منٹ میں آجائیے۔ پھر سڑکوں کو

روندتے نکل جائیں گے۔"

"میں ابھی آیا، تم حریم کو یہیں چھوڑ جاؤ۔" وہ واش روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا تھا۔

"حریم آپی یہیں آپ کی منتظر رہیں گی۔ آپ دو منٹ میں تشریف لے آئیے گا۔" محسن مزے سے کہنے لگا۔

"چلیے آپی!" ماہیر کے جاتے ہی محسن شرارتی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم جاؤ، میں اور ماہیر آتے ہیں۔"

"او۔۔۔ ہو، لگتا ہے معاملہ دونوں طرف ایک ہی جیسا ہے، برابر، برابر۔" وہ سر دھننے لگا۔

"محبت کرنے والوں کی میں بہت قدر کرتا ہوں۔"

"خود جو ناکام عاشق ہو اس لیے۔" محب بھی بدلہ چکانے فوراً" آیا تھا۔

"مہمانوں کو اپنی اوقات مت دکھانا۔" مہک جلبلاتے ہوئے بولی تھی۔ اور پھر ان سب کے قہقہوں سے فضا مہک اٹھی۔

☼ ☼ ☼

صرف چھ دنوں میں وہ اسلام آباد کا چپا چپا گھوم چکے تھے۔ آج ان کا پروگرام مہک کی پھوپھو کے گھر جانے کا تھا۔

انہوں نے صبح صبح ہی رخت سفر باندھ لیا تھا۔ صرف تین گھنٹے بعد وہ ایک خوب صورت پہاڑی گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ حسین ترسبز مرغزاروں سے سجا یہ گاؤں قدرت کی صناعی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ خوش خرام ندیاں، بہتے جھرنے، سرمست دریا، بہت دلربا وادی تھی۔ پھلوں سے لدے پھندے باغات۔

دوپہر کا کھانا بہت لذیذ تھا۔ پھوپھو بہت سادہ طبیعت کی پر خلوص خاتون تھیں۔ انہوں نے چھوٹی سی دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔

سہ پہر کے وقت ان سب نے گاؤں کی جھیل دیکھنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ ماہیر کا ارادہ آرام کرنے کا تھا۔ وہ کافی تھک چکا تھا۔ البتہ بچوں نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔

اس وقت وہ جھیل کے کنارے بیٹھے سرخ سرخ تازہ امرود کھا رہے تھے۔

"اس پہاڑی پر ایک مزار ہے۔ یہاں کے لوگ کہتے ہیں اس گاؤں میں داخل ہونے والا اجنبی اگر کوئی دعا مانگے تو جلد قبول ہوگی۔" محسن من گھڑت قصے سنانے لگا تھا۔

"آپی! ہم بھی دعا مانگیں۔" مہک مچل اٹھی۔

"صرف دعا نہیں کرنی، سرخ رنگ کا دوپٹہ بھی وہاں رکھنا ہے۔ یہ اپنا دوپٹہ وہاں رکھ دینا۔" محسن نے مہک

کو چھیڑا۔

"رکھ دوں گی۔"

"خود کیا بغیر دوپٹے کے گھر جاؤ گی۔" محب نے سمجھ داری کا مظاہرہ کیا۔

"آپ کی شال ہے نا۔" مہک بہت مچل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد حریم بھی نیم رضامند ہو گئی۔

"آپ کیا دعا مانگیں گی آپی! ماہیر بھائی تو آپ کو مل چکے۔" محسن اسے چھیڑ رہا تھا۔

"تمہاری شادی کے سلسلے میں دعا مانگیں گی۔ جلد از جلد کوئی چڑیل تمہاری زندگی میں شامل ہو جائے۔" محب نے محسن کو چڑایا۔

"یہ بات ہے' پھر تو میں آپ کو ضرور مزار پر لے کر جاؤں گا۔ آپی! میرے لیے خاص الخاص دعا کرنا۔" محسن اس کے کان میں گھس گیا۔

"آپی! میرے لیے بھی۔" محب بھی ٹھنکا۔

"تمہارے لیے کیا مانگوں۔" حریم شرارت سے ہنسی۔

"محسن کی طرح ایک چڑیل میری زندگی میں بھی شامل ہو جائے۔" محب سرگوشیانہ بولا۔ کچھ فاصلے پر ماہیر' خالہ کے ساتھ نہ جانے کس مسئلے میں الجھا تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے۔ انہیں اٹھ کر ایک ہموار سڑک کی طرف جاتا دیکھ کر ماہیر اونچی آواز میں بولا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"اس مزار تک۔" حریم کی بجائے محسن نے قدرے دور سفید جھنڈے والے مزار کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا کرنے۔" ماہیر کی بازگشت سنائی دی۔

"یہ سیکرٹ ہے۔" محسن دور سے چہکا۔

"حریم! تم مت جاؤ۔" ماہیر بلند آواز میں بولا تھا۔ وہ اس سے کافی فاصلے پر چلے گئے تھے۔ حریم نا سمجھی کے عالم میں پلٹی۔

"ماہیر کچھ کہہ رہے ہیں۔" حریم نے محسن سے تصدیق چاہی۔

"نہیں آپی! کچھ بھی نہیں کہہ رہے۔" مہک کو مزار تک پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ میٹرک میں بہتر رزلٹ آنے کی دعا کرنا چاہتی تھی۔

"حریم! میں کہہ رہا ہوں واپس آؤ۔" اب تو خالہ بھی انہیں اشارے سے بلا رہی تھیں۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے ماہیر اور خالہ اور بھی دور دکھائی دے رہے تھے۔

"آیئے نا آپی!" مہک اس کا ہاتھ تھام کر بلندی کی طرف چڑھنے لگی۔ راستہ ہموار تھا بلکہ بہت اچھی سڑک مزار تک تعمیر کروائی گئی تھی۔ تاکہ آنے جانے والے عقیدت مندوں کے لیے آسانی رہے۔

انہوں نے مزار کی عمارت میں داخل ہو کر دعا بھی مانگ لی تھی۔ دوپٹہ بھی ایک رسی کے ساتھ باندھ دیا۔

حریم بہت تھک گئی تھی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ مگر وہ جلد از جلد نیچے جانا چاہتی تھی۔ اسے ماہیر کی بات سننے کی جلدی تھی۔ نہ جانے ماہیر کیا کہہ رہے تھے۔ وہ سوچتے ہوئے اپنے دھیان میں مگن چل رہی تھی' جب کوئی چھوٹی سی پرندہ نما چیز اس کے سر سے ٹکرائی تھی۔ حریم کے لبوں سے بے ساختہ چیخ نما آواز برآمد ہوئی۔ اسی اثناء میں پرندوں کا پورا جھنڈ غل غپاڑہ مچاتا ان کے سروں پر سے گزرا تھا۔ مہک بھی خوف زدہ ہو کر چیخنے لگی تھی۔ مہک کی چیخوں سے گھبرا کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیسے اس کا پاؤں رپٹ گیا تھا۔ شاید کوئی پتھر جوتی کے نیچے آکر پھسل گیا تھا۔ بس لمحوں کا کھیل تھا۔ حریم لڑھکتی ہوئی دور بہت دور تک چیختی چلاتی' آوازیں دیتی ایک چھوٹی سی کھائی میں جا گری۔ مہک اور محسن کے دل گویا لمحہ بھر کے لیے دھڑکنا بھول گئے۔ ان کی دردناک چیخوں کی آوازوں سے یہ چھوٹی سی بستی تھرا اٹھی۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

اس نے آخری انڈہ بھی چھیل کر پلیٹ میں دھرے دوسرے دو انڈوں کے ساتھ رکھا۔ چولہے سے ساس پین اتار کر پیالے میں گرما گرم دودھ پتی انڈیلی اور دونوں چیزیں ٹرے میں سجا کر کچن کا جالی والا دروازہ کھولتی صحن میں نکل آئی جہاں دادی اپنے تخت پوش پہ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز جاتی فروری کی دھوپ سینک رہی تھیں۔ ہاتھ میں لکڑی کے دانوں کی خوبصورت تسبیح تھی' جس کے دانے گرنے کی رفتار ان کے ہلتے لبوں سے کہیں تیز تھی۔ اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ دادی نے ناگواری سے اس کی سمت دیکھا اور بولیں۔

"کیوں صبح صبح پاگلوں کی طرح اکیلی ہی ہنس رہی ہے؟ کچن میں اپنی کوئی ہم شکل چوہیا دیکھ کے نکلی ہے کیا؟"

تین دن ہوگئے تھے' دادی کے کچن میں کوئی چوہیا آن گھسی تھا (یہ صرف دادی کی ہی زیرک نگاہی تھی کہ انہیں اس کی جنس کا اندازہ ایک نگاہ میں ہوگیا تھا) اور اب اس نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ہر چیز کی حفاظت کرنی پڑ رہی تھی۔

"دادی' مجھے بھی وہ ورد بتائیں جسے منہ بند کر کے کرتے ہیں' مگر تسبیح کے دانے دھڑا دھڑ گرتے ہوں۔" اس نے تخت پوش پہ ٹرے رکھی۔ اور خود بھی ٹانگیں سمیٹ کے دادی کے کھیس میں چھپائیں۔

"بک بک بند کر تیری طرح ہر وقت بولتے رہنے کی' عادت نہیں مجھے' اس لیے بند منہ کے پیچھے بھی زبان ہلاتی رہتی ہوں۔" دادی سادگی میں کیا بول گئی تھیں انہیں پتا بھی نہیں چلا۔

"واہ' واہ دادی! یہ ہنر بھی ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ توپ کا دہانہ تو بند ہو مگر گولے مسلسل برآمد ہوتے رہیں۔ واہ! واہ لیجیے۔ دودھ پتی اور انڈے نوش فرمائیے۔" اس نے ٹرے دادی کے آگے کھسکائی۔

"آؤ بتاؤں تمہیں انڈے کا فنڈہ۔
یہ نہیں پیارے کوئی معمولی بندہ
اس میں چھپا ہے جیون کا فلسفہ
انڈے کا فنڈہ۔"

دونوں نے ناگواری سے ساتھ والے گھر کی طرف گردن موڑ کر دیکھا۔ جہاں سے ڈیک کی آتی بے ہودہ آواز صبح صبح زہر لگ رہی تھی۔ ایک اس معاملے میں دادی اور ہانیہ کی رائے مشترکہ تھی کہ ساتھ والے گھر میں آنے والے یہ نئے ہمسائے انتہائی واہیات تھے۔ صبح ہوتے ہی ان کا ڈیک بھونکنا' شروع ہو جاتا تھا۔ دیوار سے دیوار جڑی تھی اس لیے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی دادی کے صحن میں ہی آرکسٹرا ارینج کر کے بیٹھ گیا ہے۔

"ہانیہ! اے بچے' انڈے سے یاد آیا جا کر مرغیوں کا ڈربا کھول اور انہیں باہر نکال کر دانا ڈال پھر رضیہ صفائی کرنے آجائے گی۔ آج اس سے ڈربے کی صفائی بھی کرانی ہے۔ اس لیے اٹھ شاباش! انڈے اکھٹے کر کے ٹوکری میں رکھ۔" ہانیہ جس کو یہ ہی امید تھی کہ اس "انڈے کے فنڈے" سے دادی کو اپنی مرغیوں کے انڈے یاد آئیں ہی آئیں سو وہ ہی ہوا۔ جتنی دادی کو اپنی ان چہیتوں سے محبت تھی' اتنی اسے چڑ تھی۔ دو چار بھی ہوتیں تو کوئی بات تھی۔ پر یہ تو پوری فوج تھی مرغیوں کی۔ اٹھائیس مرغیاں تھیں اٹھائیس۔ اور جسے دادی ڈربا کہہ رہی تھیں۔ وہ دادی کے پچھلے صحن میں دھرا ایک بہت بڑا پنجرہ تھا۔ ظاہر ہے اتنے ڈھیر کو رکھنے کے لیے پنجرہ بھی چھوٹا محسوس ہوتا تھا۔ اور ہانیہ کو ان مرغیوں اور ان کے روز کے سیاپوں نے تنگ کر رکھا تھا۔ کبھی دانا ڈالو' کبھی رضیہ کے ساتھ صفائی کراؤ۔ کبھی انڈے اکٹھے کرو۔ اسے تو اب انڈے سے ہی چڑ ہوگئی تھی۔

دادی روز ہی تو انڈوں سے کوئی نہ کوئی چیز بنواتی تھیں۔ کبھی انڈوں کا حلوہ' کبھی خاگینہ' کبھی آلو انڈے تو کبھی انڈے آلو' بس انڈے ہوں' انڈے اس کا بس نہ چلتا تھا۔ ان تمام مرغیوں کو چھری پھیرے اور بروسٹ بنا کر محلے میں بانٹے پر دادی کی بات ماننے کے علاوہ چارہ بھی نہ تھا۔ آخر کو ان کے پاس رہتی تھی اور اگر وہ کوئی بات نہ مانتی یا آنا کانی کرتی تو دادی فون پہ پوری رپورٹ اس کے گھر پہنچانے میں دیر نہیں لگاتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

دادی کے چھ بچے تھے تین بیٹے اور تین بیٹیاں سب سے بڑی دو بیٹیاں تھیں۔ جن کی رخصتی اسی گھر سے ہوئی تھی۔ ایک ملتان بیاہی گئی تھی اور دوسری شادی کے بعد ہالینڈ جا بسی' پھر ہانیہ کے ابو کا نمبر تھا۔ جن کی شادی اسی گھر میں ہوئی' ہانیہ اور اس کے تین بہن بھائی یہیں پیدا ہوئے۔ مگر پھر بسلسلہ روزگار ہانیہ کے ابو کو لاہور شفٹ ہونا پڑا' اور پچھلے آٹھ سال سے وہ پوری فیملی وہیں سیٹل تھی۔ ہانیہ کے ابو کے بعد دادی کے دو بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک کا انتقال محض اٹھارہ سال کی عمر میں ہوگیا تھا۔ وجہ شاید کوئی حادثہ تھی۔ پھر چھوٹے چچا تھا۔ جو ڈاکٹر تھے اور مانچسٹر میں اپنی فیملی کے ساتھ سیٹل تھے۔ اکثر آتے جاتے تھے۔ پر گزشتہ دو تین سال سے ازحد مصروفیات کی بنا پر نہیں آپا رہے تھے۔ پھر باری تھی چھوٹی پھپھو کی۔ جن کی شادی سعودیہ میں مقیم ایاز صاحب سے ہوئی تھی۔ وہ چونکہ اکلوتے تھے۔ ماں باپ دونوں کا انتقال ہوچکا تھا۔ آگے پیچھے کے تمام رشتہ دار "آگے پیچھے" ہی ہو چکے تھے۔ لہٰذا چھوٹی پھپھو عرصہ پانچ سال تک دادی کے ہمراہ یہیں رہیں۔ پھپھا ہر سال ایک ماہ کے لیے آتے اور واپس سدھارتے۔ اس دوران پھپھو کے دو بچے بھی ہوگئے۔ اب پھپھا کو اچانک لگا کہ پھپھو سے شادی ان کی ہوئی ہے' دادی کی نہیں لہٰذا انہوں نے پوری فیملی کو اپنے پاس سعودیہ بلوالیا۔ پھپھو تو چلی گئیں' مگر مسئلہ دادی کا تھا۔ جو کسی بھی قیمت پر اس گھر سے دور ہونا نہیں چاہتی تھیں۔

پرانے وقتوں کا دس مرلے کا مکان تھا۔ بڑے بڑے کشادہ کمرے اور آگے پیچھے کھلے صحن۔ وہ ادھر ہی بیاہ کر آئی تھیں' یہیں اولاد پلی بڑھی اور اب وہ ادھر سے ہی اگلے جہاں کی فلائیٹ پکڑنا چاہتی تھیں۔

ہانیہ کے ابو نے بہتیرا زور لگایا کہ وہ ان کے پاس لاہور میں رہیں' پر ناں جی سو تبھی سب بچوں نے سر جوڑ کر فیصلہ کیا کہ ادھر اماں کے پاس باری باری ہم سب کے بچے رہا کریں گے۔ خاص طور پر وہ جو تعلیم وغیرہ سے فارغ ہوچکے ہیں۔ بڑی پھپھو نے نادر مشورہ دیا کہ ہم اپنی بیٹیوں کو باری باری اماں کے پاس رہنے بھیجیں' تاکہ بچیوں کی اماں کی سرپرستی میں بہترین تربیت ہوسکے۔ اور بات ہوئی جب تربیت کی تو ہانیہ کی امی کو اس سے زیادہ کوئی بھی قابل تربیت نہ محسوس ہوا۔

جس کا کام سارا دن کدکڑے لگانا تھا۔ تھوڑی منہ پھٹ بھی تھی اور سادہ مزاج بھی چند دن پہلے خالہ کی طرف بات پکی ہوئی تھی' سو امی چاہتی تھیں کہ چونکہ شادی میں ابھی تھوڑا ٹائم ہے لہٰذا پہلی فرصت میں ہانیہ کو دادی کے پاس روانہ کیا جائے تب سے ہانیہ بی تھیں' دادی تھیں اور ان کی اٹھائیس مرغیاں' جنہوں نے ہانیہ کی صحیح معنوں میں مت مار کر رکھ دی تھی۔ اور آج کل سارا وقت اس کا ان مرغیوں سے چھٹکارے کی ترکیبیں سوچتے گزرتا تھا۔

☼ ☼ ☼

صحن میں چاروں اور کٹ کٹ کرتی مرغیاں اور ان کی پٹ پٹ کرتی بیٹیں رقصاں تھیں۔ ہانیہ تخت پر بے زار سی کبھی انہیں تو کبھی دانا ڈالتی دادی کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس کی آنکھوں میں شرارت انگڑائی لے کر بے دار ہوئی۔ اس نے بڑے غور سے دادی کو دیکھا' عین اسی لمحے دانا پھینکتی دادی نے چشمے کی اوٹ سے اسے جھانکا اور پوچھا۔

"کیا دیکھ رہی ہے؟ شرم تو نہیں آتی کب سے ان بے چاریوں کے ساتھ کھپ رہی ہوں' اٹھ کر تھوڑا ہاتھ ہی بٹا دو۔" دادی نے پوچھنے کے ساتھ ساتھ لتاڑ بھی دیا۔

"اصل میں دادی میں دیکھ رہی تھی کہ کچھ دن سے آپ کی شکل میں تبدیلی سی آگئی ہے کچھ کچھ۔۔۔" وہ سوچنے والے انداز میں انگلی کنپٹی پہ مارنے لگی۔

"کیا۔ !کیا کچھ کچھ۔" دادی اپنی شکل کے معاملے میں اس عمر میں بھی حساس تھیں۔

"کچھ کچھ نا۔ بس کچھ کچھ' زیادہ نہیں۔ تھوڑی بہت مرغی جیسی ہوتی جارہی ہے۔"

"کم بخت' بے ہودہ' ادھر دفع ہو ذرا۔" دادی سارے دانے ہاتھ سے پھینکتی اس کی طرف آئیں اور رکھ کے کمر پہ دو ہتڑ رسید کیے۔

"ہائے دادی۔" وہ واویلا کرتی بولی۔

"میں تو آپ کو خطرے سے آگاہ کررہی تھی کہ ابھی تک تو صرف ناک ملنی شروع ہوئی ہے' اگر مزید کچھ عرصہ آپ ان کم بختوں کے ساتھ رہیں تو کچھ بعید نہیں۔۔۔"

"ہاں !ہاں۔۔۔ ساری مرغی بن جاؤں گی' پھر تو مجھ پہ چھری چلانے کا شوق پورا کرنا۔"

"لاحول ولا۔ جن پہ چلانی چاہیے' ان پہ تو چلانے نہیں دیتیں۔ نرے انڈے کھلا کھلا کے "انڈے" جیسی شکل ہوگئی ہے میری۔" اس نے دادی کے گلے میں کس کے بانہیں ڈال لیں اور انہیں مزید کسا۔

"اے۔۔۔ اے' ڈھیلا کر ہاتھ بدتمیز۔ سچ میں مرغی سمجھ بیٹھی ہے کیا جو گردن مروڑنے کے در پے ہے۔ چھوڑ مجھے۔" دونوں ہاتھوں سے اسے پرے دھکیلا' پر وہ جھٹ سے زور زور سے منہ چومنے لگی۔ پھر بولی۔

"آپ کو پیار کروں تو برا مانتی ہیں۔ دھیان نہ دوں تو میری شکایت کرتی ہیں۔" وہ ابھی انہیں لاڈوں میں مصروف تھی کہ اس کی نظر بالکل سامنے چہل قدمی کرتی سفید مرغی پر پڑی۔

"دادی! یہ تو گئی۔" وہ جیسے افسوس کرتی بولی۔

"کون گئی؟" دادی بوکھلائیں۔

"یہ جو سامنے سفید مرغی ہے نا' دیکھیں کیسے ڈول ڈول کر چل رہی ہے' بس یہ پھڑکنے والی ہے' میں تو کہتی ہوں' کسی کو بلوائیں اور تکبیر پھیر دیں۔ آہاہا۔ ایسا شاندار چکن قورمہ بناؤں گی کہ۔" اس سے آگے کچھ بولنے کی نوبت ہی نہیں آئی کہ دادی کے بھاری کرارے ہاتھ نے اس کے مزاج پوچھ ڈالے۔

"مرن جوگی۔۔۔ سب پتا ہے مجھے' بڑی چلتر ہے وہ' یہ جو تیرے ڈڈو جیسے دیدے اس وقت سے میری مرغی کو تاڑ رہے ہیں۔ سب نظر آرہا ہے مجھے۔ پر تو جو مرضی کرلے تیری جان نہیں چھٹنے والی ان سے۔ ککڑی (مرغی) کے منہ والی۔" ایک اور زوردار دھمو کہ اسے جڑ کر دادی اپنی مرغیوں پہ واری صدقے ہوتے چلی گئیں جب کہ ہانیہ اپنا کندھا سہلاتے ہوئے کینہ توز نظروں سے مرغیوں کو دیکھ رہی تھی۔

"ان کی تو میں "سجیاں" بنوا کر رہوں گی۔" اس نے خود سے عہد کیا اور اٹھ کے کچن میں چائے بنانے چل دی۔

☼ ☼ ☼

وہ بڑے انہماک سے ٹی۔ وی لاؤنج میں بیٹھی سینٹرل ٹیبل پہ اپنے نئے سوٹ کی شرٹ کا کپڑا پھیلائے' اسے بڑی پھرتی کے ساتھ کاٹنے میں مگن تھی۔ جب سے دادی کے ہاں آئی تھی' اس کا سلائی میں ہاتھ کافی صاف ہوگیا تھا۔ اب وہ اپنے اور دادی کے کپڑے آرام سے سی لیتی تھی۔

"اے ہانیہ' او کدھر ہے تو؟" زوردار پکار پر قینچی اس کے ہاتھ میں کانپ سی گئی۔

"کیا ہے دادی؟ یہاں ہوں ٹی وی لاؤنج میں۔" وہ کوفت سے بولی۔ "ابھی اس کی قینچی بے تکی چل جاتی تو۔؟"

تبھی دادی ہاتھ میں ہزار' ہزار کے دو نوٹ پکڑے چلی آئیں۔

"میں یہ پیسے الماری میں رکھنے گئی تھی۔ وہاں مجھے لٹھے کا نیا تھان نظر نہیں آیا تو نے تو نہیں ادھر ادھر کیا۔" وہ سامنے صوفے پہ بیٹھ گئیں۔ شکر ہے ان کا دھیان ہانیہ کے چہرے کی بجائے میز پہ پھیلے کپڑے پہ تھا۔

نہیں تو اس کے چہرے کا اڑتا رنگ ضرور بھانپ لیتیں۔ کیونکہ لٹھے کا پورا تھان اس نے محلے کی ایک غریب درزن کے حوالے ابھی کل ہی تو کیا تھا' جس وقت دادی اندر کمرے میں ٹیلی فون پہ ملتان والی پھپھو کے ساتھ دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی اس وقت درزن بے چاری باہر دادی سے خاص کچھ مدد لینے آئی تھی۔ اب دادی ٹھہریں بلا کی کنجوس' کھیسے کو ہوا بھی نہیں لگواتی تھیں۔ سو ہانیہ نے دادی کی ٹیلی فونک مصروفیت کا فائدہ اٹھایا اور جھٹ دادی کی الماری سے وہ پورا تھان لا کر درزن کے حوالے کیا اور ساتھ ہی ہدایت بھی کردی ہے۔

"اپنے بچوں کے "یونیفارم" بنا لینا اور اگر کچھ بچ جائے تو لنگوٹ سی دینا۔ ضائع مت کرنا۔" اب یہ ہانیہ کی قسمت کہ اگلے دن ہی دادی کو وہ تھان گمشدہ محسوس ہوگیا۔ سو اب ہانیہ کا ستیاناس لازمی تھا۔

"اے۔۔۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں۔ منہ میں' گھنگنیاں' ڈال رکھے ہیں۔ تھان کدھر ہے۔؟"

"وہ تو دادی میں نے سامنے والے ماسٹر صاحب کی بیگم کو پکڑا دیا تھا' جس دن وہ عمرہ کرنے جارہی تھیں۔" اسے جلدی میں یہی بہانہ سوجھا تھا۔

"ہیں۔ وہ کیوں بھلا۔ احرام بنانے تھے کیا انہوں نے۔" دادی نے کڑے تیوروں سے گھورا۔

"ارے نہیں دادی! ایسا نہیں ہے۔ بس بھلے برے وقت کا پتا نہیں ہوتا۔ میں نے ان سے کہا کہ اس تھان کو آب زم زم سے دھو کرلادیں۔ دادی نے کہا ہے۔"

"شاباش ہے تجھ پہ نالائق' کہہ دے' کہہ دے۔ میری میت پہ چڑھانا ہے۔ بد بخت! شرم نہ آئی تجھے' میں کہے دیتی ہوں' میں بھی تیری دادی ہوں۔ وقت کی وقت دیکھی جائے گی۔ ابھی تو میں وہ تھان واپس لے کر استعمال میں لاؤں گی۔ سمجھی؟" دادی نے پورے جلال میں اپنی پلاننگ سے آگاہ کیا جبکہ ہانیہ پوری فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلائے دل میں شکر ادا کررہی تھی کہ کم از کم مہینہ بھر تو دادی کی تفتیش سے بچ گئی تھی۔

ماسٹر صاحب اور ان کی بیگم سعودیہ اپنے بیٹے کے پاس گئے تھے۔ اور عمرہ کرکے ظاہر ہے' کچھ عرصہ تو قیام کرتے' بعد میں وہ پھر کوئی بہانہ بنا ہی لیتی' کہ اس کے "بھیجے" میں آئیڈیاز کی نت نئی فصلیں اگتی رہتی تھیں۔

"اب جلدی سے اٹھ ذرا' یہ پیسے رکھ کے الماری میں اور مجھے تین انڈے ہی ابال دے۔ کمزوری سی محسوس ہورہی ہے۔ ساتھ میں الائچی والی دودھ پتی بھی بنادے۔" دادی صوفے پہ دراز ہوتے ہوئے بولیں۔ جبکہ ہانیہ کے چہرے پہ انڈے ابالنے کے ذکر سے ہی کوفت در آئی تھی۔ اف! زچ ہوگئی تھی اب وہ ان انڈوں اور مرغیوں سے۔

"حد ہے دادی! ہر وقت انڈے' انڈے' انڈے مجھے تو شک ہے کہ کسی دن ہم دونوں رات کو بھلی چنگی سوئیں گی تو صبح مرغیاں بنی اٹھیں گی۔" دادی پہ اس کی بکواس کا کوئی اثر نہیں ہورہا تھا' ان پہ غنودگی چھا رہی تھی۔

"اچھا یہ پیسے ہیں کس چیز کے؟" کمرے سے جاتے جاتے اس نے پوچھ لیا۔

"ہوں۔ ہاں یہ انڈوں کے ہیں کتنے دنوں کے اکٹھے ہوئے پڑے تھے۔ ظہیر حلوائی آیا تھا۔ اس کے ہاتھ بیچ دیے۔"

"کیا۔۔؟" وہ دنگ رہ گئی۔

"دادی آپ انڈے بیچتی ہیں۔ حد ہوگی بھلا محلے کے کسی غریب کو دیا کریں۔ دعائیں دیں گے آپ کے دونوں بیٹے اچھے خاصے پیسے بھجواتے ہیں۔ پھر بھی آپ؟" اسے لگا دادی سو گئیں۔۔۔ سو پھر سے قریب چلی آئی۔ دو چار آوازیں دینے پہ بھی ٹس سے مس نہ ہوئیں تو تاسف سے انہیں دیکھتی پیسے رکھنے چل دی پر چند لمحوں میں ہی اس نے ان "انڈوں کا فنڈا" کرنے کا پلان بنالیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج جمعہ تھا۔ اور دادی صبح صبح سر میں تیل کی مالش کروا کر بارہ بجے تک نہانے چلی جاتی تھیں۔ اس وقت نو بج رہے تھے اور ہانیہ پورے زور و شور سے دادی کے

سر کا مساج کر رہی تھی۔ ساتھ ہی مسلسل ہمسائے کی طرف سے آنے والی بھونڈی گانے کی آواز پہ سر اور منہ بھی ہلا رہی تھی۔

انڈے کا فنڈا انڈہ۔

انڈے کا فنڈا انڈہ۔

آؤ دکھاؤں.....

"ہانیہ بو تھی بندر رکھ کر صرف ہاتھ چلا۔"

"صبح صبح یہ لوگ تھوڑی نحوست پھیلاتے ہیں جو باقی کی کسر تو پوری کرتی ہے' اور ہاں خبردار جو تو نے زیادہ تال میل رکھا ان سے' کل بھی دیوار سے سنگی گپیں ہانک رہی تھی۔ ان لڑکیوں سے۔ سنا؟"

"دادی میں تو صرف یہ پوچھنے چڑھی تھی کہ آخر یہ لوگ صرف "انڈے کا فنڈا" بنانے میں ہی کیوں دلچسپی لیتی ہیں۔ ہاہاہا....."

ویسے دادی اتنی بری نہیں ہیں۔ محنت کر کے پیٹ پال رہی ہیں۔ بھائی کوئی ہے نہیں باپ دوسری شادی کر کے دوسرے بال بچوں میں مگن اور ان کی ماں خالہ زہرہ بھی اچھی ہیں۔ زیادہ چالاک نہیں لگی مجھے۔" وہ ابھی مزید تفصیلات میں جاتی مگر دادی نے ٹوک دیا۔

"تجھے سیدھے اور الٹے چپل کی پہچان تو ہے نہیں' بندہ کیا خاک جانے گی۔ اپنے کام سے کام رکھا کر۔ چل اب بال باندھ میرے اور مرغیوں کی خیر خبر لے۔ رضیہ بھی آئی ہو گی۔" اس کا کوئی موڈ نہیں تھا مرغیوں کی سیوا کرنے کا مگر انڈے۔ ہاں! انڈے تو اسے آج لازمی اکٹھے کرنے تھے۔ سو جلدی سے دو چار کس کس کے دادی کی چوٹی کو بل دیے۔ ابھی مزید دیتی پر اسے لگا دادی کی آنکھیں ماتھے کو چڑھ رہی ہیں۔

"ارے ہانیہ نکمی! جڑ سے اکھاڑے گی کیا؟ حلق میں سانس اٹک گئی میری' دل کر رہا ہے دو جوتے لگاؤں تیرے۔ کوئی کام چج کا نہیں تیرا۔" دادی جوتا اٹھانے کو نیچے جھکیں پر دوبارہ جھٹکا کھا کر پہلی پوزیشن پہ چلی گئیں۔ کیونکہ چوٹی ابھی تک ہانیہ کے ہاتھ میں ہی تھی۔

"اوئی میری بے بے! ناہنجار چھوڑ تو سہی میرے بال۔"

"سوری' سوری دادی' یہ لیں چھوڑ دیے۔ پر پلیز موزور (جوتا) مت اٹھانا۔ پہلے ہی تڑاتڑ فائرنگ کر کے گھسا مارا ہے اسے۔" ہانیہ کا سارا دھیان چونکہ دیوار پار لگا تھا سو اسے پتا بھی نہیں چلا کہ دادی کے بالوں کی کیا درگت بن رہی ہے۔

"ویسے دادی آپ کے بال اس "آخری عمر" میں بھی بڑے حسین ہیں۔ آخر ماجرا کیا ہے ہیر یے۔" دادی کا چہرہ اپنی تعریف سن کر بڑا رنگین ہو گیا تھا لہٰذا "آخری عمر" جیسے گھناؤنے لفظ پہ دھیان نہ دیا۔

"بس شروع سے خیال رکھا بہت' کبھی ننگے سر نہیں بیٹھی اللہ بخشے تیرے دادا کو بھی میرے بال بڑے پسند تھے۔ حق ہاہ! بڑا پیار تھا میرا اور ان کا۔" دادی پتا نہیں کن خیالوں میں کھو گئیں۔ ہانیہ کو لگا شاید افسردہ ہو گئی ہیں تبھی دھیان بٹانے کی غرض سے بولی۔

"ویسے دادی' ابو جی بتاتے ہیں آپ شادی سے پہلے بڑی خوبصورت ہوا کرتی تھیں۔" کتنی احمقانہ بات تھی۔

"ہاں بیٹا! شادی سے پہلے تو تیرے باپ نے مجھے دیکھ رکھا تھا نا۔ میرا جہیز اسی نے تو تیار کرایا تھا۔" دادی نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ انہیں ہانیہ کی کم عقلی پہ بے حد افسوس ہو رہا تھا۔

"نہیں نہیں اصل میں انہوں نے آپ کی کوئی تصویر دیکھ رکھی ہو گی نا۔" اس نے اپنی بے وقوفی کو سنبھالا دیا۔

"لاحول ولا۔ استغفر اللہ! میں نے کبھی انگوٹھے جتنی (پاسپورٹ سائز) تصویر نہ بنوائی تو' تو کس تصویر کی بات کر رہی ہے۔" دادی کو تو گویا پتنگے لگ گئے تھے۔

"ہانیہ! میں کہتی ہوں عقل پکڑ تھوڑی۔ تیرے پھپھن تجھے سسرال میں چھتر پڑ جائیں گے۔ تجھے اگر خالہ کے گھر کی خماری ہے تو کسی بھول میں نہ رہنا ہو۔ سسرال' سسرال ہوتی ہے۔ اب اٹھ جا کر انڈے

اکٹھے کر تب تک میں نہا کے نکلتی ہوں۔" دادی چپل گھسیٹتی نہانے چل دیں۔

تبھی گیٹ پہ بیل ہوئی۔ کام والی رضیہ دندیاں نکالتی اندر داخل ہوئی۔ اسے صفائی میں لگا کر خود جلدی سے پچھلے صحن کی طرف ٹوکری پکڑے بھاگی۔ انڈے اکٹھے کرنے میں ہی دس پندرہ منٹ صرف ہو گئے۔ فٹا فٹ ٹوکری لے کر کچن میں گئی۔ اور تمام انڈوں میں سے سات انڈے الگ کیے باقی کے انڈے لیے وہ خالہ زہرہ کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"خالہ۔ او خالہ' کدھر ہیں۔" اسے آواز دھیمی رکھنی پڑ رہی تھی کہ کہیں رضیہ نہ سن لے۔ پوری دادی کی چچی تھی "پھاپھا کٹنی"۔

"ارے ہانیہ بیٹے! صبح صبح خیریت تو ہے نا۔ دادی ٹھیک ہیں؟ اور یہ ہاتھ میں کیا ہے؟"

خالہ زہرہ جب بولتیں تو یوں لگتا بہت سے لوگ کورس میں "نون غناں' نون غناں' نون غناں" کا ورد کر رہے ہیں اور ہانیہ کو بے اختیار ہنسی آجاتی پر ابھی ہنسنے کا موقع نہیں تھا۔

"جی خالہ سب خیریت! یہ دادی نے آپ کے لیے انڈے دیے ہیں یہ رکھ لیجیے۔ اب روز کے روز جتنے ہو سکے' دیا کریں گی۔ اصل میں دو تو ہم جی ہیں اور مرغیاں ہیں کہ دم ہی نہیں لیتیں۔ دے انڈے پہ انڈہ' دے انڈے پہ انڈہ' سو دادی نے سوچا کہ کچھ انڈے روز کے روز آپ کو بھی دے ماریں اور میرا مطلب ہے دے دیں کار ثواب ہے۔"

"ضرور بیٹا' ضرور!" خالہ نے جھٹ ٹوکری جھپٹ لی تھی' مانو ڈر ہو کہ کہیں دادی کا ارادہ ہی نہ بدل جائے۔

"اپنی دادی کا میرا شکریہ کہنا بلکہ میں شام میں خود آؤں گی۔ آج کل تو انڈے ویسے ہی بہت مہنگے ہیں۔ بڑا تکلف کیا انہوں نے۔" خوشی ان کے لفظ لفظ سے ٹپک رہی تھی۔ لیکن لفظ کیا تھے وہ ہانیہ کو ذرا مشکل سے پتے پڑے۔ بس یوں لگا ڈھیر سارے (نون غناں) تڑاتڑ انڈوں کی طرح اس کے سر پہ برس گئے ہوں۔

"نہیں نہیں خالہ' یہ غضب نہ کرنا۔ آپ سو دفعہ آئیں' پر انڈوں کا ذکر کبھی نہ کرنا' نہیں تو سمجھ لیں کل سے انڈے بند۔ کیونکہ دادی کو اپنی نیکیاں کسی کے منہ سے سننا بالکل پسند نہیں۔ سمجھ گئیں نا؟"

"بالکل! بالکل' بڑی نیک ہیں تمہاری دادی۔" خالہ زہرہ نے انڈوں کو کلیجے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"سو تو ہیں۔ وہ محاورہ تو آپ نے سنا ہو گا نا۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔ بالکل اسی طرح "انڈے دے' ہمسایوں میں بانٹ" کی پالیسی اپنائی ہے دادی نے۔" کمرے سے کھٹکے کی آواز آئی تھی۔ یقیناً" دادی نہا کے نکل آئی ہوں گی۔

"اچھا خالہ! اللہ حافظ۔" وہ جھٹ چھلانگ مارتی تخت پہ آ بیٹھی۔ اسے بے تحاشا ہنسی آرہی تھی۔ اب اسے دادی کو بس یہ بتانا تھا کہ آج ان کی مرغیوں نے صرف سات انڈے دیے ہیں۔ جو یقیناً" دادی کے لیے صدمے کی بات تھی۔ ہانیہ کا پلان عنقریب کامیاب ہونے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یا اللہ! آج پھر صرف آٹھ انڈے' ہائے میری مرغیوں کو کیا ہو گیا۔ کس بد نظرے کی نظر لگ گئی میرے انڈوں کو۔ اے ہانیہ! تو نے صحیح سے دیکھے تھے نا انڈے' اتنے ہی تھے؟ کہیں کوئی پنجرے میں نہ رہ گیا ہو۔" دادی حیران پریشان کچن میں کاؤنٹر پہ رکھی ٹوکری میں موجود گنتی کے چند انڈوں کو دیکھ رہی تھیں۔ کتنی دفعہ تو گن چکی تھیں کہ شاید انڈے میں سے انڈہ نکل آئے۔ پر مایوسی سی مایوسی تھی۔

"اے ہانیہ! کہاں مر گئی ہے۔؟ جواب تو دے۔" دادی صحن کی طرف منہ کر کے جلال سے بولیں جہاں ہانیہ دادی کے تخت پہ لیٹی کھیس میں منہ دیے ہنسی دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"دادی میں نے اچھی طرح دیکھے ہیں۔ مرغیوں نے انڈے دینے کم کر دیے ہیں۔ کل بھی تو چھ تھے پرسوں نو تھے اور آج آٹھ ہیں۔" وہ چپل پہنتی کچن

میں چلی آئی۔ دادی سے ہمدردی بھی تو ضروری تھی۔

"دادی مجھے لگتا ہے آپ کی مرغیاں سیانی ہو گئی ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو کم کرنے میں حصہ ڈال رہی ہیں۔ کم انڈے، خوشحال گھرانہ۔"

"تیری ہی نظر لگی ہے مجھ (بھینس) کے ڈیلوں والی۔" دادی نے اسے کس کے ایک دھموکا جڑا۔

"ہر وقت میری مرغیوں کو نظر میں لیے رکھتی تھی۔ ہائے، ہائے اب میں کس سے پوچھوں ان مسکینوں کا علاج۔"

دادی سخت افسردہ تھیں۔

"مجھ پہ کیوں غصہ نکال رہی ہیں۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔ مجھے ان میں بیماری کے اثرات نظر آرہے ہیں۔ چھری پھیر دیں۔ پر نا جی! انڈے کھانے کے چکر میں بروسٹ سے بھی گئے۔" اس نے کن انکھیوں سے دادی کے تاثرات کا جائزہ لیا جو کسی گہری سوچ میں تھیں۔ اور چپکے سے کچن سے کھسک لی آج اس کے پلان کی کامیابی کا چوتھا دن تھا۔ اور عنقریب اس کی ان مرغیوں سے جان چھوٹنے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج دادی صبح سے بے حد مصروف تھیں۔ سارے گھر کے سامان کا جائزہ لیتی پھر رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی اور وہ کسی سے باتوں میں مصروف ہو جاتیں۔ کبھی مرغیوں کی باتیں اور کبھی سامان کی باتیں۔ پر وہ کچھ خاص اندازہ نہیں لگا پائی تھی۔ تھک ہار کر باہر صحن میں تخت پہ آکر لیٹ گئی۔ کچھ دیر گزری کہ دادی بھی اس کے پاس آبیٹھیں۔ کچھ چپ چپ سی وہ فٹافٹ ٹانگیں سمیٹ کے اٹھ بیٹھی۔ اسے انڈوں والی نوکری کی بھی فکر تھی، جو ابھی تک وہ خالہ زہرہ کو پکڑا نہیں سکی تھی۔ آٹے والے کنستر کے اندر پڑی تھی۔ دادی آج موقع ہی نہیں دے رہی تھیں۔

"دادی کیا بات ہے؟ کیوں چپ چپ ہیں؟ اور سارے گھر میں کیا اتھل پتھل مچا رکھی ہے۔؟" وہ زیادہ دیر سسپنس برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

"بس ہانیہ! آج میں نے تیرے باپ کی بات مان ہی لی۔ رات فون آیا تھا اس کا، تیرے سونے کے بعد کل تیری خالہ دن ڈال گئی ہے شادی کا۔" ہانیہ کے چہرے پہ ڈھیر ساری خوشی چمکنے لگی۔

"مجھ سے کہنے لگا، اماں اب بس کریں، چھوڑ دیں ضد مکان کو تالا ڈالیں اور آجائیں اپنے بچوں میں۔ آپ کی زندگی تک مکان کہیں نہیں جاتا۔ بس آپ آجائیں اب، سوچ رہی ہوں اب تیری شادی ہو جائے گی تو پھر کسی پوتی یا نواسی کو زبردستی باندھوں گی۔ تو کیوں نا خود ہی بچوں کے بیچ چلی جاؤں۔ حق ہاہ! پرانا محلہ ہے۔ چھوڑنے کا دکھ تو ہو گا نا۔ کیسے ہم دو اکیلی عورتوں نے اس گھر میں رہ لیا۔ صرف اس لیے کہ سب سنگی ساتھی ہیں۔ میں تو......"

"دادی! عورت کس کو کہا؟ اب اتنا بھی اندھیر نہیں۔" اتنے انہماک سے سنتی ہانیہ کو صرف یہ لفظ سوئی کی طرح چبھا تھا۔

"اچھا چلیں اداس نہ ہوں۔ وہاں سب اپنوں میں جائیں گی تو آپ کو ادھر کی یاد بھی نہ آئے گی۔" پھر ایک دم اچھل کر بولی۔

"دادی! مرغیاں! ان کا کیا کرنا ہے۔؟"

"دے دوں گی۔"

"دے دیں گی۔ زبردست، یہ کی ہے تاجیالوں والی بات۔ ویسے بھی ان کا کیا کرنا ہے اب ذبح کرتے آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔ انڈوں کو بے چاریوں کے ویسے ہی "ڈکا" لگ گیا ہے۔ اچھا ہے کسی کو دے دیں۔ دعائیں دے گا۔ ہمیں تو نصیب نہ ہو سکا ان کا لذیذ گوشت کوئی اور کھائے گا، جان بنائے گا تو دل پہ آرے تو چلیں گے پر کیا کیا جا سکتا ہے؟" اس کے لہجے میں افسوس تھا (مصنوعی)

"اب ان پچیس مرغیوں پلس تین مرغوں کو ساتھ ساتھ کہاں لے...؟" وہ اپنی دھن میں خوشی کے مارے بولتے جا رہی تھی کہ ایک بار پھر دادی کے تھپڑ نے ہی ہوش دلایا۔

"پٹر پٹر کرتی جایا کر بس۔ جتنی لمبی تیری زبان ہوتی جا رہی ہے نا باپ کو کہہ جہیز میں ایک ملازمہ اس کو اٹھانے کے لیے بھی دے دے۔" دادی نے تو شرمندہ کرنے کی خوب کوشش کی پر اسے شرم ذرا کم ہی آتی تھی۔ سو ابھی بھی دانت نکالتے ہوئے بولی۔

"بالکل یہی بات آج سے دس ماہ پہلے امی بھی ابو جی سے کہہ چکی ہیں۔ میرے یہاں آنے سے پہلے، کتنے ملتے ہیں آپ کے اور آپ کی بہو کے خیالات ہیں نا۔" پر دادی اس بات سے متفق نہیں تھیں سو بولیں۔

"اچھا یہ بتا تیری خالہ کی کوٹھی کتنی بڑی ہے؟" دادی نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

"اچھی خاصی ہے۔ لان بھی بہت بڑا ہے۔ آگے پیچھے صحن بھی وسیع ہے۔ کیوں آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟ آپ نے تمبو لگوانے ہیں۔؟" وہ ابھی بھی شرارت سے باز نہیں آئی تھی۔

"تمبو نہیں پاگل، پنجرہ بھجوانا ہے۔ مرغیوں سمیت۔ تیری خالہ سے فون پہ بات ہو گئی ہے میری۔ میں نے تو اسے فون کیا تھا کہ اس کا داماد ڈنگروں کا ڈاکٹر ہے، ذرا پوچھوں تو میری چنگی بھلی مرغیوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کہنے لگی اماں جی! آپ نے تو شہر آ ہی جانا ہے۔ مرغیاں مجھے دے دیں۔ میں دیکھ بھال کر لوں گی۔ ان کی جگہ بدلے گی تو ٹھیک ہو جائیں گی۔ ویسے بھی مجھے بڑا شوق ہے مرغیاں پالنے کا۔ گھر کے انڈے، گھر کا گوشت اور ہانیہ کو بھی آپ کے ساتھ رہ کر انہیں سنبھالنے کا تجربہ تو ہو ہی گیا ہو گا۔ اب ہم دونوں مل کر دیکھ بھال کر لیں گی۔ آپ بس انہیں میرے حوالے کر دیں۔"

میں تو جیسے سکون میں آگئی ہانیہ! انہیں تو میں نے سوچ لیا تھا کہ جاتے وقت انہیں زہرہ کو دے جاؤں گی۔ پر اللہ بھلا کرے تیری ساس کا، میری مشکل آسان کر دی۔ ان شاء اللہ کل تیری سسرال سے کوئی بندہ پک اپ لائے گا اور مرغیاں لے جائے گا میری بچی کو سسرال میں بھی روز انڈے کھانے کو ملیں گے۔ خوش رہ بس۔ چل اب اٹھ تھوڑا تھوڑا کر کے سامان سمیٹنا شروع کر۔ پرسوں تک چلے جائیں گے ہم اٹھ شاباش۔" دادی اس پہ بڑا ہی "فیوی ڈرون اٹیک" کر کے اندر جا چکی تھیں۔ اور ہانیہ کو لگ رہا تھا جیسے وہ خود بھی مرغی ہے۔ جس کے آگے بھی مرغی پیچھے بھی مرغی، دائیں بھی اور بائیں بھی اور انڈوں کا تو حساب ہی نہیں تھا۔ وہ بڑی بری پھنسی تھی۔ دادی کو سچ بتاتی تو مرغیاں تو اس کے سسرال ہر حال میں پہنچنی ہی تھیں پر جو درگت اس کی بنتی تھی۔ وہ بھی یادگار رہتی۔ کس بری طرح سے ان مرغیوں اور انڈوں کے بیچ اس کا فنڈا بن گیا تھا اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں تو دادی تھیں کہہ سن لیتی تھی۔

سسرال میں کس سے کہنی اور کس نے سننی؟ ادھر تو ساس نے خود اس کا "چکن تکہ" بنا دینا تھا۔ اب بہتری اس میں تھی کہ خاموش رہے اور "انڈے" کھائے نہیں تو بولنے سے صرف ایک چیز کھانے کو ملنی تھی اور وہ تھے۔ "چھتر"

آؤ سناؤں۔ تمہیں انڈے کا فنڈا۔
نہیں پیارے، یہ کوئی معمولی بندہ۔
اس میں چھپا ہے۔ جیون کا فلسفہ
انڈے کا فنڈا، انڈے کا۔

خالہ زہرہ کے گھر بھونپو پھر بج اٹھا تھا۔ اور ہانیہ نے غصے اور بے بسی سے تخت پر لیٹ کر سر تک کھیس تان لیا۔ کیونکہ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

☼ ☼

نبیلہ عزیز

دردِ ساحل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل حور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۱۲ بارہویں قسط

نگارش بیڈ روم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو عبداللہ سامنے ہی بیڈ پہ بیٹھا اسی کا انتظار کرتا دکھائی دیا تھا۔ نگارش کے لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ دروازہ بند کرکے بیڈ کے قریب آئی اور چائے کا کپ عبداللہ کی سمت بڑھا دیا تھا۔ لیکن عبداللہ نے کپ تھاما مگر اس کی کلائی سمیت۔

"آرام سے عبداللہ' چائے گر جائے گی۔" نگارش نے اسے روکا' لیکن وہ اسے گھور کے دیکھ رہا تھا۔

"میں ہمیشہ ہر معاملے میں آرام سے ہی پیش آتا ہوں' لیکن تم میرے اس آرام اور تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہو۔" وہ نگارش کے ہاتھ سے کپ لے کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھ چکا تھا۔

"میں ناجائز فائدہ اٹھاتی ہوں؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟" نگارش اپنی مسکراہٹ دبا کے بولی تھی۔

"جب بھی کسی کام سے جاتی ہو' واپس آنے کا نام نہیں لیتیں' اور اگر آتی بھی ہو تو دیر لگا کے۔" عبداللہ نے اسے آہستگی سے کھینچ کے بیڈ پہ بٹھا لیا تھا۔

"اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے' بیڈ روم کے اندر آپ ہوتے ہیں اور بیڈ روم کے باہر آپ کی بہن ہوتی ہے اور ظاہر ہے میں نے تو دونوں کو ٹائم دینا ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"ارے! اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ وہ تو چار دن کی مہمان ہے' چند دنوں تک چلی جائے گی' تم اپنی بات کرو' تم کیا کرو گی پھر؟"

"پھر میں وہ ہی کروں گی جو آپ کہیں گے۔" وہ ہلکے سے مسکرائی۔

"عبداللہ! مجھے کچھ کہنا تھا آپ سے۔" اس نے بمشکل اپنے ہوش و حواس قابو میں رکھتے ہوئے کہا تھا' ورنہ عبداللہ اپنے جذبات سمیت اس پہ حاوی ہو رہا تھا۔

"ابھی نہیں' پھر کبھی۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

"لیکن عبداللہ۔"

"نگارش پلیز یار! اس وقت تمہارے سوا کوئی بات اچھی نہیں لگ رہی' ایسے میں اگر کچھ کہہ دو گی تو سر کے اوپر سے گزر جائے گا' اس لیے اپنی بات کل کے لیے اٹھا رکھو۔" عبداللہ کے کہنے پر نگارش کے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی' اس نے مجبوراً "ہتھیار ڈال دیے تھے۔"

صبح سنڈے تھا' اس لیے جلدی اٹھنے کی فکر نہیں تھی' وہ دونوں خوب گہری نیند سوئے اور ابھی نہ جانے کتنی دیر تک سوتے کہ اچانک بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا عبداللہ کا موبائل بجنے لگا' رنگ ٹیون کا میوزک بجتے ہی اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی' اس نے موبائل اٹھا کر نمبر دیکھا تو اسکرین پہ بابا جان کا نمبر جلتا بجھتا دکھائی دیا' جسے دیکھ کر عبداللہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا' وہ یک دم اٹھ بیٹھا تھا۔

"السلام علیکم بابا جان۔" اس نے محبت اور اشتیاق سے لبریز لہجے میں کہا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" وہاں سے نپا تلا سا جواب آیا تھا۔

"بابا جان کیسے ہیں آپ؟ آج... آج میں اتنا خوش قسمت کیسے ہو گیا؟" اس کی خوشی اس کی آواز اور لہجے سے جھلک رہی تھی۔

"ہم نے تمہیں تمہارے لیے فون نہیں کیا' ہم نے تمہیں زری کے لیے فون کیا ہے۔" انہوں نے اس کی خوشی پل میں ختم کر ڈالی تھی۔ وہ چپ کا چپ رہ گیا تھا اور چند ثانیے تو کچھ کہہ ہی نہیں سکا تھا' لیکن وہ ان کے سامنے جذباتی ہو کر کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا' اسی لیے اپنے آپ کو کنٹرول کرتے ہوئے آپے میں ہی رہنا پڑا۔

"زری کے لیے فون کیا ہے؟ خیریت۔" اس کے لب و لہجے میں بھی سنجیدگی اتر آئی تھی۔

"اسے پاکستان کب بھیج رہے ہو؟"

"پاکستان... کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں سمجھا نہیں؟" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"کیا ساری زندگی اسے کنواری بٹھانا چاہتے ہو؟" انہوں نے طنزیہ کہا۔

"دیکھیے بابا جان! آپ جو کہنا چاہتے ہیں صاف صاف کہیں' مجھے پہیلیاں سمجھ نہیں آتیں۔" اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"برخوردار! بات ویسے ہی صاف صاف ہے' اس کی شادی نہیں کرنی کیا؟ اس کے لیے رشتہ آیا ہے' اسے پاکستان بھیجو' رشتہ طے کرنا ہے اس کا' شادی کرنی ہے اس کی۔" وہ کافی سخت اور دبنگ انداز میں بول رہے تھے۔ عبداللہ ان کی بات سن کر ٹھٹک گیا تھا۔

"زری کے لیے رشتہ آیا ہے؟" وہ جیسے دہرا کے بولا تھا اور اس کے قریب ہی بیڈ پہ جاگی سوئی سی نگارش بھی اس بات پہ یک دم اٹھ بیٹھی تھی۔

"ہاں! اس کے لیے رشتہ آیا ہے' پہلے بھی دو' تین اچھے رشتے آئے تھے' لیکن اس کی پڑھائی کے شوق اور تمہاری ضد کی وجہ سے ان رشتوں کو انکار کر دیا تھا' لیکن اب یہ رشتہ ایسا ہے کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا' اس لیے اسے ایک مہینے کے اندر اندر واپس پاکستان بھیجو' بہت ہو گئی پڑھائی' پانچ سال ہونے والے ہیں آخر۔" وہ زری کی واپسی کا حکم جاری کر رہے تھے۔

"ایم سوری بابا جان! وہ اپنی پانچ سال کی محنت اور شوق ادھورا اور آخری اسٹیج پہ چھوڑ کے نہیں آسکتی' اس کا لاسٹ سمسٹر چل رہا ہے اور ایگزامز بھی بس چند روز میں اسٹارٹ ہونے والے ہیں' ایک مہینے سے زیادہ ٹائم لگ جائے گا' آپ انتظار کر سکتے ہیں تو ٹھیک ہے' ورنہ اس رشتے سے بھی انکار کر دیں۔" عبداللہ' زری کے معاملے میں کوئی کمپرومائز نہیں کرتا تھا' زری اسے بہت عزیز تھی' کیونکہ وہ تھی ہی ایسی' نرم اور ٹھنڈی میٹھی شہد آگیں لہجے والی' صابر اور شاکر' وہ اس کے ساتھ کوئی زبردستی یا ناانصافی نہیں ہونے دے سکتا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ عورت ذات ہے وہ' اس کے لیے شادی ضروری ہے یا پڑھائی۔" وہ غصے سے بولے تھے۔

"دونوں چیزیں ضروری ہیں' پہلے پڑھائی' پھر شادی۔" عبداللہ نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

"دماغ چل گیا ہے تمہارا' ولایت کے آزاد ماحول میں رہ' رہ کر عزت اور غیرت کے نام کو بھی بھول گئے ہو' بہن کو اپنے نقش قدم پر چلانا چاہتے ہو۔" وہ فون میں ہی دھاڑنے لگے تھے۔ ان کی آواز ایئرپیس سے باہر تک سنائی دینے لگی تھی۔

"تو کیا آپ کے نقش قدم پہ چلنے دوں؟ عزت' غیرت اور جاگیر کے نام پہ دلوں کو اجاڑ دوں؟ نام نہاد عزت' نام نہاد غیرت اور نام نہاد جاگیر کی خاطر اپنے سگے اور قابل احترام رشتوں کو خوف زدہ کر دوں؟ بری نظر رکھوں؟ یا پھر... یا پھر شیریں کی طرح اسے بھی کسی چوہدری کی چوہدراہٹ میں دے دوں؟ تاکہ وہ اس چوہدری کی پہلی بیویوں اور ان

کے بچوں کو پالتی رہے؟ ہونہہ! یہ خوش فہمی ہے آپ کی' آپ زری پہ کوئی زور زبردستی نہیں کرسکتے' میں اسے ساری زندگی کنواری بٹھا کر اس کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں' لیکن اسے کسی چوہدری کے پاؤں کی جوتی نہیں بنا سکتا۔" وہ دبے لہجے میں چبا کر بولا تھا۔

"تو تم اپنے باپ سے متھا لگاؤ گے۔" وہ غرا کے بولے تھے۔

"میری اتنی مجال کہاں بابا جان؟ میں بھلا کون ہوتا ہوں آپ سے متھا لگانے والا؟ آپ والد محترم ہیں ہمارے' آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پہ' لیکن میں معذرت چاہتا ہوں آپ سے' زری کے معاملے میں' میں آپ کا کوئی حکم نہیں مان سکتا' وہ پاکستان آئے گی تو اپنی اسٹڈی کمپلیٹ کرکے اور دوسری بات کہ شادی اس کی پسند اور مرضی کے بغیر نہیں ہوگی' شہرین والا معاملہ زری کے ساتھ نہیں ہوگا۔" اس نے بابا جان کو واضح الفاظ میں بتا دینا اور سمجھا دینا ضروری سمجھا تھا۔

"تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ سخت انداز میں بولے۔

"جی! کافی اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

"تم بھول رہے ہو کہ میں تمہارا باپ ہوں' اگر ضد پہ آگیا تو ولایت مجھ سے دور نہیں ہے' میں وہاں بھی آسکتا ہوں۔" انہوں نے گویا دھمکی دی۔

"شوق سے آئیے' لیکن یہ بھی یاد رکھیے کہ ہوگا وہی جو زری چاہے گی' یہ ملکہ الزبتھ کی ریاست ہے' آپ کی جاگیر نہیں ہے' یہاں عورت کی ویلیو ہے' مرد کو تو کوئی جانتا بھی نہیں' یہاں صرف عورت ایک فون کال کرتی ہے اور مرد جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا ہے' آپ سوچ لیجیے کہ آپ نے کیا کرنا ہے؟ اگر آپ زری کے لیے آنا چاہتے ہیں تو کبھی آنے کا سوچیے گا بھی مت' اور اگر آپ ہم سے ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں تو آپ کا ریٹرن ٹکٹ میری طرف سے۔" عبداللہ بھی ان ہی کا بیٹا تھا' اس نے باتوں باتوں میں انہیں بہت کچھ جتا دیا تھا' جسے سن کر انہوں نے یک دم غصے سے فون بند کر دیا تھا اور عبداللہ موبائل کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے موبائل سائیڈ ٹیبل پہ ڈال دیا تھا۔

"کیا بات ہے عبداللہ؟ بابا جان کیا کہہ رہے تھے؟" نگارش نے پریشانی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی اور سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھا کر سگریٹ سلگا لیا تھا۔

"آپ زری کے بارے میں بات کر رہے تھے' آپ زری کو پاکستان بھیج دیں گے؟" نگارش عبداللہ سے بھی زیادہ متفکر ہو رہی تھی۔

"ارے یار نہیں بھیج رہا۔" عبداللہ سر جھٹکتے ہوئے جھنجلا کر بولا تھا اور نگارش اس کا موڈ دیکھ کر چپ ہو گئی تھی' وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سگریٹ پھونک رہا تھا' وہ اسے اس کے حال پہ چھوڑ کے اٹھ کر واش روم میں چلی گئی' کافی دیر بعد شاور لے کر باہر نکلی تو عبداللہ کھڑکی میں کھڑا نظر آیا تھا' وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی اور اپنے بال سنوارنے لگی' عبداللہ ہنوز گہری سوچ میں گم تھا۔

"آپ شاور لے لیں' میں ناشتا بناتی ہوں۔" وہ دوپٹہ اٹھا کر پھیلاتے ہوئے عبداللہ سے مخاطب ہوئی تھی۔

"ٹھہرو۔" عبداللہ کی آواز پہ اس کے قدم ٹھہر گئے تھے۔

"جی؟"

"ادھر آؤ۔" اس نے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے قریب آگئی۔

"رات کو تم کچھ کہنا چاہتی تھیں؟"

"جی! مگر ابھی مناسب نہیں۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"تو پھر یہی بات ہے جیسی آپ چھپا رہے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"جی نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"نگارش....." عبداللہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"تو پھر آپ بتائیں نا کیا مسئلہ ہے' بابا جان کیا کہہ رہے تھے؟ زری کے رشتے کی بات کر رہے تھے آپ لوگ؟" نگارش بھی جواباً خفگی سے بولی تھی اور عبداللہ چند ثانیے کے لیے خاموش سا ہو گیا' پھر اسے ساری بات نگارش کو بتانا پڑی تھی' جسے سن کر نگارش بدک گئی تھی۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے بھلا؟ وہ یہاں سے پڑھ لکھ کر جائے اور وہاں کسی پینڈو' جاہل اور اجڈ کی خدمت گزاری کرے' وہ ان چیزوں کو سہنے والی نہیں ہے' آپ نے بابا جان کو بتایا کیوں نہیں کہ زرین' شہرین نہیں ہے' وہ شہرین تھی جو سب کچھ سہہ گئی' یہ تو ایک دن میں مرجائے گی' ہاں اسے مارنا چاہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہے' پھر جیسا چاہیں کر سکتے ہیں۔" نگارش زری کے لیے تڑپ اٹھی تھی اور عبداللہ بے ساختہ نگارش کو دیکھے گیا تھا' وہ اس کے دیکھنے پہ ٹھٹک گئی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"دیکھ رہا ہوں کہ اتنی محبت ہے تمہیں زری سے؟" عبداللہ کی بات پہ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے اور چہرہ جھکا لیا تھا۔

"سچ ہے عبداللہ' میں زری کو آپ کی بہن نہیں' اپنی بہن سمجھتی ہوں اور اپنے بہن' بھائیوں کے لیے کوئی بھی برا نہیں سوچ سکتا..... بلکہ میں تو شروع سے ہی زری کے لیے کچھ اور سوچتی ہوں۔" نگارش نے بالآخر کہہ ہی دیا تھا۔ عبداللہ نے چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔

"کچھ اور؟ کیا مطلب؟" "مطلب کہ اس کی شادی کے حوالے سے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "کیا سوچتی ہو اس کی شادی کے حوالے سے؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور نگارش بھی اس کے برابر کھڑکی سے لگ کے کھڑی ہو گئی' باہر کا موسم آج پھر ابر آلود ہو رہا تھا۔

"نبیل بھائی اور دل آور بھائی کسی بھی لڑکی کے لیے آئیڈیل شوہر ثابت ہوسکتے ہیں' میں جب بھی ان دونوں کو دیکھتی ہوں تو مجھے زری کا خیال آتا ہے اور مجھے لگتا ہے زری کی جوڑی دل آور بھائی کے ساتھ ہی سج سکتی ہے' کسی اور کے ساتھ نہیں۔" نگارش نے بات کرتے ہوئے نبیل کا ذکر بھی شامل کر لیا تھا' تاکہ عبداللہ کو شک نہ گزرے اور دوسری طرف عبداللہ' نگارش کی بات سن کر ششدر سا کھڑا تھا۔ نگارش کتنی بڑی بات کہہ گئی تھی۔

"عبداللہ! کیا زری کی شادی دل آور بھائی سے نہیں ہوسکتی۔ وہ تو جس کا بھی نصیب بنیں گے خوش قسمت کہلائے گی وہ۔" نگارش اس سے پوچھ رہی تھی اور عبداللہ کچھ کہنے کی بجائے گم سم سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"عبداللہ! آپ چپ کیوں ہو گئے؟ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے؟" نگارش نے اس کا بازو ہلایا تھا۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے نگارش؟ اک ناممکن سی بات کہہ رہی ہو تم۔"

"اس جہان میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے عبداللہ' بس کرنے کی نیت ہونی چاہیے۔" وہ اسے اکسا رہی تھی کچھ کہنے پہ اور کچھ کرنے پہ۔

"نگارش! دل آور میرا دوست ہے' ہم اک دوسرے کے سامنے سر اٹھا کر رہتے ہیں اور آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرتے ہیں' نہ تو وہ میری بہن کے بارے میں اس حوالے سے سوچ سکتا ہے اور نہ ہی میں اسے کچھ کہہ سکتا

ہوں۔" وہ حیرانی اور بے یقینی سے کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ کچھ نہیں کرسکتے' لیکن اگر وہ کچھ کہے تو پھر آپ کی کیا رائے ہوگی....؟" وہ اس کا عندیہ جاننا چاہتی تھی۔

"میں فی الحال اس ٹاپک پہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے لیے جتنی زری اہم ہے اتنا ہی دل آور بھی اہم ہے۔ لیکن ان دونوں کے بارے میں کبھی سوچا نہیں ہے اس لیے رائے دینا مشکل کام ہے' پلیز میں پہلے ہی ٹینس ہوں مجھے مزید نہ الجھاؤ۔"

"ٹھیک ہے میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کرتی لیکن جب آپ زری کی شادی کا سوچیں تو دل آور بھائی کو بھی سوچیے گا۔" نگارش نے زور دے کر کہا اور وہاں سے ہٹ گئی تھی لیکن عبداللہ پہ نئی سوچ کے در وا کر گئی تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا اور دوسری طرف ذہن میں بابا جان کی باتیں گردش کر رہی تھیں....

☼ ☼ ☼

"منصور حسین....! تجھے دیکھ کر میں اک بات سوچ رہا تھا۔" عارف نے بڑی دلچسپی سے کہا تھا۔ منصور حسین ابھی ابھی نہا کر آیا تھا پرانی سی جینز پہ بدرنگ سی بنیان پہنی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی دلکش رنگت اور کسرتی جسم کے مضبوط مسلز بے حد نمایاں ہو رہے تھے جن کو دیکھ کر عارف کی نظروں میں ستائش اتر آئی تھی۔ اور وہ کہے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

"کیا سوچ رہے تھے مجھے دیکھ کر....؟" منصور حسین نے دلچسپی سے پوچھا اور تولیے سے بال رگڑتا ہوا کمرے میں لٹکے چھوٹے سے شیشے کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"تمہارے چہرے کی داڑھی صاف کروا کے' تمہارے بالوں کی کٹنگ کروا کے' تمہیں نئے اور امیروں والے کپڑے پہنا کر سامنے لایا جائے تو قسم سے مجھے پورا یقین ہے تمہارے جیسا جوان پورے شہر میں نہیں ہوگا۔" عارف نے بڑے شوق اور بڑے جوش سے کہا تھا جس پہ منصور حسین یکدم فلک شگاف قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور اس کے قہقہے کی گونج کافی دور تک گئی تھی۔

"اچھا! تو تم مجھے تصور کی آنکھ سے امیروں والے حلیے میں دیکھتے ہو....؟" منصور حسین کو عارف کی بات بہت دلچسپ لگی تھی۔

"ہاں یار! تمہاری چال ڈھال ہی ایسی ہے' لیکن تمہیں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے' تمہیں کسی امیر گھرانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا' بس غلطی سے غریب گھرانے کے فرزند بن گئے ہو۔" عارف افسوس سے کہہ رہا تھا لیکن منصور حسین کو کوئی افسوس نہیں تھا وہ جس گھرانے میں پیدا ہوا تھا وہ اسی پہ خوش تھا۔

"یار! امیری اور غریبی پہ اتنا افسوس یا خوشی نہیں ہونی چاہیے' یہ سدا رہنے والی چیزیں نہیں ہیں' نہ کوئی ہمیشہ امیر رہتا ہے اور نہ کوئی ہمیشہ غریب رہتا ہے' وقت اور حالات بدلتے رہتے ہیں' اللہ میرا ساتھ دے تو میں اپنے زور بازو پہ اپنے حالات بدل سکتا ہوں اور جو چیز بدل سکتی ہے اس پہ افسوس کیسا....؟" منصور حسین کی بات ہی ایسی تھی کہ عارف کو متاثر ہونا پڑا تھا اور اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"ہاں یار! یہ بھی تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو' لیکن یار میں چوکیدار ہوں اور تم ڈرائیور' اب تم یہ بتاؤ کہ چوکیداری کر کے یا ڈرائیوری کر کے حالات کہاں تک بدلے جا سکتے ہیں....؟" عارف کے لب و لہجے میں مایوسی کا رنگ تھا۔

"تو کس نے کہا ہے کہ ساری زندگی چوکیداری کرتے ہی گزار دو' اس سے اچھا اور بہتر کام ملے تو وہ کر لو' میں بھی دیکھتا ہوں کہ اس ڈرائیوری میں میرے گھر کے حالات کہاں تک بدلتے ہیں؟ اگر نہ ہوا تو کہیں اور ہاتھ پاؤں مار لوں گا۔" اس نے لاپروائی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

"یار! تم جانتے تو ہو کہیں اور ہاتھ پاؤں مارنا آسان نہیں ہے۔ آج کل کام کہاں ملتا ہے اور اگر ملتا ہے تو حالات بدلنے والا نہیں ملتا۔" عارف نے گہری سانس کھینچی تھی۔

"عارف صاحب! تم اللہ کے بندے ہو' اور اللہ کے بندے اللہ سے مایوس نہیں ہوتے' اور وہ کیا کہتے ہیں کہ کوشش کرنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے تم کام کی بات کرتے ہو....؟ کوشش کرو میری جان تمہیں سب کچھ ملے گا' خدا بھی اور خدا کی خدائی بھی۔" منصور حسین نے پلٹ کر عارف کے کندھے پہ تھپکی دی تھی اتنے میں مبارک خان اس کے کوارٹر میں داخل ہوا تھا جسے دیکھ کر منصور حسین مسکرا دیا تھا۔

"دیکھو مبارک خان بھی تو ہے نا' جو کبھی مایوس نہیں ہوا۔" اس نے مثال دی عارف بھی سر ہلا کر مسکرایا تھا۔

"کیا ہوا ہے اسے....؟" اس نے عارف کا پوچھا۔

"چند منٹوں کے لیے حالت افسوس میں گیا ہے بس' پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے ابھی اس حالت سے نکل آئے گا۔" منصور حسین نے مبارک خان کو تسلی دی۔

"حالت افسوس میں گیا کیوں تھا....؟" مبارک خان نے وجہ پوچھی۔

"غریب بندہ ہے' کسی بھی وقت حالت افسوس میں جا سکتا ہے اس پہ پابندی تو نہیں ہے نا۔" منصور حسین عارف کی طرف داری کر رہا تھا۔

"چلو پھر غریب بندے کی دلجوئی بعد میں کر لینا پہلے اپنے کام پہ جاؤ۔" اس نے منصور حسین کو اشارہ کیا تھا۔

"کام پہ....؟"

"ہاں' وہ علیزے بی بی نے کہیں جانا ہے شاید۔" مبارک خان اسے بلانے آیا تھا۔

"جانا کہاں ہے....؟"

"شاپنگ پہ جانا ہے شاید ساتھ میں عون اور عدید صاحب بھی ہیں۔" مبارک خان نے اطلاع دی۔

"ٹھیک ہے پھر تم جاؤ میں آ رہا ہوں۔" منصور حسین الرٹ ہو گیا تھا فوراً شرٹ پہن کر اپنے جوتے پہننے کے لیے بیٹھ گیا۔

"جلدی آؤ' وہ ڈرائنگ روم میں تیار بیٹھی ہیں۔" مبارک خان کہہ کر پلٹ گیا تھا اور عارف کے ساتھ وہ بھی کوارٹر سے نکل آیا تھا وہ سیدھا گاڑی تک پہنچا تھا۔

اتنے میں مبارک خان کی اطلاع پہ علیزے بھی دونوں بھائیوں کے ساتھ حویلی کے مرکزی مین ڈور سے باہر آ گئی تھی منصور حسین نے انہیں دیکھتے ہی گاڑی کے ڈور کھول دیئے تھے۔ علیزے اور عدید بیک سیٹ پہ بیٹھے تھے جبکہ عون خود ہی ڈور کھول کر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا منصور حسین گاڑی کے تمام ڈور بند کر کے دوسری طرف سے گھوم کے آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا اس نے گاڑی اسٹارٹ کی ہی تھی کہ مین گیٹ بھی وا ہو گیا گاڑی فراٹے بھرتی روڈ پہ آ گئی تھی۔

"علیزے آپی! پہلے کہاں جانا ہے؟ آئس کریم پارلر یا شاپنگ سینٹر....؟" عون نے گردن موڑ کر پیچھے بیٹھی علیزے کو دیکھا تھا۔

"یہ تو تم دونوں کی پسند پہ ڈپینڈ کرتا ہے کیونکہ میں تم دونوں کے کہنے پہ ہی تو آئی ہوں۔" علیزے نے لاپروائی ظاہر کی۔

"واؤ! یعنی ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں؟ ہمیں کھلی چھوٹ ہے....؟" عون نے چہکتے ہوئے علیزے کو چھیڑا تھا۔

"زیادہ بھی کھلی چھوٹ نہیں ہے' بس آئس کریم یا پھر شاپنگ' اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں' میں نے انہی

دونوں چیزوں کا وعدہ کیا تھا۔" علیزے نے ان کو ہری جھنڈی دکھائی تھی۔

"آپی صاحبہ! آپ نے اپنا وعدہ ایفا کرنے میں اتنے دن لگا دیے ہیں اب تو قرض کے ساتھ سود بھی کافی بن چکا ہے' شاپنگ اور آئس کریم کے ساتھ ساتھ گھومنے پھرنے کا بھی حق بنتا ہے ہمارا اور آپ ہمیں ہمارے حق سے محروم نہیں کر سکتیں۔" عدید نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

"تم دونوں چیٹنگ کر رہے ہو' تم لوگوں نے کہا تھا کہ صرف آئس کریم کھانی ہے یا پھر شاپنگ کرنی ہے' اب یہ تیسرا حق کہاں سے نکل آیا۔؟" علیزے نے ان دونوں کی بے ایمانی پہ احتجاج کیا تھا۔

"ٹھیک ہے' ہم کچھ بھی نہیں کرتے' ہم واپس چلتے ہیں ڈرائیور! گاڑی واپس لو۔" پیچھے سے عدید نے شور مچا دیا تھا اور منصور حسین ان کے شور پہ گاڑی روکنے پہ مجبور ہو گیا تھا اور بے ساختہ بیک ویو مرر سے علیزے کو دیکھا اس کی دلفریب سی صورت پہ پریشانی کے سائے پھیل رہے تھے وہ ہکا بکا سی ان دونوں کی چالاکی دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم لوگ۔۔۔؟"

"ظاہر ہے خالی خالی شاپنگ کرنے کا بھلا کیا فائدہ؟ وہ تو ہم کسی کے ساتھ بھی جا کر کر سکتے ہیں' آپ ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہتیں تو بہتر ہے واپس حویلی چلے جاتے ہیں۔" عون نے کندھے اچکائے اور علیزے ان دونوں کی چالاکی اور ہوشیاری دیکھ کر بے بس ہو گئی تھی۔ گھر سے اتنی دور آ کر وہ واپس بھی جاتے تو اچھا نہ لگتا اور اگر واپس چلے بھی جاتے تو علیزے کو معلوم تھا کہ وہ دونوں ساری زندگی وعدہ نہ نبھانے پہ طعنے دے دے کر مار دیتے۔ اس لیے بہتر تھا کہ ان کی بات مان لیتی جو مشکل تو تھی لیکن ناممکن نہیں تھی۔"

"چلو ڈرائیور۔" علیزے نے اشارہ کیا۔

"کہاں؟" وہ ابھی بھی بیک ویو مرر سے دیکھ رہا تھا علیزے کی نگاہ اٹھی تو اسے اپنی سمت دیکھتے پا کر چہرے پہ ناگواری بکھر گئی تھی۔

"مارکیٹ۔" وہ ناگوار لہجے میں ہی بولی تھی۔

"صرف مارکیٹ۔۔۔؟" عون نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں! جہاں تم لوگ کہو گے وہاں بھی۔" وہ چڑ کے بولی۔

"ہائیو۔" انہوں نے یکدم نعرہ لگایا تھا اور منصور حسین نے گاڑی آگے بڑھا دی علیزے نے دو تین بار پھر وقفے وقفے سے مرر کی سمت دیکھا تھا لیکن اسے دوبارہ منصور حسین کی نظریں جھکی ہی نظر آئی تھیں بیک ویو مرر اس کی آنکھوں ــــــ سے خالی تھا اور وہ اپنے آپ کو اطمینان دلاتی دوبارہ سے عون اور عدید کے ساتھ باتوں میں لگ گئی تھی "پیپس" کے سامنے گاڑی پارک کی تو وہ تینوں بہن بھائی گاڑی سے اتر گئے تھے اور منصور حسین نے وہیں ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے بیٹھے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس نکال کر سگریٹ سلگا لیا اور تیلی کو پھونک مار کے بجھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا لیکن آگے بڑھتے ہوئے بلا ارادہ ہی عون کی نظر منصور حسین پہ پڑی تو اس کے قدم تھم گئے وہ آگے بڑھنے کی بجائے واپس منصور حسین کی سائیڈ پہ آ رکا تھا۔

"ایکسکیوز می۔" اس نے اسے متوجہ کیا منصور حسین نے چونک کر دیکھا تھا۔

"جی! کہیے؟" وہ الرٹ ہو گیا۔

"آپ اس گاڑی میں سگریٹ نہیں پی سکتے۔" عون جیسے حکم صادر کر رہا تھا۔

"کیوں؟ کیا یہ گاڑی موم کی بنی ہے یا پھر اس میں بم فٹ ہے۔۔۔؟" منصور حسین بھی عادت سے مجبور تھا کہے بغیر نہ رہ سکا' یہ دیکھے اور سوچے بغیر کہ جس سے وہ بات کر رہا ہے وہ اس کے مالک کا بیٹا ہے' کچھ بھی کہہ سکتا ہے اور کچھ بھی کر سکتا ہے۔

"نہ موم کی بنی ہے' نہ بم فٹ ہے' یہ گاڑی علیزے آپی کی ہے اور انہیں سگریٹ کی بو سے سخت الرجی ہے' ان کی وجہ سے آج تک حویلی میں کسی مرد نے اسموکنگ نہیں کی' اس لیے پلیز آپ بھی احتیاط کیجیے' ورنہ یہ اسموکنگ آپ کو جاب سے نکلوا بھی سکتی ہے۔" عون اتنا بڑا نہیں تھا لیکن اس لمحے علیزے کو خود سے کئی سال بڑا اور ذہین محسوس ہوا تھا۔

"اور ہاں! میری بات کو مائنڈ مت کیجیے گا۔ مجبوری ہے' آپ کو اگر اسموکنگ کی زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے تو گاڑی سے باہر آ جائیے۔" اس نے منصور حسین کو سگریٹ پینے کا حل بتایا تھا اور پلٹ کر علیزے اور عدید کے پاس آ گیا جو چند قدم کے فاصلے پہ کھڑے اس کی بات سن رہے تھے منصور حسن چند لمحے یونہی بیٹھا رہا' پھر گہری سانس کھینچ کر گاڑی سے نکل آیا تھا۔ لیکن اس نے انگلیوں میں دبے سگریٹ کو بجھانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ دور جاتے عون کو پیچھے تک دیکھتا تھا جس کی چال ڈھال اور بات کرنے کے انداز میں ہی امیری کا زعم تھا اور منصور حسین اس بچے سے کئی سال بڑا ہونے کے باوجود بھی اس کے سامنے بے بس تھا کیونکہ غربت اس کی مجبوری تھی ایسی مجبوری جس پہ کچھ دیر پہلے عارف افسوس کر رہا تھا اس کے افسوس کی وجہ منصور حسین کو محسوس ہو ہی گئی تھی کہ کبھی کبھی بندے کا جہاں بولنے کو دل چاہے وہ مجبوری کے مارے بول بھی نہیں سکتا!

☼ ☼ ☼

آنے سے اس کے آئے بہار جانے سے اس کے جائے بہار
بڑی مستانی ہے میری محبوبہ' میری زندگانی ہے میری محبوبہ

عدیل کے ساتھ فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے چھوٹا بڑی ترنگ میں گانا گنگنا رہا تھا اور چھیڑتی ہوئی معنی خیز سی نظریں عدیل پہ ہی مرکوز رکھی تھیں۔ عدیل جانتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کے لیے گنگنا رہا ہے۔ اسی لیے وہ سنی ان سنی کرتا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا سڑکوں پہ تو جیسے گاڑیوں کا سیلاب امڈ آیا تھا اور اس سیلاب میں سے گزرنا اور اپنے لیے راستہ بنانا بے حد دشوار ہو رہا تھا' تبھی وہ دونوں موقعے کی تلاش میں تھے کہ کب وقفہ پڑے اور وہ دونوں سڑک کراس کر کے دوسری فٹ پاتھ پہ چلے جائیں جہاں سے دوسرا بس اسٹاپ قریب تھا کیونکہ ان کے روٹ کی بس دوسرے بس اسٹاپ سے باآسانی مل جاتی تھی۔

"استاد! اتنے دن ہو گئے آپ کا اس حسینہ سے دوبارہ کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا۔" چھوٹے نے اسے چھیڑ ہی دیا عدیل نے گردن موڑ کر اسے دیکھا لیکن گھورتی ہوئی نظروں سے۔

"اس قیامت خیز ماحول میں تمہیں وہ حسینہ یاد آ رہی ہے۔؟" عدیل کی بات پہ چھوٹا بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

"تمہیں کیا پتا استاد قیامت خیز ماحول میں اگر کوئی حسینہ یاد آ جائے تو وہ بھی جنت خیز ہو جاتا ہے' یہ بدنما آوازوں والی گاڑیاں بھی خوش نما تتلیاں لگنے لگتی ہیں۔" چھوٹا سرور لیتے ہوئے بولا تھا اور عدیل اس کے انداز پہ بے ساختہ امڈنے والی مسکراہٹ نہیں روک سکا تھا جس کو دیکھ کر چھوٹا خود بھی ہنس پڑا۔

"پاگل ہو تم لوگ بھی۔" عدیل نے کہتے ہوئے سر جھٹکا اور مسکرا دیا۔

"پاگل نہیں' ہم لوگ درویش ہیں درویش جو بات کہہ دیں وہی ہوتی ہے اور میں نے تو پہلے روز سے ہی کہہ دیا ہے کہ وہ لندن پلٹ حسینہ ہمارے استاد کی ہے' اور دیکھ لینا استاد ایسا ہی ہو گا اور جس دن ایسا ہوا میں داتا دربار جا کر حاضری دوں گا اور زردے کی میٹھی دیگ چڑھاؤں گا وہ بھی اپنی محنت مزدوری کی کمائی سے۔" چھوٹا بڑے جوش و خروش سے اور پرعزم لہجے میں کہہ رہا تھا اور عدیل اس کی خوش فہمیوں پہ مسکراتا ہوا چھوٹے کا ہاتھ پکڑ کے سڑک کراس کرنے کے لیے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا لیکن انتہائی تیز رفتار گاڑی کے ٹائر بڑے زور سے

اک عجیب سالودیتا ہوا احساس تھا جو عدیل کے سینے کو چھو گیا تھا بس لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی بیٹھنے کے لیے سیٹ نہیں تھی کھڑے ہو کے سفر طے کرنا تھا اور بھی کئی لوگ کھڑے تھے اور ان میں وہ بھی شامل تھا مگر اک دلکش سا احساس لیے، عجیب سے مہکتے ہوئے جذبات کے ساتھ۔ اپنے جذبات کو لیے وہ گھر آیا تھا اور جیب سے وہ دلکش سا احساس نکال کر احتیاط سے اور آہستگی سے اپنے بستر کے سرہانے رکھ دیا تھا اور خود کپڑے اٹھا کر نہانے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا تھا لیکن جذبات اب بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

☼ ☼ ☼

شاپنگ کرنے اور کئی جگہوں پہ گھومنے پھرنے کے بعد وہ فارغ ہو چکے تو آئس کریم کے لیے شور مچا دیا تھا لیکن علیزے کی ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔

"پلیز عون! اب گھر چلتے ہیں۔" واٹر پارک سے نکلتے ہوئے علیزے نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا تھا۔

"بس اب صرف آئس کریم ہی تو رہ گئی ہے۔" وہ لاپروائی سے بولے۔

"دیکھو پلیز! میں بہت تھک گئی ہوں۔" وہ نڈھال سے انداز میں کہتی قریب آئی تو منصور حسین نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے منصور حسن کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اسے منصور حسین کی کاٹ دار اور بے باک آنکھیں ناگوار گزرتی تھیں۔

"لیکن ہم تو ابھی بھی نہیں تھکے۔" عدید نے کندھے اچکائے۔

"میں تم دونوں کی شکایت کروں گی بابا سے۔" اس نے دھمکی دی۔

"کوئی بات نہیں بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" وہ دونوں ہنس رہے تھے اور وہ انہیں گھور کے رہ گئی۔ جیسے ہی منصور حسین نے گاڑی اسٹارٹ کی علیزے کا دھیان اسموکنگ کی طرف چلا گیا اسے گاڑی میں سگریٹ کی بدبو محسوس ہوئی تھی اور اس کی پیشانی پہ سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔

"پلیز ڈرائیور! ایئر فریشنر آن کرو گاڑی میں سگریٹ کی اسمیل ابھی بھی ہے، میرا دماغ بھاری ہو رہا ہے۔" اس نے اپنی کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے کہا تھا عون اور عدید نے چونک کر علیزے کی سمت دیکھا وہ دونوں پریشان ہو گئے تھے جبکہ منصور حسین حیران پریشان رہ گیا تھا گاڑی میں ذرا سی بھی اسمیل نہیں تھی جو تھی وہ کب کی ختم ہو چکی تھی لیکن اس کی حس ــــ ایسی تیز تھی کہ وہ ذرا سی اسمیل بھی برداشت نہیں کر پا رہی تھی اور یہ حیرت، تعجب اور بے یقینی کا ہی تو مقام تھا اتنی نازکی بھی تو نہ کبھی دیکھی تھی نہ کبھی سنی تھی اسے تو روز حیرت کے جھٹکے لگتے تھے۔

"ڈرائیور! آپ ایئر فریشنر آن کر کے گاڑی کے تمام شیشے فولڈ کر دیں۔" عون نے تیزی سے کہا تھا اور حیران پریشان منصور حسین نے تیزی سے ایئر فریشنر کا بٹن پش کیا اور تمام کھڑکیوں کے شیشے فولڈ کر دیئے تھے باہر کی تازہ ہوا اندر آنے لگی تھی تب جا کے اس کا دماغ کچھ ٹھکانے پہ آیا تھا۔

"کسی کولڈ کارنر پہ گاڑی روکو۔" علیزے نے حکم جاری کیا تھا منصور حسین نے دائیں بائیں دیکھا قریب ترین کوئی بھی کولڈ کارنر نہیں تھا۔ تھوڑا آگے جا کر اسے آئس کریم پارلر دکھائی دیا تھا اور وہ گاڑی کی اسپیڈ بڑھا کر وہاں تک فوراً" پہنچا تھا۔

"آپ آئس کریم لیں گی یا کولڈ ڈرنک ــــ؟" منصور حسین خود ہی گاڑی سے اتر گیا تھا۔

"ملک شیک بنوا کے لے آؤ' علیزے آپی کولڈ ڈرنک نہیں لیتیں۔" عدید نے جواب دیا تھا۔

"اور آپ کے لیے؟" اس نے عون اور عدید دونوں کو دیکھا۔

"نہیں! ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔" وہ بے چارے دونوں ہی سہم چکے تھے منصور حسین بھی کافی پریشان ہوا تھا

وہ تیزی سے اندر گیا اور اس کے لیے ملک شیک بنوانے کے ساتھ ساتھ عون اور عدید کے لیے مینگو فلیور آئس کریم بھی لے آیا تھا۔ ان تینوں بہن بھائیوں کو چھوٹی سی ٹرے گاڑی کے اندر ہی مہیا کی تھی اس نے۔

"آپ نے کچھ نہیں لیا۔؟" عون اور عدید وغیرہ کو شروع سے خیرو بابا اور مبارک خان کے ساتھ بے تکلفی کی عادت تھی اسی لیے منصور حسین کے ساتھ بھی وہ اسی طرح سے پیش آ رہے تھے۔

"ضرورت نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔

"آئس کریم ضرورت کے لیے نہیں کھائی جاتی بلکہ شوق سے کھائی جاتی ہے۔"

"مجھے شوق بھی نہیں ہے۔"

"تو کیا آپ کو صرف اسموکنگ کا شوق ہے۔؟"

"ہاں! شوق تو ہے لیکن لگتا ہے کہ چھوڑنا پڑے گا۔" منصور حسین نے کہتے ہوئے اک نظر علیزے کی سمت دیکھا جس کے حواس ٹھکانے پہ آئے تو چہرے سے ہی فریش لگنے لگی تھی۔

"چھوڑ دیں تو اچھی بات ہے۔"

"اچھی بات تو ہے لیکن آسان بات نہیں ہے نا۔"

"کوشش کرنے سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔" عون نے بڑے بزرگوں کی طرح دلیل دی۔

"ہوں! کروں گا کوشش۔" اس نے کہتے ہوئے سر ہلایا تھا اور اتنے میں علیزے نے ملک شیک کا گلاس خالی کر کے ٹرے منصور حسین کی طرف بڑھا دیا تھا وہ احتیاط سے ٹرے اور بل لے کر واپس چلا گیا تھا واپس گاڑی میں آیا تو وہ تینوں بہن بھائی واپسی کے لیے تیار بیٹھے تھے منصور حسین نے گاڑی اسٹارٹ کر کے روڈ پہ ڈالی ہی تھی کہ علیزے کا موبائل بجنے لگا۔

"ہیلو آذر بھائی۔"

"السلام علیکم! علیزے ــــ کہاں ہو تم؟" آذر نے پریشانی سے پوچھا وہ اک پل بھی ادھر ادھر ہو جاتی وہ سب کے سب متفکر ہو جاتے تھے۔

"جی وہ میں عون اور عدید کے ساتھ آئی تھی انہوں نے مجھ سے شاپنگ کا وعدہ لیا تھا اس لیے پورا کرنا پڑا۔"

"علیزے! پاگل ہو گئی ہو تم؟ جانتی بھی ہو کہ حالات کیسے ہیں۔ پھر بھی تم ان بچوں کے ساتھ چلی گئیں ــــ؟"

آذر کو ہلکا سا غصہ آیا تھا۔ اور اس کے ذرا سے غصے پہ ہی علیزے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

"آذر بھائی! میں ان کے ساتھ اکیلی تو نہیں ہوں' ڈرائیور بھی ساتھ ہے' آپ اور پاپا خود ہی تو کہتے ہیں کہ جب ڈرائیور ساتھ ہو تو تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ روہانسے ــــ لہجے میں بولی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہو اور آذر بھائی اس کی غلطی پہ اس سے خفا ہو گئے ہوں۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں ٹائم کا اندازہ ہے کوئی ــــ؟ شام ڈھل چکی ہے اور اندھیرا بھی بس گہرا ہونے والا ہے؟" آذر اس کے لیے اتنا فکر مند ہو رہا تھا کہ بے دھیانی میں یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ الٹا علیزے کو پریشان کر چکا ہے اس کے آنسو بہہ نکلے تھے وہ خود کو رونے سے روک نہیں پائی تھی۔

"علیزے ــــ" آذر نے چونک کر بے تابی سے پکارا تھا وہ اس کی سسکی سن چکا تھا۔

"بھائی! میری کوئی غلطی نہیں ہے' بس وہ ضد کر رہے تھے' میں انہیں۔ منع نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے ہی اتنا ٹائم لگا دیا ہے۔" وہ دبے دبے سے انداز میں روتے ہوئے بے ربط سا بول رہی تھی اور آذر کی تو جان پہ بن آئی تھی وہ خواہ مخواہ اسے رلا بیٹھا تھا۔

"علیزے پلیز یار! رو مت، میں تمہیں ڈانٹ نہیں رہا، تمہیں صرف واپسی کا احساس دلا رہا ہوں۔ ڈیڈ بھی تمہارا پوچھ رہے تھے، انہوں نے ہی مجھے فون کرنے کو کہا ہے۔"

"لیکن بھائی! ہم تو واپس ہی آ رہے ہیں۔۔۔"

"اوکے! پھر فون بند کرو، میں انتظار کر رہا ہوں۔" آذر نے بات سمیٹتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا تھا اور علیزے نے بھی فون بند کر دیا مگر اس کے آنسو بند نہیں ہوئے تھے اس کا ذرا سا تو دل تھا اونچی آواز کی دھمک بھی نہیں سہہ پاتا تھا۔ منصور حسین، عون اور عدید تینوں خاموش بیٹھے تھے وہ اس کانچ کی گڑیا کو کب تک بہلاتے۔۔۔؟ اور دس منٹ بعد خدا خدا کر کے وہ لوگ واپس بڑی حویلی پہنچے تو شکر کا سانس لیا تھا۔ گاڑی گول روش پہ گھوم کر گیراج کی طرف آئی تو آذر بھی قریب آ گیا تھا۔ منصور حسین نے فوراً" اتر کر گاڑی کا دروازہ کھولا تھا نڈھال سی علیزے تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل آئی تھی۔

"علیزے! آر یو آل رائٹ۔۔۔؟" آذر نے فوراً" اسے کندھوں سے تھام کے سہارا دیا تھا۔

"مم۔۔۔ مجھے اندر جانا ہے۔" وہ اندر کی طرف بڑھنے لگی عون اور عدید بے چارے سہمے ہوئے کھڑے تھے کہ زیادہ ٹائم ویسٹ کرنے پہ انہیں اب ضرور ڈانٹ پڑے گی۔

"آؤ میرے ساتھ۔" آذر اسے ساتھ لیے اندر کی طرف بڑھ گیا تھا عون اور عدید بھی پیچھے پیچھے ہی گئے تھے جبکہ منصور حسین ڈگی کھول کے ان کے۔۔۔ بیگز نکالنے لگا عون، عدید اور علیزے تینوں نے ہی ڈھیر ساری شاپنگ کی تھی اس لیے بیگز بھی کافی زیادہ تھے وہ سارے بیگز اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر پلٹا تو مبارک خان مین ڈور سے باہر آتا دکھائی دیا۔

"یہاں کیوں کھڑے ہو منصور حسین۔۔۔؟" مبارک خان نے رک کر پوچھا۔

"یہ علیزے بی بی کے شاپنگ بیگز ہیں، کیا کروں۔۔۔؟" اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا اس کے مضبوط ہاتھوں کی انگلیاں شاپنگ بیگز کے بوجھ سے لدی ہوئی تھیں۔

"علیزے بی بی کے شاپنگ بیگز ہیں تو اندر پہنچا کر آؤ، وہ خود تو یہاں لینے نہیں آئیں گی نا؟ تھوڑا بہت خود بھی عقل سے کام لے لینا چاہیے۔" مبارک خان نے اسے سرزنش کی تھی منصور حسین چپ ہو گیا۔

"جاؤ، ان کا سامان اندر رکھ کے آؤ۔" اس نے راستے سے ہٹتے ہوئے کہا اور منصور حسین سر ہلا کر اندر آ گیا۔ اس نے حویلی کے اندرونی حصے میں پہلی بار قدم رکھا تھا اور آنکھیں چکا چوند ہو گئی تھیں آبنوسی مین ڈور سے لے کر کوریڈور کے سنگ مرمر سے مزین چمکتے فرش تک ہر چیز کمال تھی۔

طویل کوریڈور میں تقریباً" پانچ درمیانے سائز کے فانوس لٹکے ہوئے تھے اور پانچوں کا ایک ہی ڈیزائن تھا دیواروں کے ساتھ کچھ قدیمی اور کچھ جدید دور کے مناظر کی فریم شدہ سینریاں اور تصاویر سجی ہوئی تھیں وقفے وقفے سے چار پانچ آبنوسی لکڑی کے ڈیکوریشن کارنر رکھے ہوئے تھے جن پہ کچھ کرسٹل پیسز اور کچھ جانوروں کے آرٹی فیشل اجسام سجا رکھے تھے جن میں شیر اور ہرن سرفہرست تھے بڑے بڑے قیمتی گلدانوں میں مختلف قسم کے ان ڈور پلانٹس بھی موجود تھے اور منصور حسین سوچ رہا تھا کہ جن کا کوریڈور اتنا لگژری ہے ان کے بیڈ رومز اور باقی گھر کا کیا حال ہو گا۔۔۔؟ وہ کوریڈور کی خوبصورتی میں مگن کب کوریڈور کے آخری سرے پہ پہنچ گیا۔۔۔ پتا ہی نہ چلا تھا چونکا تو وہ اس وقت جب اس کی سماعتوں سے وقار آفندی کی آواز ٹکرائی تھی لیکن آواز اتنی حلیم اور چاشنی لیے ہوئے تھی کہ منصور حسین پلٹ کر دیکھنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

"میری جان، میری گڑیا، آذر نے تمہیں بھلا کب ڈانٹا ہے؟ وہ تو صرف تمہارے لیے پریشان ہو رہا تھا، شام گہری ہو چکی تھی اور تم لوگ واپس ہی نہیں آ رہے تھے، پہلے بھی تمہارے ساتھ اتنا سنگین حادثہ پیش آ چکا ہے اب پھر

کچھ ہو جاتا تو۔؟" وقار آفندی ڈرائنگ روم کے جہازی سائز صوفے پہ بیٹھے علیزے کا سر اپنے کندھے سے لگائے تھپک رہے تھے اور وہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔

"علیزے! دیکھو اگر تم اب بھی چپ نہ ہوئیں تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا تم نے ذرا سی بات پہ مجھے مجرم بنا دیا ہے' میں گلٹی فیل کر رہا ہوں۔" آذر اور وقار آفندی اسے منانے بہلانے اور چپ کرانے کی کوششیں کر رہے تھے جس پہ آسیہ آفندی بے ساختہ مسکرا اٹھی تھیں اور نجانے کیوں ان کی نظریں آذر پہ تھم سی گئی تھیں لیکن نظروں کے ٹھہرنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ کب سے علیزے کو منا رہا تھا۔ بہلا رہا تھا اس کی خوشی کے لیے بار بار سوری کر رہا تھا اور اس کے انداز میں اتنی چاہ اور اتنی محبت تھی کہ آسیہ آفندی کی نظروں سے اس کے جذبات چھپے ہوئے نہیں رہ سکے تھے علیزے اس کی دھمکی پہ چپ ہو گئی تھی اور آذر اپنی دھمکی کے اثر پہ بے اختیار مسکرا دیا تھا' آسیہ آفندی بھی انہیں مسکراتے دیکھ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی تھیں لیکن باہر منصور حسین کو کھڑے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئیں۔

"کیا بات ہے؟ یہاں کیوں کھڑے ہو....؟

"جی وہ علیزے بی بی کا سامان رکھنے آیا ہوں۔" اس نے شاپنگ بیگز دکھائے۔

"جاؤ اس کے بیڈ روم میں رکھ آؤ۔"

"بیڈ روم میں....؟" وہ حیران ہوا۔

"ارے نہیں! ایک منٹ ٹھہرو۔"

"جی"! وہ رک گیا۔

"رجو۔ رجو۔ کہاں گئی ہو۔؟" انہوں نے کچن میں کام کرتی رجو کو پکارا تھا وہ نیپکن سے ہاتھ پونچھتی بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

"جی بیگم صاحبہ....؟"

"اس کے ساتھ جاؤ اور علیزے کا سامان اس کے بیڈ روم میں رکھواؤ۔" انہوں نے منصور حسین کی طرف اشارہ کیا تھا رجو نے پلٹ کر منصور حسین کو دیکھا اور دیکھ کر آنکھوں کا رنگ بدل گیا وہ جو کوئی بھی تھا دل کے تار ہلا دینے والوں میں سے تھا۔ "رجو" آسیہ آفندی نے سختی سے پکارا وہ ٹھٹک کر حواسوں میں لوٹ آئی۔

"ج...جی بیگم صاحبہ۔"

"کھڑی کھڑی کیا دیکھ رہی ہو؟ جو کہا ہے وہ سنائی نہیں دیا تمہیں؟"

"ج.....جی بیگم صاحبہ جا رہی ہوں میں۔" وہ فوراً" آگے بڑھی۔

"جاؤ تم بھی۔" انہوں نے منصور حسین کو اشارہ کیا....

"جی بہتر...." وہ کہہ کے رجو کے پیچھے ہی چل پڑا تھا کشادہ سیڑھیوں کی تعداد بھی کافی زیادہ تھی رجو اس کے آگے آگے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اور وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ آخری پورشن پہ پہنچ کر وہ دائیں طرف مڑ گئی دائیں طرف کے آخر والا بیڈ روم علیزے کا تھا وہ بیڈ روم کے دروازے کے پاس جا کر ٹھہر گئی۔

"علیزے بی بی کے بیڈ روم میں اور کوئی ملازم نہیں جا سکتا۔ صرف میں جاتی ہوں۔ اس لیے تم یہیں ٹھہرو' میں باری باری سامان اندر رکھ دیتی ہوں۔" رجو نے اسے اندر آنے سے روکا تھا وہ وہیں دروازے کے باہر ہی ٹھہر گیا وہ اکتایا ہوا اور بے زار ہو رہا تھا۔ اس لیے جلد از جلد اس بوجھ سے آزاد ہونا چاہتا تھا جو چار پانچ بیگ لے کر اندر گئی اور قالین پہ رکھ آئی تھی۔ پھر دوبارہ لے کر گئی اور دوبارہ بھی رکھ آئی تھی بیگز سے ہاتھ آزاد ہوئے تو وہ ہاتھ جھاڑ کے واپسی کے لیے پلٹا تھا۔

"سنو۔" رجو لپک کے بیڈ روم سے باہر آئی تھی۔

"جی سنائیں۔؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"منصور حسین۔"

"اچھا نام ہے۔"

"جی شکریہ۔"

"علیزے بی بی کے ڈرائیور ہو...؟"

"جی! خوش قسمتی سے۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"اور میں علیزے بی بی کی خاص ملازمہ ہوں۔"

"اور میں خاص ڈرائیور...." منصور حسین نے دلچسپی سے مسکرا کر کہا تھا۔

"خاص تو تم دور سے ہی لگ رہے ہو۔" رجو عام سی اک لڑکی تھی عام سے جذبات تھے اپنا ہم پلہ مرد دیکھا تو فوراً ہی ریجھ گئی تھی۔

"قریب سے دیکھنے پہ اور بھی خاص لگتا ہوں۔" منصور حسین کے جواب پہ وہ شرما گئی تھی حالانکہ منصور حسین نے عام سے لہجے میں کہا تھا۔

"ابھی میں فارغ نہیں ہوں فارغ ہو کر بات کروں گی۔"

"نہ بھی کرو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ کندھے اچکا کے لاپروائی سے بولا تھا۔

"اچھا بات سنو' تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا مجھ کو۔" رجو نے آفر کی۔

"روٹی پانی کے علاوہ کوئی ضرورت نہیں ہے اپنی اور وہ ٹھیک ٹھاک طریقے سے پوری ہو رہی ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔" وہ اب بھی بے نیازی سے کہہ رہا تھا رجو چپ ہو گئی تھی بڑا عجیب بندہ تھا اس کی طرف دیکھے بغیر ہی چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

عبداللہ ناشتا کرنے کے فوراً" بعد ہی گھر سے نکل گیا تھا۔

وہ دونوں جب سے اپنے بیڈ روم سے باہر نکلے تھے وہ بار بار کن انکھیوں سے ان کے چہروں کی سمت دیکھ رہی تھی جو بے حد سنجیدگی لیے ہوئے تھے۔ ناشتا بھی خاموشی سے کیا تھا اور عبداللہ اسی خاموشی سے اپنا موبائل اور گاڑی کی چابیاں لے کر گھر سے چلا گیا تھا ان کی خاموشی' سنجیدگی اور سپاٹ چہروں کو دیکھ کر زری کی تو جان نکلی جا رہی تھی۔

"بھابھی! کیا بات ہے....؟ کیا ہوا ہے۔" زری مین ڈور لاک کر کے سیدھی نگارش کے پاس آئی تھی نگارش ٹیبل سے برتن سمیٹ کر ٹیبل صاف کر رہی تھی۔ زری نے آتے ہی اس کے ہاتھ تھام لیے تھے نگارش بھی چپ تھی' وہ زری کو بتاتی بھی تو کیا....؟

"بھابھی بولیے نا؟ آپ چپ کیوں ہیں....؟" زری کی آواز میں انجانے خدشوں کی وجہ سے لرزش اتر آئی تھی۔

"بات اچھی نہیں ہے' سن کر کیا کرو گی۔؟" زری دھک سے رہ گئی تھی۔

"بھابھی میرا دل برباد کرنا ہے تو کچھ سوچ کر کیجیے گا زری مر جائے گی اپنے شاہ کے بغیر۔" اس کے آنسو تھے کہ لب

بام آگئے۔ سینے میں قید پنچھی پھڑپھڑا رہا تھا۔ جیسے اندر اس کا دم گھٹ رہا ہو اور رہائی کے لیے ہاتھ پیر مار رہا ہو۔

"آج صبح پاکستان سے بابا جان کا فون آیا تھا۔" نگارش نے بات کی ابتدا کی۔

"بابا جان کا فون۔۔۔؟" زری کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

"ہاں! اور انہوں نے فون تمہارے لیے کیا تھا۔" نگارش کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ یکدم ہی زری پہ بم پھوڑ دے۔

"میرے لیے؟ مگر کیوں۔۔۔؟" اب پہلے سے زیادہ حیرت ہوئی تھی۔

"تمہیں واپس پاکستان بلا رہے ہیں، تمہارے لیے کسی کا رشتہ آیا ہے، تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔" نگارش نے کہہ ہی دیا اور زری یکدم چار قدم پیچھے ہٹی تھی نگارش کے ہاتھ اپنے ہاتھوں سے چھوڑ دیئے تھے۔ اور لب بام آئے موتی گر کر زمین بوس ہو گئے تھے۔ اک دھڑ دھڑ کرتی ٹرین تھی جو شور اٹھاتی ہوئی اس کے دل کو پٹڑی تلے روند کر گزر گئی تھی۔

"زری پلیز! میری پوری بات تو سن لو۔" نگارش نے آگے بڑھ کے اس کے ہاتھ تھام لیے جو پل میں ٹھنڈے اور یخ ہو چکے تھے۔

"میں تو۔۔۔ میں تو بات سن لوں گی، مگر میری بات کون سنے گا۔۔۔؟" آنکھوں سے دو موتی کیا گرے کہ باقیوں کو رستہ ہی مل گیا تھا بہتے چلے جا رہے تھے۔

"سب سنیں گے میری جان، سب سنیں گے، عبداللہ تمہارے ساتھ ہیں، انہوں نے بابا جان کو صاف انکار کر دیا ہے کہ وہ تمہیں ابھی پاکستان نہیں بھیجیں گے، تم ابھی پڑھ رہی ہو، تمہارے ایگزامز سر پہ ہیں، اور تم اپنی اسٹڈی ان کمپلیٹ چھوڑ کر نہیں آسکتیں۔" نگارش اسے سمجھا بجھا کر تسلیاں دے رہی تھی۔

"لیکن بھابھی! اک دن تو واپس جانا ہی ہے؟ کب تک یہاں رہوں گی اور اپنے دل کو زمانے کے سرد و گرم سے بچا کے رکھوں گی۔۔۔؟" زری کی آواز جیسے سرد و سپاٹ پتھرائی ہوئی لگ رہی تھی، آنسوؤں کا نمکین پانی اس کے عارض بھگو رہا تھا۔

"جانا، ضرور جانا، لیکن کسی حتمی فیصلے کے بعد، اور مجھے پورا یقین ہے عبداللہ تمہیں اکیلے نہیں جانے دیں گے، وہ تمہارے ساتھ خود جائیں گے، اور تمہاری پسند اور مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو گا۔" نگارش نے اسے سمجھایا۔

"بھابھی! میرے گاؤں کے دینو موچی نے اپنی بیٹی کی پسند اور مرضی پہ سر نہیں جھکایا تو یہ تو پھر میرے بابا جان ہیں، اونچے شملے والے ملک ہیں، جاگیردار ہیں دوسروں کی بیٹیوں کی زندگی کے فیصلے پنچایت میں بیٹھے بیٹھے کر ڈالتے ہیں اپنی بیٹی تو ان کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں ہے۔" زری متواتر رو رہی تھی۔

"زری! تم بھول رہی ہو کہ دینو موچی کی بیٹی کا کسی نے بھی ساتھ نہیں دیا تھا، نہ ماں نے، نہ باپ نے، نہ بہن بھائیوں نے، جبکہ میں اور عبداللہ تمہارے ساتھ ہیں، بابا جان بات کے پکے ہیں تو عبداللہ بھی انہی کے بیٹے ہیں، اول تو ضد نہیں کرتے، اور جب کرتے ہیں تو ضد کو پورا کیے بغیر پیچھے نہیں ہٹتے، جو کچھ شہرین کے ساتھ ہوا وہ عبداللہ کو آج بھی نہیں بھولتا اور اس کے بعد وہ تمہاری زندگی داؤ پہ نہیں لگنے دیں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" نگارش نے اسے حوصلہ افزا لفظوں میں سمجھایا تھا۔

"اور ایک بات اور۔" نگارش آخر میں مسکرا کے بولی۔

"اللہ خیر۔" زری نے دل پہ ہاتھ رکھ کے دل کو سنبھالا دیا۔

"میں نے عبداللہ سے تمہاری اور ولی آور بھائی کی بات کی ہے۔" نگارش نے ایک اور انکشاف کیا۔

"کیا۔۔۔؟" زری یکدم اچھل پڑی تھی۔

"ہاں یار! اب یقیناً وہ اسی بات کے متعلق سوچ رہے ہوں گے۔" وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔

"بھابی! اگر آس کا یہ دیا بھی بجھ گیا تو زری کی سانسوں کی لو بھی بجھ جائے گی۔" زری کو اپنے چاروں اطراف میں خطرے کی گھنٹیاں بجتی محسوس ہوئی تھیں دل پہ سیاہ بادلوں نے گھیرا ڈال لیا تھا اور وہ متوحش ہرنی کی مانند ان خطروں کی لپک سے جان بچانے کی کوششوں میں لگ گئی تھی۔

"اللہ نے چاہا تو یہ آس کا دیا نہیں بجھے گا، کبھی نہیں بجھے گا، ہمیشہ جلتا ہی رہے گا، میری دعائیں اس دیئے کے ساتھ ہیں، تحفظ کا حصار لیے ہوئے۔" نگارش نے اس کے نرم گداز دودھیا ہاتھوں کو نرمی سے دباتے ہوئے ہلکے سے اس کا رخسار بھی تھپکا تھا اور زری یونہی نڈھال سی ہو کر ڈائننگ چیئر پہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔

"میں یہاں مر رہی ہوں، میری جان نکل رہی ہے اور اسے۔۔۔ اسے پتا ہی نہیں ہے، کتنا بے خبر اور کتنا پرسکون ہے وہ؟ کیا اسے میری محبت کا ذرا احساس نہیں ہے؟ میں اکیلی پاگل ہو رہی ہوں۔۔۔؟ ہائے میں مر جاؤں۔۔۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہتی اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کے رو پڑی اور اسے رونا ولی آور شاہ کی بے خبری اور سکون پہ آیا تھا۔

"زری پلیز یار۔۔۔ ایسوں پگلی بن رہی ہو۔۔۔؟ پلیز سنبھالو اپنے آپ کو، ابھی تو صرف بات ہوئی ہے کون سا نکاح ہو گیا ہے۔۔۔؟ یا پھر رشتہ طے ہو گیا ہے۔۔۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔" نگارش اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔

"میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے بھابھی، کچھ بھی نہیں ہے، میرا سب کچھ بگڑنے والا ہے۔ میں۔۔۔ میں بکھرنے والی ہوں۔" وہ روہانسے لہجے میں کہتی ہوئی اٹھ کر تیز تیز قدموں سے چلتی اوپر اپنے بیڈ روم میں آگئی تھی لیکن بیڈ پہ بیٹھ کر روتے روتے نہ جانے دل میں کیا سمائی کہ اس نے اپنا موبائل فون اٹھا کر ولی آور شاہ کا نمبر ڈائل کر لیا تھا۔

اس کے دل و دماغ کا بے چینی اور اضطراب سے عجب حال تھا اس کا دل چاہ رہا تھا آج ولی آور شاہ اس کے سامنے کھڑا ہو اور وہ اس کے سینے میں سما جائے، ساری دنیا اور سارے خدشوں سے چھپ جائے، اس کی مضبوط بانہوں کے حصار میں خود کو قید کر لے، یا پھر اس کے نام کی چادر اوڑھ کر ہر چیز سے بے فکر اور بے خبر ہو جائے۔ لیکن ایسا تو تب ہوتا جب وہ ملتا اور اس کے سامنے ہوتا۔۔۔! دوسری طرف رنگ جا رہی تھی۔ لیکن وہ ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے نمبر ری ڈائل کر ڈالا تھا اور کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ زری کا نمبر ولی آور شاہ کے نمبر پہ بجا تھا۔۔۔

موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ وائبریشن مسلسل ہو رہی تھی، موبائل جیسے تھرک رہا تھا اور صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بچارن تڑپ رہی ہے، البتہ وہ اتنا تڑپ کیوں رہی ہے، یہ پتا نہیں تھا۔۔۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ اس کی تڑپ پہ ولی آور شاہ بھی تڑپ گیا تھا مگر وہ کال ریسیو کر کے نہ اس کی تڑپ سن سکتا تھا نہ اپنی سنا سکتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ آج اگر کال ریسیو کر لی تو اس بچارن کی تڑپ کو ڈھارس مل جائے گی، اور جہاں اسے ڈھارس ملتی وہیں وہ اپنی تمام کشتیاں جلا دیتی، جو فی الحال وہ نہیں چاہتا تھا وہ جانتا تھا کہ جن راستوں پہ زری چل رہی ہے ان میں ابھی۔۔۔ پیچ و خم ہیں، نشیب و فراز ہیں، اور ان راستوں سے گزرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا مگر پھر بھی وہ چل رہی تھی اور اس کی یہی مسافت کئی مرتبہ ولی آور کے دل میں بے چینیاں بھر دیتی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اکیلی ان راستوں پہ چل چل کے تھک جائے گی، نڈھال ہو کے گر جائے گی، ہو سکتا ہے بے دم بھی ہو جاتی، اور اگر ایسا ہوتا تو وہ بھلا سکون سے کب رہ سکتا تھا۔۔۔؟

ادھر اس کی کال بج رہی تھی اور ادھر وہ بے چین اور مضطرب سا کمرے میں ٹہل رہا تھا' بے سکونی سی بے سکونی تھی۔ یونہی ٹہلتے ٹہلتے اس نے اپنے ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے تھے اس کا دھیان زری کے اردگرد کروٹیں لے رہا تھا۔

"نجانے ایسی کیا بات ہے کہ وہ میرے نمبر پہ کال کرنے پہ مجبور ہو گئی ہے۔۔۔؟ نجانے کیا انتہا ہو گئی ہے آج۔۔؟ وہ کیوں کر رہی ہے کال۔۔۔؟ کیوں اپنی اور میری چپ کا تالا توڑ رہی ہے۔۔۔؟ کیا چاہتی ہے وہ۔۔۔؟ اف کیا کروں۔۔۔؟"

وہ بے کل سا کمرے میں ادھر سے ادھر پھر رہا تھا وہ فون کر کر کے تھک گئی تو موبائل اسکرین پہ دس مسڈ کالز کا ریکارڈ دکھائی دینے لگا تھا وہ دس بار مچلی تھی' وہ دس بار تڑپی تھی اور دل آور شاہ نے دس بار اسے اگنور کیا تھا لیکن دس بار ہی بے سکون ہوا تھا وہ تڑپ کا سلسلہ بند کر چکی تھی لیکن دل آور کے تجسس کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا وہ اسی کے متعلق سوچ رہا تھا جب اس کے موبائل پہ ایک بار پھر رنگ ہوئی' اس نے ٹھٹک کر دیکھا لیکن کال کرنے والی زرین ملک نہیں بتول شاہ تھیں۔ اس نے بوجھل سے انداز میں کال ریسیو کی تھی۔

"السلام علیکم اماں!"

"وعلیکم السلام! کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔"

"اچھا! مگر تمہاری آواز تو کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔" وہ اس کی آواز کا بوجھل اور بے چین اتار چڑھاؤ بھانپ چکی تھیں۔

"جی ہاں! میں اس وقت بہت ڈسٹرب ہوں' بہت زیادہ۔" وہ اپنی انگلیوں سے اپنی کنپٹی مسلتے ہوئے بولا اسے بس یہ پریشانی تھی کہ آج زری نے صبر و ضبط کا دامن چھوڑا ہے تو کیوں چھوڑا ہے۔۔۔؟

"کیوں کسی کیس کا مسئلہ ہو گیا ہے کیا۔۔۔؟" بتول شاہ نے فکرمندی سے پوچھا حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ بڑے سے بڑے پیچیدہ کیس پہ بھی نہیں گھبراتا بلکہ دوسروں کو گھبرا کے رکھ دیتا ہے۔

"نہیں اماں! مجھے صرف ایک ہی کیس پریشان کرتا ہے' جب بھی اس کیس پہ سوچتا ہوں' فکر کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

"کس کیس کی بات کر رہے ہو؟"

"اس کیس کی جو انگلینڈ چھوڑ آیا تھا۔"

"کیا؟ زری کی بات کر رہے ہو؟ کیا ہوا ہے اسے؟" بتول شاہ چونک اٹھی تھیں۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا' بس کال آئی تھی اس کی۔" اس نے آہستگی سے بتایا۔

"کیا کہتی ہے وہ؟"

"میں نے کال ریسیو نہیں کی۔" اس نے مجرمانہ سے انداز میں جواب دیا۔

"اف! دل آور شاہ تم بھی کبھی کبھی حد کر دیتے ہو۔" وہ غصے میں ہوتیں تو اسے پورے نام سے مخاطب کرتی تھیں۔

"اماں! میں حد رکھنا چاہتا ہوں مگر وہ حد توڑ رہی تھی' لگ رہا تھا کہ پاگل ہو رہی تھی وہ۔" وہ بتول شاہ کو ساری تفصیل بتا رہا تھا۔

"تمہیں چاہے گی تو پاگل ہی ہو گی بے چاری' لیکن دل آور شاہ دل پہ پتھر رکھ لینا اچھی بات ہے' مگر دل کو پتھر بنا لینا اچھی بات نہیں ہوتی۔"

"مگر اماں! آپ نہیں جانتیں۔ میں اگر دل کو پتھر نہ بناؤں تو کوئی اور بے چارا یا تو پاگل ہو جائے گا یا پتھر۔۔۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم کون ہے وہ بے چارا؟" وہ ٹھٹک گئیں۔

"جو بھی ہے پر جان سے عزیز ہے' اس کے لیے تو دل آور شاہ کا سر بھی حاضر ہے۔"

"نبیل۔۔۔؟ نبیل کی بات کر رہے ہو۔۔۔؟"

"نہیں اماں! اس ٹاپک پہ پھر بات کریں گے۔" دل آور نے سر جھٹک دیا تھا۔

"تم کراچی سے واپس کب آ رہے ہو۔۔۔؟"

"چند دن لگیں گے' دعا کیجیے گا کہ میں یہ کیس جیت جاؤں۔" وہ تھکے تھکے سے انداز میں کہہ رہا تھا اور بتول شاہ چپ ہو گئیں ان کا دھیان زری' نبیل اور دل آور شاہ کو سوچ رہا تھا اور خود دل آور شاہ بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا بتول شاہ کا فون بند ہو چکا تھا۔ لیکن زری کی یاد کا سلسلہ بند نہ ہوا' وہ ساری رات سو نہیں پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے نیو سم خریدی تھی اور اسے خود ایکٹیویٹ کیا تھا' یہ نمبر سب کے لیے نیو اور ان نون تھا۔ اس نمبر کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا اور یہ تسلی ہی کافی تھی اس نے وہ سم دوسرے موبائل میں لگائی اور موبائل جیب میں ڈال کے بائیک اڑا لے گیا تھا۔ اس کا رخ سائم کے گھر کی طرف تھا حالانکہ اسے پتا تھا کہ سائم اس وقت اپنی گرل فرینڈ زاد ر باقی دوستوں کے ساتھ اپنے فلیٹ پہ موج مستی میں مصروف ہے اور یہی موقع اس کے لیے اچھا موقع تھا اگر فاطمہ گھر پہ ہوتی تو۔۔۔!

"ہیلو۔" اس نے ان کے گیٹ پر پہنچ کر چوکیدار کو مخاطب کیا۔

"سلام صاحب۔"

"وسلام! کیسے ہو؟"

"اللہ کا کرم ہے صاحب۔"

"سائم صاحب سے کہو جودت صاحب بلا رہے ہیں۔" اس نے ڈرامہ کیا۔

"سائم صاحب تو نہیں ہیں گھر پہ۔" جواب عین توقع کے مطابق موصول ہوا تھا۔

"اچھا! کون ہے گھر پہ؟"

"جی صرف فاطمہ بی بی ہیں۔"

"اوہ! سائم کب آئے گا۔۔؟"

"پتا نہیں صاحب۔"

"چلو میں اس کے موبائل پہ پتا کر لیتا ہوں۔" جودت نے سر ہلایا۔

"جی جیسے آپ کی مرضی۔"

"او کے اللہ حافظ۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا اور بائیک کو کک لگا کے اڑا لے گیا مگر صرف ان کی کوٹھی کے کونے تک ذرا اوٹ میں جا کے اس نے بائیک روک لی تھی اور موبائل نکال کر میسج ٹائپ کیا تھا۔ میسج سینڈ کرنے کے ٹھیک سات منٹ بعد ان کے گھر کا گیٹ کھلا تھا اور فاطمہ کی گاڑی تیز رفتاری سے باہر نکلی تھی۔ جودت نے بڑی پھرتی سے بائیک کے اسٹینڈ پہ لٹکا بلیک کلر کا ہیلمٹ سر پہ چڑھا لیا تھا اور فاطمہ کی گاڑی کے پیچھے ہی اپنی بائیک کی اسپیڈ بڑھا دی تھی وہ بہت عجلت میں تھی اور کافی رش ڈرائیو کر رہی تھی اس کے پیچھے وہ بھی اتنی ہی تیزی سے اسے فالو کر رہا تھا اور اپنے پلان کی کامیابی پہ دل ہی دل میں دل کھول کے مسکرا رہا تھا۔!!

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

سعدیہ عزیز آفریدی

"تم اس کے ساتھ اچھا نہیں کر رہی ہو۔"

"میں نے کسی سے مشورہ نہیں مانگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کیا نہیں اس لیے جو میرا دل چاہتا ہے وہ کر رہی ہوں۔" اس نے سامنے رکھے گلدستے کو کھڑکی سے اٹھا کر باہر پھینک دیا۔

"آخر تمہیں اس سے پرخاش کیا ہے۔" مترنم آواز نے پھر سوال کیا۔

"بس نہیں پسند مجھے وہ بندہ، میں اسے جب دیکھتی ہوں میرا خون کھول جاتا ہے۔"

"اسے دیکھ کر تمہارا خون کھول جاتا ہے، تمہارا، علینہ ملک کا خون کھول جاتا ہے۔" آواز حیرت بن کر اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔

"ہاں میرا خون کھول جاتا ہے علینہ ملک کا خون میرا بس چلے میں اسے کسی ایسے پاتال میں گم کر دوں کہ پھر وہ چاہے بھی تو میری نظروں کے سامنے نہ آسکے۔"

"تمہیں نہیں لگتا تم آفندی کے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔"

"نہیں رافعہ درانی مجھے نہیں لگتا میں آفندی کے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں میرا جو دل چاہتا ہے میں نے ابھی اس کا دس پرسنٹ بھی نہیں کیا۔"

"کیا تم چاہتی ہو آفندی مر جائے؟"

"نہیں مر سکتا وہ، اس جیسے مطلب پرست خود غرض ابن الوقت قسم کے لوگ نہیں مرا کرتے مرنے کے لیے جان کی بازی لگانے کے لیے انسان کا حساس ہونا، جی دار ہونا بہت ضروری ہے۔" وہ لمحہ بھر کو چپ ہوئی اور آہستگی سے بولی۔

"یہ بتاؤ تم نے چائے منگوائی ہے یا نہیں دماغ کی ساری نسیں کھنچ گئی ہیں۔"

"ہاں منگوائی ہے چائے۔" رافعہ درانی نے دراز سے بسکٹ کا پیکٹ برآمد کیا تھا اور اسی وقت ان کا پیون چائے کے دو کپ سجائے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"علینہ باجی وہ آپ کے مہمان کمرے کے باہر کھڑے تھے میں نے کہا بھی کہ اندر آجائیں مگر انہوں نے مسکرا کر کہا نہیں مجھے ایک بہت ضروری کام یاد آگیا ہے۔ ویسے جب میں گیا تھا تب تو وہ اندر کرسی پر بیٹھے تھے پھر باہر کھڑے کیا کر رہے تھے۔"

"اپنی کھو جانے والی اوقات ڈھونڈ رہے ہوں گے۔" ترت جواب دے کر علینہ نے بسکٹ کا ریپر پھاڑا پیون چلا گیا تھا اور حسب توقع رافعہ درانی پوری حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو۔" وہ مزے سے چائے کے ساتھ بسکٹ کا لطف اٹھاتے ہوئے مطمئن انداز میں پوچھنے لگی اور رافعہ درانی اٹھ کر اس کے سامنے والی کرسی پر آگئی۔

"مجھے لگا تھا غلام الدین کی بات سن کر تم تھوڑا سا شرمندہ ہو گی مگر تمہارے چہرے پر تو شرمندگی کا دور دور تک نام و نشان نہیں ہے۔"

"کیوں ہو گا میرے چہرے پر شرمندگی کا نشان، میں نے کیا غلط کیا ہے۔"

"اپنے دل سے پوچھو کیا واقعی تم نے کچھ غلط نہیں کیا ہے۔" رافعہ درانی نے تیز آواز میں پوچھا مگر وہ ٹائم ضائع کیے بغیر اپنی نئی کور اسٹوری کا فائل ٹچ دینے لگی

ناولٹ

وہ ایک این جی او کے تعاون سے ایک میگزین کی ایڈیٹر ان چیف تھی بظاہر یہ پرچہ باقاعدہ طور پر اس این جی او سے منسلک نہیں تھا مگر جاننے والے جانتے تھے مسز فاروقی اور مرزا جالب اس این جی او کے سرکردہ رکن ہیں مگر قانونی طور پر اس میگزین کے تمام تر اخراجات ان کے ذاتی اکاؤنٹ سے شو کیے جاتے تھے اس طرح وہ کم دکھا کر دونوں اطراف سے کماتے تھے اور ثواب دارین مفت میں ہاتھ آجاتا تھا رہی رافعہ درانی تو وہ ایک آئیڈیلسٹ لڑکی تھی دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتی تھی اور چاہتی تھی دنیا بھی اسی کی نظر سے دنیا کو دیکھے بلند خیالات، محبت، حساسیت، دنیاداری میں رہتے ہوئے زندگی کو عام بھیڑ بکریوں سے افضل درجے پر جاکر جینا یہی مقصد اسے یہاں لایا تھا اور نظر بچا کر وہ کبھی کبھار اس طرح کا کوئی بلنڈر کر ہی دیا کرتی تھی رہی علینہ ملک تو رافعہ درانی کی طرح اس کی زندگی کی

کوئی خاص نہج نہیں تھی سوشیالوجی میں ایم اے کیا تھا اور اب بظاہر دنیا کو بدلنے کے سوانگ میں اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر جیا جائے کی دوڑ میں شامل ہو گئی تھی اور یہی بات رافعہ درانی میں اور اس میں الگ تھی۔

"تم شام کو کب تک جاؤ گی۔" رافعہ درانی کو اپنی ماں کو آنکھیں ٹیسٹ کروانے کے لیے لے کر جانا تھا تبھی وہ ساڑھے چار بجے سے ہی اپنی چیزیں اپنے بڑے سے بیگ میں ٹھونس رہی تھی اور علینہ ملک لکھتے لکھتے پتا نہیں کہاں گم ہو گئی تھی۔

"تمہیں گلٹی فیل ہو رہا ہے۔" وہ اپنی ہی مرضی سے بات نکال کر لائی۔

"نہیں میں تو یہ سوچ رہی ہوں اگر ایسی کور اسٹوری میں کسی غیر ملکی جریدے کو دوں تو بہت آسانی سے بہت سارا پیسہ کما سکتی ہوں۔"

"پیسہ، یہ تمہاری زندگی کا مقصد پیسہ کب سے ہو گیا تم نے تو اس میگزین میں شمولیت کچھ نیا کر جانے، کچھ نئے راستے کھوجنے، کچھ نئی منزلوں کی طرف سفر کرنے کی شرط پر کی تھی۔"

"تو ہر ادارے کو دیکھتے ہوئے بندہ اپنے کمنٹ پاس کرتا ہے اگر میں یہاں آنے کی وجہ یہ بتاتی کہ مجھے کہیں اچھی جاب نہیں مل رہی تھی اس لیے آپ کا میگزین جوائن کیا تو کیا مجھے نوکری مل جاتی؟"

رافعہ درانی چپ رہی تھی اور وہ پھر سے بولی تھی۔

"یہاں سب کچھ فار سیل ہے مائی ڈیئر خریدنے والے کی جیب بھاری ہو تو سب بک جاتا سب خریدا جا سکتا ہے۔"

"تم آہستہ آہستہ کتنا بدلتی جا رہی ہو چھ سال پہلے جب ہم ملے تھے تم کتنا مختلف سوچا کرتی تھیں۔"

"شاید میں اپنی جگہ بنانے کے لیے مختلف سوچنے کی اداکاری کیا کرتی تھی اور اندر سے ایک عام سی لڑکی تھی روپے پیسے نام کے پیچھے بھاگنے والی عام سی لڑکی۔"

"تمہیں ڈر نہیں لگتا اگر میں بلیک شیپ بن کر تمہاری یہ ساری باتیں نمک مرچ لگا کر اونرز تک پہنچا دوں۔" علینہ ملک ہنس پڑی تھی۔

"مجھے تم سے ایسی کوئی توقع نہیں کیونکہ تم بے وقوفانہ حد تک دوستی، محبت پر یقین رکھتی ہو اگر بالفرض تمہیں اس شکایت کے بدلے کوئی مراعات ملیں بھی تو تم جانتی ہو ان چھ سالوں میں، میں نے اتنی جگہ بنالی ہے اس فیلڈ میں کہ میں اس سے اچھی سیلری پر کہیں بھی جا سکتی ہوں۔

تمہیں پتا ہے میرے ماموں ایک کپڑے کی دکان پر سیلزور کر تھے اور اپنے کام کے اتنے ماہر اپنی مرضی سے کام ہٹ کر کرنا پسند نہیں کرتے تھے نوکری منہ پر مار کر شام کے بازار میں پھر کسی نئی دوکان پر سیلزور کنگ پر کھڑے ہوتے اور ممانی کو پتا تک نہ چلتا کہ وہ پہلی نوکری کو تیل کر چکے ہیں۔"

"تم نے کرئیٹو کام کو کپڑے بیچنے سے ملا دیا تمہارا دماغ خراب ہے۔"

"بھئی میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے بزنس مائنڈڈ ہوں اس لیے ..... ویسے کرئیٹوٹی ہر شعبے میں ہر شخص کر رہا ہے تم کسی موچی کی دوکان پر کھڑے ہو کر اس کے ہاتھوں کی مہارت دیکھو وہ کیسے ٹانکا لگاتا ہے کیسے مرمت کر کے بے کار چیز کو کار آمد کر دیتا ہے کرئیٹو وہ بھی ہے مگر ہم یہ صرف لکھنے پڑھنے والے لوگوں سے مشروط کر لیتے ہیں حالانکہ بہت خوب صورت لفظ لکھنے والے لوگوں کے اندر جھانک کر دیکھو تو صرف اندھے کنوئیں کی بازگشت کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا ان سے مل لو تو لگتا ہے لفظ صرف جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ نہیں۔"

"تم بزنس مائنڈ ہو تم نے یہ کہا تو کیا آفندی سے میل جول یہ چار سال کی رفاقت یہ بھی کسی بزنس کا حصہ تھی۔"

علینہ ملک کو چپ لگ گئی رافعہ درانی اسے دیکھتی رہی مگر اس نے سر نہیں اٹھایا تھا یہاں تک کہ رافعہ درانی آفس سے اٹھ گئی تھی تب اس نے خاموشی سے سوال کیا تھا۔

"کیا واقعی آفندی سے تم نے بزنس پوائنٹ آف ویو سے میل جول بڑھایا تھا۔" آنکھوں میں نم اتر آیا تھا مگر اس نے یہی کہا ہوا اوں سے۔

"ہاں مجھے آفندی سے نفرت ہے میرا دل چاہتا ہے وہ مر جائے وہ ٹوٹ پھوٹ جائے بالکل ذرہ بن جائے پھر میں اسے اپنی سینڈل کی ہیل سے مسل کر مکمل طور پر ختم کر دوں۔"

☆ ☆ ☆

اور بیل پر وہ رسالہ ہاتھ سے رکھ کر اٹھا تھا۔ سامنے غیر متوقع طور پر آفندی کھڑا تھا مگر صبح کے آفندی اور اس وقت کے آفندی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

"خیر ہے کی ہو گیا ہے جان برادر۔"

وہ کچھ کہے بغیر اندر آیا تھا اور صوفے پر گر جانے والے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ خاموشی اس کے گرد ٹھنڈک کی طرح جمی ہوئی تھی اور آنکھوں کا نم بڑھا ہوا تھا۔

"بول بھی کیا ہوا تو تو اس علینہ ملک سے ملنے گیا تھا۔"

"ہاں میں گیا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ آج میں اتنے دنوں کی بے رخی کا سبب پوچھوں وہ وجہ بتائے تو میں بے وجہ اس سے لڑ پڑوں وہ جب مجھے منانے لگے تو میں یہ ڈبیا نکال کر اس کے سامنے رکھ دوں پھر کہوں علینہ کیا تم آفندی سے شادی کرو گی اور وہ میرے اس جملے پر جھوم اٹھے مگر....."

"مگر کیا؟" اس چہرے نے فکر مند سا ہو کر پوچھا اور آفندی کی آواز بھرا گئی۔

"مگر یہ کہ اس نے کہا میرا دل چاہتا ہے تم مر جاؤ میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں کسی ایسے پاتال میں پھینک دوں کہ پھر تم چاہو بھی تو مجھے نظر نہ آسکو۔"

"وہ کون ہوتی ہے میرے یار کو موت کی سزا دینے والی اس کی تو میں....." اس نے نازیبا کلمات کہنے چاہے مگر آفندی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیے۔

"ہم محبت کر سکتے ہیں مگر کسی کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ بھی ہم سے محبت کرے۔"

"اسی لیے مجھے محبت سے نفرت ہے سالی یہ محبت وحبت کچھ بھی نہیں ہوتی ادھر دیکھ میرا باپ اور میری ماں دونوں نے محبت کی شادی کی دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھ دیکھ کر جیتے تھے میں پاگل کا پتر اس محبت پر خوش کہ اس ارضی دنیا میں جنت کے مزے لوٹ رہا تھا مگر جب اماں مریں تو ابا نے کہا او گاڈ اس محبت کے سوانگ کو کرتے کرتے میں تو پگلا گیا تھا نہ اپنی نیند سوتا تھا نہ اپنی نیند جاگتا تھا بیوی کے سامنے کتا بن گیا تھا۔" میں نے ابا کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"آپ کو محبت نہیں تھی تو جھوٹ کیوں بولتے رہے۔" تو ابا نے کہا۔

"اس سالی کے گھر میری دو بہنیں بیاہی تھیں انہیں آباد رکھنے کے لیے یہ سوانگ بھرے پھرتا تھا۔"

مجھے اس دن ابا پر پتا نہیں غصہ آیا یا ترس مگر کچھ تھا جو اندر نرم نرم ہاتھوں سے چھناکے سے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ میں اس دن اماں کی قبر پر جا کر خوب رویا پھر ان کے چالیسویں کے بعد ان کی الماری کھولی تو اماں کی ڈائری ہاتھ لگ گئی۔ اس ڈائری میں ابا کو ایسے ایسے الفاظ سے نوازا گیا تھا کہ یہ ابا پڑھ لیتے تو اماں طبعی موت نہ مرتیں ابا کے ہاتھوں قتل ہو کر مرتیں، ابا کے ساتھ وہ اس لیے رہتی تھیں کہ ان کے وڈیرے بھائی ابا سے زیادہ جنگلی اور جانور تھے ابا کا ڈھکا چھپا جنگلی گنوار پن وہ برداشت کر سکتی تھیں مگر اپنے گھر میں تیسرے درجے کا شہری بن کر رہنا نہیں چاہتی تھیں اس دن محبت کا پندار ایسے ٹوٹا کہ دل نے اس محبت نام کی کمینگی کو دو حرف کہہ دیے تو کبھی بھول جا کچھ نہیں رکھا اس اضافی من موجی کرنے میں، دیکھ مست جی، مجھے دیکھ مجھے پندرہ دن میں نئی لڑکی مل جاتی ہے، جیب میں دھیلہ ہو تو میلہ یوں لگتا ہے یوں۔"

"تجھے پتا ہے میں ایسا بندہ نہیں ہوں مجھے میلہ نہیں دیکھنا میں ایک گھر گھر ہستی والے گھر کے خواب دیکھنے والا انسان ہوں۔"

"ایک گھر کے خواب یعنی چھوٹا سا آنگن چاندنی کی کھڑکی اور دو خوب صورت خوب صورت بچے زندگی

کی تلخی میں زہر گھول دینے والے میں جب چھوٹا تھا تو بڑا کمینہ ہوا کرتا تھا دونوں کو انگلیوں پر نچاتا لوگوں کو فرماں بردار اولاد ملتی ہے مجھے فرماں بردار ماں باپ ملے تھے۔ پھوٹی آنکھ میں یک دیدہ ہو تو بینائی کی قدر ہوتی ہے۔"

"آذر بس کر دے ماں باپ کا ذکر احترام سے کیا کر چاہے وہ کیسے بھی ہوں۔۔"

"ابے چل چاہے وہ کیسے بھی ہوں' میرے ابا کی طرح بھی ہوں؟" تھوڑا سا وقفہ دیا پھر غصے سے بولا۔

"مجھ سے نہیں ہوتی ابا جیسے شخص کی عزت' امی کی تو برسی فاتحہ کروا لیتا ہوں پر ابا جس دن مرے نا تو انہیں تو پلٹ کر بھی نہیں پوچھنا' پتا نہیں کہاں کہاں کی خاک چھانتے ہیں پچاس برس کے ہو کر میری عمر کی اٹکھیلیاں کرتے پھرتے ہیں اتنی لڑکیوں کے فون تو مجھے نہیں آتے جتنے ان کو آتے ہیں۔"

"سنبھل جائیں گے یار کچھ وقت دے انہیں۔"

"ابے میں کیا مرا جا رہا ہوں انہیں سدھارنے کے لیے آج مرے کل دوسرا دن' جو کر رہے ہیں خود بھگتیں گے مگر مسئلہ ہے اس احمق لڑکی کا۔"

"وہ احمق نہیں ہے یار بہترین دماغ ہے' اس کے دماغ اس کے لفظوں ہی نے تو مجھے متاثر کیا تھا وہ ہمارے چینل کے لیے فری لانس ڈیسک ورک کرتی تھی "شاہ زیب" کا پروگرام "سچ" اسی کے ہوم ورک کی وجہ سے کامیاب تھا۔"

"کیا ہم اس وقت اس کی ذہانت پر ماتم کرنے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔"

"نہیں مگر کیا کریں ہر ایک کی قسمت میں محبت تو نہیں ہوتی' کاش وہ دل بھر بھر کے گالیاں دیتی اپنی ڈائری کے صفحے بھرتی رہتی مگر تیری اماں جیسی بھی محبت کرتی رہتی تو میں خود کو خوش قسمت سمجھتا۔"

"اللہ معاف کرے دنیا میں اگر میں کسی کے لیے اچھا سوچتا ہوں تو وہ تو ہے خبیث' میری دعا ہے اگر تجھے زندگی میں محبت ملے تو پوری محبت ملے سچی محبت ملے۔۔۔" اس نے کھینچ کر آفندی کو گلے لگا لیا تھا مگر آفندی رویا نہیں تھا پھر یہ تین دن کے بعد کی بات تھی' اس کے فلیٹ میں علینہ ملک چلی آئی تھی وہ صم بکم ہو گیا تھا۔

"تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے۔"

"میں ایک بار پوچھنا چاہتا ہوں تمہیں مجھ سے ایک دم اتنی نفرت کیوں ہو گئی ہے۔"

"محبت کب ہوئی تھی جو تمہیں نفرت کا غم کھائے دے رہا ہے۔"

"ہم بہت اچھے دوست تھے علینہ۔۔۔" وہ اس کے قدموں میں بچھ گیا تھا۔

"ہم دوست کبھی نہیں تھے آپ کی اور ہماری اوقات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"کیا تم مجھے عزت دے رہی ہو یا مجھے ذلیل کر رہی ہو۔"

"یہ آپ کی ذہانت پر منحصر ہے میں تو لفظ لکھتی ہوں لوگ انہیں اپنے من مرضی کے چولے پہناتے رہتے ہیں میں نے کبھی پروا نہیں کی دوسروں کی سوچ کے لیے میں نے خود کو کبھی ہلکان نہیں کیا۔"

"علینہ۔۔۔"

"آپ کو کب لگا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟" وہ پتا نہیں اسے کس فیز میں کھینچ لینا چاہتی تھی۔

"پہلے دن سے تمہارا جب پہلا آرٹیکل پڑھا تھا تمہارے اندر کی حساس لڑکی نے مجھے متاثر کیا تھا اس دن میں نے خود سے کہا تھا تبدیلی لانے والے دماغ تم جیسے ہوتے ہیں اتنا مختلف سوچتی کیسے ہو تم۔"

"میں اتنا مختلف اس لیے سوچ سکتی تھی کیوں کہ مجھے قدم رکھنے کے لیے جگہ اور ایک اچھا مستقبل درکار تھا آپ تو جانتے ہیں آج کا دور نمائش پسندی کا دور ہے اور اسی معاشرے میں مجھے لائم لائٹ چاہیے تھا اور یہ ان لفظوں میں ہی پنہاں تھا کہ میں لوگوں کے دل کی بات ان کے دل کی زبان میں لکھتی تاکہ پڑھنے والوں کو لگتا میں بھی ان میں ہی سے ایک فرد ہوں اور مسٹر آفندی یہ ٹرک کبھی ناکام نہیں ہوتی۔"

"مگر میں نے تو یہ کبھی نہیں سوچا تھا میں تو تمہاری طرف پوری ایمانداری سے بڑھا تھا۔"

"ایمانداری اور تمہاری ذات یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں آفندی۔"

"علینہ تم ایسا کیوں سمجھتی ہو؟"

"اچھا ایک بات بتاؤ تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ کیا تمہاری ذاتی کمائی کا ہے۔"

"ہاں جو کچھ کمایا ہے میں نے اپنی محنت سے کمایا ہے۔"

"اپنی محنت سے کیا واقعی تمہیں اس کا یقین ہے؟ اچھا تمہیں کیا کبھی لگتا ہے سچ کبھی نہ کبھی اتنے بھرپور طریقے سے بولتا ہے کہ پھر کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔"

"سچ کبھی اتنے کان پھاڑ دینے والے لہجے میں نہیں بولتا کہ سماعت پر گراں گزرے' سچ دل میں سرسراہٹ بن کر دوڑتا ہے اور چھا جاتا ہے۔"

"شاید پرانے کسی دور میں سچ کی یہی تعریف ہو مگر آج کے دور میں سچ وہ ہے جو میڈیا دکھاتا ہے' جو اینکر پرسن کھینچ کھانچ کر ڈھونڈ ڈھانڈ کر لاتے ہیں اور میں نے یہ کر سیکھ لیے ہیں۔"

"مطلب۔۔۔" وہ حیران ہوا تھا۔

"سمجھ جاؤ گے بس اتنا جان لو' لوگ جان گئے ہیں تمہارا ٹرسٹ کتنا بڑا ڈھونگ ہے اور یہ کہ تم جیسا شخص جس کے والدین کا بھی نہیں پتا اس کے اندر کتنی گراوٹ ہے دولت اور نام کے لیے کتنی ہوس ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہمیشہ اصولوں کی بات کی ہے۔"

"اصولوں کی باتیں تمہارے منہ سے اچھی نہیں لگتیں آفندی! رہی بات تم سے شادی کی تو ایک لڑکی شادی کرتے وقت دو چیزیں دیکھتی ہے اس کا حسب نسب اور اس کے معاشی استحکام' تمہیں کیا لگتا ہے تم مجھے یہ سب کچھ دے سکتے ہو۔"

"علینہ تمہارے لیے دولت جاہ حشم کب سے اہم ہو گئے مجھے تو لگتا تھا تم انسان سے انسان کی محبت اور بے لوث محبت پر یقین رکھتی ہو۔"

"بے لوث محبت کے زمانے گئے آفندی! اب انسان' انسان سے اسی وقت محبت کرتے ہیں جب ان کے دونوں ہاتھ بھرے ہوئے ہوں اور تم آج کے سینیریو میں بالکل خالی ہاتھ ہو۔"

"تمہیں واقعی مجھ سے کبھی محبت نہیں تھی۔"

"نہیں مجھے تم سے کبھی محبت نہیں رہی آفندی۔"

اور آفندی کی آنکھوں کا نم اس کے خوابوں کے کناروں پر آن جما مگر وہ رویا نہیں تھا پھر کس طرح وہ اپنے فلیٹ پہنچا تھا یہ اس کو خیال بھی نہیں رہا وہ بس آیا تھا اور اپنے بیڈ پر گر گیا تھا موبائل اس کا سائلنٹ پر تھا آذر فون کر کر کے تھک گیا تھا تب وہ اس کے فلیٹ پہنچا تھا اور وہ خالی ڈھنڈار محل سرائے کی طرح پڑا ملا تھا۔

"تجھے اتنے فون کیے کیا کر رہے تھے۔" جواب ندارد اور وہ خاموش — پڑے آفندی کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے پاگل اس طرح کیا ٹکر ٹکر چھت کو دیکھ رہا ہے۔" وہ اب بھی کچھ نہیں بولا تھا۔

"مجھے سمندر میں ڈبو دو جا کر میں مر جانا چاہتا ہوں۔"

"تیرا دماغ ٹھیک ہے سمندر ایسی گندی مندی جانوں کو تھوک دیتا ہے چل زیادہ ڈرامے نہ کر۔"

"آذر میں مر رہا ہوں۔۔۔"

"کیا مطلب؟" آذر کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا وہ بجلی کی تیزی سے آگے آیا تھا۔

"تو نے کوئی ڈیم فل قسم کی حرکت تو نہیں کی۔"

"میں نے سلیپنگ پلز کھالی ہیں۔" وہ سوئی جاگی آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولا اور وہ چلایا۔

"تجھے میں قتل کر دوں گا اگر مرنے کی کوشش کی دیکھ میں ابھی ایمبولینس منگواتا ہوں ہسپتال دور نہیں اور تیرے سونے کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے معاف کر دے میں تیری کوئی بات' کوئی فرمائش پوری نہیں کر سکا۔"

"چل دفع ہو زیادہ فلمی ہیرو بننے کی ضرورت نہیں

دیکھ تیری وجہ سے ہی تو زندگی میں رنگ ہیں۔" وہ ہسپتال کا نمبر ڈائل کر رہا تھا اور اسے باتوں میں لگا رہا تھا۔

مگر اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں تبھی اس نے کچن سے چھری اٹھائی تھی۔

"چل ساتھ مرتے ہیں پھر۔۔۔" اس نے چھری کو کلائی پر رکھا تھا آفندی کے وجود میں ہل چل مچی تھی۔

"پاگل ہو گیا ہے کیا؟" بہت مدھم آواز میں اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر تب تک وہ چھری کو کلائی پر چلا چکا تھا خون نکلا تھا اور وہ سسکاری لے کر اس کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

"چل اب مزے سے دونوں جہنم میں چلیں گے دونوں کے تکے کتنے مزے دار ہوں گے نا۔" آفندی اٹھ بیٹھا تھا۔

"پاگل ہے تو۔" اس کی نیند بھری آنکھیں کھل گئی تھیں اور وہ یہی چاہتا تھا کہ وہ سو نہ سکے۔ آفندی چلایا تھا۔

"فرسٹ ایڈ باکس وہاں رکھا ہے پٹی تو باندھ خون کتنی تیزی سے بہہ رہا ہے۔"

"بہنے دے تجھ سے بڑھ کر تھوڑی ہے چل اٹھ میرے ساتھ واش روم چل۔" وہ کسی نہ کسی طرح اس جیسے تن و توش والے بندے کو واش روم لے گیا تھا پھر اس کے حلق میں انگلی ڈال ڈال کر دو تین وامیٹ کروائی تھیں اس کے وجود کا سارا بوجھ اس کے اپنے وجود پر تھا اور آفندی نے منہ دھو کر اس کے کندھے سے آنکھیں رگڑی تھیں۔

"اب تو ہاتھ کی بینڈج کر لے خون دیکھ کتنی تیزی سے بہہ رہا ہے۔"

"جب تک تو زندہ ہے میں بھی مر نہیں سکتا اور سن ہم دونوں بڑے کمینے انسان ہیں اتنی جلدی نہیں مریں گے۔" لمحہ بھر کو رکا پھر آہستگی سے بولا۔

"چل اب ہوش کر تھوڑا۔" وہ اسے تھام کر واپس کمرے میں لایا تھا۔

اے سی کی کولنگ تیز کی تھی۔

"ٹی وی والے کہتے ہیں اے سی ہمیشہ 26 پر چلائیں 26 پر۔" وہ خود ہی کہہ کر ہنسنے لگا مگر اب وہ پریشان ہو رہا تھا کیوں کے آفندی پھر سونے کی پوزیشن اختیار کر رہا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ اسے خود ہسپتال لے کر بھاگتا ایمبولینس کے رکنے کی آواز آئی آفندی کے نام کی وجہ سے پیرا میڈیکل اسٹاف اس کے فلیٹ میں ہی آ گیا تھا۔

"یہ خبر کہیں سے بھی لیک آؤٹ نہیں ہونی چاہیے۔"

"جی اسی لیے میں کوئی خاتون نرس ساتھ نہیں لایا میری آفندی سے اچھی دعا سلام ہے اس لیے آپ بے فکر رہیے۔" ڈاکٹر کہہ کر طبی امداد کنٹی نیو کرنے لگا تھا پھر دو گھنٹے بعد اس نے آخری کارروائی کی اسے انجیکشن دیا۔

اور آذر تھا اس کے سو جانے پر پریشان ہو کر بولا تھا۔

"یہ سو کیوں گیا ہے؟" ڈاکٹر نے پلز نوٹ کی تھیں پھر آہستگی سے بولا۔

"ہم نے سب بہتر طریقے سے کر لیا ہے' یہ نیند کی گولیوں کا اثر دو تین دن رہے گا وہ سوئے جاگے رہیں گے مگر یہ ان کے اسٹریس سے بچنے کے لیے اچھا بھی ہے' ویسے آپ بہت کمال چیز ہیں آپ نے بہت ذہانت سے ان کی توجہ ڈائیوٹ کی اگر یہ سو جاتے تو ان کو بچانا بہت مشکل کام تھا آپ کا زخم بہت ہلکا سا ہے' یہ آپ نے فرینڈ کے لیے خود کو لگایا تھا۔ مجھے کہنے دیجیے اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو جتنی پلز انہوں نے لی تھیں ان کا بچایا جانا ناممکن تھا آپ نے انہیں وامیٹنگ بھی کروائی کی کوشش کی تھی یہ بھی بہتر رہا۔" وہ اب بیٹھ چکا تھا آذر ان سب کے لیے چائے اور اسنیکس رکھ رہا تھا۔

"آفندی صاحب بہت بیسٹ انسان ہیں بہت باہمت مگر جو کچھ ان کے ساتھ کیا گیا واقعی بہت اذیت انگیز ہے اگر ان کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی خود کشی کرنے کو ہی ترجیح دیتا۔"

"کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے آفندی کے ساتھ۔" آذر کو اچنبھا ہوا تھا کہ علینہ کا معاملہ کیسے لیک آؤٹ ہوا اور ڈاکٹر صاحب بولے۔

"ابھی شام کی نیوز میں چینل پر ایکس کلوز رپورٹ چلی آفندی کا بچپن جوانی سب الٹ پلٹ کر رکھ دی گئی ہیں اسے جی بھر کے بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

"اچھا۔۔۔" آذر کا رنگ اور پھیکا ہو گیا تھا اس کی ہابی انگلش چینل ہوا کرتے تھے یا کبھی کبھار "دی دی رپورٹ" پر آفندی کی ڈاکو منٹریلس ٹاک شو دیکھ لیا کرتا تھا کیوں کہ ہر پروگرام کے بعد آفندی اس سے فون کر کے پوچھتا تھا وہ اس کے پروگرام میں تنقیدی پہلو سے گفتگو کرتا اور آفندی کو یہی بات پسند تھی۔

ڈاکٹر دو گھنٹے مزید رکا تھا اور آذر عباس اس کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ساری رات وہ نیند میں بڑبڑاتا رہا تھا۔

"تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں علینہ! مجھے تمہاری آنکھوں میں ہمیشہ اپنے لیے احترام اور ایک خاموش محبت کا اظہار ملا کرتا تھا۔" دوسری صبح وہ اٹھا تھا ڈاکٹر اس بار تنہا آیا تھا خاموشی سے چیک اپ کر کے اس کے لیے دوائیں اور کھانے کا مینو سیٹ کر کے چلا گیا تھا اور وہ بلیک کافی لیے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"چل کافی پی اپنی طرح کالی اور کڑوی سی۔" کافی کی اس تشبیہ پر وہ ہمیشہ اس سے لڑ پڑتا تھا مگر اس وقت وہ خاموش بیٹھا تھا۔

"چل نا میں ایویں مذاق کر رہا تھا میرا رنگ تیری طرح صاف نہیں نا اس لیے جلتا ہوں تجھ سے بقول تیرے۔" وہ اب بھی کچھ نہیں بولا تھا اس کی توجہ ادھر ادھر کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

"کیا چاہیے۔۔۔" وہ جانتا تو تھا کہ اسے کیا چاہیے مگر وہ پھر بھی اسے بولنے پہ مجبور کرنا چاہتا تھا۔

"ریموٹ کہاں ہے؟"

"یہ رہا میرے پاس کیا دیکھنا ہے۔ بین 10 یا ٹام اینڈ جیری۔" اس نے ریموٹ اس کے حوالے کیا تھا اور اس کی توقع کے مطابق وہ ایکس کلوز و چینل لگا کر بیٹھ گیا تھا اس کے موضوع پر ٹاک شو ہو رہا تھا۔

"مسٹر آفندی ایک کرپٹ انسان ہیں میڈیا کو اب تک ان کے ساتھ پر شرمندگی ہے کہ انہیں اس قدر تعظیم دی اس قدر۔۔۔" وہ ایک دم پھر سے حال سے کمیو فلاج کر گیا تھا وہ وہاں تھا مگر کچھ نہیں سن رہا تھا۔

"تو ٹھیک کہتا تھا ہم میڈیا کے لوگ گدھ کی طرح ہیں خبر ملتی ہے اور وہ ٹھیک ہے غلط ہے ملک کے فائدے میں ہے نقصان میں ہے بس سب سے پہلے چلا دیتے ہیں میں ایک بات کہتا تھا ہم میڈیا کے لوگ ہی لوگوں کو بناتے ہیں اور جب چاہیں انہیں خاک میں ملا کر خاک بھی کر دیتے ہیں اس سارے سینٹریو میں یہ سب میرے یار دوست ہیں مگر اس وقت یہ میری بدنامی کو شہرت کو بھی کیش کر لینا چاہتے ہیں ان کیمرہ ہونا بارہواں کھلاڑی والی حسرت کی طرح ہے اور یہ سب اسی حسرت اس پیاس کو مٹا رہے ہیں۔ انہیں لگتا ہے موقع سے فائدہ کیسے اٹھایا جا سکتا ہے اور وہ اٹھا رہے ہیں اور مجھے ان میں سے کسی سے شکوہ نہیں۔"

"تجھے شکوہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ میں جانتا ہوں دنیا میں اگر کوئی سچا انسان ہے کوئی اصولوں کی بات کرتا ہے تو وہ تو ہے۔"

"میں کہتا تھا میں میڈیا مین ہوں جسے چاہوں آسمان پر بٹھا سکتا ہوں جسے چاہوں زمین پر پٹخ سکتا ہوں مجھے اپنی ذہانت' اپنی چابک دستی' موقع کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی صلاحیت پر ناز تھا مگر میں غلط تھا میرا یقین جھوٹا تھا میں ایک عام انسان تھا اور اپنی سرپھری طبیعت کے ساتھ آسمان پر کیے جانے والے فیصلوں سے جھگڑ پڑا تھا۔"

"تمہیں کس بات کا دکھ ہے؟" آذر عباس نے نئے سرے سے اسے دریافت کرنے کی کوشش کی۔

"پتا نہیں مجھے اپنے مرنے کا غم ہے یا اپنی غلطی کو سمجھ لینے کی خوشی یا یہ جان کر دل دکھا ہے کہ دنیا میں علینہ نام کی ایک محبت تھی جس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا نہیں آفندی مجھے تم سے محبت نہیں۔"

"اس بے وقوف لڑکی کو رہنے دو اس سے میں نبٹ لوں گا بس یہ معاملہ کیسے دبایا جائے یہ بتا؟"

"اس لڑکی سے کیسے نبٹ سکتے ہو؟"

"سیدھا سادا بندہ ہوں دوغلی بات نہیں کرتا میرا تو ایک ہی طریقہ ہے لڑکی کو تھوڑا سا دھمکانا ہے دو چار اچھی بری باتیں کرنی ہیں اسے سیدھا ہو جانا ہے۔" آفندی قہقہہ لگا کر ہنسا مگر اس قہقہے میں خوشی نہیں دیوانہ پن جھلک رہا تھا۔

"تجھے کیا لگتا ہے وہ اتنی دبو لڑکی ہے کہ تیرے دھمکانے میں آجائے گی۔ آذر میری بدنامی کی کمپین اس کی محنت اور ہوم ورک کا نتیجہ ہے وہ پس پردہ رہ کر بڑے بڑے کام کر گزرنے والے لوگوں میں سے ہے۔" آذر عباس حیران ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

"مگر رپورٹنگ پر تو ایکس کلوزو کے سیکنڈ کمانڈ احمد درانی کا نام چل رہا ہے۔"

"ہاں احمد درانی میری کامیابی سے ناخوش رہتے تھے نگران کی ادارے میں ایک نہ چلتی تھی پھر یہ ایشو ہاتھ آگیا تو ان کی تو دل کی مراد بر آئی علینہ اسٹریس لے کر کام نہیں کر سکتی یہی وجہ ہے اس نے اپنی رپورٹنگ اچھی قیمت پر بیچ دی اسے نام اور شہرت سے نہیں پیسے سے سروکار ہے۔"

"علینہ اور پیسے سے سروکار وہ تو ہمیشہ اصولوں کی' سچائی کی' سچ بیانی کی بات کرتی ہے۔" آفندی کچھ نہیں بولا تھا۔

"دیکھ ایک کام کرتے ہیں ہم ایک پریس کانفرنس بلواتے ہیں اور اس ساری اسٹوری سے لاتعلقی کا اظہار کر لیتے ہیں۔"

"اچھا سچائی سے لاتعلقی کا اظہار کرنا آسان ہے اس نے میرے چلڈرن ہوم کے ایڈمن سے ملاقات ریکارڈ کی ہے' میرے اس زمانے کے فرینڈز سے بات چیت کو ہائی لائٹ کیا ہے اس چلڈرن ہوم سے بھاگنے اور مستقبل بنانے کے لیے ہر صحیح غلط کو درست قرار دیے جانے پر خوشمالی کی ہے انہوں نے کہا کہ مجھ میں انسانیت نہیں ہے اپنی جان سے بڑھ کر مجھے کسی کی جان کی پروا نہیں اور اس بات کے لیے وہ جس واقعے کو بنیاد بنا رہے ہیں وہ میری چودہ برس کی عمر کے خوف کی کہانی ہے۔

اس وقت چلڈرن ہوم میں بچے کچن میں کام کر رہے تھے کہ ایک ساتھی بچے کی بے احتیاطی سے کچن میں آگ لگ گئی اس نے ڈر کے مارے جلتا ہوا کپڑا ہاتھ سے ایک جھٹکے سے دور پھینکا اور وہ گیس پائپ پر جا پڑا اس سے پہلے کہ چلڈرن ہوم کے انتظامیہ پہنچ پاتی آگ چاروں طرف بھڑک گئی سب آگ کو بجھا رہے تھے کسی حد تک آگ بجھانے میں کامیاب بھی ہو رہے تھے کہ میرا ساتھی اندر پھنس گیا مگر آگ کے بلند ہوتے شعلے میرا حوصلہ توڑ گئے اور میں نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی میری ٹانگ زخمی ہو گئی تھی مگر میرے کمرے میں رہنے والا میرا روم میٹ افضل اس آگ میں کام آگیا تھا سب کا خیال تھا کہ وہ مجھ سے چھوٹا تھا اس لیے مجھے پہلے اسے بچانا چاہیے تھا پھر اپنی زندگی کو بچانے کی تدبیر کرنی چاہیے تھی سب نے مجھے لعن طعن کر رہے تھے کوئی میری فیلنگ نہیں سمجھ رہا تھا کہ میں بھی تو ایک بچہ تھا چودہ سال کا سہی مگر اندر سے میں بھی ڈرا ہوا خوف زدہ بچہ ہی تو تھا مگر ان سب نے مجھے خود غرض' بے حس مشہور کر دیا یہی وجہ تھی کہ میں نے سر کی چھت کو خیرباد کہا اور اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے معاشرے کے اکھاڑے میں اتر گیا۔"

"مجھے معلوم ہے دنیا کتنی مشکل جگہ ہے اگر سر پر ماں باپ کا سایہ نہ ہو۔" لمحہ بھر کو وہ پھر بولا۔

"میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں مگر ابا کے نام نہاد سائے میں چھپنے کو فوقیت دیتا ہوں مجھے لگتا ہے جب تک ابا میرے ساتھ ہیں میں دنیا کی سفاکی' دنیا کے غرور کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔"

"دنیا کا غرور ہاں تو ٹھیک کہتا ہے ہم جو سمجھتے ہیں ہماری ذات ہر چیز سے بالا' ہر انسان سے افضل ہے ہم جو سوچتے ہیں ہمارا دماغ ساری دنیا میں ذہانت کی ساری سیڑھیاں ایک ساتھ طے کر سکتا ہے تو در حقیقت ہماری ذات کا غرور دنیا کے غرور کے آگے مٹی چاٹتا ہوا

نظر آتا ہے۔ وہ رب سچ کہتا ہے غرور انسان کو نہیں سجتا انسان کو ہضم نہیں ہوتا۔ کہیں نہ کہیں میری طرح منہ کے بل ضرور گر کر رہتا ہے۔"

"تو دل تھوڑا نہ کر اور اس کیس کو ایک ماہر الیکٹیو کی طرح ہینڈل کر میڈیا کو میرے سر پر چھوڑ دے کوئی سوال پوچھنے نہیں آئے گا یہ میری گارنٹی ہے۔" اس نے پی ٹی سی ایل فون کو مشین پر منتقل کر دیا تھا اور موبائل کو اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔

"تو نے مجھے کیوں بچایا آذر عباس۔" وہ تھک کر لیٹ گیا تھا اور وہ اس کو دوا دیتے ہوئے مسکرایا تھا۔

"سیدھی سی بات ہے جہاں میں ہوں وہاں تجھے ہونا چاہیے' جب مریں گے دونوں ساتھ مریں گے پندرہ سال پرانا عہد و پیماں ہے' چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں ہوتا چھوڑ دنیا کو ایک پپٹ شو سمجھ یہاں جب جس کا داؤ لگ جائے وہ مور کا پر لگا کر ایلیٹ کلاس کا حصہ بن جاتا ہے۔ بس اپنا مورال مت گرنے دے دنیا کا تو کام ہی ایک ایک قدم پر ذلیل کرنا ہوتا ہے اور اس دنیا میں جینا ہے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ذلیل کرنے والا بننا چاہیے۔" اس کے حادثے کے ساتویں دن وہ بیٹا اسے سمجھا رہا تھا۔

پھر ایک دم سے پتا نہیں کیا سوجھی وہ اس کے لیے فروٹ خریدنے کے لیے باہر جانے لگا۔

"دیکھ اب کوئی حماقت مت کرنا۔" اس نے تنبیہہ کی۔

"مرنے کی کوشش وہ کرتا ہے جو زندہ ہو۔" وہ روٹھی سے بولا تھا۔

"کیا جرانی باؤنسر مارا ہے چل۔ مجھے تو اسی حالت میں قبول ہے۔" وہ باہر نکلا اور علینہ کی سنڈے شاپنگ کو برباد کرنے پہنچ گیا۔

"کچھ لوگ صرف بھوک ہونے پر کھاتے ہیں اور کچھ لوگ عادتاً کھاتے ہیں اور کچھ لوگ آپ کی طرح دوسروں کی زندگیاں تک نگل جاتے ہیں مگر ان کے اندر کی بھوک نہیں مٹتی۔" علینہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں تھی۔

"آپ خود کو سمجھتی کیا ہیں....." وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی تب اس نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔

"تمہاری جی داری اور راتوں رات شہرت کی ہوس نے ایک شخص کو موت کے کنارے پہنچا دیا ہے کیا تمہیں اس کا کچھ احساس ہے۔"

"آفندی جیسے لوگ نہیں مرا کرتے۔" سرسراہٹ بھرا بے حس لہجہ۔

آذر عباس کی جان جل گئی تھی۔

"کیا بگاڑا ہے تمہارا اس نے کہ تم اس کی زندگی کے درپے ہو گئی ہو۔"

"غیر ضروری باتوں کا جواب دینا میں ضروری نہیں سمجھتی۔"

"جب تم کسی کو غیر ضروری طور پر ڈس ہارٹ کر سکتی ہو تو تمہیں یہ بھی بتانا پڑے گا کہ آفندی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔"

"آفندی ایک کرپٹ انسان ہے اور میں چاہتی ہوں دنیا سے ہر کرپٹ آدمی ختم کر دیا جائے۔"

"اس آدمی کو مار کر صرف کرپٹ آدمی مر سکتا ہے کرپشن نہیں مر سکتی اس کی جگہ کوئی اور لے لے گا۔" وہ اس سے بحث کرنے لگا تھا۔

"تو میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس کرپشن کا مقابلہ کرتی رہوں گی۔"

"کرپشن کا مقابلہ اور تم' کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارا نام' شہرت بھی سب مانگے کی عزت کی طرح ہے تم نے بھی دولت کمانے کے لیے ہر طرح کے راستے کو اپنایا۔"

"مجھے صرف مضبوط بیک گراؤنڈ چاہیے تھا۔" اس بار اس کی آواز مدھم تھی اور آذر عباس اس سے لڑ پڑا تھا۔

"قانون ہو تو سب کے لیے برابر ہو گا نا تم خود کو کیا مقدس گائے سمجھتی ہو کہ تم سے بازپرس نہیں کی جائے گی اگر میں تھوڑا سا ہوم ورک کر لوں نا تو تمہیں آفندی سے بڑا کرپٹ کریکٹر ثابت کر سکتا ہوں یہاں پیسے دو تو گواہیاں خرید لینا مشکل تو نہیں۔"

"یہ باتیں تمہیں مجھ سے نہیں ایکس کلوزو چینل کے اونر سے کرنی چاہئیں تاکہ تمہیں اس کام سے فائدہ بھی ہو تم جو ایک بے وقوف باپ کی اولاد ہو میں تم سے کسی عقلمندی کی توقع نہیں کر سکتی۔"

"میرا باپ بے وقوف نہیں۔" وہ آفندی کو بھول کر اپنے باپ کا دفاع کرنے لگا تھا اور وہ طنز سے ہنس پڑی پھر نرمی سے بولی تھی۔

"تمہارا باپ جس طرح کا رنگین مزاج کردار ہے وہ ایلیٹ کلاس میں ہو کر بھی چٹکیوں میں مسلا جا سکتا ہے میں اگر اس کی دو چار رنگین داستانوں کی اسنیپس یوٹیوب پر ڈال دوں ناتو تم کہیں کے نہیں رہو گے مجھے تمہیں ایکس پوز کرنے کے لیے الگ سے محنت نہیں کرنی پڑے گی تمہارے لیے عباس رضوی کا بیٹا ہونا اور آفندی کا دوست ہونا ہی سب سے بڑی گالی بن سکتی ہے اور پھر تم خود کون سے ولی ہو تمہاری کہانیاں بھی کم تو نہیں۔" آذر کھڑا رہ گیا تھا اس سے ہلا بھی نہیں گیا تھا وہ جو کہہ رہی تھی غلط نہیں کہہ رہی تھی اور ایسے دشمن جو دھیمے مزاج کے ہوں وہ جب ایکشن لیتے ہیں تو ارد گرد کی دھرتی کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔

آذر عباس نے آفندی کے لیے شاپنگ کی تھی اور گھر آ گیا تھا۔ وہ چیزوں کو فریج میں رکھ رہا تھا جب اچانک آفندی نے کہا تھا۔

"بہت سخت زبان استعمال کی ہے اس نے۔۔۔"

آذر نے مڑ کے دیکھا وہ بیڈ پر تکیہ کمر کے نیچے رکھ کر اونچا ہو کر لیٹا ہوا تھا پہلے اس کی آنکھیں بند تھیں مگر اب یہ دو کھوجتی آنکھیں اس پر جم سی گئی تھیں۔

"کس کی بات کر رہے ہو میں تو سنڈے بازار گیا تھا؟"

"اچھا مجھے لگا تم علینہ سے مل کر آ رہے ہو۔"

"اپنے یہ میڈیائی ٹوٹکے مجھ پر مت آزما تو جانتا ہے میں بڑا کمینہ انسان ہوں گھبراتا نہیں ہوں۔"

"مگر جب علینہ کے سامنے کھڑے تھے تو تمہاری بولتی پر صدمہ کیوں آ گیا تھا۔" آذر عباس کے کان کھڑے ہوئے تھے وہ تیزی سے اس کے بیڈ کے قریب آیا تھا اور منٹوں میں بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا اس نے ریسیو کالز میں دیکھا علینہ کا نمبر مسترد ہو رہا تھا وہ بیگ میں جو کچھ ڈھونڈ رہی تھی وہ بھی کارروائی تھی وہ اس کی سوچ سے بھی زیادہ تیز لڑکی تھی۔

"وہ مجھے ختم کرنا چاہتی ہے مگر یہ صرف ہائی لائٹ ہونے کی خواہش نہیں لگتی۔"

"تجھے کیسے پتا۔۔۔" آذر بیٹھ گیا تھا۔

"تیری طرح ایک دوست ہے حسام وہ کہہ رہا تھا کہ احمد درانی نے بہت ہائی فائی ٹرمز اینڈ کنڈیشن پر اسے رکھنے کی کوشش کی ہے مگر اس نے صاف انکار کر دیا وہ میری سیٹ نہیں چھیننا چاہتی مگر کیوں؟"

"کیونکہ اس نے ایک جھٹکے میں تری بیساط پلٹ دی ہے کیا اب تو اس جاب پر واپس جائے گا۔ وہ کیوں اپنا وقت ضائع کرے جب کہ سارے چینل ایک دوسرے سے برتری حاصل کرنے کے لیے تیری ذات کے بخیے خود ادھیڑنے کو تیار رہیں۔" وہ ایک لمحے کو رکا اور پھر بولا۔

"تا حکم ثانی تیرے سارے بینک اکاؤنٹ فریز کر دیے گئے ہیں۔" "یہ بات اس تک پہنچی تھی کہ تبھی وہ اچھل کر بیٹھ گیا تھا نیند کا خمار ایک دم سے اتر گیا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے اس طرح ٹرسٹ کے زیر انتظام چلڈرن ہومز اور اولڈ ہومز کے معاملات کیسے چلیں گے کچن کا سارا انتظام ٹھپ ہو جائے گا ان بڑھوں کی دواؤں کے اخراجات کا کیا ہو گا علینہ پاگل لڑکی ہے اس نے یہ سب کچھ کیوں نہیں سوچا۔" وہ اٹھا تھا لہرایا تھا مگر آذر کے روکنے پر بھی نہیں رکا تھا۔

گاڑی کی چابی لے کر وہ نکل کھڑا ہوا تھا پھر علینہ سے مذاکرات کرنے وہ اسے فالو کرتا ہوا اس کے فلیٹ کے باہر پہنچا تھا آج تک ہوٹلز' آفسز میں ہی وہ ملتے رہے تھے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے فلیٹ تک پہنچا تھا پہلے اس کا خیال تھا وہ علینہ سے ملے اور معاملات سدھارے گا مگر اب اس نے ارادہ بدل دیا تھا وہ اب علینہ کے بھائی سے مل کر انہیں قائل کرنا چاہتا تھا

یہی سوچ کر وہ پلٹ گیا تھا پھر دوسرے دن جب وہ فلیٹ پہنچا تو دستک پر ایک بوڑھی ملازمہ نے دروازہ کھولا تھا۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں علینہ بی بی گھر میں نہیں ہیں۔" ملازمہ کی آنکھوں میں چمک لہرائی تھی اور وہ مدھم لہجے میں بولا تھا۔

"مجھے علینہ بی بی سے نہیں ان کے بھائی عالیان ہاشمی سے ملنا ہے۔"

"وہ کسی سے نہیں ملتے آپ صرف علینہ بی بی سے بات کریں۔" ملازمہ نے دروازہ بند کرنا چاہا مگر اس نے یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دی تھی وہ اندر آ گیا تھا ملازمہ فون کی طرف دوڑی تھی مگر اس نے پی ٹی سی ایل کا تار نکال دیا تھا ملازمہ کو صوفے پر زبردستی بیٹھ جانے کو کہا تھا اور خود نرمی سے عالیان بھائی کو آواز دی تھی۔ چھٹی ساتویں آواز پر کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"کون ہے کیوں آواز دے رہے تھے کیا پھر کوئی نئی خبر ملی ہے میرے بارے میں۔" آفندی کو آواز سن کر شبہ ہوا تھا پھر وہ مڑا تھا اور پتھر کا بت بن گیا تھا۔

"عالیان ہاشمی! یہ ہیں یہ عالیان ہاشمی۔" اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔

"تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو؟ کیا تم میرا انٹرویو کرنے آئے ہو۔" آفندی کا گلا خشک ہو گیا تھا اس سے وہاں رکا ہی نہیں گیا اور وہ ملازمہ سے معذرت کرتا ہوا باہر نکل گیا تھا اور پھر فلیٹ آیا تو اس کے آنسو رک ہی نہیں رہے تھے۔

"میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا آفندی لیکن میں آپ کی بربادی کی دعا نہیں کروں گا بلکہ میں اپنے اللہ سے کہوں گا کہ تمہیں قدم قدم پر کامیابیاں ملیں اتنی زیادہ کہ تمہیں اپنے ماضی کی یہ غلطی کبھی یاد نہ آئے تمہیں کبھی معافی مانگنے کی توفیق نہ ملے۔"

آفندی پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

"وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا اور مجھے یقین ہے یہ اتنی چھوٹی سی غلطی کبھی میرا راستہ نہیں روکے گی عالیان صاحب' رہیں مراعات تو میں آپ کو کسی اور چینل میں یہ سب کچھ دلوا سکتا ہوں۔" اس کا غرور بول رہا تھا۔

"نہیں میں نے کامیابی کبھی بھیک میں نہیں حاصل کی مجھے اپنے راستے خود بنانے کی عادت ہے مگر یاد رکھو جہاں میں کھڑا ہوں کسی اور وقت کسی اور سینیریو میں تم کھڑے ہو سکتے ہو اور ضروری نہیں تمہارے سامنے کوئی دل جو لہجہ تمہاری ساری ناکامی خود میں جذب کرنے کے لیے تیار کھڑا ہو گا۔" آفندی نے یکدم خود کو بستر پر گرا لیا تھا اور ماضی کا ایک ایک لمحہ اس سے ملنے چلا آیا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب اس کے دل میں سچائی کی قدر اور رشتوں کا پاس موجود تھا وہ ایک عام سا صحافی تھا جب ٹھٹھرتی سردی میں اس کے مالک مکان نے اس کا آرٹیکل پڑھ کر اپنے گھر سے باہر نکال دیا تھا وہ ایک چائے کے ہوٹل پر بیٹھا تھا جب اسے پہلی بار آذر ملا تھا وہ اس کے روز چھپنے والے آرٹیکل کی وجہ سے پہچان گیا تھا۔

"اوئے اس خبیث کی یہ مجال کہ اپنے ہیرو کو یوں ٹھنڈ لگائے۔" آفندی کا دل پتا نہیں اس کی باتوں سے کیسا پگھلا تھا کہ اس شہر میں ملنے والے پہلے ساتھ کو وہ دل کا حال کہہ سنانے سے روک نہیں سکا اور پھر اس کا رد عمل۔

"سن تو میری حمایت کر رہا ہے یا مجھے ذلیل کر رہا ہے۔" ٹھنڈ لگانے پر وہ جلبلایا تھا اور آذر عباس قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے تیری قسم ہم صرف تیرے حمایتی رہیں گے۔"

"تو ہمیشہ اتنا جھوٹ بولتا ہے یا صرف آج موڈ میں ہے۔" آذر عباس کی مسکراہٹ ہونٹوں پر پھر سے پھیل گئی تھی۔

"جھوٹ سچ کا نہیں پتا ہم تو بس یاروں کے یار ہیں ترے قلم میں وہ بات ہے ضرور کہ روز کے روز بدن میں کچھ کر گزرنے کی امید سر اٹھاتی ہے اور میں روز سوچتا تھا تجھ سے ملنا ضرور ہے اب دیکھ نیت نیک تھی

تو مجھ سے مل کے رہا۔" وہ اپنا بیگ کاندھے پر ڈال کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور پھر نرمی سے بولا۔

"ایسے قلم کا فائدہ کہ رات کے بارہ بجے آپ کا مالک مکان آپ کو جبری گھر سے نکال دے اور کہیں اتنا سچ لکھتے ہوئے ہم اس کا بار نہیں اٹھا سکتے خود تو مرو گے ہمیں بھی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ نہیں بھئی نہیں ہم مکان کرائے پہ دینا چاہتے ہیں۔ قبر برائے فروخت پر پیسہ نہیں لگا سکتے۔"

"ہاہاہا ذہین بندہ تھا لیکن خیر یہاں تمہیں یہ ڈر نہیں ہے تم جو لکھنا چاہتے ہو لکھ سکتے ہو تم تو فری لانس صحافی ہونا۔"

"ہاں۔" مختصر جواب آذر کی پراڈو سڑکوں پر پھسل رہی تھی پھر ایک کوٹھی کے سامنے آکر اس نے پراڈو کی رفتار کم کر دی تھی ہارن پر چوکیدار نے گیٹ کھولا تھا پھر وہ باہر نکلا تھا کہ ایک عورت نے آذر کو گلے لگا لیا تھا۔

"اپنے ابا کی باتوں کا اتنا برا مت منایا کرو وہ بس زبان کے تیز ہیں دل کے برے نہیں۔"

"جی اماں آپ بے فکر رہیں میں بھی ان کا بیٹا ہوں ایویں ان سے چھیڑ کرتا رہتا ہوں سیدھی سی بات ہے ابا نے جس قسم کی لگژری زندگی گزارنے کی عادت مجھے ڈال دی ہے۔ میں کہیں نہیں جا سکتا زیرو سے شروع کرنا میری ہمت نہیں ابا کی جائیداد کا ہی آسرا ہے، سو انہیں تو طرح دینی ہی پڑتی ہے۔" اماں نے مصنوعی خفگی سے اس کی لن ترانی پر اس کے کان پکڑے تھے اور وہ ہنستا ہوا آفندی کا تعارف کروانے لگا تھا۔ اماں بھی اس کے کالم شوق سے پڑھتی تھیں، سو گیسٹ ہاؤس میں اس کے لیے ایک کمرہ ٹھیک کروا دیا گیا تھا۔ مگر اگلا کالم اس نے میل کیا تھا کہ اس کو نوانٹری بھگتنا پڑی تھی، اسے ایک جھٹکا سا لگا تھا، وہ رات گئے اخبار کے آفس پہنچا تھا۔

"مسٹر ظفر آپ نے میرے کالم کو مسترد کیوں کیا ہے؟"

ظفر احمد نے اس کی طرف دیکھا اور نرمی سے بولا۔

"حکومت پر کڑی تنقید کرنا چھوڑ دو ہمیں تمہارے کالم لگانے میں کوئی عار نہیں۔"

"مگر آپ کا اخبار سچ کا علم بردار رہا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ مگر کل میں نے سوچا اگر حکومتی حلقوں سے بنا کر نہیں رکھی گئی تو یہ اخبار صرف دو صفحوں پر چھپے گا، ایک تم پڑھا کرو گے ایک میں۔"

"کیا آپ کو دھمکی ملی ہے۔" وہ کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"دھمکی نہیں ملی، میں نے آج اپنے بزنس مارکیٹنگ سیل کی رپورٹ اعداد و شمار دیکھے ہیں، ہم اپنی پالیسی کی وجہ سے اول درجے سے تیسرے درجے پر آکر رک گئے ہیں۔"

"مگر ہمیں عوام میں جو مقبولیت حاصل ہے ہماری کہی بات پر عوام جس طرح آنکھ بند کر کے یقین کرتے ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تیسرے درجے کا اخبار کہلائیں۔"

"آفندی ڈریم لینڈ میں رہنا چھوڑو حقیقت کا سامنا کرو، مقبولیت پیٹ نہیں بھرتی، مقبولیت لگژریز نہیں دیتی، کمپرومائزز زندگی کا حصہ ہیں، اگر میں تھوڑا سا اپنا مستقبل محفوظ رکھنا چاہتا ہوں تو کیا برا ہے اور رہی عوام تو عوام کی آج تک سنی کس نے ہیں، بس ملک پر بیس فیصد افراد کی حکمرانی ہے اور ہمیں یہ حکمرانی ماننی پڑے گی۔" ایک لمحہ کا وقفہ لیا، پھر نرمی سے بولے۔

"زہر اور مٹھاس ایک ساتھ پڑی ہوں تو تم زہر تو نہیں کھاؤ گے نا، زندگی کا ایک چانس لینا عین فطری تقاضا ہے، تم ہمارے اخبار کی کریم ہو، بس ہاتھ ہولا رکھو تو تم بھی چل سکتے ہو اور میں بھی۔" وہ اٹھ کر آگیا تھا۔ دوسرے اخبارات سے رابطہ کیا تھا۔ ہر سب طرف سے انکار تھا، پھر بے انتہا کم سرکولیشن والے اخبار میں اس نے کالم شروع کر دیے تھے۔ اس اخبار کی سرکولیشن تو بڑھ گئی تھی۔ مگر اس کے ذاتی معاملات بہت بگڑ گئے تھے۔ آذر اس کا سپورٹر تھا، مگر اسے خود شرمندگی ہوتی تھی۔ پھر جن دنوں وہ آفس میں تھا۔ ظفر صاحب کا بلاوا ایک بار پھر سے آیا تھا۔ کوئی نیا اخبار لانچ کرنا چاہتے تھے وہ میٹنگ میں پہنچا تھا اور تب پتا چلا تھا۔ وہ اپنی حکومتی پالیسی پر تنقید کرنے پر ایک چینل کھولنے کا این او سی لینے میں کامیاب ہو گئے تھے اور وہ اس چینل میں نیوز روم کی ساری ذمہ داری اسے دینا چاہتے تھے۔

"کمپرومائز کر لینا کچھ برا نہیں تم خود کو بیچ تھوڑی رہے ہو دل نہ چاہا تو چھوڑ دینا چینل۔" آذر نے سمجھایا، مگر ظفر صاحب بھی کائیاں تھے دو سال کا کم مدتی کنٹریکٹ سائن کروایا، پھر خبریں تھیں اور اس کے نام کی مہر تھی اور وہ بلبلایا تھا، پھر ایک دم سے لگژریز نے اس کی آنکھیں چکا چوند کر دیں۔

چلڈرن ہوم سے بھاگے ہوئے بچے کو ایک دم سے مضبوط پیر نما کر راستے طے کرنے کا این او سی مل گیا تھا۔ ساری سچائی کے جراثیم آہستہ آہستہ مرنے لگے تھے۔ سچ اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ شاید سچ بھی اس کی جگہ بنانے کی مجبوری کی طرح تھا۔ کچھ مختلف نظر آنے کی حسرت جیسے، اپنے ماضی کو جھٹلانے کی ایک ناکام کوشش جیسا، تب ہی اسے یہ تبدیلی جلدی قابل قبول لگنے لگی تھی۔ بڑی بڑی حکومتی پارٹیز میں وہ شریک ہونے لگا تھا اور اسے یہ رنگینیاں اچھی لگنے لگی تھیں، اس نے کون سا نروان لیا تھا جو وہ ان رعنائیوں سے منہ پھیر لیتا، پھر ایک کے بعد ایک چینل وہ بہترین مراعات کے چکر میں بدلتا گیا، ان دنوں اسے یہ ایک ہابی کی طرح لگتا تھا، یہاں تک کہ وہ ایکس کلوزو چینل پر انٹر ہوا تھا تب اس وقت اسد درانی نے کہا تھا۔

"مراعات جو تم چاہو، مگر کام وہ جو ہم چاہیں۔"

"جی بالکل آپ کی مرضی ہی میرا ایمان ہے۔" ان دنوں لفظوں کی ساخت اور لفظوں کی بدصورتی کچھ بھی اسے ہراساں نہیں کرتی تھی۔ وہ چاپلوسی اور مکھن میں ہر ایک کو پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ آذر عباس اس کے ٹریک بدلنے پر تنقیدی مکالمہ کرتا رہتا تھا، مگر کامیابی کے ہنڈولے میں جھولنے کی عادت اسے کسی کی آواز تو کیا خود اپنے ضمیر کی آواز سننے کو بھی منع کر دیا کرتی تھی، وہ اس وقت اسد درانی کے پھیلائے ہوئے جال کا شکار تھا، تب انہوں نے ایک فائل اس کے سامنے رکھی تھی۔

"یہ تمہارا ٹیسٹ کیس ہے، اوپر سے احکامات آئے ہیں، اس بندے کو میڈیا سے آؤٹ کر دو، اگر تم کامیاب رہے تو تمہارے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے ہوں گے کہ تم اپنا چینل کھول سکتے ہو۔"

"اس آدمی میں کیا خاص بات ہے سر۔"

"یہ حکومت کی پالیسز سے ٹکراتا ہے، حکومت پر تنقید کرتا ہے اور عوام کی مقبولیت کی وجہ سے حکومت کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر چیلنج کرتا ہے، حکومت کے متوازی حکومت کرنے ملکی رٹ کو چیلنج کرنے کے جرائم ہیں اس کی چارج شیٹ میں، اسے مارنا مشکل نہیں، مگر اس طرح یہ قوم کا ہیرو بن جائے گا اور حکومت نہیں چاہتی کہ اسے کوئی تمغہ شجاعت ملے۔" وہ لمحہ بھر کو رکے، پھر آہستگی سے بولے۔

"ہماری قوم بھی ناڈیم فل قسم کے تمغے جیب میں لے کر پھرتی ہے جہاں کہیں کسی نے ان کے حق کی بات کی بھلے اپنی شہرت کے لالچ میں بھی آواز اٹھائی تو فوراً سینے پر تمغہ سجانے کو بے تاب ہو جاتے ہیں، اپنے بچوں تک کے نام اس کے نام پر رکھ کر خراج عقیدت پیش کر دیتے ہیں اور پھر جب ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں تو پھر سے کوئی نیابت ڈھونڈنے نکل پڑتے ہیں جو ان کے غم، خوشی، ان کے دل کی بات کو اپنی آواز دے سکے، مگر یہاں کوئی کسی کے ساتھ مخلص نہیں ہے، ہر شخص کی ضرورتوں کا الگ گوشوارہ ہے، مگر ہماری پوری پاکستانی قوم۔۔۔" اسد درانی کا لہجہ اسے بانٹ کر رہا تھا، مگر وہ بھی بے حسی کے عمیق غاروں میں گر گیا تھا اور اس نے فائل اٹھالی تھی۔

سارا بائیوڈیٹا اس کے سامنے تھا، اس نے دوستی کی تھی، عالیان ہاشمی کے ساتھ اور اس کو اپنے آئیڈیل کی طرح ٹریٹ کرتا تھا۔ عالیان ہاشمی اس کی توجہ اپنے کاز کے لیے اس کی پرخلوص ہونے پر خوش تھا۔

"تم جس چینل سے وابستہ ہو اس کے ایمپلائی اس طرح کا دل نہیں رکھتے، مگر تمہاری بچپن کی یادیں تمہیں اتنا اچھا رکھنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ واقعی انسان جس دکھ، جس کرائسز سے گزر چکا ہو اس کا

دکھ صرف وہ ہی جان سکتا ہے۔"

"جی عالیان بھائی۔" اس نے ریشہ خطمی انداز میں کہا تھا۔ اور عالیان ہاشمی کے کاز کے لیے اتنا اہم ہو گیا تھا کہ عالیان اس پر بہت بھروسہ کرنے لگے تھے۔ بنا پڑھے دستخط کرنے لگے تھے۔ تب ہی اس نے دو' تین پراپرٹیز کے کاغذات پر سائن لیے تھے۔ انہوں نے بے گھر افراد کی کفالت کرنے کے لیے "آشیانہ ہومز" اسکیم پر عملدر آمد کیا تھا۔ لوگ روز ایک روپیہ ان کے کاز کے لیے دیتے تھے۔ اسپتال کا ایک پروجیکٹ کمپلیٹ ہو چکا تھا' دوسرے کا 75 فیصد کام ہو چکا تھا اور یہ ہی وقت تھا جب اس نے عالیان ہاشمی کا میڈیا ٹرائل فیک نام سے ایکس کلوزو کو سمیٹ کیا گیا تھا۔

پہلی قسط ہی دھماکے دار تھی۔ میڈیا ہل کر رہ گیا تھا اور عوام ہکا بکا' وہ عالیان ہاشمی کے کردار کے بخیے ادھیڑ رہا تھا۔ کیسے ایک عام پروفیسر کا بیٹا اتنے بڑے مقام پر پہنچ گیا۔ میڈیا نے عالیان ہاشمی کا گھیراؤ کر لیا تھا۔

"آپ کے اتنے سارے بینک اکاؤنٹ' اتنا پیسہ آپ کے پاس کہاں سے آیا' کیا آپ نے عوام کو چیٹ کیا ہے۔"

"نہیں میں اپنے لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتا' جس جرم کی سزا کبھی معاف نہیں ہوتی وہ اپنی قوم سے غداری ہے' میں غدار نہیں ہوں۔"

"پھر یہ وے آف لائف کیا آپ کے آباؤ اجداد کے زمانے سے آپ کے ساتھ ہے' یہ گھر' یہ گاڑی' یہ سب۔"

"میں سول انجینئر ہوں۔"

"تو کیا سول انجینئرنگ میں اتنی جلدی پیسہ ارن ہوتا ہے۔" ایک اور تیکھا سوال۔

"نہیں مجھے نہیں پتا' یہ اکاؤنٹ کب اور کیسے کھلے اتنی پراپرٹی میرے نام سے کس نے خریدی۔"

"تو کیا آپ اینجلز کے زمانے میں جی رہے ہیں سر۔"

"کیا ان ڈاکومنٹ پر دستخط آپ کے نہیں۔"

اخبارات میں ڈاکومنٹ چھاپ دیے گئے تھے۔ حکومتی حلقوں میں خبروں سے چٹخارے کشید کیے جا رہے تھے۔ فیر جسٹس کی باتیں ہو رہی تھیں' کمیشن بٹھایا جا رہا تھا' ملکی پیمانے پر یہ بہت بڑا کھیلا سامنے آیا تھا' سب اپنے اپنے مزے لے رہے تھے' بس عوام ہکا بکا کھڑی تھی۔ عالیان شاہ کے سارے خدمت خلق کے ادارے حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیے تھے ان آشیانوں میں رہنے والوں کی آہ بکا الگ تھی۔ مگر آفندی ان دنوں ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اسے اتنے بڑے ایکس کلوزو رپورٹ پر سال کی بہترین رپورٹنگ کا ایوارڈ دیا گیا تھا' اس کا بینک بیلنس ایک دم بہت سارے ہندسوں کو پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ آذر عباس نے حقیقت جاننے کی کوشش کی' مگر وہ خود کو صاف نتھار کر لے گیا تھا۔ وہ جانتا تھا آذر عباس کتنا جذباتی ہے' اگر اسے بھنک بھی پڑ جاتی کہ عالیان والے قصے میں اس نے کوئی گیم کھیلی ہے تو وہ اس پر دو حرف کہہ کر اس سے الگ ہو جاتا اور اتنی ساری دنیا میں اس نے بہت مشکل سے ایک دوست پایا تھا۔ مطلب پرست' خود غرض بہت سے رشتوں میں سے ایک سچا رشتہ جسے وہ گنوانے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا' مگر ایک دوستی اس نے عالیان ہاشمی سے بھی توڑی تھی۔ وہ خود کتنا سچا اور کھرا دوست بن پایا ان کا؟

انسان کے اندر جو کچھ ہوتا ہے وہ دنیا کو وہ ہی کچھ دیتا ہے تو کیا اس کے اندر مطلب پرستی' ذات کے زور' خود غرضی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کیا علینہ سے محبت کرنے میں بھی اس کا کوئی سواد تھا؟

"کیا وہ علینہ سے بے غرض محبت کرتا تھا۔" اس نے خود سے سوال کیا' مگر اس کے وجود کے اندر اتنے پنڈورا باکسز کھل گئے تھے کہ وہ خود کو کوئی جواب نہیں دے پا رہا تھا۔

"انسان ایک بار جیتا ہے' ایک بار مرتا ہے" اور وہ اپنی غرض' اپنے دھوکے کے ساتھ ہر روز تھوڑا مر جاتا تھا۔ وہ بیچ لی کر جھوٹ بیچتا تھا' وہ کتنا گھٹیا سوداگر تھا۔ آخرت کو دنیا کی قیمت پر فارسیل کرتا آیا تھا' جب تک اسے اپنے چلڈرن ہوم کا وہ چھ سال کا بچہ نہیں بھولا تھا جو اس پر یقین رکھتا تھا۔

"آپ مجھے بچالیں گے نا آفندی بھائی۔"

"ہاں میں تمہیں ضرور بچالوں گا۔" اس نے سوچا تھا وہ اس کارنامے کے بعد ایک دم سے چلڈرن ہوم کے بچوں میں ہیرو بن جائے گا' مگر آگ کی کسی سے دوستی نہیں ہوتی۔ دہکتے شعلے برساتی آگ دیکھ کر اپنے اردگرد اسے اپنا وعدہ یاد رہا' نہ ہیرو بننے کا خواب اس نے کھڑکی کھولی تھی اور کود گیا تھا۔

"مجھے نہیں بچایا آفندی بھائی۔" کتنی راتوں تک یہ آوازیں اس کے وجود کو چھیدتی رہیں' پھر اسے عادت ہو گئی وہ چلڈرن ہوم کے مخالفانہ ماحول سے بھاگ گیا' پھر اس نے جتنا بھی سفر کیا' جو بھی ایکٹ کیا صرف اپنی ذلت کی نمائش' اپنے آپ کو سب سے افضل ثابت کرنے کے لیے کیا وہ شدید احساس کمتری کا شکار تھا اور خود کو ایک ہیرو کی طرح ٹریٹ کرتا تھا جس نے نامساعد حالات میں کبھی ہار نہیں مانی۔

"مگر کیا واقعی اس نے کبھی ہار نہیں مانی تھی؟" ہزار با کی طرح یہ سوال اسے پھر سے ہراساں کر رہا تھا' مگر وہ تو باری ہوئی نسل کا نمائندہ تھا' وہ نسل جو ہر دور میں اس ملک کی بی داور قوم کے متوازی چلتی آرہی ہے جو کہتی ہے زندگی میں کوئی ہوپ' کوئی امید بھی نہیں۔ اور وہ خود کو بزعم خود اس امید کو ڈھونڈ نکالنے والا اونی سا کارکن سمجھتا تھا۔

مگر چاہتا تھا کہ لوگ اس کی کسر نفی پر خود سے اس پر ستائش کے ڈونگرے برسائیں اسے کندھوں پر بٹھا کر سب سے اونچے سنگھاسن پر بٹھا دیں' مگر اس نے یہ سب پانے کے لیے کتنے غلط راستے کا انتخاب کیا تھا۔ عالیان ہاشمی نئے سرے سے اس کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

ان کا کہا ہوا جملہ اس کے وجود میں سرسراہٹ پیدا کر رہا تھا۔

"جہاں میں آج کھڑا ہوں یقیناً" لوگوں کے لعن طعن کو سہہ رہا ہوں' مگر میرا ضمیر مطمئن ہے' مجھے پتا ہے میں نے غلط نہیں کیا' لیکن کیا آج کے بعد تم بغیر سلیپنگ پلز کے سو سکو گے' ایسی کامیابی جو بغیر محنت کے تمہیں ملے تمہارے دل کو خوشی نہیں دے سکے گی' تمہیں جب جب خود پر غرور ہو گا تب تب تمہارے اندر کا آفندی تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے گا۔ چھینی ہوئی یا لوٹی ہوئی کامیابی سے تم اپنی ذات کو کبھی ڈیفائنڈ نہیں کر سکو گے۔ زندگی چکر کی طرح ہے آج میں اوپر سے نیچے کھڑا ہوں' لیکن تم جب اوپر سے نیچے آؤ گے تو کیا کھڑے رہ سکو گے۔" وہ چلتے چلتے بیٹھ گیا تھا' اس کا سارا وجود پسینے سے بھر گیا تھا۔

تب ہی بیل بجی تھی اس نے دروازہ کھولا اور اس کے سامنے علینہ کھڑی تھی' اس نے دھکے دے دے کر اسے دیوار سے لگا دیا تھا اور پھر چلائی تھی۔

"تم اتنے گھٹیا انسان ہو سکتے ہو میں نہیں جانتی تھی' مجھ پر بس نہیں چلا تو میرا بھایان جی کو کڈنیپ کر لیا' میں تمہیں میڈیا کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گی' تم سمجھتے کیا ہو خود کو اب کوئی حیثیت نہیں ہے تمہاری' تم ایک ذرہ ہو ذرہ جسے میں اپنی سینڈل کے نیچے جب چاہوں مسل سکتی ہوں۔" آفندی جو دماغی طور پر پہلے ہی اکھاڑ پچھاڑ کا شکار تھا اس نئی آفت سے ششدر رہ گیا تھا۔

"بکو' کہاں ہیں میرے بھایان... آفندی میں اتنی پاگل ہو رہی ہوں کہ اس وقت تمہیں قتل بھی کر سکتی ہوں۔"

"کردو قتل' میں مرجانا چاہتا ہوں۔" اس کی ذہنی رو یک دم معذرت کی طرف گھوم گئی تھی۔ اس نے اس کے قدموں میں بیٹھ کر بے قراری سے کہا تھا۔

"مجھے معاف کردو میں واقعی بہت برا انسان ہوں' مجھ سے تم محبت تو کیا نفرت بھی مت کرنا' میں راندہ درگاہ ہوں' مجھے تم جتنا ذلیل کرو گی میرے دل سے تمہارے لیے اتنی ہی دعائیں نکلیں گی' عالیان بھائی کی بہن ہو معاف کرنے کو کہوں تو کبھی معاف مت کرنا' میں اتنی بے کار زندگی کے لیے کتنے انمول لوگوں سے جھگڑتا رہا۔" وہ کہہ کر سمندر کی طرح چپ ہو گیا تھا' اس کی آنکھیں غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ علینہ

ہکا بکا اس کے رد عمل کو دیکھتی رہی، وہ ابھی تک اسی طرح زمین پر بیٹھا تھا۔

"آفندی۔" اس نے اس کا کندھا ہلایا، مگر اس میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ وہ تیزی سے بیڈ پر پڑے آفندی کے موبائل کو اٹھا چکی تھی، پھر آذر کا نمبر ڈائل کیا تھا، اس نے بہت چہکتی آواز کے ساتھ اس کا فون ریسیو کیا تھا اور نان اسٹاپ بولنے لگا تھا۔

"یار یہ عالیان بھائی بڑے مزے کے انسان ہیں ان کی میموری ابھی تک اسی طرح فل ہے، مطالعہ اور زندگی کے تجربوں سے بھرپور بس تھوڑے سے ایب نارمل ہو گئے ہیں۔ مگر انسانوں کے درمیان رکھا جائے تو وہ بہت جلد کور کر سکتے ہیں، میری تو ان سے پکی والی دوستی ہو گئی ہے۔ یہ علینہ بھی ناگھا مڑ ہے، اس نے ان کو دکھ اور غم کے ساتھ خود سے لڑنے نہیں دیا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا وہ چیختے چلاتے، مگر آخر کار زندگی کو نئے پیٹرن کے ساتھ مان لیتے، پھر آہستہ آہستہ اس بات کو لوگ بھول جاتے وہ بھی اپنی ذات کی تسکین کے لیے خدمت کرنے کا کوئی اور راستہ چن لیتے، مگر علینہ اس نے ماؤں والی دل گیری سے انہیں اپنے پروں میں چھپا لیا، دنیا سے کاٹ کر ایک فلیٹ میں محدود کر دیا اسے لگتا تھا کہ ساری دنیا صرف ان کے کرپشن کے قصے ہی ان سے ڈسکس کرے گی۔ میڈیا کے ساتھ یہ سلوک روا رکھتی تو اچھا تھا۔ مگر اس نے گناہ کی طرح انہیں گھر میں چھپا کر رکھ دیا۔ اتنا کیریئو بندہ دن میں ہزاروں لوگوں سے ملنے والا ان کے دکھ درد سننے والا بندہ ایک فلیٹ میں محدود کر دیا جائے تو رد عمل تو نکلے گا نا۔" لحہ بھر کو چپ ہوا، پھر آہستگی سے بولا۔

"یہ تو اتنا چپ کیوں ہے، کہیں علینہ بی بی نے تیرے بخیے تو نہیں ادھیڑ کر رکھ دیے۔" اس نے فون رکھ دیا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی، آفندی ابھی تک ایسے ہی بیٹھا تھا۔ اس بار اس نے آذر کو اپنے نمبر سے فون کیا تھا۔

"پلیز جلدی یہاں آؤ، آفندی عجیب سا بی ہیو کر رہا ہے۔" آذر نے فون سنتے ہی فلیٹ کی طرف دوڑ لگائی تھی۔

عالیان بھائی کی شکل دیکھ کر وہ ان سے لپٹ گئی تھی اور پھر سے ہچکیوں، سسکیوں سے رو پڑی تھی۔ آفندی غلط تھا تو اس نے کون سے ٹھیک راستے سے کامیابی کمائی تھی اس نے تو ان لوگوں سے بھی داؤ گھات کیا تھا جو صرف اس کے قلم کی سچائی پر ایمان رکھتے تھے۔ ایک کرپٹ انسان دوسرے کرپٹ انسان کو گالی نہیں دے سکتا تھا۔ عالیان بھائی نے دیکھا، آفندی لٹے ہوئے مسافر کی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ وہ اس کے قریب آ گئے تھے۔ آذر اسے آوازیں دے دے کر تھک چکا تھا۔ مگر وہ جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔

"تمہیں بھی کسی نے دھوکہ دیا ہے کسی دوست نے؟ تمہیں پتا ہے دوست جب دھوکہ دے تو بڑا دل جلتا ہے جولیس سیزر کے آنسو ابھی تک میرے اندر گرتے رہتے ہیں۔ وہ ہر شام میرے قریب آ کر بیٹھ جاتا ہے کہتا ہے کسی کا بھی اعتبار کر لو مگر دوستی کا اعتبار مت کرنا۔" آذر نے چونک کر دیکھا، آفندی کی وجود میں تحریک پیدا ہوئی تھی۔ اس کی پتلی کا زاویہ عالیان ہاشمی پر آ کر رک گیا تھا اور عالیان ہاشمی نے پھر سے کہا تھا۔

"مگر یہ آذر عباس ہے یہ کہتا ہے دنیا میں سب لوگ برے نہیں ہوتے، دنیا میں بہت اچھے دوست بھی ہوتے ہیں، یہ بھی بہت اچھا دوست ہے، یہ کہتا ہے یہ مجھے کبھی دھوکہ نہیں دے گا۔

سنو تم بھی اس سے دوستی کر لو، یہ تمہیں بھی دھوکہ نہیں دے گا۔ پر وہ علینہ کہتی تھی سب لوگ برے ہیں، مگر دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں، تب ہی تو دنیا ابھی تک چل رہی ہے، تم میرے دوست بنو گے۔" آفندی نے ان کا ہاتھ تھام کر اپنا سر ان کے ہاتھ پر جھکا دیا تھا۔ پھر وہ ایسے رویا تھا جیسے کسی کا ماتم کر رہا ہو۔

"میں اچھا نہیں ہوں، میں بہت برا ہوں، مگر آپ مجھے اچھا بنا سکتے ہیں، دنیا میں سب لوگ فرشتے نہیں ہوتے مجھ جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں، عالیان بھائی مجھے معاف کر دیں، پلیز مجھے معاف کر دیں۔"

"تم مجھے جانتے ہو ارے واہ۔" عالیان ہاشمی بے طرح خوش ہوئے تھے۔ پھر علینہ کی طرف دیکھ کر بولے تھے۔

"یہ بہت اچھا لڑکا ہے شاید غلط فہمی کا شکار ہے کہ یہ برا انسان ـــ ہے، بابا کہتے تھے برے انسانوں کی آنکھ میں آنسو نہیں آتے آنسو صرف ان کی آنکھوں میں آتے ہیں جن کے دل نرم ہوں جنہیں اللہ توبہ کی توفیق دینا چاہتا ہو اور جسے توبہ کی توفیق مل جائے، وہ اتنی بے چارگی سے نہیں روتا، غلطی مان لینا آدھی معافی ہے۔"

"عالیان بھائی۔" آفندی نے دیکھا، وہ ایک لمحے میں دانا لگتے تھے، ایک لمحے میں معصوم سے بچے جس کا من اندر سے صاف تھا علینہ، عالیان بھائی کو لے کر نکلی تھی۔ آذر اس کے ساتھ باہر نکلا تھا، پھر نرمی سے بولا۔

"بہنا میں نے اپنے ایک بہت اچھے ڈاکٹر دوست سے بات کی ہے، وہ کہتا ہے عالیان بھائی بالکل ٹھیک ہو سکتے ہیں، بس وہ تین ماہ ان کے ساتھ محنت کرنی ہے گی۔"

"میں ساری زندگی ان کے نام لگا چکی ہوں، دو تین ماہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔"

"تمہاری یہ ہمت اور حوصلہ قابل دید سہی، مگر زندگی کے حصے میں سے آفندی کو کبھی باہر مت نکالنا، وہ بہت معصوم، بہت سیدھا انسان ہے، تم جانتی ہو ماں باپ کے زیر نگرانی بچوں میں بھی کردار کی ٹیڑھ کمزوریاں رہ جاتی ہیں، وہ تو پھر ایک چلڈرن ہوم میں پلا ہوا انسان ہے اسے معافی کا مارجن تو ملنا چاہیے نا۔" علینہ کچھ نہیں بولی تھی، مگر اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ جو آذر سے ڈاکٹر کی میٹنگ کے بعد عندیہ سے پیدا ہوئی تھی، بہت گہری تھی، آذر اندر پلٹا تھا اور آفندی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا، پھر لجاجت سے بولا تھا۔

"میں برا انسان سہی، مگر اتنا برا نہیں کہ آج عالیان بھائی کو اس حال میں دیکھ کر بھی سچ نہ بولوں، آذر یہ سب میری وجہ سے۔" آذر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"میں جانتا ہوں اس کہانی کا جو بھی سچ ہے میں اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ معاملات چل رہے تھے، میں تجھے روکنا چاہتا تھا، مگر تیری آنکھوں کا سرور، خوشی اس نے مجھے خود غرض بنا دیا، میں تجھے اتنا ہی کامیاب دیکھنا چاہتا تھا جتنا تو اس وقت ہو رہا تھا۔ مگر اس کی قیمت بہت بڑی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ تو اس وقت خود اقرار کرے، مگر تیرا موڈ یہ نہیں تھا، ہاں میں نے ایک اچھا دوست ہونے کا ثبوت نہیں دیا، مگر میں بس دوست تھا، سماج سیوک نہیں، میں ان بہت سارے لوگوں میں سے ایک تھا جو گھر کے ڈرائنگ رومز، کیفے ہر جگہ چائے کی پیالی میں طوفان کی بات تو کرتے ہیں، مگر موقع پڑنے پر کمر دکھا دیتے ہیں، تجھے کیا لگتا ہے تو جو عالیان بھائی کے ٹاسک کی پروگریس بتاتے وقت ہمیشہ میری آنکھوں سے آنکھیں بچا کر جھکا کر بات کرتا تھا تو مجھے پتا نہیں چلتا کہ تو رونگ ہے ٹوٹلی رونگ۔" آفندی کسی بچے کی طرح اس کے سینے سے آن لگا تھا۔ پھر سے رو پڑا تھا، یہاں تک کہ مطلع صاف ہوا تو وہ شام گئے جلدی جلدی مچانے لگا تھا جانے کی تب آفندی نے بھنا کر کہا تھا۔

"کس کے لیے گھر جانا ہے تجھے، کون ہے جو تیرا انتظار کر رہا ہے وہاں، مت جانا آج ہم اپنی ساری پرانی باتیں کرتے ہیں۔"

"پرانی کیوں نئی باتیں کریں گے، مگر جان من گھر میں تین دن سے ابا آئے ہوئے ہیں۔"

"یعنی تین دن سے تیری غیر حاضری اسی وجہ سے تھی۔" مسکرایا پھر بولا۔

"ہاں تین دن پہلے ابا کا فون آیا تھا انہیں سخت بخار تھا کوٹھی میں کوئی ان کی دیکھ بھال نہیں کر رہا تھا، تب ابا نے مجھے فون کیا، کہنے لگے میں بہت برا انسان ہوں، مگر یار میرا ابھی دل چاہتا ہے تیری ماں کی طرح میری بھی قبر ہو جس پر تو دنیا دکھاوے کو ہی سہی فاتحہ پڑھنے ضرور آئے۔"

"میں نے کہا ابا فاتحہ پڑھوانی ہے تو مر کر دکھانا ہو گا۔" ایک دم سے اموشنل ہو گئے' کہنے لگے۔

"تجھے کیا لگتا ہے میں زندہ بھی تھا۔ ادھر دیکھ میں جو سمجھتا تھا میں اور تیری ماں ہمیشہ محبت کا ناٹک کرتے رہے تھے۔ سچ پوچھ تو اس کمال عورت نے اپنا اتنا عادی بنا دیا کہ ہر عورت میں' میں اسے ڈھونڈتا ہوں' وہ نہیں ملتی تو میرا ہر معاشقہ اپنی موت آپ مر جاتا ہے' اب باقی کی زندگی اس کے نام گزارنی ہے۔" میں نے کہا۔

"ابا کچھ زندگی بچی ہے' ابھی تو فاتحہ اور قبر کی بات کر رہے تھے تو کہنے لگے بے چارگی سے' آجانا خبیث کچھ بھی سہی برا یا بھلا تیرا باپ ہوں تو چاہتا ہے ایدھی والے اس بڈھے کی لاش کو دفنائیں ماتم ہو نہ فاتحہ سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

"بس دل پسیج گیا ابا کو لے آیا گھر اب تو پھر سے نگڑے ہو رہے ہیں۔"

"میں بھی چلوں تیرے ساتھ۔" وہ تنہائی کے خیال سے بے چارگی سے بولا اور وہ ہنس پڑا۔

"دیکھ ایک جان ہے میری دو بچوں کو نہیں سنبھال سکتا۔"

"تو سب کر سکتا ہے تو سپر ہیومن ہے میری جان۔"

"چل اتنی تعریف پر تو راضی ہونا پڑے گا۔"

وہ دونوں سیڑھیاں اترنے لگے تھے جب آفندی کے موبائل پر میسج ٹون بجی تھی۔

میں نے تنہا بوئے
خوابوں کی اس دھرتی میں
پودے خوشبو کے

اس نے فون ملایا تھا' ریسیو کرنے والی علینہ ہی تھی۔

"کچھ تو بولو۔" وہ بے قراری سے پکارا تھا۔

"میں نے ایک نئی ایکس کلوز رپورٹ یوٹیوب پر ڈال دی ہے مسٹر احمد درانی' وکی لیکس کو بھول جائیں گے' عالیان بھائی نے مجھے ہمیشہ ایک بات سکھائی تھی' برائی سے نفرت کرو برے انسان سے نہیں اور تم میں اتنا حوصلہ موجود ہے کہ تم حکومتی ایوان ہلا سکتے ہو میں نے عالیان بھائی کا کیس نئے سرے سے اسٹڈی کیا ہے اور ان سارے ناموں کو بے نقاب کیا ہے جنہوں نے انہیں آج اس حال کو پہنچایا' کیا تم میری اس سلسلے میں مدد کرو گے۔" اس نے گہرا سانس لیا تھا اور نرمی سے بولا تھا۔

"ساری سی ڈیز' سارا مواد جو میں نے اپنی بچت کے حوالے سے جمع کیا تھا تمہارے پاس آذر کے ذریعے پہنچ جائے گا۔ رہی میری بدنامی تو وہ موت کی طرح ایک بار ہی ہو سکتی ہے جو ہو چکی ہے' مگر تمہارے اس کیس فائل سے میرے گناہ کی سزا کم ہو جائے گی۔"

"گناہ کی توبہ کرنے والے مومن بن جاتے ہیں اور مجھے ایک توبہ بھرے دل کا ساتھ ساری عمر کے لیے قبول ہے' اگر تم میری غلطیوں کو بھول سکو۔"

"تمہاری غلطیاں میری خود سری کی مزاحمت اور میری غلط طور پر کمائی ہوئی کامیابیوں پر کیے جانے والے غصے کا رد عمل تھا۔"

"تو میں کیا سمجھوں۔" اس نے مزید وضاحت مانگی۔ اور وہ گنگنایا تھا۔

تیری کوشش تیری تدبیر ہونا چاہتا ہوں
میں تیرے ہاتھ کی تحریر ہونا چاہتا ہوں

تو میرے پاس آئے اور پلٹ کر نہ جائے
میں تیرے پاؤں کی زنجیر ہونا چاہتا ہوں

میں اس لیے تباہ خود کو کر رہا ہوں
کہ تیرے ہاتھ سے تعمیر ہونا چاہتا ہوں

علینہ کی محسوس کی جانے والی مسکراہٹ اس کے گرد حصار ہو گئی تھی اور وہ ہر سود و زیاں سے بے گانہ ہو گیا تھا کہ ایک ہاتھ میں محبت تھی' ایک ہاتھ میں رشتوں کی سچائی اور دل میں توبہ کا احساس اور فی زمانہ وہ اپنی ناکامی کو چھو کر جی کر ایک نئی کامیابی کی طرف قدم بڑھا رہا تھا اور وہ خوش نصیب تھا کہ مرنے سے پہلے ہی اٹھا تھا۔

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی' بڑھتی' اٹھتی' گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

زنداں کی بلند دیواروں کے اس پار کی دنیا بہت حسین ہوتی ہے ڈھیروں مناظر نظروں سے گزرتے ہیں آوازیں سماعتوں سے ٹکراتی ہیں آزاد اور پر لطف زندگی چاروں طرف رقصاں ہوتی ہے۔ آزادی ایک حسین اور تابناک چیز ہے اس کی قدر و قیمت و اہمیت اس سے پوچھیں جس پر جیل کی چھوٹی سی دنیا میں کائنات محدود کر دی جاتی ہے۔

کرن میں اس ماہ سے نیا سلسلہ "روداد قفس" کے نام سے شروع کیا جا رہا ہے۔ جیلوں میں قید خواتین کے حالات و واقعات پر مبنی۔ آخر ایسے کون سے مسائل و حالات تھے جن کی وجہ سے وہ قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے پر مجبور ہوئیں۔ اس سلسلے کی کوئی کہانی آپ کے پاس ہے تو ہمیں روانہ کریں۔ ہم نوک پلک سنوار کر اسے شائع کریں گے۔

روداد قفس

روشنی بخاری

ناولٹ

آصف نے گاڑی ڈسٹرکٹ جیل کے باہر روکی اور پھر اتر کر ڈگی کھولنے لگا اب وہ ڈگی میں سے مختلف شاپنگ بیگ نکال رہا تھا جن میں چاول، دالیں، سیب، خشک دودھ کے پیکٹ، کوئلے اور ایسی ہی کچھ دوسری چیزیں بھی شامل تھیں۔

ساری چیزیں نکال لینے کے بعد اس نے ڈگی بند کی گاڑی کے شیشے چڑھا کر گاڑی لاک کی اور پھر جیل کے اندرونی احاطے کی طرف بڑھ گیا ایک جگہ سے اس نے سیمنٹ کی بوریوں سے بنائے گئے خاکی کاغذ کے کچھ خالی لفافے خریدے اور پھر شاپنگ بیگز میں موجود سارا سامان ان لفافوں میں منتقل کرنے لگا اس کے بعد وہ اس پولیس والے کی طرف بڑھا جس کے سامنے ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی اور وہ کرسی میز ڈالے بیٹھا سب کو پرچی کاٹ کاٹ کر دے رہا تھا آصف بھی قانون کے مطابق قطار میں لگ گیا کافی دیر کے بعد اس کی باری آئی تو وہ پولیس مین کے قریب پہنچ گیا۔

"نام۔" پولیس والے نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"سیما۔" اس نے جواب دیا۔

"ولدیت" پولیس والے نے دوسرا سوال کیا تو آصف کے ہونٹوں سے آزاد ہونے والے الفاظ تھے "غلام حسین" "بیرک نمبر" پولیس والے نے سر اٹھائے بغیر اپنے مخصوص انداز میں دہرایا "تین" آصف کے جواب دینے پر پولیس والے نے ایک پرچی پھاڑ کر آصف کے ہاتھ میں تھما دی اب آصف کا رخ اسی جانب تھا جدھر اس سے پہلے پرچی حاصل کرنے والے سب لوگ جا رہے تھے یہاں ایک سلاخ دار دروازہ تھا جس کے باہر ایک باوردی پولیس والا ہاتھ میں گن پکڑے مستعد کھڑا تھا۔

سب لوگ اس کے ارد گرد جمع تھا لہٰذا وہ بھی کھڑا ہو گیا تقریباً" دس منٹ کے بعد اس نے دروازہ کھولا تو سب لوگ جلدی جلدی اندر داخل ہونے لگے آصف نے بھی ان کی تقلید کی اور وہ بھی اس تنگ راہداری نما کمرے میں داخل ہو گیا جس کے سامنے کے رخ پر دائیں سے بائیں ایک طویل جالی لگی ہوئی تھی کمرے کے ایک کونے میں ایک اور سلاخ دار دروازہ نظر آ رہا تھا جو شاید جیل کی اندرونی سمت میں کھلتا تھا اس دروازے کے باہر بھی باوردی پہریدار موجود تھا جو کرسی ڈال کر بیٹھا تھا اور اس کے ارد گرد خاکی لفافوں کا ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔

بالکل ویسے ہی لفافے جو اس وقت آصف نے اٹھا رکھے تھے آصف بھی اسی سمت بڑھ گیا اس نے وہ لفافے اس پولیس والے کے سامنے رکھے تو اس نے پہلے پولیس والے کی طرح سوال کیا "نام؟" اور ایک مرتبہ پھر اسی انداز میں آصف نے نام ولدیت اور بیرک نمبر بتایا تو پولیس والوں نے اٹھ کر کچھ معلومات لفافوں پر درج کر دیں اس کے بعد آصف جالی کی طرف متوجہ ہوا اور پھر ایک جگہ جالی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا ٹھیک اسی لمحے جالی کے اندرونی جانب ایک دروازہ کھلا اور پھر بھانت بھانت کی خواتین شیڈ میں داخل ہونے لگیں۔

بالکل بھیڑ بکریوں کی طرح..... کچھ ہی دیر میں شیڈ کھچا کھچ بھر گیا۔ آصف کی متلاشی نظریں ابھی تک شیڈ کے اندر موجود اکلوتے داخلی دروازے پر جمی ہوئی تھیں اور پھر وہ اندر داخل ہوئی سولہ سترہ سال کی وہ خوب صورت لڑکی جس نے ایک نومولود بچہ اٹھا رکھا تھا۔ حسن و خوب صورتی کا وہ شاہکار اس وقت کملائی ہوئی حالت میں تھا۔

لمبے سیاہ بال، تیکھے نقوش، بڑی بڑی اداس لیکن جھیل سی گہری آنکھیں جن میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ سرخ و سپید رنگت لیکن اس وقت اس کے رخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اس نے بھی شاید آصف کو دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ سیدھی اس کے سامنے آکر رکی تھی اور پھر ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ آصف بھی خاموشی سے اسے تکتا رہا پھر لڑکی کے ہونٹوں میں ارتعاش سا پیدا ہوا اور اس کی آواز بلند ہوئی۔

"وکیل صاحب! کیوں کرتے ہیں یہ سب؟ آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں تو آپ کے احسانوں کا بدلہ بھی نہیں اتار سکتی۔"

یہ کہہ کر وہ سسکنے لگی اور دو موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک آئے آصف کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھ ڈالے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ لوہے کی مضبوط جالی ان دونوں کے درمیان حائل تھی اور جالی نہ بھی ہوتی تو بھی شاید وہ یہ جرات نہ کر پاتا بھلا اس کا اس سے رشتہ بھی کیا تھا؟ وہ صرف اس کی ایک کلائنٹ تھی اور کلائنٹ بھی ایسی جس کا مقدمہ لڑنے کی اس نے کوئی فیس نہیں لی تھی۔

اس نے بہت کوشش کی تھی کہ عدالت سیما کو بری کر دے لیکن اس کی سر توڑ کوشش کے باوجود ایسا ہو نہیں پایا تھا اور اسے سات سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی تھی آخر ایک انسانی جان ضائع ہوئی تھی..... بہرحال جو بھی تھا ایک بات طے تھی کہ کیس لڑنے کے دوران آصف اس لڑکی سے بری طرح متاثر ہو چکا تھا اس کی کہانی عجیب و غریب تھی اس کا کیس اسے مجرم ثابت کر رہا تھا لیکن آصف اپنے دل کا کیا کرتا؟ وہ تو عجیب سے انداز میں دھڑکنا شروع ہو گیا تھا لڑکی کا رکھ رکھاؤ اس کے بات کرنے کا انداز اس کی معصومیت یہ سب آصف کی سوچوں میں ہلچل مچانے کے لیے کافی تھا اس کے سینے میں چپکے چپکے کچھ اور ہی جذبات پرورش پانے لگے۔

اور آصف جو پچیس سالہ خوب صورت جوان اور ایک ہوشیار وکیل بھی تھا اس کی ساری ہوشیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ کیس تو وہ ہار ہی تھا لیکن ساتھ ہی اپنا دل بھی ہار بیٹھا تھا اس کی وکالت کو شکست ہو گئی تھی لیکن اس کی جوانی جیت چکی تھی اس نے بار بار خود کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود..... اس کا دل جوانی کی لے پر رقص کناں تھا اور دھڑکنیں بھی اسی کے گیت گانے لگی تھیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود ایک کامیاب وکیل ہوتے ہوئے بھی وہ سیما سے ابھی تک اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکا تھا۔

یہ رعب حسن تھا یا شاید سیما کی مظلومیت کا احساس..... یا شاید احساس ندامت کہ وہ اسے بچا نہیں پایا تھا، جو کچھ بھی رہا ہو حقیقت یہی تھی کہ جب جب وہ سیما کا سامنا کرتا تھا اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دیتی تھی اور وہ چاہنے کے باوجود کچھ بھی نہیں کہہ پاتا تھا پچھلے ایک سال سے اس کی یہی روٹین تھی کہ وہ باقاعدگی سے ہر ہفتے سیما سے ملاقات کے لیے آتا تھا اور بساط بھر اس کی ضرورت کی تمام چیزیں اسے پابندی سے پہنچاتا تھا۔

سیما کے گھر والے تو پتا نہیں اس سے ملاقات کے لیے آتے تھے یا نہیں وہ ضرور آتا تھا۔ اب بھی وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ

"سیما یہ سب میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہی تو کر رہا ہوں۔ جس پیار کا تعاقب تمہیں جیل کی چار دیواری تک لے آیا ہے اس سے کئی گنا محبت میں تمہیں دینا چاہتا ہوں تمہیں دنیا کی ہر وہ خوشی دینا چاہتا ہوں جو آج تک تمہیں نہیں مل سکی تمہارے دکھ بانٹنا چاہتا ہوں اگر میں یہ سب کرتا ہوں تو تمہیں اس پر اعتراض کیوں ہے؟

یہ سب میں تمہارے لیے نہیں اپنے لیے ہی تو کرتا ہوں میرے دل کو اس سے خوشی ملتی ہے اور پھر تم مجھ سے الگ کب ہو؟ میری ذات کا ایک حصہ ہی تو ہو تم ایک اٹوٹ انگ....." لیکن وہ ایسا کچھ بھی نہ کہہ سکا اور ہکلاتے ہوئے بولا۔

"س..... سیما تم..... تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں..... مم میرا مطلب ہے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" اسے اپنے سوال کی بے ربطگی کا احساس ہوا تو گڑبڑائے ہوئے سے انداز میں اس نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

بھلا آزاد فضاؤں میں اڑنے والے ایک پنچھی کے پر کاٹ کر اسے پنجرے میں قید کر دیا جائے تو اس سے بڑی تکلیف اس کے لیے اور کیا ہو گی؟ جیل میں بند رہنے والے کسی شخص سے یہ پوچھا جائے کہ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟ بھلا اس سے بڑا احمقانہ سوال اور کیا ہو گا؟ اور وہ یہ سوال کرنے کے بعد دل ہی

دل میں بری طرح شرمندہ ہو رہا تھا۔
لیکن سیما کا لہجہ اعتماد سے بھرپور تھا۔

"نہیں وکیل صاحب! مجھے کوئی پریشانی نہیں..... میں اپنے کیے پر نادم نہیں ہوں اور نہ ہی اس سزا سے خائف ہوں میرے دن کٹ رہے ہیں اور کٹ ہی جائیں گے اور پھر آپ کے احسانات بھی تو ساتھ ہیں ضرورت کی ہر چیز بلکہ میری ضرورت سے کچھ زیادہ ہی آپ مجھے پہنچا دیتے ہیں پھر بھلا تکلیف کیسی؟ ہاں یہ بات ضرور پریشان کرتی ہے کہ آپ یہ سب کیوں کرتے ہیں میں تو اس کے بدلے میں آپ کو کچھ بھی نہیں دے سکتی..... شاید دعائیں بھی نہیں کہ میری تو شاید دعائیں بھی کسی کے کچھ کام نہ آسکیں۔

دعائیں بے ثمر جاتی تو خود اپنے ہی ہاتھوں سے لبوں پر کانپتی ہر اک دعا کا خون کر ڈالا میں تو..... میں تو شاید کسی کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔" اور اس کا یہ انداز دیکھ کر پتا نہیں کیوں آصف کے دل پر جیسے ایک گھونسہ سا لگا۔

"نہیں سیما! ایسا نہیں کہتے' دعائیں کبھی خالی نہیں جاتیں اور پھر میں یہ سب کسی صلے کی غرض سے تو نہیں کرتا..... بس میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے لیے جو کر سکتا ہوں وہ کروں' میں تمہیں سزا سے تو نہیں بچا سکا' لیکن یہ سب تو میں کر سکتا ہوں نا؟ تم یہ مت سوچا کرو کہ میں یہ کیوں کرتا ہوں کچھ تعلق' کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں غرض اور بدلے کے ترازو میں' نہیں تولا جا سکتا نا' یہ کوئی احسان ہے اور نہ ہی مجھے تم سے اس کا کوئی صلہ درکار ہے' بس میں یہ چاہتا ہوں کہ تم جلد سے جلد ان سلاخوں سے باہر آجاؤ۔"

اور سیما کے ہونٹوں پر ایک اداس مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر نمودار ہو کر غائب ہو گئی پھر وہ بولی۔

"وکیل صاحب! سزا تو مجھے ملنی ہی تھی اور یہ کیا کم ہے کہ آپ کی کوششوں کی وجہ سے مجھے پھانسی یا عمر قید کی سزا نہیں ملی..... صرف سات سال قید کی سزا ہوئی اور باہر آکر میں نے کیا کرنا ہے؟ زندہ ہی رہنا ہے نا؟ تو وہ تو میں یہاں بھی جی ہی رہی ہوں پھر اب تو میری تنہائی کا سہارا یہ منا بھی میرے ساتھ ہے' میری زندگی کا مقصد اور محور اب یہی ہے' اچھا ہے کہ یہ اس ظالم دنیا سے دور یہیں رہے۔"

آصف نے کچھ کہنا چاہا لیکن ٹھیک اسی وقت شیڈ میں آواز گونجی "ملاقات کا وقت ختم ہوا؟" آصف نے جلدی سے کہا "کچھ سامان لایا تھا وصول کر لینا۔" اور پلٹ کر جاتی ہوئی سیما نے سر ہلا دیا۔ آصف کے ہونٹوں سے ایک طویل سانس آزاد ہوئی اور پھر وہ بہت سے لوگوں کے تعاقب میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

ظفر ایک بیس بائیس سالہ خوب صورت نوجوان تھا دبلا پتلا' پھرتیلا اور چمکدار آنکھوں والا جب وہ سیما کے گھر آیا تو پہلی مرتبہ سیما نے اسے دیکھا' سرسری سا انداز تھا لیکن پہلی ہی نظر میں وہ سیما کو اچھا لگا تھا شاید اس لیے کہ وہ سیما کا خالہ زاد تھا یا شاید اس لیے کہ پہلی مرتبہ ان کے گھر مہمان آئے تھے۔

سیما ایک غریب گھر کی لڑکی تھی اور پورے گاؤں میں ان کا اور کوئی رشتہ دار نہ تھا صرف ایک ہی گھر آباد تھا ان کا اس پورے گاؤں میں' کئی لوگوں کے خاندان کے خاندان آباد تھے' اس کے باپ کے انتقال کے بعد ددھیال میں سے کبھی کوئی نہیں آیا۔ صرف ایک ہی خالہ تھی جس کے بارے میں سیما نے صرف سن رکھا تھا کہ خالہ صغریٰ شہر میں رہتی ہیں لیکن نہ تو سیما کبھی ان کے گھر گئی تھی اور نہ ہی وہ کبھی ان لوگوں کے گھر آئیں۔

یہ پہلا موقع تھا کہ خالہ صغریٰ اپنے بیٹے کے ساتھ ان کے گھر آئی تھیں اور سیما کو یہ تبدیلی اچھی لگی تھی۔ کسی اپنے کے ہونے کا احساس یقیناً سبھی کو اچھا لگتا ہے۔ وہ لوگ ان کے اپنے تھے اور خاص طور پر ظفر وہ تو بہت جلدی سیما سے گھل مل گیا تھا ہنسنا' مسکرانا اور طرح طرح کے لطیفے سنا سنا کر سیما کو بھی ہنسنے پر مجبور کر دینا جیسے اس کا دل پسند مشغلہ تھا اور سیما کو بھی یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ ظفر کی اس قدر عادی ہو گئی کہ اگر وہ گھر سے باہر نکل جاتا تو سیما بےچین ہو جاتی اور چلتے پھرتے گھر کے کام کاج کرتے ہوئے بھی اس کی نظریں جیسے دروازے سے چپک کر رہ جاتیں اور ایک دن جب ظفر سارا دن باہر گزار کر شام کو گھر میں داخل ہوا تو سیما اس پر چڑھ دوڑی۔

"یہ کیا طریقہ ہے ظفر' تمہیں پتا ہے کہ میں صبح سے دروازے کو تک رہی ہوں' اور تم ہو کہ تمہیں پروا ہی نہیں' جاؤ آج کے بعد میں تم سے بات ہی نہیں کروں گی۔" سیما نے خفا ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے' ارے اتنا غصہ؟ ایسا سلوک تو بیویاں بھی نہیں کرتیں۔" اور اس کی بات سن کر سیما شرم سے گلنار ہو گئی اس کا سارا غصہ ہرن ہو گیا اور وہ بھاگ کر اندر گھس گئی۔ ظفر نے یہ منظر دیکھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور پھر وہ بھی اندر داخل ہو گیا۔ سیما لوہے کی پیٹی کھولے کھڑی بستر نکال رہی تھی اسے دیکھ کر پیٹی کا ڈھکن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ جلدی سے دوپٹہ درست کرنے لگی۔ ظفر عین اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

"سیما! مجھ سے شادی کرو گی؟" اور سیما دھک سے رہ گئی۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ اپنے اندر ایک عجیب سی بےچینی' ایک انوکھا سا اضطراب محسوس کر رہی تھی' ظفر' ظفر' ظفر اس کی سوچ ہر وقت اسی کے گرد گھومنے لگی تھی اور آج وہ ظفر کے منہ سے یہ جملہ سن کر اس تبدیلی کی وجہ بھی سمجھ گئی تھی' وہ بھی شاید یہی تو چاہتی تھی لیکن اس بےباکی کی توقع شاید نہیں تھی اسے لیکن بہرحال یہ بات اور ظفر کا یہ انداز اسے برا نہیں لگا تھا۔

"ظفر! تم باہر جاؤ' دیکھو امی جان آجائیں گی۔" اس نے پریشان سے انداز میں کہا تو ظفر نے ایک قدم مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہو گا؟ اچھا ہے دیکھ لیں گے تو جلدی سوچیں گے۔" ٹھیک اسی وقت ساتھ والے کمرے سے آنے والی آوازیں سن کر دونوں کی توجہ ادھر مبذول ہو گئی۔

سیما نے غور کیا تو دہل کر رہ گئی' امی جان اور خالہ جان جو پڑوس میں کسی کے گھر گئی ہوئی تھیں واپس آچکی تھیں اور اس وقت دوسرے کمرے میں داخل ہو چکی تھیں۔ اگر وہ اس کمرے میں آجائیں تو..... اس نے گھبرا کر سوچا اور پریشان ہو گئی لیکن ظفر ان سب باتوں سے بےپروا اسی طرح اس کے قریب موجود تھا۔

"اللہ کا واسطہ! ظفر تم باہر جاؤ اگر امی نے اس طرح ہمیں دیکھا تو وہ کوئی اچھا تاثر نہیں لیں گی' تم باہر جاؤ۔" لیکن ظفر اس وقت پتا نہیں کس موڈ میں تھا کہ اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی اس نے آگے بڑھ کر سیما کا بازو پکڑ لیا اور پھر کھینچ کر اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

"سیما! میں اب تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"
اور سیما اس کی اس حرکت پر لرز کر رہ گئی۔

اسے ظفر کی یہ دیوانگی اچھی بھی لگ رہی تھی لیکن گھر میں امی جان کی موجودگی کا احساس کر کے اس کی روح فنا ہو رہی تھی اور ظفر تھا کہ بےخود ہو رہا تھا اور پھر جس قیامت کا خطرہ تھا جس سے سیما ڈر رہی تھی وہ رونما ہو ہی گئی۔ یہ خالہ جان تھیں جو اچانک کمرے میں داخل ہوئی تھیں اور اندر کا منظر دیکھ کر بھونچکی رہ گئی تھیں۔

ظفر سیما کو بازوؤں کے حصار میں لیے کھڑا تھا اور سیما کسی معصوم پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چند ثانیے کے لیے تو ان کی جیسے سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا لیکن جب سمجھ میں آیا تو ان کا چہرہ سرخ ہو گیا وہ غیض و غضب کے عالم میں آگے بڑھیں اور پھر ان کا زناٹے دار تھپڑ ظفر کے گال پر پڑا۔ تھپڑ لگتے ہی جیسے ظفر کا سارا نشہ ہرن ہو گیا اور سارا عشق جیسے ہوا ہو گیا اس نے گھبرا کر سیما کے وجود پر سے اپنے بازوؤں کی گرفت ختم کر دی اور سیما جو شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی سرخ چہرے کے ساتھ دوپٹہ درست کرتی ہوئی جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

کمرے سے نکلتے وقت اسے خالہ جان کی دبی دبی غراہٹ سنائی دی تھی "تیرے یہ چھن مجھے کہیں کا نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ رات سیما نے کروٹیں بدلتے گزاری، ظفر بار بار اس کے دل پر دستک دے رہا تھا اور وہ اپنے دل کا دروازہ اس کے لیے بند نہیں رکھ سکتی تھی وہ اپنا تجزیہ کر رہی تھی پھر وہ نتیجے پر بھی پہنچ گئی اور نتیجہ یہ تھا کہ ظفر سے الگ رہنا اب اس کے اختیار میں نہ تھا لیکن خالہ جان کا ناقابل فہم رویہ اس کی ساری امیدوں اور ارمانوں پر پانی پھیر رہا تھا۔ کیسا زوردار تھپڑ لگایا تھا انہوں نے ظفر کو؟ یہ تو شکر تھا کہ امی جان نہیں آئیں ورنہ جو تھپڑ ظفر کو لگا تھا وہ شاید اس کے حصے میں آتا اسے یہ خدشہ بھی پریشان کر رہا تھا کہ کہیں خالہ جان امی سے اس واقعہ کا ذکر نہ کردیں لیکن خیریت گزری کہ خالہ جان نے ایسا کچھ نہ کیا وہ شاید صرف ظفر ہی کو قصوروار سمجھ رہی تھیں اور حقیقتاً" تھا بھی ایسا ہی آج کے اس واقعہ میں سیما کے کسی ارادے کو کوئی دخل نہ تھا ہاں اسے ظفر کی یہ جرات اچھی ضرور لگی تھی اور اس کے بعد سے اس کی دھڑکنوں کا انداز تبدیل ہو گیا تھا۔

وہ ٹھنڈے میٹھے سپنوں میں گم ہو کر رہ گئی لیکن اگلی صبح حیران کن تبدیلیوں کے ساتھ طلوع ہوئی تھی وہ سو کر اٹھی تو اس نے دیکھا کہ خالہ جان واپسی کی تیاری کر چکی تھیں اور امی جان ان کی اس اچانک روانگی پر حیران و پریشان تھیں۔ انہوں نے خالہ جان کو روکنے کی کافی کوشش بھی کی لیکن خالہ جان نے اپنی واپسی کے ایسے ایسے جواز پیش کیے کہ امی جان کو ماننا ہی پڑا اور پھر وہ رخصت ہو گئیں۔

جاتے ہوئے ظفر کی نظریں جب سیما کی نظروں سے ٹکرائیں تو اسے وہاں ان گنت چراغ روشن نظر آئے جن کی روشنی لیے بہت کچھ سمجھا گئی اور سیما مطمئن ہو گئی ظفر کی الوداعی نظریں اس کا حوصلہ بڑھا گئی تھیں ان کے جانے پر وہ کچھ ملول اور افسردہ ضرور ہو گئی تھی لیکن جب اسے ان نظروں کا خیال آتا اس کے دل کو جیسے حوصلہ سا مل جاتا، وقت گزرتا گیا دن کٹتے گئے لیکن سیما کے دل سے ظفر کی تصویر دھندلا نہ سکی اسے یقین تھا کہ وہ واپس ضرور آئے گا اور پھر تقریباً" پندرہ دن کے بعد وہ آگیا۔

امی حسب معمول کسی پڑوسی کے گھر گئی ہوئی تھیں وہ گھر میں داخل ہوا تو سیما کھل اٹھی لیکن ظفر اسے کافی پریشان دکھائی دیا وہ اسے بازو سے پکڑ کر سیدھا کمرے میں لے گیا اور پھر بولا۔

"میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا، میری بات توجہ سے سنو اور ہاں خالہ جان کو میری آمد کے متعلق کچھ نہ بتانا۔"

اس نے چند لمحے پریشانی کے انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور سلسلہ کلام کو جوڑتے ہوئے بولا۔

"امی جان سخت غصے میں ہیں اور کسی صورت میری بات ماننے کو تیار نہیں ہو رہیں ہاں اگر خالہ جان خود ان سے ہمارے رشتے کی بات کریں تو مجھے پورا یقین ہے وہ مان جائیں گی۔" ظفر کی بات سن کر سیما بری طرح گڑبڑا گئی اور پھر گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔

"پاگل ہو گئے ہو ظفر! میں بھلا امی جان سے کیسے بات......"

نہیں! تم غلط سمجھی ہو، تمہیں خالہ جان سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میں سارا پروگرام بنا کر یہاں پہنچا ہوں اس گاؤں میں میرے دوست الیاس نے تمام بندوبست کیا ہے تھوڑی مشکل ضرور پیش آئے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ بات بن جائے گی میں صبح سے گاؤں پہنچا ہوا ہوں ابھی الیاس ہی نے بتایا تھا کہ خالہ جان کسی کے گھر گئی ہیں تو میں موقع غنیمت جان کر یہاں پہنچ گیا تاکہ ساری بات تمہیں اچھی طرح سمجھا دوں۔"

ظفر نے سیما کی بات کاٹتے ہوئے طویل تقریر کر دی تو سیما کی ہکلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ل...... لیکن ظفر! کرنا کیا ہے؟ مجھے تو کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا!"

"اچھا میں تمہیں تفصیل سے سمجھاتا ہوں۔"

نے تسلی آمیز انداز میں ایک چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ادھر بیٹھو اور پوری توجہ سے میری بات سنو؟"

جب سیما اس کے برابر بیٹھ گئی تو ظفر پوری تفصیل کے ساتھ اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا اس دوران سیما بار بار گھبرا کر کچھ نہ کچھ بول پڑتی، کوئی نہ کوئی سوال کر اٹھتی لیکن ظفر پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اس کے ہر سوال کا جواب دیتا رہا اور اسے قائل کرتا رہا پھر تقریباً" آدھے گھنٹے کے بعد جب ظفر وہاں سے رخصت ہوا تو سیما اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔

✡ ✡ ✡

کمرے میں اگر بتیاں سلگ رہی تھیں اور ان کی خوشبو پورے کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی فرش پر ایک بڑی دری بچھی ہوئی تھی جس نے پورے کمرے کے فرش کو بخوبی ڈھک رکھا تھا۔ بیرونی دروازے کے بالکل سامنے کمرے کا اندرونی دروازہ بھی تھا جو شاید پیچھے موجود صحن یا کسی اور کمرے میں کھلتا ہو گا لیکن اس وقت وہ دروازہ بند تھا بیرونی اور اندرونی دروازے کے درمیان پورے کمرے میں دری بچھی ہوئی تھی جس پر اس وقت مختلف قسم کے لوگ بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے۔

پھر اندرونی دروازہ کھلا اور دو ملنگ نما آدمی نمودار ہوئے جنہوں نے بالکل دروازے کے سامنے ہی ایک خوب صورت اونی گدا بچھا دیا اور پھر اس پر ایک خوب صورت گاؤ تکیہ سجا دیا ایک ملنگ نما آدمی تیزی سے ایک طرف بڑھا جہاں شیشے کا ایک گلاس رکھا ہوا تھا جس میں شاید آٹا بھرا ہوا تھا اور اس آٹے کے اندر گڑی اگر بتیاں کمرے میں خوشبوئیں پھیلانے کا موجب تھیں اس ملنگ نما آدمی نے وہ گلاس اٹھایا اور گدے کے سامنے سجا دیا پھر ایک طرف مودب کھڑا ہو گیا جبکہ دوسرا آدمی دوبارہ اندرونی کمرے میں غائب ہو گیا۔

چند لمحوں بعد دروازہ دوبارہ کھلا لیکن اس مرتبہ جو شخصیت کمرے سے برآمد ہوئی اسے دیکھ کر وہاں بیٹھے سب لوگ احتراماً" کھڑے ہو گئے۔ لمبے قد کا مالک وہ آدمی گدے پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب لوگوں کو نیچے بیٹھنے کے لیے کہا۔ تمام لوگ دوبارہ سے بیٹھ گئے ٹھیک اسی لمحے اندرونی دروازے سے اندر جانے والا ملنگ نما آدمی باہر نکلا اس کے ہاتھوں میں ایک بہت بڑا پنکھا تھا جو لکڑی کے ایک ڈنڈے یا شاید بانس کے ساتھ جڑا ہوا تھا یہ پنکھا شاید کھجور کے پتوں سے بنایا گیا تھا لیکن اس پر خوب صورت مخملیں کپڑا چڑھا ہوا تھا اور وہی کپڑا اس کے ساتھ جڑے ڈنڈے یا بانس پر بھی چڑھایا گیا تھا۔

ملنگ نما آدمی ایک سائیڈ پر کھڑا ہو کر گدے پر بیٹھے مضبوط جسم کے مالک اس آدمی کو پنکھا جھلنے لگا جس کی لمبی لمبی زلفیں تھیں، بڑی بڑی مونچھیں اور سرخ انگارہ آنکھیں تھیں۔ اس نے ایک نظر کمرے میں بیٹھے تمام لوگوں پر دوڑائی اور پھر ایک کونے میں بیٹھی بوڑھی عورت سے مخاطب ہوا۔

ہدایت بی بی! اللہ تجھے ہدایت دے تو پھر آگئی؟ تجھے کہا تو تھا کہ تعویذ کسی اونچے درخت سے بندھوا دے، تیرا بیٹا واپس آجائے گا کچھ دن صبر تو کر، مگر تو روز آجاتی ہے جا چالیس دن انتظار کر، آجائے گا تیرا بیٹا چل اٹھ اب جا یہاں سے۔"

وہ عورت ہاتھ باندھ کر الٹے قدموں دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"پیر بابا! میرا ایک ہی بیٹا تھا خوب صورت، گھبرو جوان، تین مہینے سے اس کا پتا نہیں چل رہا آپ تو اللہ والے ہو جی! بس آپ کی دعائیں لینے آجاتی ہوں جی، معاف کردیں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو اور لہجے میں لجاجت تھی پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئی، ٹھیک اسی لمحے الیاس اور ظفر کمرے میں داخل ہوئے اور پیر بابا کو سلام کر کے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔

پیر بابا نے غور سے ان کی جانب دیکھا اور پھر اس شخص کی طرف متوجہ ہو گیا جو ہاتھ باندھے اس کے

سامنے آیا تھا اور پھر دو زانو بیٹھ کر اپنا مسئلہ بیان کرنے لگا پیر بابا نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور پھر ملنگ کو اشارہ کیا اس نے جھٹ سے کاغذ اور قلم نکال کر پیر بابا کے سامنے رکھ دیا پیر بابا نے منہ ہی منہ میں کچھ بدبداتے ہوئے کاغذ پر کچھ تحریر فرمایا اور پھر وہ کاغذ اس شخص کے حوالے کر دیا۔

اس آدمی نے کاغذ کو ادب سے چوما اور پھر اپنی جیب میں رکھ لیا پھر جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور پیر بابا کے سامنے رکھ کر الٹے قدموں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ پھر ایک ایک کر کے سب لوگ باری باری پیر بابا کے سامنے آتے گئے وہ سب اپنے مسائل بیان کرتے ان کے حل کے لیے کاغذ کا ٹکڑا حاصل کرتے اور کاغذ کے کچھ ٹکڑے پیر بابا کے سامنے ڈال کر باہر نکل جاتے کاغذ کے ٹکڑوں کا یہ تبادلہ تقریباً" تین سے چار گھنٹوں تک جاری رہا اس دوران کئی بار پیر بابا کی نظریں الیاس اور ظفر کی جانب اٹھیں لیکن وہ خاموش اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔

پیر بابا کی جہاندیدہ نگاہیں ان کے چہرے کے تاثرات سے ان کے دل کا حال جان چکی تھیں دن رات یہی تو کام تھا ان کا اور پھر جب کمرے میں موجود آخری شخص بھی باہر نکل گیا تو الیاس نے ظفر کو ٹہوکا دیا۔ وہ ہچکچاتا ہوا سا اٹھا اور پیر بابا کے سامنے جا بیٹھا ابھی وہ مناسب الفاظ کی تلاش میں ہی تھا کہ پیر بابا کی پاٹ دار آواز بلند ہوئی۔

"عشق کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا' بچہ میرے پاس کیوں آگئے؟ یہاں اس قسم کے کام نہیں کیے جاتے۔"

اور پیر بابا کی یہ بات سن کر ظفر بوکھلا کر رہ گیا ابھی تو وہ حرف مدعا زبان پر بھی نہ لایا تھا اور پیر بابا بات کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے ظفر فوراً" ہی ایمان لے آیا۔ اس کے ہاتھ آپوں آپ ہی جڑ گئے اور پھر جب وہ بولا تو اس کی آواز جذبات کی شدت سے کپکپا رہی تھی۔

"لیکن پیر بابا! میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا میں اس سے محبت کرتا ہوں وہ اتنی پیاری' اتنی خوب صورت ہے کہ میں اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ آپ..... آپ کوئی راستہ تو نکالیں؟"

"واہ بھئی واہ تو تو پکا عاشق ہے بھئی! تیرے لیے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔" پیر بابا کو راضی ہوتا دیکھ کر ظفر کی جان میں جان آئی۔

"اچھا یہ بتا کیا لڑکی بھی تجھ سے محبت کرتی ہے؟" پیر بابا نے سوال کیا۔

"جی پیر بابا! وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن گھر والے راضی نہیں ہو رہے' سگی خالہ کی بیٹی ہے میری لیکن میری ماں ہی اس رشتے کی مخالف ہے۔" ظفر نے افسردگی سے جواب دیا تو پیر بابا نے ایک اور سوال کیا۔

"اچھا اگر لڑکی والے خود تیری ماں سے بات کریں تو کیا وہ مان جائے گی؟" ظفر کو امید کی ایک کرن نظر آئی وہ بولا۔

"جی پیر بابا! ایسا ہو جائے تو یقیناً" وہ مان جائیں گی۔"

"اچھا تو پھر سن یہ کام تعویذوں سے ہونے والا نہیں ہے لیکن تیرے پیار کی سچائی دیکھتے ہوئے میں تیری مدد بھی کرنا چاہتا ہوں یہ بتا اگر تو لڑکی سے کوئی بات کہے تو وہ مان لے گی؟" پیر بابا نے ایک اور سوال کیا۔

"جی پیر بابا! میرا خیال ہے کہ وہ مان لے گی۔" ظفر نے جواب دیا۔ "اچھا تو پھر کان لگا کر سن اور اس پر عمل کر!" پھر پیر بابا اسے تفصیل سے سمجھانے لگے کہ اس سلسلے میں اسے کیا کرنا ہو گا۔ پیر بابا کی ساری بات سننے کے بعد ظفر نے سوال کیا۔

"لیکن پیر بابا! اس کا فائدہ کیا ہو گا؟"

"بے وقوف اس پورے علاقے میں اور کوئی صاحب علم نہیں ہے اسے علاج کے لیے میرے ہی پاس لایا جائے گا تب میں اس کی ماں سے کہوں گا کہ خیریت اسی میں ہے کہ اپنی لڑکی کی شادی اپنی بہن کے گھر کر دے ورنہ پچھتائے گی اور یوں تیرا کام بن جائے گا۔"

پیر بابا کی بات پوری طرح ظفر کی سمجھ میں آگئی اور اس

کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے اسے پورا یقین ہو گیا کہ اب سیما اس کی ہو کر رہے گی۔ اس نے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر پیر بابا کے سامنے رکھے اور پھر بڑی عقیدت مندی سے الٹے قدموں چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا' الیاس نے بھی اس کی تقلید کی تھی جبکہ پیر بابا چند لمحے پُرخیال انداز میں دروازے کی طرف تکتے رہنے کے بعد سامنے موجود نوٹوں کے ڈھیر کو سمیٹنے لگے۔ ان کے ذہن میں ظفر کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"وہ اتنی پیاری' اتنی خوب صورت ہے کہ میں اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں....."

☆ ☆ ☆

سیما کی حالت خراب تھی' اس نے اپنے کپڑے تار تار کر لیے تھے اور بری طرح چیختے چلاتے ہوئے پورے گھر میں بھاگی پھر رہی تھی۔

اس کی چیخیں سن کر محلے کی دو تین عورتیں بھی آ پہنچی تھیں لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کریں تو کیا کریں؟ ادھر سیما اپنے بال نوچ رہی تھی اور اول فول گفتگو کیے جا رہی تھی اس کی آنکھیں گہری سرخ ہو رہی تھیں' بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے اور دوپٹے کا تو اسے ہوش ہی نہیں تھا' اس کی ماں نے دبوچ کر اسے پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے اس بری طرح جھٹکا دے کر خود کو چھڑایا تھا کہ اس کی ماں انگشت بدنداں رہ گئی۔

سیما کے بدن میں تو جیسے کوئی شیطان حلول کر گیا تھا ایک وحشیانہ اور جنونی سا انداز تھا اس کا' سیما کی ماں پریشان انداز میں کھڑی فریادی نظروں سے ان خواتین کا چہرہ تکے جا رہی تھی جو سیما کی چیخ و پکار سن کر اکٹھی ہو گئی تھیں لیکن کسی کی جرات نہیں ہو رہی تھی کہ وہ سیما کو پکڑنے کی کوشش کرتیں یا اس کے قریب جاتیں۔

پھر سیما بھاگتے بھاگتے ایک چارپائی سے ٹکرائی اور الٹ کر چارپائی پر جا گری اب اس کے جسم کو تشنج زدہ انداز میں جھٹکے سے لگ رہے تھے یہ دیکھ کر سیما کی ماں سے رہا نہ گیا وہ تڑپ کر بیٹی کے قریب پہنچی اور سہارا دے کر اسے بٹھانے کی کوشش کی ایک عورت نے بھاگ کر گھڑونچی سے پانی کا گلاس بھرا اور گلاس لیے ماں بیٹی کے قریب پہنچی ٹھیک اسی لمحے سیما نے اپنی ماں کے ہاتھ ایک مرتبہ پھر بری طرح جھٹک دیے اور انتہائی بدتمیزی سے بولی۔

"اے بڑھیا! پیچھے ہٹ اپنے ناپاک ہاتھ ہم سے دور رکھ جانتی نہیں کہ ہم آئے ہوئے ہیں۔" وہ سیما کی آواز ہی نہ تھی' ایک عجیب سی نامانوس مردانہ سی آواز تھی جسے سن کر پانی لانے والی عورت کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر زمین پر جا پڑا اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

سیما کی والدہ بھی ایک مرتبہ پھر پیچھے ہٹ چکی تھیں۔ اب سیما بال جھلاتے اور اپنا سر گھماتے ہوئے بری طرح جھول رہی تھی جبکہ اس کی ماں کا دل لرز رہا تھا۔ جھومتے جھومتے سیما پٹ سے گری اور پھر ساکت ہو گئی! اس کی ماں نے بھاگ کر اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے اور اسے چارپائی پر چت لٹا دیا۔ سیما کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے اور وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

"ہائے ہائے کبریٰ بہن سیما پر تو جن آگیا ہے' اللہ معاف کرے کیسی مردانہ آواز میں باتیں کر رہی تھی اور حال تو دیکھو اپنا ہوش ہی نہیں تھا بے چاری کو....." ایک دیہاتی عورت نے سیما کی ماں کبریٰ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو کبریٰ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی ایک ہی تو بیٹی تھی اس کی اور اس کا یہ حال تھا کہ کبریٰ کا دل دہل رہا تھا۔

"وہ اپنی رحمتے کی شانو پر بھی تو جن آگیا تھا! بالکل یہی حال تھا اس کا بھی ایک دن دورے کی حالت میں گھر سے نکل بھاگی تھی اور پھر بڑی نہر میں جا کودی تھی پورے چار دن بعد لاش ملی تھی بے چاری کی۔" ایک دوسری عورت نے کبریٰ کی معلومات میں اضافہ کیا اور

کبریٰ کو مزید دہلا دیا۔

"ہاں ہاں ہاجرہ! جب جن آتا ہے تو بندہ اپنے ہوش میں تھوڑی ہوتا ہے اس شانو بے چاری کو تو پتا بھی نہیں ہو گا کہ وہ نہر میں کود رہی ہے۔ پتا نہیں کیسے جان نکلی ہو گی بے چاری کی اور وہ مہران کی لڑکی گڈی پر بھی تو جن آگیا تھا وہ تو بھلا ہو پیر بابا کا ایسا علم کیا کہ گڈی بالکل ٹھیک ہو گئی پھر کبھی جن نہیں آیا اس پر اب تو خیر سے تین کاکے ہیں اس کے۔"

پہلی عورت نے تائید کرتے ہوئے کہا تو کبریٰ مزید پریشان ہو گئی لیکن ان کی باتوں میں اسے ایک کام کی بات بھی سنائی دے گئی تھی۔ ایسی عورتیں ہر جگہ پائی جاتی ہیں جو جاتی تو اگلے کا غم بانٹنے ہیں لیکن اس کے دکھوں میں مزید اضافہ کر کے چلتی بنتی ہیں۔

جب بولتی ہیں تو یہ بھی نہیں سوچتیں کہ ان کی باتیں دوسروں کے لیے کتنی عذاب ناک ہیں! انہیں تو صرف بولنا ہوتا ہے اپنے لفظوں کا ذخیرہ ختم کرنا ہوتا ہے اور وہ ایسا کر کے رہتی ہیں ورنہ ان کے پیٹ کا ابال کیسے ختم ہو؟ یہ خواتین بھی اسی قبیل کی تھیں لیکن جہاں ان کی باتیں کبریٰ کے لیے اذیت کا باعث بن رہی تھیں وہیں اسے ایک نیا راستہ بھی دکھا گئی تھیں۔ اس نے بھی پیر بابا کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا وہ جانتی تھی کہ پیر بابا بہت "کرنی والے" ہیں خواتین جہاں بھی اکٹھی ہو کر بیٹھ جائیں وہاں سارے گاؤں کے قصے دوہرائے جاتے ہیں اور پیر بابا کے قصے بھی اس نے اکثر سنے تھے۔

وہ دل ہی دل میں پیر بابا سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی.....! ٹھیک اسی لمحے سیما نے کراہ کر آنکھیں کھولیں تو کبریٰ جلدی سے اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔ سیما چارپائی پر بیٹھی حیرت سے پلکیں جھپکا رہی تھی اس نے اردگرد نظریں دوڑا کر محلے کی عورتوں کی طرف دیکھا اور پھر معصومیت بھرے لہجے میں اپنی ماں سے سوال کیا۔

"کیا بات ہے امی جان خیریت تو ہے؟ یہ سب لوگ کیوں جمع ہیں یہاں پر اور..... اور یہ میرے کپڑوں کو کیا ہوا؟" سیما کی نظر جب بات کرتے کرتے اچانک اپنے تار تار کپڑوں پر پڑی تو وہ حیرت سے چلائی۔

کبریٰ نے ایک طویل سانس لی اور پھر محبت بھرے انداز میں سیما کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں بیٹا شاید چکر آگیا تھا تمہیں۔" محلے دار خواتین نے جب حالات معمول پر دیکھے تو ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگیں بالکل یوں جیسے سینما کا شو ختم ہونے پر تماشائی باہر نکلتے ہیں۔ باقی کا دن خیریت سے گزر گیا اور سیما پر دوبارہ جن بھی نہیں آیا لیکن کبریٰ پریشان تھی وہ جانتی تھی کہ جن اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتے اور سیما کسی بھی وقت دوبارہ زیر اثر آسکتی ہے اور کبریٰ یہ رسک ہرگز نہیں لینا چاہتی تھی ویسے بھی وہ محلے دار عورتوں کی باتیں سن سن کر سخت خوفزدہ تھی اور کیوں نہ ہوتی۔

سیما اس کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ اس کی جان داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی یہ اسے ہر صورت اس جن سے نجات حاصل کرنا تھی جو اس کی بیٹی کے ہوش و حواس چھین لیتا تھا اور کسی بھی وقت اسے کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔

شام ہوتے ہی کبریٰ نے سیما کو ساتھ لیا اور گھر سے باہر نکل کر گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر روانہ ہو گئی۔ اسے پیر بابا کا ڈیرہ معلوم تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ وقت پیر بابا کی ملاقات کا وقت نہیں ہے کیونکہ پیر بابا مغرب کی اذان سے پہلے پہلے تمام سائلین کو فارغ کر دیتے تھے اور پھر کسی سے نہیں ملتے تھے لیکن کبریٰ دن کے وقت سب لوگوں کے سامنے ملنا بھی نہیں چاہتی تھی آخر جوان بیٹی کا معاملہ تھا اسے یقین تھا کہ پیر بابا اس کی مجبوری کو سمجھ جائیں گے اور ملاقات کے لیے ضرور وقت دیں گے۔

شام کے سائے اپنے پر پھیلا چکے تھے اور سارا دن تلاش رزق میں مصروف رہنے والے پرندے بھی اپنے اپنے گھونسلوں میں واپس لوٹ چکے تھے ادھر سورج نے افق کی گود میں آخری ہچکی لی ادھر کبریٰ سیما کو ساتھ لیے پیر بابا کی چوکھٹ پر پہنچ گئی۔ پیر بابا کا ڈیرہ گاؤں سے کافی فاصلے پر قطار اندر قطار لگے درختوں کے درمیان میں واقع تھا قریب ہی کچھ فاصلے پر صاف و شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی نہر بھی بہتی تھی جس کا پانی انتہائی ٹھنڈا اور فرحت بخش تھا یہاں آنے والے اکثر لوگوں کا عقیدہ تھا کہ پیر بابا کے زیر سایہ بہنے والی اس ندی کا پانی بہت سی بیماریوں سے شفایابی بخشتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ گرمیوں کے دنوں میں آنے والے اکثر سوالی اس نہر کے پانی میں ضرور نہاتے تھے۔

کبریٰ نے ڈیرے کے دروازے پر دستک دی لیکن جواب میں خاموشی چھائی رہی چند لمحے انتظار کے بعد کبریٰ نے دوبارہ دستک دی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، کبریٰ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ شاید پیر بابا اپنے کسی مرید کے ہاں چلے گئے ہوں؟ لیکن اس طرح تو اس کا طویل فاصلہ طے کر کے آنا ایک طرح سے بے کار ہی جاتا اور پھر سب سے بڑی پریشانی تو اسے سیما کی طرف سے تھی اگر سیما کو دوبارہ دورہ پڑ گیا تو کیا ہو گا؟ اور اگر جن کو معلوم ہو جائے کہ وہ یہاں کسی ارادے سے لائی ہے تو سیما کو عمل کیا ہو گا؟

آن کی آن میں کتنے ہی خدشات کا شکار ہو کر کبریٰ نے آخری کوشش کے طور پر تیسری مرتبہ ایک زوردار دستک دی۔ نتیجہ امید افزا تھا۔ اندر سے کسی کے قدموں کی آواز بلند ہوئی جو رفتہ رفتہ دروازے تک پہنچ کر رک گئی۔ پھر دروازہ کھلا اور لمبا چوڑا ایک شخص نمودار ہوا جس کے سر پر لمبی زلفیں تھیں، بڑی بڑی مونچھیں، سرخ انگارہ آنکھیں اور ہاتھ میں تیزی سے گردش کرتی ہوئی تسبیح تھی اور یہ شخص "پیر بابا" کے علاوہ اور کوئی نہ تھا!

اپنے دروازے پر دو خواتین کو دیکھ کر اس کی پاٹ دار آواز بلند ہوئی۔ "کون ہو بی بی! تم لوگ؟ جانتی نہیں کہ یہ وقت ہماری عبادت کا ہے؟ شام کے وقت ہم کسی سے نہیں ملتے کیونکہ اس وقت سے لے کر اگلی صبح تک ہم اپنے وظائف کرتے ہیں۔" پیر بابا کا سخت لہجہ سن کر کبریٰ لجاجت سے بولی "میں جانتی ہوں پیر بابا لیکن جوان بیٹی کا معاملہ ہے تماشا نہیں بننا چاہتی اس لیے بے وقت آنے کی معافی چاہتی ہوں آپ تو اللہ کے نیک بندے ہیں آپ سے تو کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، ہماری مدد فرمائیں پیر بابا!"

اور پیر بابا نے کبریٰ کی بات سن کر پہلی مرتبہ پوری توجہ سے سیما کی جانب دیکھا جو سیاہ چادر میں نقاب کیے ہوئے ایک جانب خاموش کھڑی تھی۔ پیر بابا کی نظریں کسی عقاب کی مانند اس کا مکمل جائزہ لے رہی تھیں اور لمحوں میں چادر کے اندر چھپے وجود کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچ چکی تھیں کہ یہ دلکش لڑکی کون ہو سکتی ہے؟ پیر بابا کی نظروں کو محسوس کر کے سیما اپنی جگہ پر کسمسا کر رہ گئی اسے ان نگاہوں کی تپش اپنے وجود میں سوراخ کرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن جلد ہی پیر بابا نے نظریں ہٹالیں اور پھر راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"آؤ اندر آجاؤ۔"

کمرے میں اگربتیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو کہیں نظر نہیں آرہی تھیں شاید اگربتیوں کی یہ خوشبو اس کمرے میں ہی رچ بس گئی تھی اور اس ماحول کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی سارا دن سلگنے والی اگربتیاں شاید کچھ ہی دیر پہلے وہاں سے ہٹائی گئی تھیں لیکن ان کی خوشبو اب بھی موجود تھی، پیر بابا اپنی مخصوص نشست اونی گدے پر براجمان ہو گئے، تسبیح مسلسل گردش میں تھی۔

پھر پیر بابا کی آواز بلند ہوئی۔

"بڑا ظالم اور خطرناک جن ہے اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑے گا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تم یہاں آگئیں ورنہ اگلی مرتبہ بچی کی جان بھی جا سکتی تھی۔" یہ سن کر کبریٰ پیر بابا کے سامنے سجدہ ریز ہو گئی۔ وہ ان کی کرامت اور علم پر ایمان لے آئی تھی۔ یہ بات اس کے لیے انتہائی حیرانی کا باعث تھی کہ اس نے تو ابھی کچھ بتایا ہی نہیں اور پیر بابا کو سب معلوم ہے! یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟ واقعی پیر بابا جیسے لوگوں سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہوتا۔

پھر وہ بولی تو اس کی آواز میں عقیدت ہی عقیدت

لرزیں لے رہی تھی۔ ”پیر بابا! آپ تو دلوں کے بھید جانتے ہیں‘ اللہ کا خاص کرم ہے آپ پر‘ میری ایک ہی بیٹی ہے اس کے علاوہ میرا ہے ہی کون؟ اسے اس ظالم جن سے نجات دلا دیں‘ ساری زندگی دعائیں دوں گی اللہ آپ کا اقبال بلند کرے‘ آپ کے علم میں ترقی دے‘ پیر بابا! میری بچی کو بچالیں۔“

کبریٰ کی آواز بھرا گئی اور سیما اپنی ماں کی محبت کا یہ اظہار دیکھ کر لرز کر رہ گئی۔ وہ تو جانتی تھی کہ اصل حقیقت کیا ہے اور پھر پیر بابا! وہ تو خود اسے کسی جن سے کم نہیں لگا تھا لیکن وہ بھی کیا کرتی اس کے پاس دوسرا راستہ بھی تو نہیں تھا؟ وہ ظفر کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اگر وہ ظفر کے کہنے پر یہ سب نہ کرتی تو شاید وہ ظفر کو کبھی حاصل نہ کر سکتی اس نے دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگی اور تہیہ کر لیا کہ وہ آئندہ زندگی میں کبھی اپنی ماں کے لیے پریشانی کا باعث نہیں بنے گی۔

کبریٰ کی بات ختم ہوئی تو پیر بابا کی آواز بلند ہوئی۔

”لڑکی تو ادھر اندر حجرے میں چلی جا مجھے تیری ماں سے کچھ باتیں کرنی ہیں جا اندر چلی جا۔“ سیما نے اندرونی دروازے کی طرف دیکھا پھر ہچکچا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا تو کبریٰ بولی۔

”ہاں ہاں بیٹا تو اندر چلی جا‘ بے فکر ہو جا یہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔“ اور سیما اٹھ کر دل ہی دل میں یہ کہتی ہوئی کہ (اللہ آپ کی زبان مبارک کرے امی جان) اندرونی کمرے میں داخل ہو گئی۔

وہ جانتی تھی کہ اب پیر بابا امی جان سے یہی کہیں گے کہ اگر بیٹی کی زندگی بچانی ہے تو اس کا رشتہ اپنی بہن کے گھر کر دے اور پھر خوشیاں ہی خوشیاں اس کا مقدر ٹھہریں گی۔ ظاہر ہے اس کے رشتے کی بات اب پیر بابا اس کے سامنے تو نہیں کر سکتے تھے نا؟ ادھر پیر بابا کبریٰ سے مخاطب تھے۔

”دیکھو بی بی! جن بڑا زبردست ہے کوئی معمولی پیر یا عامل اگر اس سے مقابلے کی کوشش بھی کرے گا تو اپنی جان سے جائے گا تم عورت ذات ہو اور اپنی بیٹی سے محبت بھی بہت کرتی ہو اس لیے میں اس معاملے میں ہاتھ ڈال رہا ہوں ورنہ تو میں بھی جواب ہی دیتا۔“

”اللہ آپ کو اجر دے پیر بابا! آپ نے مجھ غریب کی خاطر اتنا سوچا۔“ کبریٰ نے تشکر آمیز نظروں سے پیر بابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو پیر بابا بولے۔

”دیکھو بی بی ہمارا یہ ڈیرا ایک مکمل پاکیزہ جگہ ہے جہاں داخل ہوتے ہوئے بڑے بڑے جنوں کی روح فنا ہوتی ہے اور جس جن کو ہم اپنے علم کے زور سے یہاں بلائیں یہاں داخل ہو کر اس کی آدھی طاقتیں سلب ہو جاتی ہیں پھر وہ جن ہمارا غلام بن جاتا ہے تم نے اچھا کیا کہ بچی کو یہاں لے آئیں ہم آج ساری رات وظیفہ کریں گے اور اس نامراد جن کو آج ہی قید کر لیں گے تم بے فکر ہو کر بچی کو یہاں چھوڑ جاؤ اور کل آ کر اسے واپس لے جانا اللہ نے چاہا تو زندگی میں دوبارہ کبھی اس پر جن نہیں آئے گا۔“

پیر بابا کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے کبریٰ کے چہرے پر چند شکنیں سی نمودار ہوئیں لیکن دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گئیں۔

”جو حکم پیر بابا! کل کس وقت حاضر ہو جاؤں؟“ کبریٰ نے مودبانہ انداز میں پوچھا تو پیر بابا بولے۔

”بس دن چڑھے آجانا۔“

”ٹھیک ہے پیر بابا! کیا میں بچی کو سمجھا دوں کہ وہ رات یہیں رکے۔“ کبریٰ نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں ہاں اندر چلی جاؤ اور اسے سمجھا دو۔“

پیر بابا سے اجازت ملنے پر کبریٰ بھی اندرونی حجرے میں داخل ہو گئی جبکہ پیر بابا وہیں بیٹھے رہے ان کے ہاتھ میں موجود تسبیح تیزی سے حرکت کرتی جا رہی تھی۔ جب کبریٰ سے صورت حال معلوم ہوئی اور رات وہیں رکنے کا حکم بھی تو سیما گڑبڑا کر رہ گئی‘ یہ بات تو پروگرام میں شامل ہی نہیں تھی ایک لمحے کے لیے شکوک و شبہات کے ناگ اس کے دماغ میں اپنے پھن پھیلا کر رہ گئے لیکن اگلے ہی لمحے وہ مطمئن ہو گئی شاید پیر بابا سارے معاملے کو حقیقت کا رنگ دینا چاہتے تھے کہ کسی قسم کے شبے کا اندیشہ نہ رہے اور پھر پیر بابا تو اتنے علم والے اور اللہ کے نیک بندے تھے سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی ماں کی خواہش بھی یہی تھی سو اس نے سر تسلیم خم کر دیا۔

کبریٰ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر اسے تسلی دیتے ہوئے رخصت ہو گئی۔ جب وہ گھر سے باہر نکلی تو عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں گاؤں کی طرف جانے والا کچا راستہ دور تک سنسان تھا کبریٰ گاؤں کی طرف واپس چل دی اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد تاریکی کا حصہ بن گئی۔

وقت دھیرے دھیرے سرکتا رہا اور رات آگے بڑھتی رہی درختوں کے جھنڈ میں گھرے پیر بابا کے ڈیرے پر گہرا سکوت طاری تھا ڈیرے سے کچھ ہی فاصلے پر بہتی ندی کا پانی اپنی دھیمی رفتار سے چل رہا تھا دور کہیں کسی کھیت میں سے کسی گیدڑ کے رونے کی آواز بلند ہو رہی تھی رات کے بارہ یا ساڑھے بارہ کا وقت ہو گا جب اچانک پیر بابا کے ڈیرے سے ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی‘ پھر دوسری چیخ..... لیکن دوسری چیخ درمیان میں ہی گھٹ کر رہ گئی یوں جیسے چیخنے والے کا منہ بھینچ دیا گیا ہو..... پھر گھٹی گھٹی سی چند مزید چیخیں سنائی دیں..... یہ چیخیں سیما کے علاوہ اور کسی کی نہ تھیں۔

☆ ☆ ☆

پیر بابا کے ڈیرے سے واپس آنے کے بعد سیما کو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ نہ وہ ہنستی‘ نہ مسکراتی نہ ہی پہلے کی طرح بے تکان ڈھیروں باتیں کرتی۔ وہ شوخ اور چنچل سیما شاید پیر بابا کے ڈیرے پر ہی رہ گئی تھی جو اس گھر میں دوڑتی‘ بھاگتی اٹھکھیلیاں کرتی پھرتی تھی کہ نہ کھانے کا ہوش نہ پہننے کا آٹھ آٹھ دن جن کپڑوں میں پھر رہی ہے وہی پہنے ہوئے ہیں کبریٰ نے یاد دلایا ”سیما کتنے دن ہو گئے تو نے یہی سوٹ پہن رکھا ہے چل میرا بیٹا نہا کر کپڑے تبدیل کر لے۔“ تو کپڑے بدل لیے کبریٰ نے کھانا دیا تو خاموشی سے کھا لیا کر کہیں بیٹھی ہے تو خاموش گم سم جیسے فضا میں کسی غیر مرئی شے کو تلاش کر رہی ہو کبریٰ اس کی اس حالت کو سمجھ تو نہیں پا رہی تھی لیکن پریشان ضرور تھی اور جہاں پریشان تھی وہیں مطمئن بھی تھی کہ کبریٰ کو اس دن کے بعد سے دورہ نہیں پڑا تھا‘ اس پر جن نہیں آیا تھا پیر بابا کے ہاں سے آئے ہوئے تقریباً تین ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا لیکن اس دوران دوبارہ کبھی بھی سیما پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی جو جن آنے کی نشانی تھی سو کبریٰ مطمئن تھی۔

اس کا خیال تھا کہ آہستہ آہستہ سیما کی یہ حالت بھی معمول پر آجائے گی اور پھر وہ وہی سیما بن جائے گی جو وہ تھی لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا اور شاید ہو بھی نہیں سکتا تھا سیما کے اندر بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی اس دن سیما کی ماں گھر سے نکلی تو کچھ ہی دیر کے بعد ظفر آن دھمکا۔

جب سے سیما‘ پیر بابا کے ہاں سے واپس آئی تھی ظفر آج تیسری مرتبہ آیا تھا دو مرتبہ پہلے بھی وہ سیما سے

یہ پوچھنے کی کوشش کرچکا تھا کہ پیربابا کے کہنے کے بعد بھی سیما کی امی نے اس کی امی سے بات کیوں نہیں کی؟ لیکن سیما خاموشی سے اسے تکتی رہ گئی تھی وہ ظفر کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکی تھی جواب ہوتا تو دیتی۔

آج بھی جب ظفر نے کہا۔

"سیما آخر کیا ہو گیا ہے تمہیں کیا میری ضرورت نہیں رہی تمہیں؟ یا مجھ سے محبت نہیں رہی؟ اس خاموشی کا مطلب؟ آخر جواب کیوں نہیں دیتیں تم؟" تو سیما پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اب وہ مزید چپ نہیں رہ سکتی تھی اور ویسے بھی شاید اب اس کی خاموشی کی ضرورت نہیں رہی تھی چند ہی دنوں کی تو بات تھی سب خود ہی جان جاتے اس کی بربادی کی کہانی آخر وہ کتنی دیر تک چھپاتی۔

"ظفر! میں تمہارے قابل نہیں رہی ہوں میں..... میں ماں بننے والی ہوں۔" اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا تو ظفر سناٹے میں رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے آسمان اچانک اس کے سر پر آن گرا ہو اور زمین اس کے پیروں کے نیچے سے سرک گئی ہو۔

"ک..... کیا کہہ رہی ہو سیما تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔" اور سیما کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں ظفر! تمہارے اس پیربابا نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔" سیما نے روتے بلکتے ہوئے سارا ماجرا کہہ سنایا اور ظفر خاموش کھڑا سنتا رہ گیا اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا وہ یک ٹک سیما کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا پھر وہ اچانک پلٹا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

سیما حیران تھی کہ وہ کچھ بولا کیوں نہیں؟ اچھا برا کچھ تو کہتا کوئی تو بات کرتا لیکن اس نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا کیا سوچا ہو گا اس نے یہ سب سن کر؟ کیا اسے پیربابا پر غصہ آیا ہو گا؟ یا میری مظلومیت پر رحم؟ سیما سوچ رہی تھی خود سے سوال کر رہی تھی لیکن جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ وہ تو جا چکا تھا۔ خاموش چپ چاپ بغیر کسی رد عمل کا اظہار کیے۔ سیما پریشان ہو گئی۔ ایک دن، دو دن، تین دن اور پھر پورے پندرہ دن گزر گئے لیکن ظفر واپس نہیں آیا تو ایک دن سیما نے ماں سے کہا۔

"امی جان مجھے شہر جانا ہے خالہ صغری کے گھر مجھے لے چلو ایک بار وہاں۔" تین ساڑھے تین مہینوں میں یہ پہلی خواہش، پہلی فرمائش تھی جو سیما نے اپنی ماں سے کی تھی پھر وہ منع کیسے کرتی؟ اگلے ہی دن وہ شہر پہنچے اور پھر صغری خالہ کے گھر! اس وقت ظفر گھر پر موجود نہیں تھا خالہ جان نے بظاہر محبت سے ان کا استقبال کیا لیکن ان کی جلتی ہوئی نظریں جب جب سیما کی نظروں سے ٹکرائیں سیما کو ان آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر ملتا شام سے کچھ پہلے ہی ظفر واپس گھر آ گیا لیکن ان پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے سلام کیا اور آگے بڑھ گیا سیما سے اس نے نظریں نہیں ملائی تھیں سیما مسلسل موقع کی تلاش میں رہی کہ ظفر سے بات کر سکے اور یہ موقع اسے اگلے دن دوپہر کو میسر آیا جب خالہ جان اور امی جان اندر کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں اس نے باہر نکلتے ہوئے ظفر کو بیرونی دروازے پر جا لیا۔

"ظفر! تم کچھ بھی کہے، کچھ بھی بولے بغیر وہاں سے چلے آئے اور پھر پلٹ کر نہیں آئے، جو کچھ بھی ہوا اس میں میرا قصور تو بتاؤ، میں نے تمہارے کہنے پر زندگی میں پہلی بار یہ سب کچھ کیا، جھوٹ بولا، ڈرامہ کیا، اپنی ماں کو دھوکہ دیا اس سے بدتمیزی کی، لیکن مجھے ملا کیا؟ بربادی، ذلت اور رسوائی کیا محبت کا یہی انجام ہوتا ہے؟ اور تم..... تم نے سب کچھ جان کر بھی کوئی جواب نہیں دیا، پلٹ کر واپس ہی نہیں آئے کیا یہی تمہاری محبت تھی؟"

سیما نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا لیکن جب ظفر نے جواب دیا تو اس کا لہجہ بڑا پرسکون اور بااعتماد تھا وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"دیکھو سیما! میں نے جس سیما سے محبت کی تھی وہ معصوم اور پاکیزہ تھی اس سیما میں اور آج کی سیما میں

زمین آسمان کا فرق ہے یا یہ فرق اس وقت بھی تھا مجھے نظر نہیں آ سکا میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری آنکھوں پر بندھی پٹی خود ہی کھول دی۔ شاید قدرت کو میری بہتری منظور تھی، جو لڑکی ایک ناجائز بچہ اٹھائے پھر رہی ہو اور پیربابا جیسے اللہ کے نیک بندے پر بھی الزام لگانے سے نہ چوکے وہ کبھی بھی معصوم اور پاکیزہ نہیں ہو سکتی اور تم پہلے بھی نیک اور پاکیزہ نہیں تھیں پتا نہیں گاؤں میں کس کس سے تمہارا کیا کیا رشتہ ہو گا جب اور کچھ نہ بن پڑا تو پیربابا پر ہی الزام لگا دیا لیکن اس فرشتہ صفت، نیک اور عبادت گزار بندے پر الزام دھرو گی تو اس پر یقین کون کرے گا؟ اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ اس گندگی اور غلاظت کو میں اپنا نام دوں گا یا اس کو قبول کرتے ہوئے تم سے شادی کر لوں گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔"

ظفر نے بات ختم کی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ سیما اپنی جگہ بھونچکی کھڑی تھی اس کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے ظفر کا ایک ایک لفظ اس کے دل پر کسی خنجر کی طرح چرکے لگا گیا تھا اس کا پورا وجود اس وقت آندھیوں کی زد میں تھا ایک طوفان ایک بھونچال تھا جو اس کو ملیامیٹ کر گیا تھا۔

کوئی بھونچال دل سے گزرا ہے
بستیاں پھر مکان کھو بیٹھیں

پھر وہ وہاں نہیں رکی تھی خالہ جان کہتی ہی رہ گئیں لیکن وہ وہاں سے واپس نکل پڑے اور رات ہونے سے پہلے پہلے گاؤں واپس پہنچ گئے۔

☆ ☆ ☆

شام کا وقت تھا اور کبری کے گھر میں اودھم مچا ہوا تھا سیما کے کپڑے تار تار تھے بال بکھرے ہوئے تھے وہ پورے گھر میں بھاگی پھر رہی تھی اور حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں جو خاصی حد تک مردانہ آواز سے مشابہ تھیں۔

کبری حیران پریشان دیوار سے لگی کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ پیربابا نے تو کہا تھا کہ اب کبھی اس پر جن نہیں آئے گا لیکن جن نا صرف آیا ہوا تھا بلکہ آج تو سیما کے دورے میں بھی پہلے کی نسبت زیادہ شدت تھی کافی دیر تک سیما کی یہ دھما چوکڑی جاری رہی پھر وہ بھاگتے بھاگتے دیوار سے ٹکرائی اور دھڑام سے زمین پر آ رہی وہ بے ہوش ہو چکی تھی کبری نے جلدی سے آگے بڑھ کر سیما کو پکڑا اور پھر بمشکل اسے گھسیٹ کر چارپائی تک لائی اور پھر اسے چارپائی پر لٹانے میں بھی کامیاب ہو گئی کافی دیر کے بعد سیما کو ہوش آیا تو اس کا رویہ کبری کے اندازے کے عین مطابق نارمل تھا اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا کہ اب سے چند لمحے قبل وہ کیا کرتی رہی ہے۔

کبری شدید پریشان تھی اس نے سیما کو کپڑے بدلنے کا کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ ابھی گھر سے نکلیں گے کہیں کام سے جانا ہے، سیما کو معلوم تھا کہ کیا کام ہے اور کہاں جانا ہے لہٰذا وہ نہانے کے بعد جلدی جلدی تیار ہوئی اس نے لباس چینج کیا تو ایک عدد تیز دھار اور لمبی چھری اس کے لباس میں منتقل ہو چکی تھی پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ گاؤں سے باہر جانے والے اس راستے پر گامزن تھیں جو لہراتا بل کھاتا بالآخر پیربابا کے ڈیرے پر پہنچتا تھا۔

خدا خدا کر کے ان کا یہ سفر اختتام پذیر ہوا اب وہ پیر

بابا کے دروازے پر تھیں۔ کبریٰ نے دستک تو حسب معمول ہی یعنی تین مرتبہ دی لیکن اس مرتبہ دروازہ کھولنے والی شخصیت پیر بابا نہیں' بلکہ کوئی ملنگ نما آدمی تھا اس نے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا اور پھر غڑاپ سے اندرونی دروازے میں غائب ہو گیا چند لمحوں کے بعد ہی اسی دروازے سے پیر بابا برآمد ہوئے۔

دونوں ماں بیٹیوں کے چہرے پر نظر پڑتے ہی پیر بابا کے چہرے پر رونق سی آگئی ایک عجیب سی چمک تھی جسے کوئی معنی یا مفہوم نہیں پہنایا جا سکتا تھا۔ کبریٰ نے احوال کہہ سنایا تو پیر بابا نے اندرونی حصے کی طرف منہ اٹھا کر آواز دی "جیرا سائیں ذرا باہر تو نکلو۔" چند لمحوں کے بعد ایک اور ملنگ نما آدمی باہر نکلا تو پیر بابا نے کہا۔

"بچی کو اندر حجرے میں بھیج دو اور تم دونوں یہاں باہر والے کمرے میں رہو گے۔"

"جاؤ لڑکی اندر چلی جاؤ اور بی بی تم جاؤ کل آجانا۔" پیر بابا کی بات ختم ہوئی تو سیما اندر جبکہ کبریٰ بیرونی دروازے سے باہر نکل گئی۔

رات اپنے پر پھیلا چکی تھی اور وقت لمحہ بہ لمحہ اپنا سفر طے کر رہا تھا پیر بابا کے ڈیرے پر مکمل خاموشی کا راج تھا پھر تقریباً" بارہ یا ساڑھے بارہ کا وقت ہو گا جب پیر بابا کے ڈیرے سے ایک بھیانک چیخ سنائی دی اور اس چیخ میں حیرت' بے یقینی' خوف' کرب و اذیت اور نہ جانے کون کون سی کیفیات شامل تھیں صرف محسوس کرنے والی سماعت کی ضرورت تھی لیکن وہ یہاں دور دور تک دستیاب نہ تھی پھر ایک اور چیخ بلند ہوئی جو پہلے سے زیادہ زوردار تھی اس کے بعد خرخرخر کی عجیب سی آواز سنائی دی پھر بھاگتے قدموں کی آواز اس کے بعد خاموشی..... گہری خاموشی چیخیں پہلے بھی گونج چکی تھیں چیخیں آج بھی گونجی تھیں لیکن فرق یہ تھا کہ شکاری آج خود شکار بن گیا تھا آج یہ چیخیں پیر بابا کی تھیں۔

آج سیما کی رہائی کا دن تھا لیکن وہ رہا ہونا نہیں چاہتی تھی اس نے جیلر سے درخواست کی کہ اسے رہائی نہیں چاہیے اسے یہیں رہنے دیا جائے لیکن ایسا کیسے ممکن تھا؟ اس کی سزا ختم ہو چکی تھی رہا تو اسے ہونا ہی تھا۔

وہ جانتی تھی کہ باہر کی دنیا میں اب اس کے لیے کچھ نہیں ہے کوئی اس کی رہائی پر خوش ہونے والا' کوئی اس کے ساتھ چلنے والا موجود نہیں ہے ظفر کی شادی ہو چکی تھی اس کے دو بچے تھے ڈیڑھ سال پہلے اسے یہ اطلاع بھی مل چکی تھی کہ اس کی ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی بھلا وہ رہا ہو کر کرتی بھی کیا؟ کوئی آسرا کوئی سہارا نہیں تھا۔ کوئی رشتہ موجود نہیں تھا جو اس کا منتظر ہوتا جو اس کی رہائی کا انعام ہوتا کوئی آنکھ اس کی راہ تکنے والی نہیں تھی لیکن ایسا نہیں تھا' یہ اس کی غلط فہمی یا اس کی اپنی سوچ تھی ایک آنکھ آج بھی اس کی منتظر تھی ایک شخص آج بھی اس کی راہ تک رہا تھا۔

بچے کو سینے سے لگائے جونہی وہ جیل کے دروازے سے باہر نکلی دو آنکھیں اسے منتظر ملیں جو صرف اس کا انتظار کر رہی تھیں وہ شخص صرف اس کے لیے وہاں کھڑا تھا سیما کا دل زور سے دھڑکا اس کے پورے وجود میں جیسے طمانیت کی ایک لہر سی اتر گئی۔

خوشیاں اس سے روٹھی نہیں تھیں وہ تو اس کی منتظر تھیں آج اسے سمجھ آگئی تھی کہ وہ اس سے ملنے بار بار کیوں آتا تھا بے اختیار اس کی آنکھوں میں اپنے مالک کے لیے تشکر کے آنسو آگئے اس کے حصے کا سکھ' اس کے حصے کی خوشیاں' اس کا نصیب' اس کی منزل اس کے سامنے تھی اور سیما اتنی نادان نہیں تھی کہ اب بھی نہ سمجھ پاتی اس نے سیما کے قریب آکر اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے تو سیما نے اپنے سینے سے لپٹا وہ ننھا پھول اس کی طرف بڑھا دیا اس نے اسے اپنے سینے سے لگایا اور پھر اس کے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگا وہ آصف تھا..... ایڈووکیٹ آصف ملک!

ام ثمامہ

"آمنہ کی ماں مبارک ہو جناح صاحب نے آزاد ریاست کا اعلان کر دیا ہے۔" ابا مٹھائی کا ڈبا ہاتھ میں تھامے زور' زور سے اماں کو پکارتے گھر میں داخل ہوئے' خوشی ان کے اک اک مسام سے پھوٹ رہی تھی' کیونکہ وہ مسلم لیگ کے ایک سرگرم کارکن تھے۔ اماں اور آمنہ دوڑی دوڑی کمرے سے باہر نکلیں۔

"آپ کو بھی بہت مبارک ہو' اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ہے کہ اب ہم اس سرزمین پر رہیں گے جہاں دینی فرائض اور اسلامی روایات کی پاسداری جرم نہیں کہلائے گی اب ہم اپنے پیارے ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان میں رہیں گے۔" اماں نے مطمئن اور مسرور لہجے میں کہتے ہوئے ایک قلاقند اپنے منہ رکھ لی۔

"ابا آپ کو پتا ہے ہم جس دن ہجرت کر کے اپنے وطن پاکستان جائیں گے میں یہ ڈوپٹہ پہنوں گی۔" اس نے ایک سفید ڈوپٹہ ابا کے سامنے پھیلا دیا' جس پر جابجا سبز ستاروں کا کام کیا ہوا تھا جو آمنہ نے خود اپنے ہاتھ سے کاڑھا تھا۔ آزادی کی خوشی کے ساتھ اس کی زندگی کی ایک اور بہت اہم اور پیاری خوشی جڑی تھی۔ ابا جان اور تایا جان نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کا اور علی کا نکاح اپنے وطن پہنچ کر کریں گے۔

"اور ہاں آمنہ کی ماں اب تم کل تک تیاری کر لو' ہم کل ہی یہاں سے نکل جائیں گے' بھائی صاحب نے سارے انتظام کر لیے ہیں' دلی اور حیدر آباد سے کافی بری خبریں آرہی ہیں' ہماری ریاست تو نواب صاحب کی وجہ سے ابھی تک محفوظ ہے۔ مگر سارے ملک میں خون ریزی اور ہنگامے شروع ہو چکے ہیں۔ تنگ نظر اور محدود سوچ والے ہندوؤں سے ہماری آزادی اتنی آسانی سے کیسے ہضم ہو گی جوان بچی کا

ساتھ ہے، جلد از جلد یہاں سے بخیر نکل جائیں تو اچھا ہے۔" اماں جلدی جلدی ضروری سامان اکٹھا کرنے لگیں اور ابا ساتھ والے گھر میں بھائی اور بھابھی کا منہ میٹھا کرنے چل دیے تو آمنہ فٹافٹ سیڑھیاں چڑھ گئی۔

"اے تلسی!" اس نے چھوٹی سی منڈیر سے جھانک کر آواز لگائی۔

"ہاں بول۔" تھوڑی دیر میں منڈیر پر ایک تیلی، سانولی سی لڑکی ماتھے پر بندی لگائے ساڑھی پہنے نمودار ہوئی۔

"تلسی تجھے پتا ہے ہمارے الگ وطن کا اعلان ہو گیا ہے۔ اب ہم کل ہی پاکستان کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ مگر تو مجھے بڑی یاد آئے گی۔" آمنہ کے لہجے میں خوشی اور دکھ دونوں بیک وقت جھلک رہا تھا۔

"ہاں ہاں پتا ہے تم مسلے واقعی نیچ ذات ہو، جس تھالی میں تمام عمر کھایا اسی میں چھید کر رہے ہو، یہاں تم کو کون سی آزادی نہیں تھی جو ہندوستان کو بانٹ کر اب خوشیاں منا رہے ہو۔" تلسی کے لہجے میں نفرت، بے زاری اور جانے کیا کیا تھا آمنہ اپنی بچپن کی سکھی کا منہ حیرت سے تکتے چلی گئی۔

"ابا شاید سچ کہتے تھے ہندو کبھی کسی کے سگے نہیں ہو سکتے، وہ تنگ نظر اور تنگ سوچ کے تھے اور ہمیشہ رہیں گے۔" اس نے دکھی دل سے سوچا اور زینے کی سیڑھیاں اتر گئی۔ اس کے ہاتھ میں دبا سبز اور سفید ستاروں والا دوپٹہ جوں کا توں اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

اللہ جانے رات کا پچھلا پہر تھا کہ آخری ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے پاکستان کی طرف گامزن تھی۔ وقتاً فوقتاً "ٹرین "نعرہ تکبیر اللہ اکبر اور پاکستان کا مطلب کیا لا الہ اللہ" کے نعروں سے گونج اٹھتی تھی۔ یکایک گاڑی کی چھک چھک کی آواز میں بہت سارے مشتعل لوگوں کا شور بھی شامل ہو گیا۔ گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ گاڑی کی پچھلی بوگیوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ چیخوں اور آہوں کے شور میں کان پڑی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"ارے بھائی میرے بیٹے کو مت مارو اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے، یہ تو جوان ہے اس نے ابھی ساری زندگی جینی ہے۔ تم ہم بڈھا بڈھی کو مار کر اپنی تلواروں کی پیاس بجھالو۔" آمنہ سہمی سہمی ابا کے پیچھے کھڑی تایا جان کو علی کی زندگی کی بھیک مانگتے دیکھ رہی تھی۔

"ارے بڈھے ان جوانوں کو ہی تو مارنا ہے جنھوں نے جا کر تمہارے ٹوٹے پھوٹے پاکستان کی باگ ڈور سنبھالنی ہے، تاکہ چند سالوں بعد تم لوگ دوبارہ گلے میں غلامی کا طوق پہنے ہمارے پاس ہاتھ جوڑے چلے آؤ۔" ایک سکھ نے ہنستے ہو کہا۔

"چلو ہم تمہاری خواہش اور اپنی خوشی دونوں ایک ساتھ پوری کر دیتے ہیں۔" اور پھر یکے بعد دیگرے تین تلواریں ہوا میں بلند ہوئیں اور تایا، تائی اور علی کا جوان خون سارے ڈبے میں پھیل گیا اب وہ سارے جنونی بلوائی اماں اور ابا کی طرف مڑے، ہوش و حواس کی دنیا سے بے گانہ ہونے سے پہلے آمنہ کو اتنا یاد تھا کہ کسی نے اس کے بازو کو زور سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا۔

☆ ☆ ☆

میرا دیش مہان تے میرے دیش دی اوچی شان
میں اودے صدقے جاواں۔

چاٹی پر لسی بلوتے ہوئے دل جیت کور اپنی دھن میں گا رہی تھی۔ مگر آواز میں آنسوؤں کی نمی کا دھیما سُر بھی اپنی جھلک دکھاتا تھا۔ دھیان کی ڈور چاٹی کی ڈوری کی طرح بھی ہاتھ سے چھوٹتی تو فضا میں اک لمحے کے لیے خاموشی ہو جاتی۔

"ماتا جی تسی آزادی دے وڈے دن سے ایک دن پہلے ہی دھرتی ماتا دے گیت کیوں گانے لگ جاتی ہو۔" مکھن کے پیڑے کے انتظار میں گرما گرم پراٹھا چنگیر میں رکھے پیڑھی پر بیٹھے سمیر سنگھ نے ماں سے پوچھا۔

"ارے جیون جو گے وہ کیا کہتے ہیں پریکٹس ٹریکٹس میں ایک دن پہلے سے ہی وہ کر لیتی ہوں۔" دل جیت کور نے ہنستے ہوئے پراٹھے پر ڈھیر سارا مکھن رکھ دیا۔

"ماتا جی یہ بتاؤ آپ کو اپنے دیش کی کون سی جگہ سب سے چنگی لگتی ہے۔" اس نے دوبارہ ماں کو بولنے پر اکسایا اسے اپنی بھولی بھالی ماتا بہت اچھی لگتی تھی مگر وہ بہت کم بولتی اور بہت ہی کم مسکراتی تھی۔ اس لیے وہ بہانے بہانے سے اسے باتیں کرنے پر مجبور کرتا تھا۔

"ارے جھلے اپنے دیش کو میں نے دیکھا ہی کب ہے۔" بے خیالی کی رو میں ایک ادھورا جملہ لبوں سے ادا ہوا۔

"کیا مطلب ماتا جی؟"

"اور میرا مطلب ہے کہ میں نے پورا دیش دیکھا ہی کب ہے میں تو کبھی پنڈ سے باہر ہی نہیں گئی۔"

"ماتا جی جتنے سوہنے آپ ہو اتنی ہی سوہنی آپ کی باتیں ہیں۔ اوہیں تو نہیں پتا جی آپ پر لٹو ہوئے ہاں گے۔" پنکی جو ابھی ابھی گردوارے میں ماتھا ٹیک آئی تھی اس نے بھی ماں اور بھائی کی باتوں میں اپنا حصہ ڈالا۔

"پنکی پتر! تیرے پتا جی کدھر رہ گئے سویر سے ان کا لاچی والا دودھ کاڑھ کر بیٹھی ہوں۔" دل جیت کور نے بات کا رخ پھیرنے کے لیے جلدی سے شمشیر سنگھ کے بارے پوچھا اور خود اٹھ کر نیم کے درخت کے تلے رکھے مٹی کے کونڈوں میں پانی اور دانا صاف کر کے رکھنے لگی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ پنکھ پکھیروں، بادل، ہوا یہ سب سرحدوں پر کھنچی لکیروں کے روکنے سے بھی نہیں رکتے تھے۔

☆ ☆ ☆

گوری چٹی تیکھے نین نقش والی دل جیت کور حسن اور اخلاق دونوں میں یکتا تھی اس کے دو ہی بچے تھے سمیر سنگھ اور پنکی، یہ ہی اس کی کل کائنات تھے گھر کے بڑے سے ویڑے میں تو شمشیر سنگھ کی پردھان منتری تھی مگر اس کے دل کے چھوٹے سے آنگن میں اس کے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں تھی۔

وہ کون تھی اسے تو یہ اچھی طرح یاد تھا۔ مگر اس سے وابستہ رشتوں کی بھلائی اسی بات میں تھی کہ وہ یہ بھولی رہے کہ وہ کون تھی، اس نے ہوش و حواس کی دنیا میں جب قدم رکھا تو اپنے اردگرد میس، کرپان، گردوارہ دیکھا ست سری اکال کی صداؤں سے کان آشنا ہوئے اور اس کی ذات کے ساتھ ایک انجان نام "دل جیت کور" نتھی کر دیا گیا جو اب اس کی پہچان بن گیا تھا پہلے پہل تو وہ بہت روئی چیخی چلائی بڑی منتیں ترلے لیے۔ دو بار اپنی جان لینے کی کوشش کی پھر اس کے پیروں میں زنجیریں ڈال دی گئیں ایک سال تک اس کا جسم اور روح زخمی ہوتے رہے اور جب اس کے یہاں سمیر سنگھ نے جنم لیا تو انہوں نے اس کے پاؤں کی زنجیر کھول دی کیونکہ اب وہ ممتا کی ایسی زنجیر میں جکڑی گئی تھی جسے وہ چاہتے ہوئے بھی نہیں توڑ سکتی تھی۔

کمرے میں دیے کی مدھم زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی دل جیت کور دیوار کی طرف پشت کر کے بیٹھی تھی پیٹی کے ادھ کھلے ڈھکن پر اک بندی چپکی تھی اس کے سر پر سفید اور ہرے ستاروں والا دوپٹہ اچھی طرح لپٹا ہوا تھا ہاتھوں میں مٹی کی اک پوٹلی تھی جس میں اس کے پاک وطن کی مٹی تھی جو اس نے پچھلے سال ان لوگوں سے منگوائی تھی جو ننکانہ صاحب زیارت کے لیے گئے تھے آنسوؤں سے تر چہرے سمیت وہ ہولے ہولے منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

"پاکستان کا مطلب کیا لا الہ اللہ۔"

الحمدللہ اب ہم ایک آزاد مسلم ریاست کے آزاد باسی ہیں آزادی کے لیے اپنی جانیں دینے والے تو شہید کہلائے مگر دل جیت کور عمر قید کی ایسی قیدی تھی جسے آزادی کی قیمت روز مر مر کر ادا کرنی تھی۔

☆ ☆

ضوباریہ ساحر

اسیرِ موسمِ ہجراں

۳

تیسری اور آخری قسط

ناولٹ
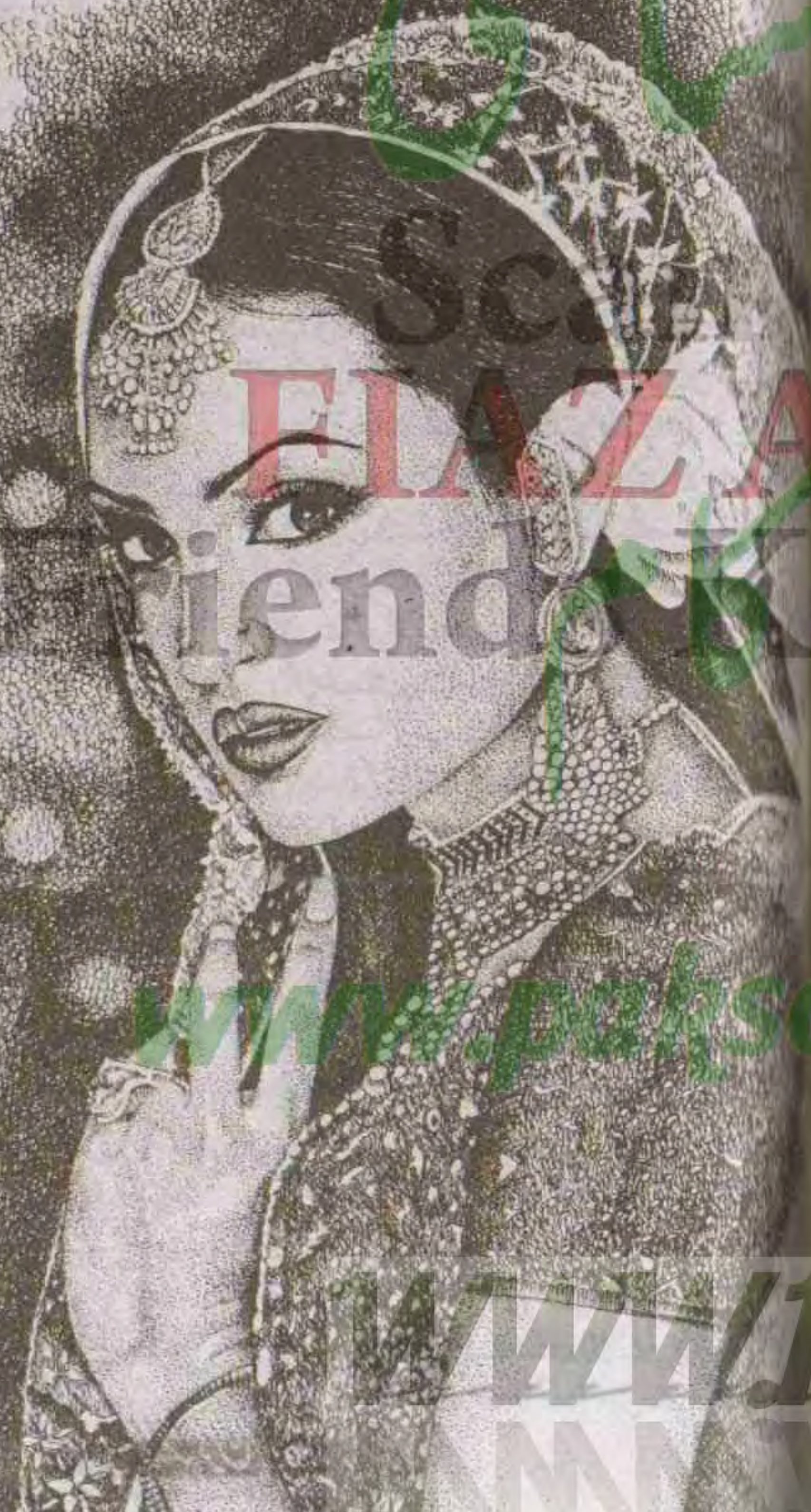
"بابا... کہاں جانا ہے آپ کو؟" فواد نے اسی طرح نرم لہجے میں کہا۔ نذیر کمپاؤنڈر اتنی دیر میں ڈبل روٹی کے دو، تین پیس ـــ اور دودھ کے ایک گلاس پر مشتمل ناشتا لے آیا۔

"بس... مجھے جانا ہے، میں جاؤں گا۔" اس کی جیسے ایک ہی رٹ تھی۔

"ٹھیک ہے آپ نے جہاں جانا ہے میں لے چلوں گا آپ کو... لیکن پہلے کچھ کھالیں۔"

"لے چلو گے۔" اس کے لہجے میں شک تھا۔

"ہاں بابا... جہاں کہیں گے لے چلوں گا، لیکن پہلے آپ کو یہ کھانا کھانا ہوگا، پھر دوا لینی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ رضامند ہوگیا تھا۔ فواد نے ڈبل روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دودھ میں بھگو کر اسے کھلانے شروع کردیے۔ نرس، نذیر اور اکبر ہونق بنے دیکھ رہے تھے۔

آج سے پہلے انہوں نے کسی ڈاکٹر کو اپنے مریض کے ساتھ اس قدر ... نہیں دیکھا تھا۔ فواد خود بھی بہت ریزرو سے تھے، لیکن انہوں نے جس سچویشن اور حالات میں اس کو دیکھا تھا وہ سمجھتے تھے کہ وہ ان کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ سو ایک لحاظ سے انہیں اس سے قلبی لگاؤ سا محسوس ہوتا تھا۔

وہ ... توجہ کے ساتھ بغیر مزاحمت کیے کھانا کھاتا رہا۔ پھر گلاس میں باقی بچا ہوا دودھ پی لینے کے بعد اس نے ارد گرد ایک نظر ڈالی۔

"اب... اب مجھے جانا ہے، مجھے لے چلو۔"

"نہیں بابا! اب کچھ دیر آرام کریں۔ آپ تھک گئے ہوں گے۔" فواد کا انداز ٹالنے والا تھا۔

اسی وقت بابر شاہ نے روم میں قدم رکھا۔ فواد ان کو دیکھ کر حیران سے ہوگئے۔ کاشف نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔

"ابو آپ... خیریت تو ہے نا؟" انہوں نے پوچھا۔ بابر شاہ بہت کم ان کے کلینک آتے تھے۔

"ہاں خیریت ہی ہے۔ گھر سے کسی کام سے نکلا تو اماں بی نے اپنی دواؤں کی پرسکرپشن تھما دی۔ یہیں قریب ہی ہاشمی بلڈرز ہیں نا وہیں کام تھا مجھے تو سوچا جاتے ہوئے پرچی تمہیں دے جاؤں۔ گھر واپسی پر یاد سے لیتے آنا۔" انہوں نے جیب سے کاغذ نکال کر ٹیبل پر رکھا۔

"ابو! آئی تھنک بات کچھ اور ہے۔" فواد نے بابر شاہ کے چہرے پر چھائے سکوت اور لہجے کی [illegible] سے اخذ کیا تھا کہ گھر میں ضرور کچھ نہ کچھ ہوا تھا۔ وگرنہ بابر شاہ اتنے چھوٹے سے کام کے لیے ان کے کلینک پر کبھی نہ آتے کہ دوائیاں تو ہر میڈیکل سے مل جاتی ہیں۔ فواد کی بات سن کر ایک ...

شاہ نے ان کے چہرے کو دیکھا۔ پھر کہنا شروع کیا۔

"عارب کے اس طرح ہنگامہ کرنے کے بعد میں آریان کو اپنے پورشن میں لے آیا ہوں۔ تم پریشان نہیں ہونا۔ آریان کے مسئلے میں تم اکیلے نہیں ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں، اس بچی کی عزت اور زندگی بچانے کے لیے جو بھی مجھ سے بن پڑے گا میں کروں گا۔" بابر شاہ نے فواد کو اپنے ساتھ کا یقین دلایا تو وہ جیسے خود کو ہلکا پھلکا تصور کرنے لگے۔

"ابھی تو میں تمہیں لینے آیا تھا کہ میرے ساتھ ایس پی کے آفس چلو، پولیس کو پہلی فرصت میں اعتماد میں لینا ہمارے لیے زیادہ سود مند ثابت ہو گا۔ پہلے ان بدمعاشوں کا تو معاملہ نبٹالیں۔ جو آئے روز پریشان کررہے ہیں۔ ستارہ بیگم کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔" بابر شاہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مجھے جانے دو، میں نے جانا ہے، چھوڑو مجھے، میں آؤں گا، میں جاؤں گا، مجھے لے چلو، میں جاؤں گا۔" آفس کے ساتھ والے کمرے سے اچانک بہت اونچی آواز بلند ہوئی۔

"کون ہے؟"

"کافی دن پہلے روڈ پر میں نے پہلی بار اسے انتہائی زخمی حالات میں دیکھا تھا۔ بچے اس کو پتھر مار رہے تھے۔ پتا نہیں میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی سی کیوں آئی۔ میں نہیں جانتا۔ بس یہ سوچ ذہن میں ابھری کہ مجھے اس شخص کو بچانا چاہیے، بس اس وقت سے یہ میرے کلینک پر ہے۔"

"کیا اس کی بیماری آخری اسٹیج پر ہے۔" بابر شاہ نے پوچھا۔

"نہیں ابو! اس کے ٹھیک ہونے کے اسی پرسنٹ چانس ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کو توجہ اور ٹریٹمنٹ ملے تو یہ جلد ہی ٹھیک ہو سکتا ہے۔" فواد نے کہا۔

"اور یہ جو کچھ بول رہا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ کہاں جانا چاہتا ہے، کسی جگہ کا نام بھی لیتا ہے۔"

"نہیں انکل! کسی جگہ کا تو نام نہیں لیتا۔۔۔ لیکن لگتا ہے کہ بے چارہ بڑی بری چوٹ کھائے بیٹھا ہے۔ لیکن کسی کو ٹھے والی کے عشق اور فرقت میں اس کا یہ حال نہ ہو گیا ہو۔" کاشف اپنی عادات کے مطابق اوٹ پٹانگ ہانکے جارہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ بابر شاہ پر اس کے ان جملوں نے کیا اثر کیا تھا۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر کاشف کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو متغیر ہوا تھا۔ جو فواد کی نظروں سے بھی چھپا نہ رہ سکا۔

"کاشف یار! کسی وقت بولنے سے پہلے سوچ بھی لیا کرو۔" پھر وہ بابر شاہ سے مخاطب ہوئے۔

"نہیں ابو! ایسی کوئی بات نہیں، بس کسی وقت دورے کی حالت میں اس کی سوئی اڑ جاتی ہے۔ عموماً خاموش ہی رہتا ہے، بس دورے کی حالت میں ہی اسے بولنے لگتا ہے اور یہ ہی جملے دہراتا ہے۔ پتا نہیں اس کے پیچھے وہ کیا کہانی ہے۔" فواد جیسے باتوں میں بابر شاہ کا دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ بابر شاہ بالکل خاموش تھے۔ جیسے وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ پھر وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا۔۔۔ میں۔۔۔ چلتا ہوں۔ میں خود ہی مل لوں گا، ایس پی سے۔" عجیب سے الجھن آمیز انداز میں کہہ کر وہ باہر جانے کو پلٹے۔ ساتھ والے کمرے سے متواتر آوازیں آرہی تھیں۔ ان کے قدم غیر ارادی طور پر اس طرف اٹھ گئے۔ حالانکہ ان کا ادھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"انکل! ادھر مت جائیے گا۔ اس وقت وہ دورے کی کیفیت میں ہے۔" کاشف نے انہیں اس طرف جاتے دیکھ کر پیچھے سے کہا۔ لیکن انہوں نے جیسے سنا ہی نہ تھا۔

"ابو۔۔۔ نہ جائیں ادھر۔ وہ آپ کو کہیں زخمی نہ کردے۔" فواد نے بھی روکا، لیکن انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کرادیا۔ اور خود دھیمے قدموں سے چلتے اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ انہوں نے کمرے کے اندر جھانکا۔ فرش پر ادھر ادھر برتن، بستر کی چادر اور جانے کیا کیا الابلا بکھرا پڑا تھا اور وہ بیڈ پر ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ پیروں میں زنجیریں تھیں، اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹوں پر یہ ہی الفاظ تھے۔

"مجھے جانا ہے، میں آؤں گا، میں جاؤں گا، چھوڑو مجھے جانے دو، مجھے لے چلو۔" بابر شاہ کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ بہت عام سے انداز میں اس کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک ان کے ذہن میں کچھ الجھن سی پیدا ہوئی۔ یوں ہی دیکھتے دیکھتے الجھن آمیز لکیریں ان کی پیشانی پر نمودار ہو گئیں۔ انہوں نے پرسوچ انداز میں آنکھیں سکوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

کون سی چیز دماغ کو چیخ کررہی تھی، وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اضطراری انداز میں ہونٹ کاٹتے وہ دوبارہ پلٹ آئے۔ فواد کو اپنے ابو کا یہ انداز بہت غیر معمولی اور عجیب لگا تھا۔ وہ بے خیالی میں چلتے ہوئے ان کے قریب آگئے۔ ان کی نظریں تو فواد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ لیکن فواد یقین سے کہہ سکتے تھے کہ بابر شاہ کی نظریں جمائے رکھنے کے باوجود انہیں نہیں دیکھ رہے تھے، ان کی باطنی آنکھیں کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔

"مہدی! تم اس کا بہت خیال رکھنا، اسے کہیں جانے مت دینا۔" بابر شاہ کے منہ سے نکلنے والے جملے غیر متوقع تھے۔ فواد کے ذہن میں کئی سوچوں نے بیک وقت سر ابھارا۔

"کیا ہے اس شخص میں کہ پہلے میں نادانستگی میں اس کے سحر میں گرفتار ہوا اور اب ابو بھی۔" وہ الجھن آمیز انداز میں اپنے ابو کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں کوئی تاثر نہیں تھا۔ بابر شاہ بات ختم کرکے دوبارہ واپسی کے لیے پلٹے، اور بہت آہستہ روی سے قدم اٹھاتے آفس سے نکل گئے۔

کاشف ان کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس سارے دورانیے میں وہ کبھی بابر شاہ کو اور کبھی فواد کو دیکھتا رہا، ان کے اثرات نوٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا۔ بابر شاہ کے جانے کے بعد وہ بھی کندھے اچکاتا وارڈ کی طرف چلا گیا۔ فواد اپنے ابو کے بارے میں سوچنے لگے۔

"کیا شناسائی ہو سکتی ہے ابو کی اس شخص سے، کیا زندگی میں پہلے کبھی یہ ملے ہیں۔" اور دوسری طرف بابر شاہ کی سوچ بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی، وہ شخص انہیں کچھ شناسا لگا تھا۔ انہیں یاد نہیں آرہا تھا کہ انہوں نے پہلے اسے کہاں دیکھا، پتا نہیں دیکھا بھی تھا یا نہیں کہ بعض چہرے یوں ہی شناسا اور مانوس سے لگتے ہیں، لیکن یہ بات تو طے تھی کہ اس شخص کو دیکھ کر بابر شاہ کے الجھے ہوئے ذہن کو ایک اور نئی الجھن مل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سر جی! وہ بابا جاگ گیا ہے۔ ناشتا بھی آرام سے کرلیا ہے اس نے۔" نرس سلمیٰ نے اندر آکر بتایا تو فواد، کاشف کو ہمراہ لے کر اس کے کمرے میں چلے گئے۔ واقعی وہ بہت خاموش اور تہذیب یافتہ انسان نظر آرہا تھا۔ کسی قسم کی حرکت کیے بغیر وہ خاموشی سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں جاؤں گا، میں نے جانا ہے۔" وہ سرگوشی والے انداز میں بولا۔

"یار فواد! یہ تمہیں دیکھتے ہی کہاں جانے کی ضد شروع کردیتا ہے۔" کاشف بولا۔

"ٹھیک ہے بابا آپ کو لے چلوں گا۔ لیکن ایک شرط پر آپ شور نہیں کریں گے۔" فواد نے کہا۔

"شور نہیں کروں گا۔" وہ فواد کو اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے گھورتا ہوا اپنے مخصوص سپاٹ انداز میں بولا۔

"ہاں۔۔۔ اگر آپ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کریں تو آپ کو لے چلوں گا۔"

"نہیں کرتا۔۔۔ لے چلو گے۔" وہ جھٹکے سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک در آئی۔

"ہاں بالکل۔۔۔ لے چلوں گا۔"

"لے چلو گے۔"

"ہاں بابا لے چلوں گا' اب اٹھیں۔" فواد نے آگے بڑھ کر اس کے پیروں کو زنجیر سے آزاد کرایا۔ زنجیروں کے نشان اس کے پیروں پر اس بری طرح بنے ہوئے تھے جیسے وہ اس کے پیروں میں ہی کھپ گئی تھیں۔

"چلو۔۔۔" اس نے خوشی سے کہا۔ پتا نہیں کیوں فواد کو اس کا اس طرح مسکرانا بہت اچھا لگا۔ بابر چچا ان ہی کے انتظار میں آفس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں آتے دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کلینک سے باہر آکر فواد نے اس کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور کاشف کو اس کے ہمراہ بیٹھنے کو کہا۔ بابر شاہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئے اور فواد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی کلینک سے نکال کر مین روڈ پر ڈال دی۔

"ابو! وہ دونوں تو گرفتار ہو گئے' جن کی وجہ سے پچھلے دنوں کافی ٹینشن رہی' لیکن مکمل طور پر اطمینان والی بات نہیں ہے ابھی۔۔۔ آریان کے اصل دعوے داروں کے علم میں جیسے ہی یہ بات آئے گی وہ وسیع پیمانے پر اس کی بازیابی کی کوشش کریں گے۔" فواد نے کہا۔

"ہاں! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ مسئلہ فی الوقت ٹل ضرور گیا ہے' لیکن حل نہیں ہوا۔ اسی سلسلے میں آج ایس پی سے ملنا ہے مجھے۔ آریان کا بیان بھی ہو جائے گا اور اس کی زبانی ستارہ بیگم کے بارے میں معلومات بھی مل جائے گی۔ ایس پی کامران کا چچازاد بھائی لاہور میں ایس پی کے عہدے پر تعینات ہے۔ یقیناً" اس وجہ سے بھی وہ ہماری فیور کرے گا۔ مجھے سو فیصد امید ہے کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔" بابر چچا پرخیال انداز میں بولے۔

وہ دونوں آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اور کاشف خاموش بیٹھا گاڑی کے شیشے سے باہر جھانک رہا تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا شخص خلاف توقع رویے کا اظہار کر رہا تھا۔ لیکن شیشے میں سے باہر بھاگتی ہوئی گاڑیوں اور لوگوں کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے ہنس رہا تھا۔ مارگلہ ہلز جانے والی سڑک پر ٹرن لیتے ہی وہ قدرے خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ وہاں پہنچ کر گاڑی روک کر فواد نے اس کی طرف والا دروازہ کھول دیا۔

"آئیں بابا۔۔۔ باہر آجائیں۔"

"باہر آؤں۔" وہ جھجکتے سے بولا۔

"جی ہاں۔۔۔" فواد نے کہا تو وہ گاڑی سے اتر آیا۔

"یار فواد! تم اس کو یوں نارمل لوگوں کی طرح آزاد مت چھوڑو۔ یہ کسی پل نظر بچا کر بھاگ بھی سکتا ہے۔" کاشف نے کہا۔

"نہیں بھاگے گا۔ تمہیں کس لیے کہا ہے کہ اس پر نظر رکھو۔ اتنی جان تو ہو گی کہ اسے بھاگتے دیکھ کر قابو کر سکو۔"

"تم نے کیا مجھے جھارا پہلوان سمجھ رکھا ہے۔ پتا بھی ہے کہ دورے کی حالت میں بیس آدمیوں جتنی طاقت آجاتی ہے اس میں۔ میں ننھی سی جان اکیلا! کہاں اسے قابو میں کر سکوں گا۔" کاشف کا کہنا بھی درست ہی تھا۔ اس کا تجربہ چند دن پہلے انہیں ہو چکا تھا۔ وہ باری باری ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

"نہیں جاؤں گا' مجھے جانا ہے' چلو۔۔۔ چلو۔"

"لو! اب موصوف اور کہیں جانے کو پر تول رہے ہیں۔ تمہاری اس فیاضی کا بھی موصوف کے دماغ پر کوئی اثر نہ ہوا۔"

"فیاض۔۔۔" ایک لفظ' کچھ جانا پہچانا سا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شدید غصے سے اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ کسی شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔

"فیاض۔۔۔ فیاض۔" اس نے کاشف کو گریبان سے پکڑ لیا اور تقریباً" جھنجوڑتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ فیاض۔۔۔ فیاض۔" وہ بری طرح کاشف سے چمٹا ہوا تھا۔ کاشف بے چارہ تو اس افتاد پر بوکھلا کر رہ گیا۔ جبکہ فواد اور بابر شاہ بھی حیران پریشان سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید ماضی کے خانے میں یاد کا کوئی روزن کھلا تھا۔ کوئی کرن سی

تھی۔ لیکن وہ صرف فواد کے لیے تھی۔ خود اس کے دماغ کو تشنج کے جھٹکے سے لگنے لگے تھے۔

"فیاض۔۔۔ لے چلو' فیاض' چھوڑو' جانا ہے۔" اس پر آہستہ آہستہ دورے کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ بابر شاہ بہت غور سے اس کو دیکھ رہے تھے۔ فواد اور کاشف دونوں ہی اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کے حلق سے چیخیں بلند ہونے لگیں۔ آنکھیں حلقوں سے ابل کر باہر آگئی تھیں اور پتلیاں پھیل چکی تھیں۔ چہرے اور گردن کی رگیں ابھر آئیں' اس کے عضلات عجیب سے تناؤ اور کھنچاؤ کا شکار ہو گئے۔ ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ وہ پھر بے سدھ ہو کر ان دونوں کے بازوؤں میں ہی ڈھلک گیا۔

وہاں رکنا اب بے کار ہی تھا۔ جس کے لیے وہ یہاں آئے تھے وہ تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ بمشکل تمام اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر وہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فواد نے پہلے بابر شاہ کو گھر پر ڈراپ کیا اور خود کاشف کے ہمراہ کلینک آگئے۔ ایمرجنسی وارڈ میں اسے خصوصی ٹریٹمنٹ دی جانے لگی۔

تھکے ہوئے پیروں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اس کے وجود کا بوجھ سہار سکتے۔ وہ تقریباً" خود کو گھسیٹتے ہوئے کمرے تک لائی تھی۔ آراستہ و پیراستہ کمرہ' نادر و نایاب قیمتی چیزوں سے سجا اس کا یہ کمرہ' اگر کسی کو کہتی کہ اس کمرے میں اس کا دم گھٹتا ہے تو وہ اس کا مذاق اڑاتا۔ اگر وہ کہتی کہ اس کمرے میں رہنے سے بہتر تو وہ یہ سمجھتی ہے کہ چھوٹی سی جھونپڑی میں رہ لے تو سننے والا اسے بے وقوف گردانتا' لیکن حقیقت یہ ہی تھی اسے یہ آسائش نہیں چاہیے تھی۔ یہ مخملیں قالین' نرم گرم بستر' اطلس و کمخواب کے ملبوسات' ان میں سے کوئی چیز اس کے لیے کشش نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے کہ اس سب کے عوض اس کی روح اس کا وجود رہن تھا۔ اس کی ذات گروی تھی۔ اور جب آزادی کا احساس ختم ہو جائے تو پنجرہ سونے کا ہو چاہے تیلیوں کا' پرندے کے لیے زندگی سے عدم دلچسپی کے لیے یہ ہی بات کافی ہے کہ وہ آزاد نہیں۔

قید ہے اور قید بھی ایسی کہ اسی پنجرے کے در و دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر ایک نہ ایک دن اسے مر جانا ہے' لیکن آزادی کا سانس اسے اب نصیب نہیں ہونا۔ اس کے ساتھ بھی تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ آزادی۔۔۔

اور آزادی کی لطافتیں سب ہی کچھ ایک سہانا خواب تھیں۔ اسے لگتا تھا جنم جنم سے وہ اس پنجرے میں قید ہے۔ بھاری بھرکم لباس سے نجات پا کر اس نے بالکل سادہ سے کپڑے زیب تن کیے۔ زیورات کے نام پر جو بوجھ اٹھا رکھا تھا اس سے چھٹکارہ پایا' چہرے پر مصنوعی حسن کے نشانات مٹائے۔

"کتنی تہوں کے نیچے دب گئی ہے میری اصل شخصیت۔ اب تو آئینے میں خود کو دیکھ کر پہچان بھی نہیں پاتی کہ یہ میں ہوں یا کوئی اور ہے۔" دروازے پر کھٹکا ہوا اور اگلے ہی لمحے غلام عباس حسب معمول ہاتھ میں چائے کا کپ لیے کھڑا تھا۔ یہ شخص اسے ہمیشہ حیران کر دیتا تھا۔ اس کے پل پل کی خبر رکھتا تھا۔

"آجاؤ غلام عباس! وہاں کیوں کھڑے ہو۔" وہ آگے آگیا' ہاتھ میں پکڑا ہوا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر واپسی کے لیے پلٹا تو چاندنی نے اسے روک لیا۔

"غلام عباس! کچھ دیر بیٹھو گے نہیں۔"

"بی بی۔۔۔ روندے ہوئے پھول اکٹھا کرنے میں بہت دیر ہو جاتی ہے' بائی جی اندھیرا کر دیں گی۔ ساری روشنیاں بجھا دیں گی تو میرے لیے بہت دشوار ہو جائے گا۔" وہ سادگی سے بولا۔

"تم کیا اندھیروں سے ڈرتے ہو غلام عباس۔"

"نہیں بی بی! اندھیروں سے کیا ڈرنا۔۔۔ غلام عباس ان اندھیروں میں ہی تو پل کر جوان ہوا ہے۔ روشنیاں چبھتی ہیں آنکھوں کو' لیکن میں ان پھولوں پر ان بکھری ہوئی پتیوں پر کسی اور کے پاؤں برداشت نہیں کر سکتا جو آپ پر نچھاور کی جاتی ہیں۔"

"غلام عباس! یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس پرخار راستے پر تم چل رہے ہو' وہ کسی منزل کی طرف نہیں

جاتا۔ تم سفر جاری رکھے ہوئے ہو بھلا اس سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟"

"بی بی! حاصل اور لاحاصل کی بحث میں پڑتا ہی کون ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ سفر میں رہنے ہی میں اطمینان قلب ہے۔ اور پھر ہر مسافر کو منزل کہاں ملتی ہے۔ کچھ تو مسافت کی دھول میں ہی گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سو میں نے منزل پانے کی ہوس اپنے دل میں پیدا ہی نہیں ہونے دی۔ مسافت کو چن لیا۔"

"یہ بہت مشکل نہیں، اکیلے زندگی بھر کی مسافت۔" چاندنی، غلام عباس کی باتوں پر غور کرتے ہوئے بولی۔

"اکیلا کب ہوں میں، آپ بھی تو ساتھ ہیں، راستے الگ ہیں تو کیا ہوا۔ ہم سفر نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ آپ بھی مسافر؟ میں بھی مسافر؟؟ میری کوئی منزل، نہ آپ کی کوئی منزل اور جب ہم دونوں ہی مسافت میں ہیں تو پھر میں اکیلا ہوں، نہ آپ تنہا ہیں۔"

"غلام عباس! کبھی کبھی تم مجھے حیران کر دیتے ہو۔ اس ماحول، اس جگہ کے باسی نہیں لگتے۔ مجھے کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے تمہاری کوئی اور دنیا ہے، تم کہیں اور سے آئے ہو، اس ماحول سے یکسر نامانوس اور اجنبی، تمہاری باتیں، تمہاری سوچیں اتنی الگ کیوں ہیں۔"

"پتا نہیں بی بی! نہیں جانتا، پر میں الگ کہاں ہوں، ایک طوائف کی کوکھ سے جنم لیا ہے میں نے، آج تک طوائفوں کی کمائی ہوئی روٹی کھائی ہے، میں ان ہی میں سے ہوں۔ میرا اصل یہ ہی ہے۔" اس کے کرب انگیز لہجے میں سچائی سمٹی ہوئی تھی۔

"غلام عباس! تم یہاں رہتے ضرور ہو، لیکن تمہارا من، تمہاری روح یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ تمہارے پیروں میں تو بیڑیاں نہیں ہیں، تم تو مرد ہو، آزاد، خود مختار اپنی مرضی کے مالک، تم تو اس عقوبت خانے سے نکل سکتے ہو، پھر کیوں نہیں چلے جاتے۔"

"کہاں جاؤں۔۔۔ میرے پیروں میں بیڑیاں نہیں۔ ــــــــــ لیکن بی بی! ایک ان دیکھی قید میں ہوں میں۔ میں آزاد کہاں ہوں، پر کاٹ کر پرندے کو کھلی فضا میں چھوڑ کر یہ سمجھ لینا کہ وہ آزاد ہے محض خود فریبی ہے اور کچھ نہیں اور میں ایسا ہی ایک پنچھی ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"بی بی! اس چار دیواری سے باہر کی دنیا بہت ظالم ہے۔ گدھوں کی طرح اپنوں کا گوشت نوچ نوچ کر کھانے والی۔ یہاں سب اپنی مرضی سے بکتے ہیں، لیکن باہر کی دنیا میں نہ خریدار ہے، نہ دکان دار، وہاں تو لوٹ مار ہوتی ہے اور بس۔۔۔ آپ کا یہ غلام عباس لٹ نہیں سکتا۔ اس کے کاسۂ دل میں بس چند سکے ہیں اور یہ ریزگاری اسے اپنی جان سے بھی پیاری ہے۔ میں نے یہیں پڑے رہنا ہے بی بی! عبادت کا پہلا اصول یہ ہی ہے کہ ایک بار جس در پر ماتھا ٹیک دیا، پھر مر جانا ہے وہ در نہیں چھوڑنا۔"

"غلام عباس تم کیا کہہ رہے ہو میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" چاندنی کو واقعی اس کی باتیں سمجھ نہیں آرہی تھیں۔

"سمجھ جائیں گی بی بی! آپ بھی سمجھ جائیں گی، جس استاد سے میں نے سبق لیا ہے، کبھی تو اس کی نظر کرم آپ پر بھی ہوگی۔ سب مفہوم واضح ہو جائیں گے۔ ہر بات سمجھ آنے لگے گی۔ پھر آپ غلام عباس کا ان کہا بھی سمجھنے لگیں گی اور مجھے اسی دن کا انتظار ہے، اس انتظار کی مسافت کے عوض جتنے کانٹے میرے پیروں میں چبھیں گے میرے اندر اور صبر آتا جائے گا۔ وہ کانٹے پھول سمجھ کر میں دامن میں بھرتا رہوں گا۔" غلام عباس بات مکمل کر کے کمرے سے نکل گیا اور چاندنی حیرت کے عالم میں دروازے کے سامنے لگے پردے کو ہلتا دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات اپنی تمام تر سیاہی کے ساتھ رخصت ہو گئی تھی، ایک پل کے لیے بھی بابر شاہ کی آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئی تھیں۔ بہت سارے مسائل کسی عفریت کی طرح منہ پھاڑے ان کے سامنے کھڑے تھے۔

فواد کے کلینک میں جس شخص کو انہوں نے آج دیکھا تھا۔ اس نے انہیں ایک نئی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ بار بار ذہن سے جھٹکنے کے باوجود اس کا چہرہ ان کی نگاہوں کے سامنے آجاتا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ بار بار تخیل کے پردے پر وہ چہرہ انہیں کیوں دکھائی دے رہا ہے۔ اس سے پہلے انہوں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ انہیں یاد نہیں آرہا تھا۔ لیکن اس چہرے کے شکست خوردہ نقوش انہیں شناسا سے لگ رہے تھے۔ کوئی سوچ ان کے ذہن میں سوئی کی طرح چبھ رہی تھی۔

اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھے وہ کسی سوچ میں گم تھے۔ اسی وقت زاہدہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ بابر شاہ کے چہرے پر ثبت پریشانی انہوں نے آتے ہی محسوس کر لی تھی۔

انہوں نے ناشتے کی ٹرے ان کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی۔ بابر شاہ کی نیند سے عاری سرخ ہوتی ہوئی آنکھیں زاہدہ بیگم کی طرف اٹھیں، تردد اور پریشانی نے جیسے انہیں ایک ہی رات میں بیمار کر کے رکھ دیا تھا۔

"زاہدہ۔ ناشتا نہیں کرنا فی الحال اسٹرونگ سی چائے کا ایک کپ چاہیے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو۔"

"تکلیف کی کیا بات ہے، ابھی بنائے دیتی ہوں۔" انہوں نے کہا اور ٹرے اٹھانے لگیں تو وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ کدھر جا رہے ہیں؟" ان کی کیفیت کو سمجھنے کے باوجود زاہدہ چچی نے کسی قسم کا استفسار مناسب نہیں سمجھا۔

"لان میں جا کر بیٹھتا ہوں۔۔۔ پتا نہیں کیا بات ہے، کمرے کی فضا میں دم گھٹ رہا ہے۔" وہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

صبح صبح لان میں بالکل خاموشی تھی۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی، وہ لان چیئر پر بیٹھ گئے۔ ذہن کے تمام گوشے حالات کی الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ پریشانی اور تفکر کی عمیق لکیروں کا جال سا پیشانی پر پھیلا ہوا تھا۔ اسی پل آریان اور روبیہ اسکول کے لیے جاتی دکھائی دیں۔ اسکول میں جاب کر لی تھی، آریان نے روبیہ کے ساتھ ہی۔

بابر شاہ کی نگاہیں آریان کے سراپے پر تھیں۔ پتا نہیں کیا بات تھی بابر شاہ کو اس بچی سے عجیب سی انسیت ہو گئی تھی۔ اس کا رکھ رکھاؤ، سلیقہ، حسن صورت، حسن سیرت، کوئی بھی تو ایسا پہلو نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ طوائف زادی نظر آتی۔ اس کی روشن پیشانی، حیا سے جھکی پلکیں، معصوم پاکیزہ چہرہ اور بھولپن اس کے خاندانی ہونے کی دلیل تھا انہوں نے اسے اپنی بیٹی کہا تھا۔ اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے مستقبل کی ذمہ داری بھی انہوں نے ہی اٹھالی تھی۔ انہوں نے ایک باپ بن کر اسے رخصت کرنا تھا اور ایک بیٹی کی طرح اس کے سارے چاؤ پورے کرنے تھے۔ لیکن کیا کوئی اتنا اعلا ظرف ہوگا کہ اس بچی کو اس کے داغ دار ماضی سمیت قبول کرے۔

جب سے وہ اسے اپنے پورشن میں لے کر آئے تھے اس کی ذات کے جوہر تو اب ان کے سامنے کھلے تھے۔ اس کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ اور صحرا کے مندر میں بجنے والی گھنٹیوں جیسی آواز انہیں بہت بری طرح کسی کی یاد دلا گئی تھی۔ اس کا مضبوط کردار، ٹھہراؤ اور اس کی شخصیت کا سلجھاؤ۔۔۔ ہر چیز ہی انہیں اچھی لگی تھی۔ انہوں نے اب تک آریان میں کوئی برائی نہیں دیکھی تھی جو قابل گرفت و قابل مذمت ہوتی۔

آریان کے لیے شریک زندگی چنتے وقت انہیں ازحد خیال رکھنا ہوگا کہ اب تک کی محرومیوں بھری زندگی کے بعد آئندہ کوئی محرومی اس کے حصے میں نہ آئے۔ ان کے ذہن میں فواد شاہ کا بھرپور سراپا در آیا۔ ان کی لو دیتی آنکھوں کی ہلکی سی چمک بابر شاہ نے دیکھی تھی۔ لیکن ابھی وہ پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتے

تھے۔ ہاں البتہ آریان کو اگر اس نگاہ سے دیکھا جاتا تو وہ ہر لحاظ سے ان کے معیار پر پوری اترتی تھی۔

"بیٹی تو میں اسے کہہ ہی چکا ہوں تو پھر مستقل بیٹی بنانے میں کیا حرج ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس کی ماں کو یہاں موجود ہونا چاہیے۔ اس کو عذاب سے نکالنا ضروری ہے۔" ایس پی صاحب سے ملاقات کے بعد بابر شاہ کافی پریشان تھے کیونکہ جن ستر سو جھنجھٹوں کا ذکر ایس پی نے ان کے سامنے کیا تھا انہیں حل کرنا قدرے مشکل تھا۔

"کن سوچوں میں گم ہیں، چائے لیں۔" زاہدہ بیگم چائے کا کپ لیے قریب ہی کھڑی تھیں۔ سوچوں کے گرداب میں پھنس کر وہ اردگرد سے بالکل ہی بے خبر ہوگئے تھے۔ انہوں نے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن وہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ آریان اور رومیہ جنہیں ابھی اسکول گئے پانچ چھ منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے۔ وہ دونوں انتہائی گھبرائی ہوئی حالت میں گیٹ سے داخل ہوئی تھیں۔ زاہدہ بیگم اور بابر شاہ دونوں ہی ان کی حالت دیکھ کر چونک گئے تھے۔ آریان کا تو گھبراہٹ کے مارے اس قدر برا حال تھا کہ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ حلق خشک اور آنکھیں بالکل بنجر سی لگ رہی تھیں۔ چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پھٹک ہو رہا تھا۔ جبکہ رومیہ قدرے حواسوں میں تھی۔ زاہدہ بیگم نے آریان کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر بٹھایا۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا... اور اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔" انہوں نے پوچھا۔

"وہ... وہ... وہ باہر..." آریان کی زبان اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ بہادر ہونے... اور بہادر بننے میں کس قدر فرق ہوتا ہے آریان کو آج اچھی طرح سمجھ آرہا تھا۔

"وہ... وہ باہر پان والی دکان پر... دونوں... دونوں بیٹھے ہوئے ہیں۔" آریان کوشش کے باوجود اپنی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ پر قابو نہیں پا رہی تھی۔ بابر شاہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بابر شاہ نے لاؤنج میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور کچھ نمبر پریس کیے۔

"ہیلو... ایس پی کامران صاحب سے بات کرائیں۔" دوسری جانب سے ریسیور اٹھائے جانے پر انہوں نے کہا۔ کچھ لمحے یوں ہی سرک گئے۔ غالباً ایس پی کا ریڈر انفارم کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ریسیور میں آواز ابھری۔

"ہیلو..." ایس پی آن لائن تھے۔

"ایس پی صاحب میں بابر شاہ بات کر رہا ہوں۔" بابر شاہ نے اپنا تعارف کرایا۔

"جی جناب! کیا حال چال ہیں آپ کے؟" ایس پی خوش گوار لہجے میں بولے۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک... کل جس سلسلے میں آپ سے ملا تھا اس کے بارے میں کچھ تفصیل مزید ہے۔"

"جی فرمائیں میں سن رہا ہوں۔"

"جن بدمعاشوں کا میں نے آپ سے تذکرہ کیا تھا۔ وہ اس وقت ہماری گلی کی ہی ایک دکان پر موجود ہیں۔" بابر شاہ نے اطلاع بہم پہنچائی۔

"ذرا حلیے تو بتا دیں ان کے۔" ایس پی نے پوچھا تو بابر شاہ نے رومیہ کے بتائے ہوئے حلیے ان کے گوش گزار کردیے۔

"آپ فکر مت کریں۔ میں ابھی تھانے فون کرواتا ہوں۔" ایس پی نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔" بابر شاہ نے ایک، دو باتیں کرنے کے بعد فون بند کردیا۔

"چاچو! کیا کہہ رہے تھے ایس پی صاحب۔" رومیہ ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ان سے مخاطب تھی۔

"اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایس پی صاحب خود اس معاملے کو سیریسلی لے رہے ہیں۔ ان شاء اللہ بہت جلد مسئلہ حل ہوجائے گا۔" وہ واپس لان میں آگئے۔

"ویسے آریان بیٹا۔ اب اگر آپ مناسب سمجھیں تو ذرا تفصیل سے اپنے بارے میں آگاہ کریں۔ اپنے والد اور والدہ کے بارے میں تاکہ اس وقت آپ جن لوگوں کے چنگل میں ہیں۔ ان لوگوں پر پکا ہاتھ ڈالا جاسکے۔" بابر شاہ آریان سے بہت نرم لہجے میں بولے۔

"انکل میرا ماضی کیا تھا، میں بتا چکی ہوں۔ ایک طوائف نے مجھے جنم دیا... باپ کون ہے، مجھے نہیں معلوم، ماں کے پاس ایک شکستہ سا کاغذ ہے، جس پر ایجاب قبول کی ایک رسمی سی کارروائی کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس شخص کا نام میرے سارے سرٹیفکٹس پر درج ہے۔ لیکن وہ کیسا ہے میں نہیں جانتی۔ میں نے آج تک اسے دیکھا نہیں۔" آریان کے لہجے میں درد کروٹیں لینے لگا۔

"ہوں... ننانوے فیصد لوگوں کی طرح گناہ کر کے منہ چھپانے والوں میں سے۔"

"نہیں انکل... اس شخص نے باقاعدہ نکاح کیا تھا امی سے... لیکن پھر جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ انہیں یوں بے یارو مددگار چھوڑ کر چلا گیا اور اس کے بعد آج تک پلٹ کر نہ دیکھا، شاید دنیا سے گزر گیا۔"

"آریان! ستارہ بیگم کے ہاتھ کیسے لگیں تم۔" رومیہ نے سوال کیا۔

"یہ میری بدقسمتی ہے۔ میں اور کیا کہوں اس بارے میں، ماں سے محبت کرنا مہنگا پڑا مجھے۔ امی کے منع کرنے کے باوجود میں ہاسٹل سے لاہور ان کی جائے رہائش پر پہنچ گئی تھی۔ سات سال سے اٹھارہ سال کی عمر تک بورڈنگ میں رہنے والے بچے کو ایک گھر کے تصور سے کس قدر طمانیت اور خوشی محسوس ہوسکتی ہے۔ شاید کوئی نہ سمجھ سکے۔ بارہ سال ماں سے الگ رہی تھی میں اور بس... ستارہ بیگم نے بس ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ لیکن اس ایک نگاہ کے بعد میں آزادی کو ترس گئی۔" آریان پرت پرت اپنی ذات کے راز کھول رہی تھی۔

"یہ ستارہ بیگم کس قسم کی ذہنیت رکھتی ہے۔" بابر شاہ نے پوچھا۔

"ویسی ہی ذہنیت رکھتی ہے جیسی ہر کامیاب دھندا کرنے والی نائکہ کی ہوسکتی ہے۔ اسے بس پیسے کی زبان سمجھ آتی ہے اور پیسے ہی کی بولی بولتی ہے وہ۔" آریان کے لہجے میں نفرت امڈ آئی۔

"آریان... تم اور تمہاری امی دونوں ہی بے قصور ہیں، ناکردہ گناہوں کی سزا کا بھگتان تم کیوں بھگتو۔ ہم ستارہ بیگم کے مطالبات پورے کریں گے۔ تمہاری تو جان چھوٹ ہی جائے گی۔ لیکن ہماری کوشش یہ ہے کہ تمہاری امی کو بھی ظلم کے چنگل سے چھڑایا جائے۔" بابر شاہ مضبوط لہجے میں بولے۔ اظہر چچا کسی کام سے باہر نکلے تو ان سب کو وہاں بیٹھا دیکھ کر وہ بھی وہیں آگئے۔

آریان، اظہر چچا اور بابر چچا کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ کسی قدر سکون کے لمحے میسر آئے تھے اسے ایک طویل عرصے کے بعد۔ زاہدہ چچی اور رومیہ بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اسی وقت صابرہ موبائل ہاتھ میں لیے ان کے قریب چلی آئی۔ کال بابر

شاہ کے لیے تھے۔ انہوں نے موبائل کان سے لگالیا۔ ہیلو کے بعد وہ کچھ نہ بولے دوسری طرف کی بات سنتے رہے اور آخر میں شکریہ کہہ کر موبائل آف کردیا۔

"آریان! تمہاری ایک پریشانی تو ختم ہوگئی۔" بابر چچا نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب انکل؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اب گھبرانے کی ضرورت نہیں، وہ دونوں پولیس کی حراست میں ہیں۔" بابر چچا نے کہا۔

"فون کس کا تھا بھائی؟" اظہر چچا نے پوچھا۔

"ایس پی کا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے انہیں فون کرکے اطلاع دی تھی کہ وہ دونوں غنڈے جو آریان کو تنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے فواد کے کلینک میں بھی کافی توڑ پھوڑ کی تھی۔ ہماری گلی میں ہی ایک دکان پر موجود ہیں۔ ایس پی صاحب کے فون پر تھانے کے عملے نے فوری ایکشن لیا اور انہیں گرفتار کرلیا گیا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا، خوامخواہ بچی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے منحوس مارے۔" زاہدہ چچی اپنی لینگوئج میں بولیں۔ آریان نے بھی سکون کا سانس لیا۔

"آریان بیٹا، تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" بابر شاہ نے کہا تو آریان سے پہلے اظہر چچا بول پڑے۔

"وہ کس سلسلے میں۔"

"ایس پی صاحب سے ملنے کے لیے۔ ان دونوں کے خلاف بیان دینا ہے آریان کو۔"

بابر چچا نے کہا، فواد تیار ہو کر باہر نکلے تو بابر چچا نے انہیں پکار لیا۔

"فہدی... ایک منٹ"

"جی ابو..." وہ ٹائی کی ناٹ سیٹ کرتے ہوئے ان کے قریب چلے آئے

"ایک منٹ تم ذرا بیٹھو۔ آریان بیٹا! تم ابھی اسکول جاؤ، میں تمہیں اسکول سے ہی پک کرلوں گا۔" وہ پہلے فواد سے اور پھر آریان سے بولے۔ فواد کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آریان اور رودیہ اسکول جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"پاپا میں ذرا آریان کو باہر لے جاؤں بس آدھے گھنٹے تک واپس آجائیں گے۔"

"ٹھیک ہے جاؤ۔" انہوں نے کہا۔ آریان ان کی اجازت پا کر کچھ جھجکتے ہوئے ان کے ساتھ ہولی۔ بابر چچا کی گہری نگاہوں نے ان دونوں کا موازنہ کیا اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"اگر یہ دونوں ہمیشہ کے لیے یونہی ساتھ ساتھ رہیں تو اس میں کوئی حرج تو نہیں۔" بیٹے کی پسندیدگی تو انہوں نے محسوس کرلی تھی۔ خود انہیں بھی آریان اس حیثیت سے اچھی لگی تھی اور انہیں یقین تھا کہ زاہدہ بیگم کو بھی اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

گاڑی گیٹ سے باہر نکال کر فواد نے اپنے بائیں جانب خاموش بیٹھی آریان کی طرف دیکھا۔

"آریان! کہاں چلیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"جہاں آپ کا دل چاہے۔" وہ یونہی سر جھکائے جھکائے بولی۔

"میرا خیال ہے کہ کسی خاص جگہ پر جانے کی بجائے لانگ ڈرائیو بہتر رہے گی۔" آریان نے کوئی جواب نہ دیا۔ گاڑی کے شیشے سے باہر کا منظر انتہائی خوب صورت لگ رہا تھا اسلام آباد کی صاف ستھری سڑکیں، آسمان پر چھائے ہوئے بادل، اچانک ونڈ اسکرین ننھے ننھے شبنم کے قطروں سے بھیگنے لگی۔

"فنٹاسٹک... دیکھو موسم کو بھی ہمارے ساتھ کتنی ہمدردی ہے۔" فواد کا انداز بالکل نیا تھا۔ یوں جیسے بہت عرصے بعد اندر کا حبس ختم ہو گیا تھا۔ باہر کی ٹھنڈی پھوار دھیرے دھیرے اندر کی ساری کثافت کو صاف کررہی تھی۔ جذبے نکھرنے لگے۔ یہ احساس کہ ان کے بے حد نزدیک بیٹھا یہ مہکتا وجود ان کی ساری محبتوں، ساری وفاؤں کا حق دار ہے... پیار کی نرمی سے اس کی روح کا ہر زخم انہوں نے ہی رفو کرنا ہے۔ خود بخود نشہ سا بن کر ان کی آنکھوں میں سما گیا۔

"آریان! ایک بات پوچھوں؟" انہوں نے بات شروع کی۔

"جی..." گھنیری پلکیں اٹھا کر اس نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"تم... تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو...؟"

"جب بھی دیکھتی ہوں دل کرتا ہے... آپ کی عزت کرنے میں جان لڑا دوں۔ کبھی کبھی ہوتا ہے نا آپ کسی کے بارے میں احترام اور عزت سے اتنا سوچتے ہیں، جتنا شاید اپنے بارے میں بھی وقت نہیں نکالنا چاہتے... مجھے آپ کے بارے میں عزت سے سوچنا یا عزت دینا اچھا لگتا ہے۔"

"کمال ہے فواد میاں! تم تو کچھ اور ہی سمجھے بیٹھے تھے۔" انہوں نے دھیمے سے لہجے میں خود سے کہتے ہوئے ہلکی سی چپت اپنے سر پر لگائی۔

"جی..." وہ حیران سی ہو کر بولی۔ ان کا کہا ہوا جملہ وہ سن نہیں پائی تھی۔

"آپ کے خیال میں آریان! آپ کے لیے جو کچھ میں اتنے عرصے سے کرتا آرہا ہوں اس کی کیا وجہ ہے؟" وہ تم سے آپ پر آگئے۔

"آپ نے جو کچھ بھی کیا میں اس کے لیے آپ کی شکر گزار ہوں۔ بلکہ یہ لفظ اس کیفیت سے بہت کم ہے جو میں دل میں آپ کے لیے محسوس کرتی ہوں۔" وہ ممنونیت سے بولی۔

"یعنی یہ سب کچھ جو میں نے کیا محض انسانی ہمدردی میں کیا... ایم آئی رائٹ۔"

"جی..." وہ سر جھکا کر بولی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ یہ عجیب و غریب باتیں کیوں کررہے ہیں۔

"کیا تم اپاہج ہو۔ کوئی کمی ہے تمہاری ذات میں کہ تم سے ہمدردی کی جائے۔ یہ سب میں نے ہمدردی میں نہیں کیا۔"

"پھر...؟" وہ سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"پھر کا مفہوم سمجھا تو دوں مگر تمہاری ناراضی کا ڈر ہے۔" وہ شریر سے لہجے میں بولے۔ آریان کو تو آج ان کی ایک ایک بات حیرت زدہ کیے دے رہی تھی۔ فواد نے اس کی طرف دیکھا۔

"حیران مت ہو..... کچھ لفظ کچھ باتیں قبل از وقت کہہ دی جائیں تو اپنی دلکشی کھو دیتی ہیں۔ سو پھر کا مفہوم پھر کبھی سہی، میرا خیال ہے واپس چلنا چاہیے۔" گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ آریان کو ان کی نگاہوں میں لکھے جذبے عجیب سی کیفیت کا شکار کر رہے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ ان کی آنکھوں میں دیکھنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ فواد بھی اس کی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ سو زیادہ ڈسٹرب کرنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا اور واپس ہو لیے۔

کبھی کبھی انسان کا دل چاہتا ہے کہ سفر ختم ہی نہ ہو۔ راستے طویل ہوتے چلے جائیں۔ لیکن یہ صرف اسی وقت ہوتا ہے جب ہمراہی دل کے قریب تر ہو..... دل ہم سفر کی رفاقت لمحوں کے بجائے صدیوں پر محیط ہو جانے کی دعائیں کرتا ہے۔ سو اس وقت فواد کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ لفظ کسی آبشار کی صورت ان کے دل سے پھوٹ رہے تھے۔ لیکن وہ انہیں ہونٹوں پر روک رہے تھے..... شاید اس لیے کہ ابھی محبت کی اوائل تھی جذبوں کی تشہیر اس وقت بھلی لگتی ہے جب وہ کندن ہو چکے ہوں۔ وقت سے پہلے کوئی بھی بات کر دینا اس کی اہمیت کو ختم کر دینے کے مترادف ہے۔

اور آریان ان کہے لفظوں کو سمجھ رہی تھی..... بھیگی بھیگی پلکوں میں جس کا عکس سمٹ رہا تھا پھیل رہا تھا۔ اس کے لہجے کی نزاکت کو وہ نہ سمجھتی تو پھر کون سمجھتا۔ وہ زندگی کیسی تھی۔ جب فواد شاہ کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو محبت کے مفہوم سے نا آشنا تھی۔ اس نے سوائے ماں کی محبت کے کسی اور محبت کا ذائقہ نہیں چکھا تھا۔ باپ کی، نہ بہن بھائیوں کی، جنگل کی اس الڑ ہوا نے راستے کا تعین کر لیا تھا۔ وہ حبس زدہ ماحول سے نکل کر خوشبو کی تلاش میں تھی جو اس کی روح کو شانت کر دے۔ وہ محبت کے لمس سے نا آشنا رہی تھی۔ مگر محبت آمیز جذبوں سے بے خبر ہرگز نہیں تھی، جس سے دل کے گلزار مہک اٹھتے ہیں۔ اس کا دل عجیب اتھاہ میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

"آریان....." فواد نے اسے بہت ہولے سے پکارا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"ایک نظم سنو گی۔"

"جی۔" آریان کے کہنے پر ایک لمحے کو فواد خاموش ہوئے۔ گاڑی اس وقت جس روڈ سے گزر رہی تھی۔ وہ کوئی مصروف روڈ نہیں تھا۔ انہوں نے گاڑی کی رفتار بہت دھیمی کر دی۔ ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بہت نرم اور گداز لہجے میں بولنے لگے۔

چلو تم کو بتاتے ہیں
کہ تم کو دیکھ کر دل نے
کہا تم رشتۂ جاں سے بھی بڑھ کر ہو
دعا کی سرحدوں پہ
جو ادھوری ہے، مری ایسی تمنا ہو
میرے دل کا مقدر ہو
کہ تم اک روشنی بن کر مسکانے کر
کبھی دستِ مسیحا کی طرح
اترے ہوئے، ہر زخمِ دل پہ ہو
چلو تم کو بتاتے ہیں
کہ تم ایماں ہمارا ہو
سرائے دہر میں، اندیشۂ زندگانی میں
تم ہی دل کا سہارا ہو
جو روح کے آسماں پہ جگمگیا ہے محبت سے
سہانی شام کی چاہتوں کا پہلا تارہ ہو
وفا کا استعارہ ہو
تمہارے قرب کی خوشبو سے پتھر کی طرح ہم نے
سلگتی دھوپ میں پھیلا دیا ہے
تمہارے پیار کے رنگین کنول ٹھنڈی ہوا سے
سرسراتے ہیں
ہم ساون میں بھیگے پیڑوں کو چھو لیں تو
تمہارے لمس کی خوشبو کے لمحے جگمگاتے ہیں
چلو تم کو بتاتے ہیں
کہ ہم نے زندگی کے سب درق لے کر
سبھی سطروں میں لکھا ہے تمنا تم کو پانے کی

زمانے بھر میں شاید کاتبِ تقدیر کے ہاتھوں
میرے دل نے لکھ لی ہے تمہاری چاہ کی خواہش
تمہاری آرزوؤں کا جو اک ادراک ہے، مجھ میں
کسی میں ہو نہیں سکتا
تمہاری مسکراہٹ کا جو اک ارمان ہے، مجھ میں
کسی میں ہو نہیں سکتا
چلو تم کو بتاتے ہیں

لفظوں میں بھی جان ہوتی ہے۔ یہ بھی دھڑکنوں کی طرح دھڑکتے ہیں۔ یہ بھی پھولوں کی طرح مہکتے ہیں اور بادلوں کی طرح برستے ہیں۔ آریان ان لفظوں کے ردھم میں پور پور بھیگ رہی تھی لیکن شاید ان دونوں کو ہی اپنی اپنی نسبت کا بھرم رکھنا آتا تھا۔ واپسی کا سفر ختم ہونے والا تھا۔ لیکن اس مختصر سے سفر کی رفاقت نے ان دونوں کے دلوں میں یقین بھر دیا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی ہیں۔

☼ ☼ ☼

آریان کا بیان قلمبند کروانے کے بعد بابر شاہ اسے لیے ایس پی کے آفس سے باہر نکلے۔

"میرا خیال ہے بیٹا! کم سے کم اب یہ دونوں تو ڈر گئے..... ستارہ بیگم کے ہاتھوں کی پہنچ یہاں تک نہیں ہو سکے گی۔ اس ٹینشن سے نجات کے بعد اب ہم پوری دلجمعی سے لاہور جا کر ستارہ بیگم سے ملاقات کر سکتے ہیں..... کیا خیال ہے تمہارا؟" گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھے۔

"جی انکل....." آریان نے مختصر جواب دیا۔

"شام ہونے والی ہے میرا خیال ہے فہدی کو بھی ساتھ لے چلیں۔" بابر چچا خود کلامی کے سے انداز میں بولتے ہوئے گاڑی چلا رہے تھے۔ فواد کا کلینک راستے میں پڑتا تھا۔ سو وہ اسی طرف چل پڑے۔ اصل مسئلہ تو کچھ اور تھا۔ اصل میں وہ اس مریض سے متعلق کافی الجھن میں تھے۔ سو غیر ارادی طور پر کلینک کی طرف رخ کر لیتے تھے۔ کلینک پہنچ کر وہ جس وقت آریان کے ہمراہ آفس میں پہنچے تو وہاں کا ماحول دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ کاشف فواد پر بری طرح ناراض ہو رہا تھا۔

"السلام علیکم انکل۔" کاشف کی نظر بابر شاہ پر پہلے پڑی۔ فواد نے بھی سلام دعا کی۔

"کیا ہوا؟ خیریت تو ہے۔" بابر شاہ نے پوچھا۔

"انکل کیسی خیریت اور کہاں کی خیریت اس شخص کی حالت بہت خراب ہے۔"

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔" بابر شاہ نے پوچھا۔

"آئیں میں خود لے چلتا ہوں۔" فواد کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

بابر شاہ کے ساتھ آفس کے دروازے سے نکل کر ملحقہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازے سے اندر آتے ہی انہیں وہ بیڈ پر دکھائی نہیں دیا تھا۔ زنجیروں سے بندھا ہوا تھا وہ بیڈ کے پائے کے ساتھ ٹیک لگائے گھٹنے سینے سے لگا کر ان کے گرد بازو حمائل کر کے ان پر سر رکھے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں اس کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔

"بابا....." فواد نے آہستگی سے پکارا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا بدستور یونہی بازوؤں پر سر رکھے بیٹھا رہا۔

"بابا....." اب کی بار انہوں نے قدرے اونچی آواز میں اسے پکارا تو اس نے بہت آہستگی سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا..... اس کی شکست خوردہ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ فواد اور بابر شاہ بے چین ہو اٹھے۔

"مرد ہو کر روتے ہو؟" بابر شاہ کا یہ جملہ تلخ سہی لیکن اس پر اثر انداز نہیں ہوا تھا۔ اس نے محض نفی میں سر ہلایا یہ اور بات کہ پلکوں پر ٹکے آنسو چھلک کر اس کے گالوں کو بھگونے لگے۔

"تو پھر یہ کیا ہے؟" انہوں نے اس کی بھیگی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آنسو کیوں نکل رہے ہیں؟"

"اندر پانی بہت جمع ہو گیا ہے۔ آنسوؤں کے ذریعے

ختم کر رہا ہوں تاکہ پھر کبھی روؤں نہیں۔" بہت سلیقے سے اس نے جواب دیا۔ بابر شاہ اور فواد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"تم کسی فیاض کو جانتے ہو؟" بابر شاہ نے پوچھا تو ایک جھٹکے سے اس نے سر اٹھایا اف خدایا کس قدر وحشت تھی اس کے چہرے پر سارے جسم کا خون جیسے آنکھوں میں سمٹ آیا تھا اس کی نظریں مسلسل بابر شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔ ان آنکھوں کی وحشت دیکھ کر بابر شاہ اور فواد ایک دم قدم پیچھے سرک گئے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پر دورے کی کیفیت طاری ہونے والی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے ان کے چہروں پر نگاہیں ٹکائے ہی عجیب سے انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

پھر وہ سر پیچھے کر کے بیڈ کی پٹی سے ٹیک کر خلاؤں میں گھورنے لگا۔ فواد نے بابر شاہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور دونوں دوبارہ آفس میں آ گئے۔

"فواد! تمہارا کہنا درست ہے۔ پہلے کی نسبت بہت بہتر ہو چکا ہے یہ..... آج اس نے جتنی باتیں بھی کیں بہت سلیقے اور تہذیب سے کیں..... بے ربط جملے اس کے منہ سے بہت کم نکلے ہیں۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"جی ابو! میں یہی کاشف کو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ اب وہ ایٹی پرسنٹ ٹھیک ہو چکا ہے۔ بس کسی کسی وقت پٹڑی سے اتر جاتا ہے۔ اب اگر ہم اس سے مزید بولنے کی کوشش کرتے، کسی قسم کا استفسار کرتے تو وہ بھڑک اٹھتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ان شاء اللہ پھر ہم چلتے ہیں..... چلو بیٹا۔" انہوں نے پہلے فواد کو اور پھر آریان کو مخاطب کیا آریان اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں کلینک سے نکل کر گاڑی میں آ بیٹھے۔

بابر شاہ گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے لیکن ان کا ذہن کا ہر نکتہ اس پاگل پر مرکوز تھا۔ اس کا لہجہ، اس کی باتیں رہ رہ کر ان کے دماغ میں کھلبلی مچا رہی تھیں۔

"اندر پانی بہت جمع ہو رہا ہے اس لیے آنسوؤں کے ذریعے ختم کر رہا ہوں کہ پھر کبھی روؤں ہی نہیں۔"

"میں نیچ ذات ہوں..... میری کوئی پہچان نہیں..... میرا کوئی نسب نہیں میں آپ کے برابر کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔" ان کے دماغ میں شائیں شائیں ہونے لگی آندھیوں کے جھکڑ سے چلنے لگے سوچ کے تناور درخت اس آندھی کے سامنے ایک ایک کر کے گرنے لگے تھے۔ پھر اچانک دماغ کی گہرائیوں میں اندر تاریکیوں کے اندر ایک جھماکا سا ہوا۔ بے اختیارانہ ان کا پاؤں پوری قوت سے بریک پر جا پڑا۔

گاڑی کے ٹائر بہت بری طرح چرچرائے اور گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ آریان گھبرا کر وحشت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ ایک پھانس جو کافی عرصے سے دماغ میں نیزے کی انی کی طرح کھبی ہوئی تھی وہ نکل گئی تھی۔ وہ کون ہے..... انہیں یاد آ گیا تھا..... اچانک تمام پردے سرک گئے تھے..... انہیں سب کچھ یاد آ گیا وہ پہچان گئے..... بھلا وہ اسے کس طرح فراموش کر سکتے تھے۔

آریان نے بہت دھیرے سے بابر شاہ کے اسٹیرنگ پر دھرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"کچھ نہیں..... کچھ نہیں بیٹا..... میں ٹھیک ہوں سوری بیٹا۔" آریان سے بات کرنے کے بعد انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور تقریباً فل اسپیڈ میں بھگاتے ہوئے گھر لے آئے۔ گاڑی روک کر وہ نیچے اترے۔ لان میں اس وقت سب ہی موجود تھے وہ آریان کو اتار کر دوبارہ چلے گئے۔

پھر رات گئے بابر شاہ گھر میں داخل ہوئے۔ سادات نگر کے آدھے مکین سو چکے تھے اور بچھ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ زاہدہ چچی کی بے خواب آنکھیں خواب گاہ کے دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ انہیں اندر آتے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھیں۔

"آخر آپ اپنی پریشانی کیوں نہیں بتاتے مجھے۔"

"کیا بتاؤں؟" بہت کمزور اور ٹوٹا ہوا لہجہ تھا ان کا۔ "بس اتنا سمجھ لو زاہدہ آج سارے گماں کھل کر

..... ٹوٹ کر بکھر گیا ہوں میں..... بہت بند باندھ رکھے تھے طوفان کے آگے لیکن..... لیکن سب کچھ بہہ گیا۔"

"کچھ بتائیں تو سہی۔" زاہدہ چچی ان کے ٹوٹے ہوئے انداز پر گھبرا کر بولیں۔

"کچھ دن پہلے تمہیں میں نے بتایا تھا کہ فواد کے کلینک میں ایک مریض کو دیکھا تھا میں نے۔"

"جی ہاں..... یاد ہے مجھے..... کیا ہوا اسے؟"

"اسے کچھ نہیں ہوا..... وہ الجھن دور ہو گئی جو اسے دیکھ کر دماغ میں پیدا ہوئی تھی..... کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔"

"تو کیا پتا چل گیا؟"

"ہاں پتا چل گیا..... پہچان لیا میں نے اسے..... یاد آ گیا مجھے کہ میں اسے کیسے جانتا ہوں۔"

"زاہدہ بیگم! اکیس سال پہلے میں نے اس شخص کو دیکھا تھا۔ محض دو لمحوں کے لیے مگر آج تک نہ بھلا سکا۔

محض اس ایک بندے کی ذات کی وجہ سے اس گھر کی خوشیاں تہس نہس ہوئیں۔ ہمارے سروں سے باپ کا سایہ اٹھا..... اماں بی کی آنکھوں میں آنسو آئے ایسے جو ابھی تک خشک نہیں ہوئے۔" بابر شاہ کی بات سن کر زاہدہ چچی جیسے سناٹے میں رہ گئیں بیسیوں بار اس گھر میں ڈھکے چھپے لفظوں میں اس کا تذکرہ ہوا تھا۔ اس کا نام کئی بار ان کی سماعت سے ٹکرایا تھا۔ وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"آپ کہیں فر..... فرجاد کی بات تو نہیں کر رہے۔"

"ہاں زاہدہ! وہ پاگل..... کوئی اور نہیں..... وہ فرجاد ملک ہے..... مسرت جہاں کی محبت اس کا شوہر۔" بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں انہوں نے کہا۔ زاہدہ چچی دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔

"مسرتی! اس کا کچھ پتا چلا..... وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟"

"نہیں..... کچھ پتا نہیں چلا..... پتا چل بھی کیسے سکتا ہے جو ہمیں اس کے بارے میں بتا سکتا ہے وہ تو

حواسوں میں ہی نہیں..... زاہدہ..... دعا کرو وہ ٹھیک ہو جائے۔ اس کا ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے۔ مسرت جہاں اس گھر کی وہ دکھتی رگ ہے جو اکیس سال سے مسلسل رِس رہی ہے۔ اب اس عذاب مسلسل سے چھٹکارہ مل جانا چاہیے۔ بہت سزا دے چکے ہم اسے ..... اور بہت پچھتاوے کما چکے ہیں ہم۔" بابر چچا کا لہجہ ہار ماننے والوں جیسا تھا۔ وہ ایک غصہ ایک ناراضی جو مسرت جہاں کے لیے ان کے دل میں تھی وہ تو بیتے برسوں میں وقت کی دھول کے نیچے دب چکی تھی۔ اب صرف محبت تھی۔ اپنی اکلوتی بہن کے لیے دل میں موجود میٹھے میٹھے نرم سے جذبے تھے۔ زاہدہ چچی خاموش بیٹھی ایک بدلے ہوئے شخص کو دیکھ رہی تھیں۔

"تم ہی بتاؤ زاہدہ کیا بہت بڑا گناہ تھا اس کا۔ کسی کو پسند کرنا اتنا بڑا جرم تو نہیں۔ رشتہ مناسب نہیں تھا تو انکار کیا جا سکتا تھا اس طرح کہ فرجاد اور مسرت اس میں اپنے لیے ہتک یا زیادتی محسوس نہ کرتے..... لیکن ابا میاں نے جس طرح کا رویہ فرجاد ملک کے ساتھ روا رکھا۔ اور ہم جس طرح اس کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ یہ ان دونوں کو ہی بہت ہتک آمیز لگا ہو گا۔ وہ بچی تھی، نا سمجھ تھی۔ عمر کی جس سیڑھی پر وہ کھڑی تھی وہاں ایسے خواب آنکھیں ضرور دیکھتی ہیں۔ لیکن ہم نے اسے اپنے ہی گھر میں اجنبیت کی دیوار میں چن دیا۔ اس کے ساتھ ایسا رویہ رکھا جیسے وہ چھوت کی مریضہ ہو اس کے ساتھ بات تک کرنی چھوڑ دی۔ ایسے حالات میں اس نے اگر انتہائی قدم اٹھا لیا تو قصوروار اکیلی وہی نہیں..... ہم بھی برابر کے شریک ہیں..... پھر سزا صرف اسی کے لیے کیوں؟" بابر چچا آج آئینے میں اپنا اصل دیکھ رہے تھے۔ قصور اور سزا کی کسوٹی پر پرکھ رہے تھے کہ کون کتنا گناہ گار ہے اور انہیں مسرت جہاں کے انتہائی قدم اٹھائے جانے میں اپنا قصور بھی دکھائی دے رہا تھا۔

"فرجاد ذہنی طور پر بیمار شخص ہے۔ مسرت کے بارے میں ہمیں تب ہی پتا چلے گا تا جب وہ ٹھیک ہو گا

...... اور وہ...... وہ کلینک میں ٹکتا ہی نہیں موقع ملنے پر بھاگنے لگتا ہے...... آج بھی دو گھنٹے مسلسل تلاش کے بعد وہ کلینک کے عملے کے ہاتھ لگا۔

اگر وہ ایسے ہی کسی دن پھر بھاگ گیا تو پھر شاید ہی ہمیں مل سکے۔ اب اگر وہ بھیڑ میں گم ہو گیا تو تمام عمر کے لیے ہمیں تہی داماں کر دے گا۔" بابر چچا حساس لہجے میں بولے۔

"تو آپ اس کو گھر لے آئیں۔" زاہدہ چچی نے تجویز دی۔

"کمال ہے! ایک غیر آدمی کو۔" وہ خاموش ہو گئے۔

"غیر کیوں ہے...... اس گھر کا داماد ہے وہ...... اس گھر کی بہت قیمتی متاع اس کے پاس ہے...... وہ غیر کیسے ہو گیا۔" زاہدہ چچی کی بات ان کے دل کو لگی۔

"ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو...... اس گھر سے اس کا رشتہ بہت مضبوط ہے پھر وہ غیر تو نہ ہوا۔ لیکن گھر کے باقی سب افراد......"

"آپ کا کیا خیال ہے مرتی کی محبت صرف آپ کے دل میں ہی جاگی ہے۔ بابر! اس گھر کا ایک ایک فرد اس کو یاد کرتا ہے۔ برملا نہ سہی...... ڈھکے چھپے انداز میں ہی سہی لیکن اس کا ذکر سب ہی کرتے ہیں۔ سوائے عارب بھائی کے...... آپ اسے گھر لے آئیں...... کسی کو اعتراض نہیں ہو گا۔ سب ہی سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور ممکن ہے گھر کا ماحول اور اپنے اردگرد خوشگوار چہروں کو دیکھ کر وہ بھی جلدی ٹھیک ہو جائے...... اتنا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ایک بار اگر یہاں آگیا تو پھر یہاں سے بھاگے گا نہیں۔" زاہدہ چچی وثوق سے بولیں۔ بابر چچا کو لگا ان کے ذہن سے آدھا بوجھ سرک گیا ہے۔

"ٹھیک ہے! پھر دیر نہیں کرنی چاہیے میں ابھی اماں بی سے بات کرتا ہوں...... بہت جلد اسے ہم یہاں لے آئیں گے۔" بابر مطمئن ہوئے تو انہیں اس کو جلدی لانے کی فکر پڑ گئی۔ وہ اٹھ کر اماں بی کے کمرے کی طرف چل دیے۔

☆ ☆ ☆

چھٹی کی گھنٹی بجی آریان نے ٹیبل پر بکھری چیزیں سمیٹیں اس کا آخری پیریڈ فری ہوتا تھا اور وہ یہ وقت پرنسپل آفس میں بیٹھ کر اخبار وغیرہ کا مطالعہ کر کے گزارتی تھی۔ تھوڑی دیر میں تمام ٹیچرز وہیں آگئیں۔ اٹینڈنس لگا کر سب ہی آفس سے نکلتی چلی گئیں وہ اور روبیہ بھی اسکول کے گیٹ سے باہر نکل آئیں۔

اسکول کے سامنے دکانوں کی ایک قطار تھی اور قدرے فاصلے پر ایک چائے کا ہوٹل تھا۔ اور دونوں سر جھکائے چلی آ رہی تھیں یہ جانے بغیر کہ دو انگارے آنکھیں مسلسل انہیں دیکھ رہی ہیں۔ پہلے روبیہ کو اپنے چہرے پر غیر محسوس سی تپش محسوس ہوئی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہوٹل کے باہر بچھے ہوئے بنچ پر کالے کمبل میں لپٹا ہوا وہ شخص اس کے لیے بالکل انجان تھا۔ لیکن اس کی متلاشی نظروں کی چبھن روبیہ کو اپنے وجود کے اندر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے آریان کا ہاتھ تھام لیا آریان نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے روبی؟"

"رینی...... وہ 'وہ شخص۔" روبیہ نے دائیں جانب دیکھتے ہوئے کہا تو آریان اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھنے لگی۔ سیاہ کمبل میں منہ سر لپیٹے ہوئے وہ شخص اس کے لیے بھی اجنبی ہی تھا۔ اس کا چہرہ تقریباً کمبل میں چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ بنچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"رینی...... وہ 'وہ اٹھ گیا ہے ——" روبیہ اس کے اس طرح اٹھنے پر گھبرا گئی۔

"روبی...... تیز تیز قدم اٹھاؤ...... آج انکل بھی نہیں آئے۔" آریان بولی روبیہ کی ساری توجہ اس سیاہ کمبل والے پر مرکوز تھی جو اب دھیرے دھیرے قدم اٹھا اسی راستے پر آگیا تھا جدھر سے چل کر وہ آئی تھیں۔ غیر محسوس طریقے سے روبیہ اور آریان کے قدموں میں تیزی آگئی۔ کمرشل ایریا ختم ہو چکا تھا اور رہائشی کالونی شروع ہو گئی دوپہر کا وقت تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں سب گھروں میں تھے گلیاں تقریباً سنسان

وہ شخص مسلسل ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتیں تو اس کے قدموں میں بھی تیزی آجاتی وہ دھیمے قدموں سے چلتیں تو وہ بھی آہستہ آہستہ چلنے لگتا۔ لیکن ان کا درمیانی فاصلہ اب کم ہوتا جا رہا تھا۔ آریان اور روبیہ کو اب یقین ہو گیا تھا کہ وہ ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ دونوں گھبرا رہی تھیں۔

"رینی! یار کیا مصیبت ہے...... یہ کون ہے؟ اب تو ستارہ بیگم کے غنڈے بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔" روبیہ پریشانی سے بولی۔

"تو تم کیا سمجھتی ہو ستارہ بیگم کے پاس غنڈوں کی کمی ہے۔ پتا نہیں کتنے پال رکھے ہیں حرام کی کمائی کھلا کھلا کر۔" آریان کا خون کھولنے لگا۔ دھیرے دھیرے وہ شخص اب ان کے بے حد قریب آگیا تھا روبیہ اور آریان کی تو جان ہی حلق میں اٹک گئی۔ وہ اب تقریباً بھاگنے کا سوچ رہی تھیں جب اچانک بہت نرم سی آواز آئی۔

"رانی بٹیا......" تیز ہوتے قدم سست پڑ گئے۔ دھڑکنیں جیسے تھم سی گئیں۔ آریان کو شاید اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رکی نہیں تھی۔

"رانی بٹیا......" آواز پھر آئی اور اب کی بار آریان کے قدم رک گئے اس نے گھوم کر اس سیاہ کمبل والے کو دیکھا۔ ایسے تو اسے صرف گھنگھرو بابا پکارتے تھے۔ پھر جیسے وہ جان گئی۔

"گھنگھرو بابا......" اس کے ہونٹوں سے ادا ہوا۔

آریان بے تابی سے ان کا ہاتھ تھام کر خود فراموشی کی سی کیفیت میں بولی۔ اس سمے وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ گھر کی چار دیواری میں نہیں بلکہ گلی میں کھڑی ہے۔ روبیہ بھی خاموش کھڑی اسی کو دیکھ رہی تھی۔

"رانی بٹیا! معاف کرنا تمہیں پریشان کیا...... تمہاری خیریت معلوم کرنا بھی ضروری تھا۔ بس اسی لیے چلا آیا مگر اس وجہ سے چھپا رکھا ہے کہ ستارہ بیگم کے غلام پہچان نہ لیں۔" اسی اثنا ایک گاڑی ان کے قریب آ رکی۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے بہت غور سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ گھنگھرو بابا نے ایک نظر گاڑی کی طرف دیکھا۔

"بس رانی بیٹا! میں اب چلتا ہوں۔" وہ کہہ کر تیز تیز قدموں سے چل آگے بڑھنے لگے۔ بابر شاہ گاڑی سے اتر آئے۔

"بابا......! آپ گھر چلیں ہمارے ساتھ...... وہاں تفصیل سے بات کریں گے۔" وہ بولی۔

"نہ رانی بٹیا! بی بی بے کل ہوں گی وہ تو کہہ رہی تھیں غلام عباس تمہارے چوکھٹ سے پیر باہر رکھتے ہی میرا انتظار شروع ہو جائے گا۔ جلدی آنے کی کوشش کرنا بی بی کا کہا رکھنا ہے مجھے میں دیر نہیں کر سکتا۔"

"گھنگھرو بابا! میں بھی تو آپ کی بی بی کی کچھ لگتی ہوں۔ ناراض ہوں تو میرا نام لے لیجیے گا...... کچھ نہیں کہیں گی۔ اب چل پڑیں۔" آریان ان کا بازو تھام کر گاڑی تک لائی۔ گھر پہنچ کر سب سے پہلے کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئے۔ پھر بابر شاہ، آریان اور گھنگھرو بابا کو ساتھ لیے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئے۔

"رستم اور کبیر نے پکڑے جانے سے ایک دن پہلے ستارہ بیگم کو فون کر کے اس گھر اور اسکول کا پتا بتا دیا تھا۔ اب ان کے پکڑے جانے کے باوجود ستارہ بیگم کے ہرکارے ہر جگہ چوکس پھر رہے ہیں۔ رانی بٹیا کی خیریت کی طرف سے اطمینان نہیں تھا سو مجھے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں آنا پڑا...... بی بی کی بے چینی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔"

"غلام عباس صاحب! آریان کی طرف سے آپ بالکل فکر مند نہ ہوں اور اپنی بی بی سے بھی کہہ دیجیے گا کہ آریان اب محفوظ ہے...... اس کے اردگرد جو حصار ہے وہ اتنا کمزور نہیں کہ ستارہ بیگم یا اس کے آدمی وہ حصار توڑ کر آریان تک پہنچ سکیں۔ ہماری اپنی بھی بیٹیاں ہیں اور بیٹیوں کی عزت کی حفاظت کیسے کی جاتی ہے ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔" بابر شاہ کا چٹانوں کی طرح مضبوط لہجہ گھنگھرو بابا کے اندر طمانیت بھر گیا۔ انہوں نے سکون بھرا سانس لیا۔

"آپ کی دعائیں رہیں تو بہت جلد آریان ہی نہیں آپ کی بی بی بھی ان ظالموں کے چنگل سے آزاد ہوں گی۔" بابر شاہ بولے۔ تو گھنگھرو بابا نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

"الٰہی تیرے رنگ..... زمین اور آسمان کا ملاپ ہو جائے گا..... شاہ صاحب! ایک معجزہ ہو گا یہ بھلا کوٹھے والوں کو کسی نے کب عزت دی ہے۔"

"نہیں غلام عباس صاحب! ہر انسان عزت کا حق دار ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ شوق سے نہیں مجبوری میں ذلت خریدتے ہیں اور عزت بیچتے ہیں۔ آریان کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی خاندانی لوگ بھی اس کیچڑ بھری دلدل میں گر جاتے ہیں۔ پھر اگر ہم جیسے لوگ ان کو کسی مشکل سے نجات دلانے کا وسیلہ بن جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔" بابر شاہ سادہ سے لہجے میں بولے۔

"گھنگھرو کی آنکھوں نے بڑے نظارے دیکھے..... ایک ایک چہرے کے کئی کئی پرت..... ذات والوں کی بدذاتی، غیرت والوں کی بے غیرتی، غرور سے اٹھے سروں کو کٹتے دیکھا..... فخر کرنے والوں کو جھکتے دیکھا پر شاہ صاحب! ایسا کہیں نہیں دیکھا۔ عزت دار وہاں جاتے ضرور ہیں۔ کچھ روز کے لیے ذات فروشوں کو عزت کے پلنگ پر بھی بٹھاتے ہیں۔ لیکن طوائفیں تو کھائے برتن کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کی کشش دنوں میں ختم ہو جاتی ہے اور پھر ان عزت داروں کے گھروں میں ان ٹوٹے ہوئے برتنوں کے لیے کون سا شوکیس رکھا ہوتا ہے۔ اپنے بکھرے ارمان سمیٹ کر واپس وہیں آجاتی ہیں جہاں سے عزت کی زندگی کے خواب دیکھتے ہوئے رخصت ہوتی ہیں۔ پر شاہ صاحب! آج تک کوئی ایسا مرد نہیں دیکھا جو کسی طوائف کو بہن اور بیٹی بنا کر گھر کی چار دیواری کی اماں بخشے۔" غلام عباس عرف گھنگھرو کے لہجے میں بابر شاہ کے لیے عقیدت ہی عقیدت تھی۔

"بس غلام عباس صاحب! اور زیادہ شرمندہ مت کریں۔ میں کسی میڈل یا کسی تمغے کی خواہش میں یہ سب نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی مجھے تعریف کا لالچ ہے۔ میں تو بس آریان بیٹی کی روشن پیشانی پر ثبت گدلاہٹ دور کرنا چاہتا ہوں۔ اسے اس کا اصل مقام دلانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"میری مدد کی..... پر مجھ جیسا کم مایہ انسان آپ کی کیا مدد کر سکتا ہے؟" گھنگھرو بابا حیرت سے بولے۔

"آپ اندر کے آدمی ہیں..... یقیناً ستارہ بیگم کی ہر عادت سے واقف اور اندرونی تمام رازوں کو جانتے ہوں گے۔" بابر شاہ نے کہا۔

"جی ہاں! بڑی بائی جی میری بڑی عزت کرتی ہیں۔ میری ماں مرتے دم تک ان کی وفادار تھی اور مجھے بھی یہی سبق پڑھایا تھا اس نے..... میری ماں نے مجھے کہا تھا کہ ستارہ بیگم کی زندگی بھر خدمت کرنا۔ پر شاہ جی! بی بی کی ذات ایسی بیچ میں آئی کہ ماں کا کہا بھول گیا میں، ستارہ بیگم سے غداری کرنے لگا۔ پر جی وہ اب بھی مجھ پر ویسا ہی اعتبار کرتی ہے جیسا پہلے کرتی تھی۔" غلام عباس سر جھکائے بولا۔

"تو آپ کے خیال میں کیا وہ آریان اور اس کی امی ہمارے حوالے کر دے گی۔"

"ناممکن ہے..... ستارہ بیگم اپنے کوٹھے کے ٹوٹے ہوئے برتن اور پھولوں کی بکھری ہوئی پتیاں بھی باہر نہیں پھینکتی..... یہ تو پھر دو زندہ وجود ہیں۔ رانی بٹیا میں اپنے مستقبل کا خواب دیکھ رہی ہیں اور بی بی! پچھلے اکیس بائیس سال سے صرف آواز بیچ کر اس کے لیے لاکھوں کی کمائی کا ذریعہ ہیں..... آج بھی بہت سے لوگ محض ان کی آواز پر لاکھوں لٹا دیتے ہیں۔ ستارہ بیگم کبھی نہیں چاہیں گی کہ یہ دونوں ان کے ہاتھ سے نکلیں۔"

"پھر کیا ہمیں قانونی راستے سے انہیں حاصل کرنا ہو گا۔" بابر شاہ استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"قانون....." طنزیہ خند مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر مچلی۔

"قانون تو خود بائی جی کے تلوے چاٹتا ہے۔ یہ وردی والے، جو دن بھر کمزوروں پر قہر بن کر ٹوٹتے رہتے ہیں۔ رات کی سیاہی میں ستارہ بیگم کے آگے یوں جھکے ہوتے ہیں جیسے نیاز مند پیرو مرشد کے آگے، اپنا ایمان، اپنی عزت گروی رکھی ہے انہوں نے..... لیکن آپ ہمت نہ ہاریں۔ کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ اس کی دکھتی رگ کو پکڑیں۔ شاید وہ مان جائے۔"

"کیا مطلب.....؟"

"طوائف کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ جیب دیکھ کر رویے میں رد و بدل کرتی ہے۔ جہاں نوٹ نظر آئے وہاں مسکراہٹ بھی ہو گی اور التفات بھی..... آپ کو ان سے سودا کرنا ہو گا ممکن ہے وہ مان جائے۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔"

"شاہ جی! مجھے اجازت دیں، بی بی کو جا کر تسلی دینی ہے کہ رانی بٹیا بالکل ٹھیک اور خوش بھی ہے..... بس آپ سے التجا ہے اس کا بہت خیال رکھیے گا۔" گھنگھرو بابا نے اسے اپنے بازو کے حلقے میں پکڑ کر اس کا سر سینے سے لگایا اس کی پیشانی چومی۔

"آپ کی مجبوری نہ ہوتی تو ہم مزید اصرار کرتے لیکن ایک ماں کی تکلیف کو سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ کو رکنے پر مجبور نہیں کریں گے۔ لیکن آپ یہاں سے جاتے ہوئے مطمئن رہیے آریان کو یہاں کوئی تنگی نہیں ہو گی۔" بابر شاہ انہیں رخصت کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ان کے ساتھ ہی گیٹ تک آئے۔

گھنگھرو بابا نے بہت گرمجوشی سے بابر شاہ سے مصافحہ کیا ایک بار پھر آریان کو پیار کیا اور بھیگی آنکھیں لیے رخصت ہو گئے۔ آریان کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگ گئے۔ لیکن یہ نمی کسی دکھ کی وجہ سے نہیں ان سے ملنے کی خوشی کی وجہ سے تھی۔

☼ ☼ ☼

دہلیز پر لگی آنکھوں میں انتظار کی ریت چبھنے لگی تھی۔ دو دن سے اس نے کوئی محفل بھی اٹینڈ نہیں کی تھی۔ ستارہ بیگم جانتی تھی کہ ممتا کو بیٹی کی تکلیف برداشت نہیں ہو رہی لیکن وہ ہمدردی نہیں کرنا چاہتی تھی یہاں ہمدردی کر کے خود ہی نقصان اٹھانے والی بات تھی اس نے اگر ذرا سا بھی چاندنی کی دلجوئی کی تو جواب میں چاندنی کی التجا اور آرزو یہی ہوتی کہ اس کی بیٹی سے دستبردار ہو جائے..... اور ستارہ بیگم کے لیے یہ گھاٹے کا سودا تھا۔ اسی لیے اس نے چاندنی کے اس رویے کا زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ گھنگھرو بھی کل سے غائب تھا۔ نہیں تو اسی کے ذریعے چاندنی کو سمجھا بجھا لیتی۔ تماش بین بار بار چاندنی کی فرمائش کر رہے تھے اور وہ اس کی ناسازی طبیعت کا بہانا کیے جا رہی تھی۔

رات ہو گئی لیکن وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی..... کمرے میں ہی اندھیرا کیے بستر میں پڑی رہی۔ طبلوں پر تھاپ پڑنے لگی۔ گھنگھرو پیروں میں بندھنے لگے۔ لچکتے مٹکتے مہکتے ہوئے سراپے ادھر سے ادھر آجا رہے تھے۔ لیکن کسی کو فرصت نہیں تھی کہ کوئی اس سے اس کا دکھ پوچھتا۔

"ایک وہ نہیں..... تو یہاں کسی کو بھی میرا خیال نہیں یہ لوگ جو میرے ارد گرد بستے ہیں۔ زندہ دل، بے فکرے لوگ..... یہ لچک دار ڈالیوں جیسی لڑکیاں میں یہاں کس لیے ہوں..... برسوں دامن کو بچائے کرب سہتے زندگی گزار دی اور اب..... اب میری بیٹی بھی گھنگھرو باندھے گی اس کے ڈھکے چھپے ہوئے سراپے کو ہوسناک نظریں برے کی طرح چھیدیں گی اور میں، میں کچھ نہیں کر سکوں گی..... یاالٰہی! تیری اس دنیا میں کوئی جائے اماں ہے بھی یا نہیں....." اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"بی بی....." اندھیرے میں آواز ابھری تو وہ تڑپ کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔ اسی پل کمرا روشنی میں نہا گیا۔ مسافت میں دھول دھول ہوتا ہوا غلام عباس اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"غلام عباس! اتنی دیر کر دی تم نے..... میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ یہ انتظار نہیں ہوتا مجھ سے..... بہت بے صبری ہوں میں..... پھر بھی..... پھر بھی تمہیں

احساس نہ ہوا..... اتنی دیر لگا کر آئے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"غلطی ہو گئی بی بی! پر رانی بٹیا کے اصرار پر مجھے وہاں کچھ دیر رکنا پڑ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ بی بی منتظر ہوں گی۔ پر اس نے کہا میرا نام لے لینا وہ ناراض نہیں ہوں گی۔" غلام عباس سر جھکا کر بولا۔ چاندنی نے پیر سمیٹ لیے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو تھم گئے۔

"کیسی ہے وہ..... ٹھیک تو ہے نا۔"

"بی بی! ہماری رانی بٹیا کو تو اللہ نے ایسی امان دی ہے کہ کیا کہوں..... شاید فرشتے اگر انسانوں کے روپ میں آئیں تو وہ ویسے ہی ہوں گے جیسے وہ لوگ..... انہوں نے اپنی بٹیا کو بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔ اس کی ہر ضرورت ہر سہولت کا خیال رکھتے ہیں۔

وہ لوگ کہتے ہیں..... آپ اطمینان رکھیں..... وہ رانی بٹیا کو بائی جی کے چنگل سے آزاد کرا لیں گے خواہ انہیں اس کے لیے کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔" غلام عباس کی بات سن کر چاندنی کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے۔

"مولا! تو معاف کر دینا..... بہت تھڑدلی ہوں میں..... تکلیف آئی تو شکوہ کر بیٹھی تجھ سے، حالانکہ یہ میرا مقام نہیں تو تو بہت بلند ہے اور میں حقیر زدہ میری کیا بساط کہ تجھ سے شکایت کروں۔ مجھے معاف کر دینا پالنے والے۔" وہ دل ہی دل میں اپنے رب سے مخاطب تھی۔ سچی بات یہ تھی کہ غلام عباس کی باتیں سن کر وہ بہت حد تک مطمئن ہو گئی تھی کہ اب آریان کو بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن ماں بھی مکمل طور پر سکون نہیں پا سکتی سو وہ بھی اس کے لیے پریشان تھی۔

☼ ☼ ☼

اماں بی اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ بات کر کے بابر شاہ کافی حد تک مطمئن ہو گئے تھے۔ فرجاد کو گھر لانے کی مخالفت کسی نے نہیں کی تھی۔ البتہ عارب تایا ابھی بے خبر تھے کہ گھر میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔

اماں بی کے دل کا درد سوا ہو گیا تھا۔ مسرت جہاں کو اٹھارہ سال انہوں نے اپنی آغوش میں سمیٹ سمیٹ کر رکھا تھا۔ پانچ بھائیوں کے بعد کتنی منتوں، مرادوں سے انہوں نے بیٹی پائی تھی۔ اس کی ہلکی سی تکلیف پر اماں بی ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتیں۔ اس کی پرورش کے دوران وہ گھر، بچوں، میاں، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی غافل ہو گئی تھیں۔ وہی مسرت جہاں جو ان کے گلے میں بازو ڈال کر اور ان کے بازوؤں میں جھول جھول کر فرمائشیں کیا کرتی تھیں۔ جب اس گھر کی دہلیز پار کرنے لگیں تو ایک پل کو بھی ماں کی قربانیوں، اس کی محبت کے بارے میں نہیں سوچا ہو گا اگر سوچتیں تو ضرور یہ خیال بھی آتا کہ میری ماں جیتے جی مر جائے گی۔ وہ تو سادات نگر کی ساری محبتیں، ساری رفاقتیں، سارے رشتے بھول کر ایک نئی منزل کی طرف چل پڑی تھیں۔ لیکن شبیر حسین شاہ کے لیے وہ رات ساری زندگی پر محیط ہو گئی۔

انہوں نے خود کو اس امتحان کے قابل نہ سمجھا کہ اس رات کی کالک منہ پر تھوپ کر وہ ایک بار پھر دنیا کا سامنا کرتے۔ سو اس رات کی سیاہی میں ہی مدغم ہو گئے۔ ایسے خاموش ہوئے کہ پھر کبھی نہ بول پائے..... بھری دنیا میں تحقیر اور ذلت کے تیر سہنے کو اماں بی رہ گئیں۔ بیٹوں نے تو مسرت جہاں کے گھر سے چلے جانے کے بعد چپ سادھ لی۔ سارا جوش، ساری غیرت اپنی موت آپ مر گئی۔ وہ دنیا کے کارخانوں میں اپنے حصے کا کام کرتے رہے۔ سانسیں بھی لیتے رہے لیکن مسرت جہاں جو زخم ان کے دل پر لگا گئی تھیں۔ وقت بھی اس کا مرہم نہ بنا سکا۔

پر اب اکیس سال بعد اس کے ملنے کی امید نظر آئی تو سارے گلے شکوے جیسے کہیں دور جا سوئے ایک خلش تو تھی لیکن اب وہ اتنی اذیت نہیں دیتی تھی۔

اور اماں بی..... وہ تو اپنے جگر پارے سے ملنے کو اتنی بے کل ہو گئی تھیں کہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھیں فرجاد جلدی سے ٹھیک ہو جائے انہیں ان کی مسرت جہاں کا پتا بتائے۔ وہ ایک بار اسے اپنے سینے سے لگا کر

دل میں جلتی ممتا کی آگ ٹھنڈی کر لیں۔ پھر چاہے زندگی ان سے روٹھ جائے۔ شاید وہ ابھی تک اسی امید اور اسی آرزو میں جی رہی تھیں۔ شاید پروردگار نے انہیں اتنی مہلت اسی لیے دی ہوئی تھی۔

بابر شاہ فرجاد کو کلینک سے لے آئے تھے۔ گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو فرجاد نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"یہ کہاں لے کر آئے ہیں مجھے؟"

"آج سے تم یہیں رہنا ہمارے پاس..... وہ کلینک والے تمہیں تنگ کرتے تھے نا تمہارے ہاتھ پیر باندھتے تھے زنجیروں سے..... تمہیں زبردستی انجکشن لگاتے تھے۔ میں اس لیے تمہیں یہاں لے آیا ہوں..... یہاں تم آزاد پھرو گے۔ تمہارے پیروں میں کوئی زنجیر نہیں ڈالے گا۔" بابر شاہ بات مکمل کر کے گاڑی سے نیچے اترے۔ پھر گھوم کر دوسری طرف آئے اور اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔

بابر شاہ کے ہمراہ وہ لان میں آ گیا شام کا وقت تھا سو سب ہی حسب معمول وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ اماں بی اسے دیکھ کر اضطراری انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بابر شاہ نے سب کو ہدایت کی ہوئی تھی کہ اس پر ابھی اپنی یا اس کی حقیقت واضح نہ کی جائے۔ اسے بس یہاں گھر کا ماحول ملنا چاہیے۔

"اماں جی..... یہ ہیں میرے دوست..... اور دوست یہ میری اور اب تمہاری بھی اماں بی ہیں۔" بابر شاہ نے مبہم سا تعارف کروایا۔ فرجاد بہت دھیمے قدموں سے چلتا تقدس کی اس مورت کے قریب آن رکا جنہیں بابر شاہ نے اماں بی کہا تھا۔

"اماں بی....." یہ لفظ اسے اپنے ہونٹوں پر بہت نامانوس اور اجنبی سے لگے۔ اماں بی کا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر ایک لمحے کو ٹکا اور پھر ان کے پہلو میں جھول گیا۔ کیسی کیفیت تھی جس کا عذاب وہ اپنے دل پر سہہ رہی تھیں۔

"یہ شخص جو خود سے بھی بے گانہ ہے۔ ان کی مسرت جہاں کا شریک زندگی ہے۔ اس شخص کے خواب مسرت جہاں کی آنکھوں نے دیکھے۔ پتا نہیں کتنا عرصہ اس شخص کے ساتھ گزارا ہو گا انہوں نے، پتا نہیں اب کس حال میں ہوں گی وہ۔" اماں بی کو خود پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ کیسی ماں تھیں وہ جو اپنی بیٹی سے اکیس سال تک بے خبر رہیں۔ پتا نہیں یہ سال اس نے ہنس کر گزارے یا رو کر، سکھ میں بتائے یا دکھ میں۔

بابر شاہ نے فرجاد کو کچھ دیر کے لیے سب کے درمیان بٹھایا۔ فیضی چچی اور حدیقہ چچی بہت دلچسپی سے اس گھر کے داماد کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے تو پہلی بار دیکھا تھا۔ اچھا خاصا ہینڈسم آدمی تھا وہ بس ذہنی طور پر اپ سیٹ ہونے کی وجہ سے خود سے لاپروا ہو گیا تھا۔ بابر شاہ نے جب دیکھا کہ فرجاد اب تھکن محسوس کر رہا ہے تو وہ اسے لے کر اپنے پورشن میں آ گئے..... جہاں پہلے ہی اس کے لیے کمرہ سیٹ کیا ہوا تھا۔ اسے کمرے میں بستر پر لٹا کر زاہدہ چچی کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ خود کسی ضروری کام سے دوبارہ باہر نکل گئے۔

رات کو عارب تایا کو جب یہ خبر ملی کہ فرجاد ملک کو بابر شاہ گھر لے آئے ہیں تو ایک بار پھر ان کا خون کھول اٹھا۔ وہ غصے سے تن فن کرتے اماں بی کے پاس پہنچ گئے۔

"اماں بی! یہ بابر آخر چاہتا کیا ہے..... کیوں سادات نگر میں کوئی ایسا طوفان لانا چاہتا ہے کہ اس آشیانے کا تنکا تنکا بکھر جائے۔"

"کیا ہو گیا..... آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔"

"اماں بی! پہلے ایک طوائف زادی کو زبردستی اس گھرانے پر تھوپا اس کے بیٹے نے اور بجائے روک ٹوک کے الٹا سب نے اسی کی حمایت کی..... اور اب یہ فرجاد۔ اس کو کس خوشی میں یہاں آنے کی اجازت دے دی گئی۔"

"اس لیے کہ وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں۔ اس کا ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے۔ وہ کلینک میں ٹکتا نہیں تھا مجبوراً بابر اس کو گھر لے آیا تاکہ اس کے ٹھیک ہونے پر مسرت کے بارے میں پوچھا جائے کہ وہ کس حال میں ہے، کہاں ہے؟" اماں بی رسانیت سے

بولیں۔

"آخر کس لیے..... جب یہاں سے چلی گئی ہے وہ تو مرے یا جیے ہمیں اس سے کیا؟" وہ برافروختہ ہوتے ہوئے بولے۔

"اتنے پتھر دل مت بنو عارب! بے شک اس نے جو کیا غلط کیا۔ لیکن اس گھر کی دہلیز چھوڑ کر چلے جانے کے باوجود وہ اب بھی یہاں حق رکھتی ہے۔ اب بھی خون کا رشتہ قائم ہے اس سے....."

"میں ایسے رشتوں کو نہیں تسلیم کرتا جن کو نبھاتے ہوئے عزت اور غیرت کا جنازہ نکل جائے۔ جس دن اس نے یہ دہلیز چھوڑی۔ ہر رشتہ تو وہ خود توڑ گئی۔ کیا باپ کی غیرت بھائیوں کی ناموس، ماں کی ممتا اس قدر بے وقعت اور حقیر تھیں جنہیں وہ روند کر چلی گئی..... معاف کیجیے گا اماں بی اس کے لیے آپ کے دل میں جگہ ہو سکتی ہے لیکن میں اس کے بارے میں سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا۔" عارب شاہ کے لہجے میں نفرت گھلی ہوئی تھی اماں بی نے ملامتی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"نہ جانے عارب تمہاری فطرت کیسی ہے..... میں یا تمہارے ابا میاں تو ایسے نہیں تھے اور اگر آج وہ زندہ ہوتے تو یقیناً" مسرت جہاں کے لیے ان کے دل میں بھی میری ہی طرح محبت جاگ اٹھتی۔"

"وہ زندہ ہوتے تب نا..... انہیں تو آپ کی لاڈلی خود اپنے ہاتھوں قتل کرکے گئی ہے۔ اور آپ کتنی آسانی سے ایک قاتل کو معاف کر رہی ہیں۔ اس لیے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔ اکیس سال تک اس گھر میں اس کا نام تک نہ لیا گیا اور اب، اب اس شخص کو جس کی وجہ سے سادات نگر طوفانوں کی لپیٹ میں آیا تھا۔ اس گھر میں داماد کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ کل کو مسرت جہاں کے لیے بھی اس گھر کا دروازہ کھل جائے گا..... سب کچھ ویسا ہی ہو جائے گا لیکن کیا ابا میاں کی زندگی اتنی ارزاں تھی کہ جسے بالکل نظرانداز کر دیا جائے۔ اماں بی اگر وہ اس گھر میں آئی تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔" عارب شاہ فیصلہ کن لہجے میں کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ اماں بی سرد سی آہ بھر کر رہ گئیں۔

ادھر فرجاد جب سے سادات نگر میں آیا تھا وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ زیادہ تر وہ اپنے کمرے میں ہی رہتا کبھی کبھار لان میں نکلتا تو ایک گوشے میں بیٹھا رہتا کلینک سے آنے کے بعد سے اسے دورہ بھی نہیں پڑا تھا۔ بابر شاہ اس کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ محض دو تین دنوں میں ہی اس کی آنکھوں میں کچھ چمک آ گئی تھی۔ زاہدہ چچی اس کی خوراک اور دوا کا بہت باقاعدگی سے خیال رکھ رہی تھیں۔ بال ترشوانے اور شیو کروانے کے بعد اس کی شخصیت بہت نکھری نکھری لگنے لگی تھی۔

بابر شاہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ گھر کے بڑوں کی نسبت بچوں کے درمیان بیٹھ کر خوشی محسوس کرتا ہے گھر کے بھی بچے اور نوجوان اس کے قریب رہنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ فواد بھی ان میں شامل ہونے لگے۔ فرجاد ملک کے لیے یہ دنیا بہت نرالی اور اچھوتی سی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے سب اس کے ساتھ یوں فرینک ہو گئے تھے جیسے وہ شروع سے ہی اس گھر کا ایک فرد رہا ہو۔ اس کی ذہنی کیفیت آہستہ آہستہ اعتدال پر آنے لگی تھی۔

آج سب کزنز فواد کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور فرجاد کو بھی اپنے پاس بٹھا رکھا تھا پہلے بڑے کزنز کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ ہوا..... کافی دیر تک شعر و شاعری ہوتی رہی پھر اپنے اپنے قصے سنانے شروع کر دیے چھوٹے بچے بے چارے بور ہونے لگے۔

"فہدی بھائی! ہم بور ہو رہے ہیں۔"

"تو پھر کیا کیا جائے۔" فواد نے مسکرا کر کہا۔

"یہ کیا جائے کہ ہمیں کہانی سنائی جائے۔" یاسر نے مشورہ دیا۔

"کہانی..... اوں..... بیٹا کہانی تو عرصہ ہوا پڑھنی چھوڑ دی۔ سو یاد نہیں ہاں..... ایسا کرتے ہیں انکل سے کہتے ہیں کہ وہ تم سب کو کوئی کہانی سنائیں۔" فواد نے فرجاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔" یاسر چہک کر بولا اور پھر یاسر، اطہر اور حسنین نے فرجاد کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

"ہاں انکل ہمیں کہانی سنائیں۔"

"کہانی....." فرجاد نے ان سب کی طرف دیکھا۔

"جی..... ہم نے آج آپ سے کہانی سننی ہے۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔" حسنین نے کہا۔

"سنا دیں انکل! ورنہ یہ نمو نے آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے۔" انیقہ نے کہا تو فرجاد نے ایک نظر سب کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے ننھے منے دوستو! ایک کہانی یاد تو ہے مجھے لیکن تم بور تو نہیں ہو گے۔" فرجاد نے کہا۔

"نہیں انکل ہم بور نہیں ہوں گے لیکن کہانی میں دیو ہو گا نا۔" ہارر کا دلدادہ اطہر اشتیاق سے بولا۔

"ہاں اس کہانی میں ایک شہزادہ ہے اور ایک شہزادی..... اور دیو بھی ہے۔" سب خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ فواد بہت غور سے فرجاد کو دیکھنے لگے۔ شاید وہ اس کی ذہنی کیپ ایبلٹی کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ فرجاد نے سر جھکا لیا۔ اب صرف چھوٹے بچے ہی نہیں انیقہ، ادیبہ، آریان، عموش، شاذان سبھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"یہ کہانی ایک شہزادی کی ہے ایک انتہائی خوب صورت اور پیاری سی شہزادی کی..... یہ بادشاہ کی اکلوتی بیٹی تھی اور بہت لاڈ پیار میں پلی تھی۔ شہزادی کو پتا ہے کیا عادت تھی؟"

"کیا.....؟"

"وہ ساون میں جھولے جھولا کرتی تھی۔ گیت گایا کرتی تھی۔ اس کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں رنگ ہی رنگ تھے..... پھر ایک دن اس شہزادی کی ملاقات ایک شہزادے کے ساتھ ہوئی۔ لیکن وہ شہزادہ اس کی طرح نہ تو امیر تھا اور نہ ہی لاڈلا۔"

"انکل کیا شہزادے بھی غریب ہوتے ہیں؟" وہ معصومیت سے بولا تو فرجاد نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا۔

"ہاں! کبھی کبھی شہزادے بھی غریب ہوتے ہیں۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس مدرسے میں شہزادی پڑھنے جاتی تھی۔ شہزادہ بھی اسی مدرسے میں پڑھتا تھا۔ شہزادے کو شہزادی کی پیاری پیاری صورت اور اس کا بھولپن بہت اچھا لگا وہ اس سے چپکے چپکے پیار کرنے لگا۔"

"انکل ہمیں تو نہیں پتا پیار کیسے ہوتا ہے؟"

"جب بڑے ہو گے تو سمجھ جاؤ گے۔ فی الحال چپ کر کے کہانی سنو۔" شاذان نے اطہر کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"ایک دن موقع پا کر شہزادے نے شہزادی کو بتا دیا کہ وہ اسے بہت چاہتا ہے شہزادی پہلے تو بہت گھبرائی، کسمسائی لیکن آخر کار اس نے شہزادے کی محبت قبول کر لی۔ پھر وہ ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ شہزادی کا باپ بہت سخت بادشاہ تھا۔ شہزادی اس سے ڈرتی بھی بہت تھی۔ لیکن شہزادے کی محبت کی وجہ سے اس میں کچھ ہمت آ گئی۔ اس نے شہزادے سے کہا کہ وہ بادشاہ سے اس کا ہاتھ مانگ لے۔"

"اس کا بھلا کیا مطلب ہوا؟"

"اس کا مطلب یہ کہ وہ بادشاہ سے درخواست کرے کہ وہ شہزادی کی شادی اس کے ساتھ کر دے۔"

"تو کیا بادشاہ نے ان دونوں کی شادی کر دی۔" اظاہر عجلت میں بولا۔

"تم بیچ میں ٹانگ نہ اڑاؤ تو شاید ہو جائے..... ظالم سماج کی طرح بار بار سامنے آ کھڑے ہوتے ہو۔" شاذان اظاہر کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولا تو فرجاد نے مسکرا کر دونوں کی طرف دیکھا۔

"نہیں بیٹا! ان کی شادی نہیں ہو سکتی تھی شہزادی امیر تھی اور شہزادہ غریب۔ پھر بھی شہزادے نے بادشاہ سے کہا کہ وہ شہزادی کو ہر طرح خوش رکھ سکتا ہے۔ پر بادشاہ نے شہزادے کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ شہزادی کے پانچ بھائی جو اصل میں دیو تھے وہ اس شہزادے کے دشمن ہو گئے شہزادہ اپنے گھر چلا گیا چپ چاپ۔ لیکن شہزادی کو بادشاہ کے رویے پر بہت دکھ

تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شہزادے کے ساتھ چلی جائے گی اپنا محل اور ساری دولت چھوڑ کر۔" فرجاد کی نگاہیں دور خلاؤں کے پار جیسے کسی نکتے پر مرکوز تھیں۔ باہر سے گزرتے بابر شاہ وہیں کھڑکی کے قریب رک گئے تھے۔

"پھر کیا ہوا انکل..... کیا شہزادے کو دیووں نے مارا؟"

"نہیں..... شہزادہ ان کے ہاتھ ہی نہیں آیا۔ لیکن انہوں نے شہزادی پر ظلم ڈھانے شروع کر دیے ایک دن شہزادی تنگ آ کر اپنا سب کچھ چھوڑ کر شہزادے کے پاس چلی گئی۔"

"واہ یہ ہوئی نا بات..... بڑی بہادر شہزادی تھی۔" شاذان خوش ہو کر بولا۔

"ہاں شہزادی بہت بہادر اور حوصلے والی تھی۔ شہزادے نے اس شہزادی کا ملک چھوڑ دیا اور اسے لے کر ایک دوسرے ملک میں اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا۔ وہاں جا کر شہزادے نے ایک چھوٹا سا گھر بنایا اور اپنے دوست کے ساتھ کاروبار کرنے لگا۔ ان دونوں کی زندگی میں بہت سکون تھا اور پھر جب انہیں یہ پتا چلا کہ ان کے گھر ایک اور ننھا شہزادہ یا شہزادی آنے والا ہے تو وہ دونوں خوشی سے پاگل ہو گئے۔ شہزادہ جی جان سے اس کا خیال رکھتا تھا وہ تھی ہی اتنی پیاری..... لیکن شہزادے کا دوست در پردہ اس کا دشمن بنتا چلا گیا۔ اس کی نیت شہزادے کی دولت پر بھی تھی اور شہزادی پر بھی پھر جب ایک دن وہ کام کے سلسلے میں کسی دوسرے ملک گئے ہوئے تھے شہزادے کے دوست نے سیر کا پروگرام بنایا اور پھر جب سیر کرنے کے لیے وہ کسی پہاڑی علاقے میں گئے تو شہزادے کے دوست نے اسے پہاڑ پر سے دھکا دے دیا۔"

"تو کیا شہزادہ مر گیا اور انکل..... اس ننھے منے شہزادے کا کیا بنا۔" انا جو بڑی محویت سے سن رہی تھی اسے کہانی میں بہت دلچسپی محسوس ہوئی۔ فواد اس سارے دورانیے میں نہایت خاموشی سے فرجاد کا جائزہ لیتے رہے۔

"پتا نہیں شہزادہ مر گیا یا بچ گیا..... یہ بھی نہیں پتا کہ ننھا شہزادہ تھا یا شہزادی۔ شہزادے کو تو اپنی شہزادی کی بھی خبر نہیں — کہ وہ کس حال میں ہو گی۔" بات ختم کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"انکل کہاں جا رہے ہیں آپ۔"

"میں..... میں جا رہا ہوں..... میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔" وہ یکدم ہی ڈسٹرب نظر آنے لگا تھا ان کے کمرے سے نکلنے کے بعد آہستہ آہستہ سبھی اٹھ کر چلے گئے۔ تو بابر شاہ اندر داخل ہوئے۔

"فہدی..... کیا ہو رہا تھا بیٹا۔" وہ کہتے ہوئے فواد کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

"ابو..... کچھ خاص نہیں اصل میں انکل جب سے آئے ہیں بالکل خاموش خاموش سے رہتے ہیں۔ سو ان کو ذرا انجوائے کرانے مل بیٹھے تھے کہ شاید ماحول کی خوشگواریت ان کی سوگواری کو کم کر دے۔"

"تو اس نے تم لوگوں کے ساتھ گفتگو میں حصہ لیا یا نہیں۔"

"بچوں کو ایک کہانی سنائی بس۔"

"اس کے بولنے سے کچھ اندازہ لگایا تم نے۔" بابر شاہ نے پوچھا۔

"جی ابو! وہ نائنٹی فائیو پرسنٹ ٹھیک ہو چکے ہیں۔ بس — محض ایک خول سا ہے جو انہوں نے اپنے اردگرد چڑھا رکھا ہے۔ جب یہ خول بھی ٹوٹ گیا تو سمجھیں بالکل ٹھیک ہو جائیں گے ان شاء اللہ اور ایسا بہت جلد ہو گا۔" فواد پر یقین لہجے میں بولے۔

اس کی کہانی بچوں کے لیے تھی۔ لیکن فواد کو بہت سے کلیو مل گئے انہیں لگا یہ اس کی اپنی کہانی تھی..... گویا فرجاد کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا اس کا ذمہ دار اس کا دوست ہے اور پھپھو کے ساتھ جانے اس نے کیا سلوک روا رکھا ہو گا..... کیا خبر وہ زندہ بھی ہیں یا..... فواد اس سے آگے نہ سوچ سکے۔

"تم کس سوچ میں گم ہو گئے میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ ایس پی صاحب دو تین دنوں کے لیے لاہور جا رہے ہیں اپنے آفیشل کام کے سلسلے میں اور انہوں نے ہمیں بھی ساتھ جانے کو کہا ہے تاکہ آریان والا معاملہ بھی لگے ہاتھوں نبٹا لیا جائے۔" بابر شاہ نے ظاہر ہی نہ کیا کہ وہ فرجاد کی ساری کہانی سن چکے تھے اور مسرت جہاں کے معاملے میں بھی قدرے مایوس ہو گئے تھے۔ اس لیے کہ فرجاد اب ٹھیک ہو بھی جاتا تو انہیں مسرت جہاں کے بارے میں شاید کچھ نہ بتا پاتا۔ بہرحال یہ تو بعد کی باتیں تھیں پہلے جو مسئلہ ان کے سامنے تھا اس کا حل بہت ضروری تھا۔

"تو ٹھیک ہے ابو چلتے ہیں ان کے ساتھ۔" فواد نے بھی ہامی بھر لی..... رات میں اماں بی کے کمرے میں جب بابر شاہ نے یہی بات تفصیل سے بتائی تو اظہر شاہ بھی ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ اماں بی خوش تھیں کہ آریان کی طرف اب میلی نگاہیں نہیں اٹھیں گی۔ اب وہ ایک گھر کی چار دیواری میں محفوظ ہو گی۔

"اماں بی آریان کے ساتھ ساتھ اس کی والدہ کا بھی رہائی پانا ضروری ہے۔ ورنہ یہ آزاد ہونے کے باوجود کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔" بابر شاہ نے کہا۔

"اور ابو دوسری بات یہ ہے کہ وہ بھی اس کی طرح بے گناہ ہیں۔ وہ کوئی پیشہ ور نہیں ہیں۔ ستارہ بیگم ان کی مجبوری کا سودا کر رہی ہے۔" فواد نے کہا۔

"ہاں..... اب ستارہ بیگم سے دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔" اظہر شاہ جوش سے بولے۔

علی الصبح وہ تینوں جانے کو تیار کھڑے تھے۔ سبھی گھر والے انہیں رخصت کرنے گیٹ تک آئے۔ اماں بی نے تینوں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا پیشانی چومی اور دعائیں دیں۔ آریان اماں بی کے پہلو سے لگی کھڑی تھی۔ فواد اماں بی سے پیار وصول کرنے کے بعد جانے کے لیے پلٹے پھر کچھ سوچ کر رک گئے..... رخ موڑ کر شریر نظروں سے آریان کی طرف دیکھ کر بولے۔

"مانا کہ آپ دعائیں نہیں دے سکتیں۔ لیکن دعا کر تو سکتی ہیں۔" آریان جھینپ گئی۔

"میں دعا کروں گی۔"

"بہت بہت شکریہ..... بڑی نوازش۔" لہجہ شرارتی اور آنکھوں میں جھلملاتی جوت" آریان نے خود کو اماں کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی۔

"اب آ جاؤ..... ایس پی صاحب ہمارے انتظار میں بیٹھے نہیں رہیں گے۔ فلائٹ میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔" اظہر چچا نے ہانک لگائی تو وہ مسکراتے ہوئے سب کو اللہ حافظ کہہ کر گیٹ سے باہر نکل گئے۔ آریان جانتی تھی کہ وہ ناممکن کو ممکن بنانے نکلے ہیں۔ اماں بی کے ہاتھ میں تسبیح کے دانے اوپر تلے گر رہے تھے۔ اور ہونٹوں پر جانے والوں کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

"الٰہی! تو جانتا ہے میرے بچے ایک نیک کام کی تکمیل کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ تیرا حکم ہے برائی کو روکو زبان سے ہاتھ سے کسی بھی طرح اور میرے بچے برائی کو روکنے کی خواہش لے کر گئے ہیں مولا تو ان کی مدد کرنا اس بچی کی عزت کا اب تو ہی محافظ ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ آریان بھی باقی سب کے ساتھ واپس ہو لی۔ یہ اور بات کہ اس کا رواں رواں ان سب کی کامیابی کے لیے دعا گو تھا۔

لاہور پہنچ کر ایس پی صاحب ان تینوں کے ہمراہ پہلے اپنی عارضی قیام گاہ گئے۔ جہاں انہوں نے ان تینوں کی رہائش کا بندوبست کروایا اور پھر سب ہی فریش ہو کر لاہور کے ایس پی زاہد صاحب کے آفس چل پڑے۔ وجہ یہ تھی کہ کامران صاحب سرکاری دورے پر تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے ریسٹ ٹائم میں ان کا معاملہ دیکھنا تھا۔ سو وقت ضائع کیے بغیر وہ انہیں اپنے ہمراہ لے کر زاہد صاحب کی طرف آ گئے۔ وہاں ان کا بہت اچھی طرح استقبال کیا گیا۔ زاہد صاحب پولیس میں ہونے کے باوجود خاصی خوش گوار طبیعت کے مالک تھے۔

کامران نے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

"ہوں..... میرے بھائی معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے..... بڑے سبھاؤ سے حل کرنا پڑے گا ستارہ بیگم کا نام تو بڑے اونچے اسٹیٹس کے لوگوں میں لیا جاتا ہے۔ بڑی

مضبوط معاشرتی ساکھ رکھتی ہے وہ۔۔۔ اس پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں۔" زاہد صاحب سنجیدگی سے بولے۔

"کیا مطلب؟ کیا پولیس اس معاملے میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔"

"ارے بھائی میرے! پولیس کا خیال تو تم اپنے ذہن سے نکال ہی دو۔ قانون اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ہم اس پر ہاتھ ڈال بھی دیں تو اس کا محض ایک فون پورے تھانے کے عملے کی پیٹیاں اتروا سکتا ہے۔"

"تو پھر۔۔۔" کامران شش و پنج میں مبتلا ہو کر بولے۔

"تو پھر یہ کہ اس کو کسی قسم کی دھمکی دینے کی بجائے۔۔۔ اس پر کوئی دباؤ ڈالنے کی بجائے اس سے طریقے سے بات کرنی ہوگی۔" زاہد صاحب نے کہا۔

"وہی تو پوچھ رہے ہیں وہ کون سا طریقہ ہے۔" فواد پہلی بار بولے۔ بابر شاہ اور اظہر اس تمام وقت میں خاموش رہے۔

"یہ اس طرح کہ ہمیں خود کو اس کے رنگ میں رنگ کر اس سے ملاقات کرنی ہوگی۔ ہم ایک خریدار کی حیثیت سے اس سے متعارف ہوں گے۔ بعد میں آہستہ آہستہ اس کو اپنی لائن پر لے آئیں گے۔"

"لگتا ہے ستارہ بیگم کی بڑی دہشت ہے لاہور میں۔" اظہر شاہ طنز سے بھرپور لہجے میں بولے۔ انہیں ایس پی زاہد جیسے عہدیدار کے منہ سے ایک طوائف کے بارے میں اس طرح کی باتیں اچھی نہیں لگیں۔

"دیکھیے جناب! ہم اس سے ڈرتے نہیں لیکن مصلحت سے کام لیتے ہیں۔ ہم اس پر دباؤ ڈالنا چاہیں تو ڈال سکتے ہیں لیکن جواب میں کیا ہوگا۔ کسی وزیر کسی مشیر کا بھانجا، بھتیجا، بیٹا اس کے ہاں آنے جانے والا چند لمحوں میں ہی اس کی جان چھڑوا دے گا۔ یہ ایک چین ہے میرے بھائی، بڑے بڑے عہدیداروں اور کوٹھے والوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لیے یہاں مصلحت سے کام لینا ہماری مجبوری ہے۔ بہرحال آپ کامران کے ساتھ آئے ہیں۔ سو میرے لیے انتہائی محترم ہیں۔ میری کوشش یہی ہوگی کہ پہلی فرصت میں آپ کا کام کیا جائے۔ جس کی خاطر آپ اتنی دور سے یہاں آئے۔" زاہد صاحب، اظہر شاہ کے طنز کو نظر انداز کر کے بہت دھیمے لہجے میں بولے۔

"تو بھائی اس مسئلے پر اب کرنا کیا ہے؟" کامران نے سوال کیا۔

"کامران آج تو دو تین بہت ضروری کام ہیں۔۔۔ کل شام دو چار سول کپڑوں میں پولیس والوں کے ہمراہ وہاں چلیں گے۔ ماحول بھی دیکھ لیں گے اور مناسب وقت دیکھ کر ستارہ بیگم سے بات بھی کر لیں گے۔"

"پھر ہم چلیں۔۔۔" کامران اٹھے تو فواد، بابر شاہ اور اظہر شاہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ایز یو لائیک۔۔۔ لیکن کل شام تیار رہنا۔" سب سے باری باری مصافحہ کرتے ہوئے انہوں نے کامران سے کہا تو سر ہلاتے ہوئے ان تینوں کے ہمراہ آفس سے باہر نکل آئے۔ بابر شاہ اس دوران کچھ نہیں بولے تھے۔ لیکن سوچوں کا ایک طویل آسمان تھا جس پر ان کا تخیل محوِ پرواز تھا۔

☆☆☆

آج کا دن اپنے جلو میں بہت سی ہلچل لیے آیا تھا ستارہ بیگم کا جوش و خروش دیدنی تھا شہر کے ایس پی صاحب آج اس کے دولت کدے کو رونق بخشنے آ رہے تھے۔ صبح صبح انہوں نے فون کر کے اپنی آمد کا بتا دیا تھا اور ستارہ بیگم اچھی طرح جانتی تھی کہ ان اونچے لوگوں کو کس طرح مٹھی میں کیا جاتا ہے۔

"چاندنی! کیوں منہ سر لپیٹے پڑی ہے۔" چاندنی کو بستر میں دراز دیکھ کر وہ بولی۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"شام میں ایس پی صاحب آ رہے ہیں چند خاص مہمانوں کے ساتھ۔ محفل میں کسی چیز کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔۔۔ بستر چھوڑ اور تیاری کر۔۔۔ چل اٹھ شاباش۔"

"باجی جی! آج میں محفل نہیں کر سکوں گی۔ دو تین دن سے مجھے شدید بخار ہو رہا ہے۔" چاندنی نے اسے ٹالنا چاہا۔

"نہ چاندنی! ایسا نہ کر۔" اس نے کہا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ بولی۔

"چل ٹھیک ہے زیادہ نہیں پر ایک گیت تو تجھے گانا پڑے گا ایس پی مٹھی میں آ گیا تو سمجھ لاہور پر راج ہو جائے گا ہمارا۔" ستارہ بیگم خلا میں نظریں جماتے ہوئے بولی۔

"اچھا۔۔۔" چاندنی آزردہ لہجے میں بولی۔

ستارہ بیگم کمرے سے نکل گئی تو چاندنی بستر پر اٹھ بیٹھی۔ دائیں طرف دیوار میں لگے قد آدم آئینے میں اس نے اپنے مضمحل سراپے پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں اپنی چمک اور رعنائی تقریباً کھو چکی تھیں سیاہ گھنیری زلفوں کے بیچ کہیں کہیں چاندی کے تار دکھائی دے رہے تھے۔ حوادث زمانہ نے اس کی صبیح پیشانی پر چند ریکھائیں کھینچ ڈالی تھیں۔ وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"گویا میری سزا اب ختم ہونے والی ہے چڑھتے سورج کے پجاریوں کو ڈھلتے ہوئے سورج کی پھیکی روشنی کہاں بھا سکتی ہے۔" وہ دل میں خود سے مخاطب تھی۔ اس کی چمک ماند پڑ رہی تھی اور ستارہ بیگم کی جہاندیدہ نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ چراغ اب کم روشنی دے رہا ہے سو اس کا نعم البدل اس نے آریان میں تلاش کر لیا۔

"تمہاری سزا ختم نہیں ہوئی چاندنی بی بی بس اس کی نوعیت بدل گئی ہے۔" چاندنی کے دماغ نے سرگوشی کی۔

"کیا مطلب؟" وہ جیسے تڑپ اٹھی۔

"ہاں! اصل سزا تو اب شروع ہوئی ہے۔ تم سمجھ رہی ہو اس لیے اب اس کوٹھے کے ایک اسٹور میں تمہارے لیے تھوڑی سی جگہ بنائی جائے گی جہاں زندگی کے آخری ایام نوے فی صد طوائفوں کی طرح تم خون تھوکتے اور بیماریوں سے برسرپیکار ہو کر گزار دو گی۔۔۔ لیکن چاندنی! تمہاری جگہ کون لے گا۔۔۔ آریان۔۔۔ آریان لے گی تمہاری جگہ۔۔۔ اس کے پیروں میں گھنگھرو ہوں گے اور زلفوں میں پھول۔ اب تمہاری جگہ وہ تماش بین کی ننگی نظروں کا سامنا کرے گی۔" دماغ ایک حقیقت کا نشتر اس کی روح میں اتار رہا تھا اور وہ تڑپ رہی تھی۔

"نہیں! ایسا نہیں ہوگا۔۔۔ میں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

"پھر کیا کرو گی تم؟" دماغ استہزائیہ انداز میں بولا۔

"کچھ بھی۔۔۔ کچھ بھی کر گزروں گی لیکن آریان کو یہاں سے بچاؤں گی۔" چاندنی کرب میں ڈوبی آواز میں بڑبڑائی۔

"میں ستارہ بیگم کی ہر بات مانوں گی۔ بس اس سے التجا کروں گی کہ آریان کا پیچھا چھوڑ دے۔ وہ جہاں ہے اسے وہیں رہنے دے۔ اس کے بدلے میں، میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔" وہ مصمم ارادہ کرتے ہوئے بستر سے اٹھی۔ گالوں پر پھسل آنے والے بے بس آنسو بے دردی سے ہتھیلی سے رگڑ ڈالے۔ آئینے سے صرف نظر کرتی وہ کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھی۔ شام کو محفل تھی اور اسے آنے والے خاص مہمانوں کا خاص انداز سے سواگت کرنا تھا۔ اپنے مرجھائے ہوئے پھولوں جیسے گالوں کو غازے سے تر و تازہ کرنا تھا۔ اپنے سراپے کو قیامت خیز بنانا تھا۔ اسے بھولنا تھا کہ وہ ایک ماں ہے۔ بس وہ ایک طوائف ہے اور طوائف کبھی ماں، بہن، بیٹی نہیں ہوتی۔

سورج ڈھل چکا تھا۔ ہال کمرے میں سرخ قالینیں بچھی ہوئی تھیں اور چاروں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ گدے بچھا کر گاؤ تکیے لگائے گئے تھے۔

ہال کے وسط میں چھت پر لگے فانوس کی روشنی نے عجیب سا جادوئی تاثر بنا دیا تھا۔ آنے والے مہمانوں کی دل بستگی کا ہر طرح سے سامان کر رکھا تھا ستارہ بیگم نے، چاندنی آج ایک طویل عرصے بعد تیار ہوئی تھی۔ سفید کمخواب کے غرارے پر سرخ قمیص پہنے بڑا سا سرخ اور سفید کنٹراسٹ کا دوپٹہ اوڑھے لمبے بالوں کی چٹیا میں موتیے کے پھول گوندھے ہوئے اور ہاتھوں،

کانوں اور گلے میں پھولوں کے گہنے پہنے ہوئے وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ ستارہ بیگم نے بڑھ کر اس کی بلائیں لے ڈالیں۔

"اے چاندنی تو تو اب بھی قیامت ہے..... تجھے کو کتنا سمجھایا۔ آجا ہماری لائن پر..... ارے لگ جاتی نا دھندے سے تو دولت تیرے گھر کی باندی ہوتی پر تو تو سدا کی جھلی رہی رے۔ اب رانی بٹیا کو سمجھاوے..... غلام عباس جا کر لے آئے گا اسے۔ ہم خود سمجھاویں گے۔" ستارہ بیگم اپنی بات مکمل کر کے آگے بڑھ گئی اور چاندنی جیسے پتھر کے مجسمے کی طرح وہیں گڑی کی گڑی رہ گئی۔

"یہ نظریں..... یہ آدم خور نظریں کھا جائیں گی اسے..... میری بیٹی کو کھا جائیں گے یہ سب لوگ مل کر..... یہ اسے جینے نہیں دیں گے۔" وہ سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔ لیکن وجود کے اندر جیسے زلزلے برپا تھے۔ وہ مردہ قدموں سے چلتی واپس اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ اس کی روح کسی پتے کی طرح لرز اٹھی تھی۔

"میرے مولا! میری سزا معاف کر دے۔ میرے پالنے والے تو جانتا ہے ایک چھوٹی سی خطا کی تھی لوگ تو کتنے بڑے بڑے گناہ کر کے بھی تیری زمین پر گردن اکڑا کر چلتے ہیں۔ ارے میں تو جیتے جی مرتی رہی ہوں۔ پچھتاؤں کی آگ میں جل جل کر خاکستر ہوتی رہی ہوں۔ کب تک سزا دے گا مجھے..... کب تک خزاؤں کی زد میں رہے گا میرا وجود..... اے رحیم و کریم! ایک ہی بار موت کیوں نہیں دے دیتا مجھے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ پتا نہیں کتنا رو چکی تھی وہ کہ آنکھوں کے سوتے بھی خشک ہو گئے تھے۔ مگر شاید اس کے آنسو بھی اس کی طرح بے قیمت تھے۔ اوپر والے کو ان آنسوؤں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں گم..... جب ستارہ بیگم نے دروازہ سے اندر جھانکا۔

"چاندنی! مہمان آنے والے ہیں..... تیار رہنا۔"

اس نے جواب میں نہ سر اٹھایا تھا اور نہ ہی کوئی بات کی تھی۔ ستارہ بیگم بھی اس کے جواب کا انتظار کرنے کی بجائے اپنی بات کہہ کر ہال کمرے کی طرف جانے لگی۔ اسی پل بیرونی جانب سے غلام عباس آتا دکھائی دیا۔

"مہمان آگئے بڑی بائی جی۔" اس نے آکر بتایا۔

ستارہ بیگم پرجوش انداز میں تیزی سے دروازے تک آئیں۔ ایس پی صاحب کے ہمراہ چار افراد اور بھی تھے۔ ستارہ بیگم نے ان کے اندر داخل ہوتے ہی ہاتھ میں پکڑے پھول ان کے قدموں میں رکھ دیے۔

☼ ☼ ☼

زندگی بھی بعض اوقات کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ جس گھر کی دہلیز پر پاؤں رکھنے پر اسے دھکے اور ٹھوکریں ملی تھیں۔ جہاں کے در و دیوار نے اس کی تضحیک کی تھی۔ جن رشتوں نے اس کی ذات کو اس کا جرم قرار دے کر تسلیم نہیں کیا تھا۔ آج وہ ان سب کے درمیان تھا۔ ان کے قریب اتنا کہ ہر رشتے سے منسلک شخص کا قرب اسے میسر آگیا تھا یہاں تک کہ اماں بی کی پیاسی نگاہوں میں بھی اس نے اپنے لیے ایک محبت بھرا سوز پایا تھا۔ ان سب کی توجہ اور محبتیں پا کر یقیناً" وہ خود پر نازاں ہوتا لیکن اب وہ خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔

"وہ جو میری خاطر اس عالیشان گھرانے کی عزت قدموں تلے روند کر میرے ساتھ ہم سفری کے خواب دیکھتے ہوئے دہلیز پار کر گئی۔ میں نے کیا کیا اس کے لیے..... کانٹے ہی کانٹے بچھا دیے اس کی راہوں میں۔ اپنے محبت میں اندھا ہو کر میں نے اس پر بھی زندگی تنگ کر دی۔ خدا جانے کہاں ہو گی وہ، کس حال میں ہو گی؟ اس کی کوکھ میں پلنے والی میری نشانی اس دنیا میں سانس بھی لے پائی ہو گی یا....." کئی بار ان سوچوں نے اس کے وجود و روح کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"یہ سب بچے جو میرے ارد گرد اپنی محبتوں کا حصار کیے ہوئے ہیں جانتے ہیں کہ میں ان کے لیے غیر نہیں۔ ان کا اپنا ہوں ایک ایسا رشتہ میرے وجود سے وابستہ ہے جس سے برسوں اس گھر کے مکینوں نے نظریں چرائی ہیں۔ یہ بچے میرے وجود میں اسی رشتے کی آسودگی ڈھونڈتے ہیں اور میں، میں ان سب کی محبتوں کے آگے ہارنے لگتا ہوں۔ زندگی کے روز و شب میرے لیے محض اذیت کے سوا کچھ نہیں۔ محبتیں بچپن سے میرے لیے بس ایک حسین خواب رہی ہیں۔ شاید یہ بچے جانتے ہیں کہ میں ہر زنجیر توڑ سکتا ہوں لیکن محبت کی زنجیر نہیں توڑ سکتا تبھی تو میرے پیروں میں محبتوں کی بیڑیاں ڈال دی ہیں انہوں نے..... لیکن میں، مجھے ان زنجیروں کو توڑنا ہو گا۔ اس لیے نہیں کہ ان سب کو دکھ پہنچاؤں، اس لیے کہ ان سب کو ان کے ایک گمشدہ حصے سے ملانے کے لیے مجھے یہاں سے جانا ہو گا میں اسے تلاش کروں گا۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اس وقت سادات نگر کے ہر مکین کی نگاہیں اسی پر جمی ہیں ہر ایک کی سوچ کا محور اس وقت اسی کی ذات ہے۔ وہ سب اس کی ذات سے ایک امید وابستہ کیے ہوئے ہیں۔

تبھی تو اس کے ٹھیک ہونے کی جلدی تھی۔ اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جب یہ سب جان لیں گے کہ وہ ٹھیک ہو چکا ہے تو ان سب کا پہلا سوال مسرت جہاں کے بارے میں ہی ہو گا۔ اس کے دماغ میں سوچیں کسی لاوے کی طرح پک رہی تھیں۔

"اس سے پہلے کہ سب جان جائیں کہ میری ذہنی کیفیت اعتدال پر آ چکی ہے۔ مجھے یہاں سے جانا ہو گا..... جتنی محبتیں سمیٹنی تھیں سمیٹ لیں..... جتنی رفاقت میسر آنی تھی آچکی۔

میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو ان سب کی سوالیہ نگاہیں بھی دکھائی نہیں دیں گی۔ بس ایک دو دن..... پھر میں چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا بالکل اسی طرح جیسے اکیس سال پہلے مسرت جہاں چپ چاپ یہاں سے چلی گئی تھی۔" اس نے دل ہی دل میں پختہ ارادہ کر لیا۔ صرف دو دن بعد وہ یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ یہاں صرف اسی صورت میں آئے گا جب اس کے ہمراہ مسرت جہاں ہوں گی۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو وہ اس دنیا کی بھیڑ میں ایسے کھو جائے گا کہ پھر خود کو بھی تلاش نہ کر سکے۔

☼ ☼ ☼

"فہدی بس کرو چلو اب..... پہلے ہی کافی لیٹ ہو گئے ہیں ہم۔" بابر شاہ نے گھڑی پر ایک نظر ڈال کر فواد کو مخاطب کیا جو آئینے کے سامنے کھڑے ٹائی کی ناٹ درست کر رہے تھے۔ اس وقت وہ، اظہر شاہ، بابر شاہ اور ایس پی کامران ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں موجود تھے۔

مغرب کی اذان میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔ وہ سب ایس پی خاور ملک کی طرف جانے کے لیے تیار تھے۔ فواد نے ناٹ ٹھیک کرنے کے بعد ہینڈ بیگ ہاتھ میں لیا اور وہ سب کمرے سے نکل آئے۔ اظہر شاہ اور بابر شاہ نے گاڑی کی پچھلی نشستیں سنبھال لیں۔ فواد فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئے جبکہ ایس پی کامران ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ ابھی انہوں نے گاڑی اسٹارٹ نہیں کی تھی کہ موبائل کی بیل بج اٹھی۔ ایس پی کامران نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔ کال خاور ملک کی تھی۔

"یار کامران! کہاں رہ گئے ہو تم لوگ، میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں..... وہ لوگ ہمارے منتظر ہوں گے۔ میں انہیں فون کر کے اپنی آمد سے مطلع کر چکا ہوں۔"

"بس خاور بھائی! ہم نکلنے ہی والے تھے۔" کامران نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے پھر جلدی پہنچو.....؟" ایس پی خاور ملک نے ریسیور رکھ دیا۔ کامران نے گاڑی اسٹارٹ کی اور قدرے تیز رفتاری سے بیک کرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکال لے گئے۔ مصروف شاہراہوں پر مناسب حد تک تیز رفتار ڈرائیونگ کرتے ہوئے تقریباً" دس منٹ میں وہ ایک عالیشان بنگلے کے سامنے موجود تھے۔

بہت بڑے آہنی گیٹ کے سامنے بیٹھا ہوا گن برادر چوکیدار انہیں گاڑی روکتے دیکھ کر چوکس ہو گیا تھا۔ کامران نے گاڑی بالکل اس کے قریب روکی۔

"صاحب کو بلاؤ...." کامران نے بغیر کسی تمہید کے حکمیہ لہجے میں کہا۔

چوکیدار کچھ مرعوب سا ہو کر پلٹا اسی پل آہنی گیٹ کے قریب لگا بغلی دروازہ کھلا اور اس میں سے ایس پی خاور ملک برآمد ہوئے۔ غالباً" انہوں نے گاڑی رکنے کی آواز سن لی تھی۔

"ہم اس وقت ایک گھنٹہ لیٹ ہو چکے ہیں کامی۔" ایس پی خاور ملک نے کامران کو مخاطب کیا جنہوں نے ان کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

"تو کیا آپ نے ان کے ساتھ ٹائم فکس کر رکھا تھا؟"

"ہاں میں نے فون پر ان سے وقت لے لیا تھا اور وہاں بھی ہمارے منتظر ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟ ہم کیا وہاں تماش بین بن کر جا رہے ہیں۔" اظہر شاہ تنک کر بولے۔

"ارے صاحب! ہمارا وہاں جانے کا مقصد کیا ہے۔ یہ تو صرف ہم جانتے ہیں نا۔ وہ تو یہی جانتے ہیں اور شہر کا ایس پی آج ان کے ہاں جا رہا ہے۔" ایس پی خاور ملک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گاڑی اس وقت نسبتاً" پرسکون ایریا سے گزر رہی تھی۔

"کامی تمہارے نزدیک اس مسئلے کو کس طرح ہینڈل کیا جائے۔ تم نے اس پر کوئی ہوم ورک کیا؟"

"کیا مطلب خاور بھائی؟ میں سمجھا نہیں۔"

"بھئی یہاں تک تو معاملات اور حالات کس حد تک درست رہے ہیں۔ لیکن اب معاملہ صرف ہمارے درمیان نہیں رہے گا۔ اب دوسرا فریق بھی اس میں شامل ہو جائے گا۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اب آگے کیا کرنا ہے کچھ اس بارے میں سوچا۔ وہاں جا کر کیا کرنا ہے کیا کہنا ہے؟"

"ملک صاحب! کہنا کیا ہے۔ جس مقصد کے لیے آئے ہیں اسے پورا کرنا ہے۔ بس دو لفظی بات ہی تو کرنی ہے۔ ہم کون سا کسی مباحثے میں شرکت کرنے جا رہے ہیں۔" اظہر شاہ مضبوط لہجے میں بولے۔

"شاہ جی! مقصد کے حصول کے لیے تگ و دو بھی تو کی جاتی ہے۔ ہم جس کام کے لیے جا رہے ہیں۔ وہ اتنا معمولی نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہے ہیں اور نہ ہی یہ دو لفظوں میں نمٹنے والی بات ہے۔" خاور ملک معاملے کی گہرائی اور الجھاؤ کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔

"اتنا غیر معمولی بھی نہیں ہے ملک صاحب! بھلا ہم چار پانچ مرد مل کر ایک عورت کو نہ ہینڈل کر سکیں گے۔"

"شاہ جی! آپ شاید اس قسم کی عورتوں کے بارے میں معلومات نہیں رکھتے' وہ کوئی مجبور و بے بس حالات کی چکی میں پسنے والی مظلوم عورت نہیں۔ بازار حسن کی سب سے مشہور نائکہ ہے۔ بڑے بڑے بیوروکریٹس اس کی ایک جنبش ابرو پر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔" خاور ملک بولے۔

"لیکن اس کی پہنچ سے ڈر کر ہم پیچھے تو نہیں ہٹ سکتے.... گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو انگلیاں ٹیڑھی بھی کی جا سکتی ہیں۔"

"اظہر صاحب! جوش سے نہیں ہوش سے کام لیں۔ آپ کوئی نو عمر یا غیر ذمہ دار شخص تو نہیں کہ معاملے کی سنگینی اور نزاکت کو نہ سمجھ سکیں۔ اس وقت بال ستارہ بیگم کے کورٹ میں ہے۔ سو ہمیں نہایت طریقے سے چلنا پڑے گا۔ ہمیں مسئلے کو حل کرنا ہے۔"

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ بجائے اس عورت سے ڈرنے کے اپنا مدعا اس کے سامنے بیان کر دیں گے سیدھی طرح مان گئی تو ٹھیک ورنہ پھر کوئی اور طریقہ استعمال کرنا پڑے گا۔"

"دیکھیے۔ ہم اس عورت سے ڈر نہیں رہے اور نہ ہی اپنا مدعا بیان کرنے کی ہمیں جلدی ہے۔ پہلے اسے رام کر کے اپنے ٹریک پر لانے کے بعد اصل مقصد پر آئیں گے تو ہمیں کامیابی حاصل ہو گی۔ آپ ایک کاروباری شخص ہیں۔ یہی سمجھ لیں کہ ہم یہاں ایک ڈیل کرنے جا رہے ہیں۔ ایک ٹینڈر پاس کروانا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں بہت سوچ سمجھ کر چلنا ہے کہ ہر امیدوار کو کک آؤٹ کر کے مالک اپنی دلچسپی کو پس پشت ڈال کر وہ ٹینڈر ہمارے حوالے کر دے۔ ایک بزنس مین سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس قدر مشکل ڈیل ہے۔ ہم اسے نہ تو مجبور کر سکتے ہیں اور نہ ہی طاقت کے زور پر اپنی بات منوا سکتے ہیں۔ پھر یہی ہے کہ معاملہ کمیونیکیشن کے ذریعے حل ہو اور اگر اس سچویشن میں آپ کچھ سخت سست کہیں گے تو معاملہ الٹ بھی ہو سکتا ہے۔" خاور ملک نے انہیں رسانیت سے سمجھایا۔

"ملک صاحب! کیا اس سلسلے میں آپ کے اختیارات بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ بالفرض محال اگر ہمیں قانون کا راستہ اختیار کرنا پڑے تو کیا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"قانون.... کون سے قانون کی بات کر رہے ہیں' اظہر صاحب! ہم جیسے بظاہر با اختیار لوگ انہیں اختیارات کی ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والوں نے قانون کو کھیل بنا رکھا ہے۔ ان کے ہاتھ میں ڈوریاں ہیں اور قانون کے اصول کٹھ پتلیاں۔ جیسے چاہیں نچا دیں اور یہ ستارہ بیگم اور اس جیسی ہم سے زیادہ با اختیار ہوتی ہیں کہ قانون بنانے والے ان کے تلوے چاٹتے ہیں۔ ہم ان پر ہاتھ ڈال بھی دیں تو اگلے دن اوپر سے ان کی سفارش آ جائے گی ان کے بڑے بڑے لنکس ہماری پیٹیاں تو اتروا سکتے ہیں لیکن ہم ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔" خاور ملک کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"حیرت ہے! ایک بیوروکریٹ ہو کر آپ اس طرح کی بات کر رہے ہیں۔ آپ چاہیں تو کیا نہیں ہو سکتا۔ پورے شہر کے حاکم ہیں آپ۔"

"نہیں اظہر صاحب! حاکمیت تو دور کی بات ہم تو خود حکم کے غلام ہیں۔ ہم جیسے بیوروکریٹس کو تو ستارہ بیگم جیسی عورتیں چٹکی میں مسل دیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ایک اسلامی مملکت میں جہاں کھلے عام گناہ کبیرہ کی دعوتیں دی جاتی ہیں۔ قحبہ خانے اور ریڈ لائٹ ایریاز ہیں۔ یہ سب ہماری یا ہمارے قانون کی نگاہوں میں نہیں ہیں۔ ایسی بات نہیں ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن ان لوگوں کے پاس کچھ ایسے قانونی جواز ہوتے ہیں۔ جن کی بنا پر ہم ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ پھر ان لوگوں کی پشت پناہی کرنے والوں کی بے حساب طاقت کے سامنے بھی ہمارا اپاہج قانون نہیں ٹک سکتا۔ یہ اگر اتنا آسان ہوتا تو یہ کوٹھے آپ کو آباد نہ دکھائی دیتے.... یہ ان ہی اونچے ایوانوں کے مالکان کے دم قدم سے ہیں۔" ایس پی خاور ملک نے ایک تلخ حقیقت بیان کی۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم سب نے ایک طوائف کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ ہم اس کی پہنچ سے خوفزدہ ہو گئے ہیں۔" اظہر شاہ کا لہجہ جھنجھلایا ہوا تھا۔ ایس پی خاور ملک نے ایک نظر ان کے چہرے کے طنزیہ تاثرات پر ڈالی اور گویا ہوئے۔

"یعنی آپ کا خیال ہے کہ کسی قسم کا ہنگامہ کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جائے.... یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ.... لیکن سوری ٹو سے اظہر صاحب! یہاں مردانگی آزمانے کا نتیجہ مائنس زیرو کے سوا کچھ نہیں نکلے گا۔ بہرحال میرا مقصد تو آپ کو سمجھانا تھا۔ آگے آپ لوگوں کی مرضی...." خاور ملک کے لہجے میں ناراضی تھی۔ اظہر شاہ سے بات کرنے کے بعد انہوں نے ڈرائیونگ کرتے کامران کو مخاطب کیا۔

"کامی.... میرا خیال ہے میرا تم لوگوں کے ساتھ جانا بھی کچھ زیادہ فائدہ مند نہیں ہو گا اور میری کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں۔ گاڑی روکو میں واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"ارے' خاور بھائی ناراض نہ ہوں..... جیسے آپ بہتر سمجھیں گے اور کریں گے۔ ہم بھی وہی کریں گے۔" کامران سنجیدگی سے بولے۔

"میں ناراض نہیں لیکن میں اپنے کیریئر کو داؤ پر لگانا نہیں چاہتا۔ اب تک کے بے داغ کیریئر پر کوئی دھبا لگ جائے۔ کم سے کم یہ مجھے منظور نہیں۔ پھر میرا

خیال ہے کہ یہ معاملہ ان کا یا ستارہ بیگم کا ہے۔ یہ آپس میں جیسے چاہیں گے کرلیں گے۔" خاور ملک حقیقتاً" اظہر شاہ کی ضد سے نالاں تھے۔

"نہیں ملک صاحب! ہم آپ کے توسط سے جا رہے ہیں اس لیے آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ آپ اس مسئلے پر ہماری مدد کا وعدہ کر چکے ہیں اس لیے پلیز کول ڈاؤن اور اظہر یار تم بھی تحمل سے کام لو۔ ابھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔ محض مفروضے قائم کیے جا رہے ہو۔ دیکھو، جھگڑا یا ہنگامہ کسی مسئلے کا حل نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ہم حاجت مند ہیں سو ہمیں جھکنا پڑے گا۔ اگر وہ کچھ سخت سست سنائے بھی تو چپ کر کے سن لیں گے۔ اس لیے کہ مسئلہ دو افراد کی زندگی کا ہے۔ کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو جھکا لینے میں کوئی حرج نہیں۔" بابر شاہ پہلے خاور ملک سے اور بعد میں اظہر شاہ سے مخاطب ہوئے۔

"ٹھیک ہے، جس طرح آپ مناسب سمجھیں۔" ان کا لہجہ اور چہرے کے تاثرات بھی کسی حد تک نرم پڑ گئے۔ بابر شاہ نے طمانیت بھری سانس لے کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ خاور ملک کے تنے ہوئے اعصاب بھی کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ اس تمام عرصے میں فواد کچھ نہیں بولے تھے۔ ان کا ذہن مسلسل ادھیڑ بن میں تھا۔ وہ حالات کی نزاکت کو پوری طرح سمجھ رہے تھے۔ اور یہ بھی جان رہے تھے کہ جو مسئلہ انہیں درپیش ہے اس کا حل بے انتہا تحمل، بردباری اور سوجھ بوجھ سے ہی ہو سکے گا۔ ذرا سی بے احتیاطی ذرا سا اشتعال سارے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کو کافی تھا۔

"آریان اور اس کی ماں ستارہ بیگم کی ملکیت تھیں۔ وہ چاہتی تو انہیں آزاد کر دیتی، چاہتی تو ان کی قیمت لے لیتی یا پھر ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی قیمت پر ان دونوں کو نہ جانے دیتی کہ بہرحال وہ دونوں اس کے کاروبار کی بنیادی اکائیاں تھیں۔" بابر شاہ نے اظہر شاہ کو تو سمجھا دیا تھا۔ لیکن وہ متفکر تھے اس لیے کہ کوٹھے کا ماحول اور وہاں بسنے والوں کی ذہنیت کو وہ بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہاں پہنچ کر بھی اظہر شاہ کی طرف سے انہیں فکر لگی رہتی تھی کہ مزاج کے خلاف کوئی بھی بات سن کر وہ ہتھے سے اکھڑ سکتے تھے۔ بہرحال اوکھلی میں سر دے کر موسلوں سے ڈرنے والوں میں سے تو وہ بھی نہ تھے۔ اب جو ہونا تھا اسے فیس کرنا تھا۔

گاڑی چند ایک خوب صورت کوٹھیوں کے قریب سے گزر کر سڑک کے ایک طرف رک گئی۔

"یہاں سے پیدل آگے جانا پڑے گا۔ گاڑی آگے نہیں جا سکتی۔" خاور ملک اپنی جانب کا دروازہ کھولتے ہوئے بولے تو وہ سب بھی گاڑی سے نیچے اتر آئے۔

سڑک کے دائیں طرف قدرے کشادہ گلی تھی۔ خاور ملک اس گلی کی طرف چل پڑے تو باقی سب بھی ان کی تقلید میں آگے بڑھنے لگے۔ فواد نے بازار حسن کا صرف نام ہی سنا تھا۔ پہلی بار ایسی جگہ آئے تھے۔ انہیں یہ جگہ کوئی غیر معمولی نہیں دکھائی دی۔ دو منزلہ تین منزلہ مکانوں کی آمنے سامنے بنی قطاریں۔ کہیں سے کشادہ اور کہیں سے تنگ گلیاں تھیں کافی آگے آنے کے بعد وہ دوبارہ دائیں جانب مڑ گئے۔ بائیں طرف پان سگریٹ، بیڑی کی دو تین دکانیں تھیں۔ یہ گلی پچھلی گلیوں کی نسبت قدرے وسیع تھی اور لوگوں کی آمد و رفت بھی تھی۔ قدم قدم پر پھول بیچنے والے ہاتھوں میں پھولوں کی لڑیاں لیے کھڑے تھے اور ہر نووارد کی طرف لپکتے تھے۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ مکانوں کے اوپری چوبارے روشن ہو چکے تھے۔

فواد کی زیرک نگاہیں اردگرد کے ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔

بازار کی چہل پہل اور رونق دوچند تھی۔ کچھ فاصلے پر چند آدمی کھڑے بڑی تولتی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سرخ اور میرون کلر کے مفلر گلے میں ڈالے، مونچھوں اور بالوں کو تیل سے چپڑے، پان سے رنگے ہونٹوں والے، انگلیوں میں بیڑیاں دبائے ایک دوسرے سے سرگوشی میں باتیں کرتے فواد کو پہلی نظر میں ہی وہ کوئی تیسری دنیا کی مخلوق دکھائی دیے۔ وہ جن معنی خیز نظروں سے ان سب کو دیکھ رہے تھے ان نظروں کا مطلب سمجھ کر فواد کو کوفت محسوس ہونے لگی۔ ان کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور محرک وہ چھبیس ستائیس سالہ جواں تھا۔ جس نے ان کے بالکل قریب آکر خاور ملک کو سلیوٹ جھاڑا تھا۔ خاور ملک نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

"سر ہم....." اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ملک صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"گدھے! یہ کوئی جگہ ہے جہاں سلیوٹ جھاڑ رہے ہو۔ نان سینس۔" خاور ملک نے خشک لہجے میں کہا۔

"سوری سر۔" نووارد کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

"سوری کا بچہ۔" وہ دانت کچکچا کر بولے اور ساتھ ہی دزدیدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا کافی لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ خاص طور پر وہ تینوں جو غالباً" شکار پھانسنے کی نیت سے وہاں کھڑے تھے بڑی ٹٹولتی ہوئی نظروں سے ان سب کو دیکھ رہے تھے۔

"باقی تینوں کہاں ہیں....؟" بہت دھیمے انداز میں خاور ملک بولے۔

"سر وہ اس وقت بی سی اور ڈی پوائنٹ پر الرٹ ہیں۔" نووارد سرکاری زبان میں بولا۔

"گڈ! ہم اوپر جا رہے ہیں تم اصغر کو ساتھ لو اور دروازے کے آس پاس ہی رہنا۔"

"جی سر...." نووارد نے ان کی بات کے اختتام پر سلیوٹ مارنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ لیکن خاور ملک کی کاٹ کھانے والی نظروں سے گڑبڑا کر سر کھجاتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔

"ملک صاحب! یہ سب کیا ہے؟" بابر شاہ نے پوچھا۔

"سیکیورٹی! جس جگہ ہم اس وقت موجود ہیں یہاں دکھائی کچھ دیتا ہے اور اصل میں ہوتا کچھ اور ہے۔ بے شک ہم یہاں جھگڑے کے لیے نہیں آئے۔ لیکن پھر بھی ہر پہلو پر غور کرنا چاہیے۔" خاور ملک سرخ لکڑی کے جالی دار دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔

"لیجیے جناب! ہماری منزل آگئی' آئیے۔" ایس پی خاور ملک نے دروازہ کھولا اور سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ سیڑھیوں کے شروع میں بائیں طرف ایک دروازہ تھا۔ جو غالباً" نچلی منزل کے اندر داخل ہونے کا راستہ تھا۔ لیکن اس دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔

وہ سب آگے پیچھے قدم اٹھاتے زینہ طے کرتے چلے گئے۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک چار پانچ فٹ لمبی چوڑی بالکونی تھی۔ بالکونی میں کھڑے غلام عباس کو دیکھ کر بابر شاہ کی نگاہوں میں شناسائی کی رمق جاگی۔ وہ آج بھی اسی حلیے میں تھا۔ جس میں انہوں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ ان کی طرف بڑھنے کی بجائے ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتا تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ پانچوں بالکونی میں ایک پل کو رکے اور پھر لکڑی کے ایک بہت بڑے منقش دروازے کے کھلے پٹ سے اندر داخل ہو گئے۔

یہ ایک بہت بڑا کمرہ یا لاؤنج تھا۔ جس کی چاروں دیواروں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بند دروازے تھے۔ یہ لاؤنج یا کمرہ قدرے گولائی کی شکل لیے ہوئے تھا اور اس کے وسط میں گہرے نیلے رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ جس کے چاروں اطراف نہایت قیمتی صوفے گولائی میں بچھائے گئے تھے۔ چھت کے وسط میں لگا فانوس ست رنگی روشنیوں سے منور تھا۔ ابھی انہیں اندر آئے ایک آدھ منٹ ہی گزرا ہوگا کہ ایک تیکھے نقوش کی گدلائے ہوئے جسم کی مالک خوب صورت عورت ان کی طرف تیزی سے آتی دکھائی دی۔ سلیو لیس ہاف بلاؤز کے ساتھ بلیک شیفون کی ساڑھی اس کے گندمی رنگ کو عجیب سی تازگی بخش رہی تھی۔ شولڈر کٹ بالوں کو مصنوعی رنگ دیا گیا تھا۔ لیکن اس پر جچ رہا تھا۔ اپنے بے باک حلیے کے باوجود وہ بری نہیں لگ رہی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پھول سب سے آگے کھڑے خاور ملک کے قدموں میں رکھ دیے سواگت کا یہ انوکھا اور دلنشیں انداز ایک پل کو ان سب کو بہت اچھا لگا۔ فواد نے کوٹھوں کے بارے میں بہت عجیب و غریب باتیں سنی تھیں۔ لیکن اس وقت ان کا مشاہدہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔

"زہے نصیب! آج تو اپنے بھاگوں پر رشک آ رہا

ہے کہ ہمارے غربت کدے میں شہر کے بادشاہ نے قدم رکھ دیا۔" اس کا لہجہ دلنشیں تھا اور انداز من موہنے والا۔

"آپ یقیناً" ستارہ بیگم ہیں۔" خاور ملک نے تائید طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ انہیں اپنی یہ پذیرائی اچھی لگی تھی۔

"جی ہاں! کنیز کو ستارہ بیگم کہتے ہیں۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔ اس کی نظریں ایس پی خاور ملک کے چہرے سے پھسل کر ان کے ہمراہ آنے والے چہروں کو ٹٹول رہی تھیں۔ یہ چہرے یہاں آنے والے چہروں سے بالکل مختلف تھے۔

"آیئے..... اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔" وہ انہیں اپنے ہمراہ لیے ہوئے آگے بڑھی۔

بابر شاہ اتنی دیر میں اس کی شخصیت کو کسی حد تک کھنگال چکے تھے اور ان کا خیال تھا کہ بظاہر ستارہ بیگم جس قدر شائستہ دکھائی دے رہی ہے اس قدر ہے نہیں۔ یہاں کی روایات میں بناوٹ کی روایت تو ہمیشہ سے زندہ رہی ہے کہ یہاں بسنے والوں کو ہر نئے آنے والے کے لیے بچھ بچھ جانا ہوتا ہے۔ خواہ دل میں اس کے لیے کتنی ہی نفرت چھپی ہو محبت اور نفرت کا بھی عجیب ہی سلسلہ ہوتا ہے یہاں.....

وہ پانچوں ستارہ بیگم کے ساتھ چلتے ہوئے لاؤنج میں ہی موجود ایک اور دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ غالباً" یہ ہال کمرہ گیت وغیرہ کے لیے آراستہ کیا گیا تھا۔ پورے کمرے میں سرخ قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں میں بنے ہوئے طاقوں میں برقی چراغ روشن تھے اور چاروں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ گدے بچھے ہوئے تھے۔ جن پر نفاست سے گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ فواد نے آگے بڑھنے سے پہلے جوتے اتارنے چاہے تو ستارہ بیگم نے منع کر دیا۔

"ارے برخوردار! تشریف لے آیئے..... کن تکلفات میں پڑ گئے۔" فواد اس کی بات سن کر اندر آ گئے۔ اس قدر صاف ستھرا، جگمگاتا ہوا ماحول۔ وہ مسحور سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ ستارہ بیگم اور وہ نیچے گدوں پر براجمان ہوئے۔ غلام عباس بھی ان کے ہمراہ کمرے میں آیا تھا۔ لیکن وہ ایک طرف دیوار کے ساتھ خاموش کھڑا تھا۔

"گھنگھرو! مہمانوں کے لیے شربت کا انتظام کرو۔" غلام عباس ستارہ بیگم کی بات سن کر باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی ستارہ بیگم دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"جی جناب..... حکم کیجیے..... کیا سنیں گے گیت یا غزل یا پھر ناچ دیکھیں گے۔ ہر فرمائش پوری کرنے کا سامان موجود ہے۔" وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں تکلف اور حجاب کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ وہ سب اس کی ایک ایک ادا کو سمجھ رہے تھے۔ ایس پی کوئی چھوٹی موٹی آسامی نہیں ہوتا پورے شہر کا حاکم ہوتا ہے اور اس وقت وہ حاکم اس کے دام میں آنے والا تھا۔ وہ گھاگ کھلاڑی تھی اور میدان میں کھیلنے کے ہر گر سے واقف تھی۔ اس آسامی کو پھنسنے سے اس کے لیے یقیناً" بہت آسانیاں پیدا ہو جاتیں۔ ایس پی خاور ملک بھی جان رہے تھے کہ وہ انہیں بولوں اور اداؤں کے تار میں جکڑنے کی کوشش میں ہے۔

"نہیں ستارہ بیگم..... ہم سننے کے لیے نہیں آئے اس پروگرام کو پھر کبھی پر رکھیں۔ ہم تو سنانے آئے ہیں۔"

"ایس پی صاحب! یہ سننے سنانے کا سلسلہ چلتا رہے گا آپ کی بھی سنیں گے لیکن آپ کوئی فرمائش تو کریں۔ یقیناً" ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"نہیں ستارہ بیگم..... آج پہلے آپ کو سننا ہے گا۔" خاور ملک کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا ستارہ بیگم کے مسکراتے ہونٹ سکڑ گئے۔ آنکھوں میں الجھن کے تاثرات در آئے۔ عجیب مخمصے کی کیفیت میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"ایس پی صاحب! یقیناً" کوئی بہت خاص بات ہے۔ ایسی ہی بات تھی تو آپ مجھے حکم کرتے میں خود آپ سے ملنے آتی۔"

"ستارہ بیگم! کام ہمارا تھا سو ہمیں خود یہاں آنا تھا۔ ضرورت ہماری تھی جو ہمیں آپ کے در تک لے آئی۔"

"ایسا کیا کام تھا..... ایسی کیا ضرورت تھی جو شہر کے حاکم کو ہمارے دروازے تک لے آئی۔"

"ستارہ بیگم ہم نے سنا تھا کہ آپ اپنے دروازے پر آنے والے کا پھولوں سے سواگت کرتی ہیں۔ پھول محبت کی علامت ہوتے ہیں۔ آپ کی شخصیت میں چھپی محبت کو آج ہم نے دیکھ بھی لیا۔ بہت اچھا لگا ہمیں جب آپ نے ہمارے قدموں میں پھول نچھاور کیے۔" خاور ملک بولے۔

"یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ ہمیں کون اس قدر اہمیت دیتا ہے۔" اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تو نہیں تھا لیکن کچھ آزردگی جھلکتی تھی۔

"آپ کی اسی محبت اور شائستگی سے حوصلہ پا کر میں اپنی عرض آپ کے سامنے بیان کروں گا اس یقین کے ساتھ کہ آپ میری عرض کو توجہ سے سنیں گی۔"

"ایس پی صاحب! جان اور ایمان کے سوا جو مانگیں گے حاضر ہو گا۔ جتنی میری بساط ہے اس سے بڑھ کر ثابت کروں گی۔ آپ کہیں میں سن رہی ہوں۔" ستارہ بیگم سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"ستارہ بیگم! بہت بڑی بات کہہ دی ہے آپ نے ..... سوچ لیجیے اس بات پر قائم رہنا پڑے گا آپ کو۔" خاور ملک بولے۔

"آزما کر دیکھ لیجیے۔ مکروں گی نہیں۔" ستارہ بیگم ثابت قدم تھی۔

"تو پھر ستارہ بیگم یوں سمجھ لیجیے ہم آپ سے آپ کا کلیجہ مانگنے آئے ہیں۔" خاور ملک گمبھیر لہجے میں بولے۔

"دیکھیے ایس پی صاحب! میں نے پہلے ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ جان اور ایمان کے علاوہ جو کچھ مانگیں گے حاضر ہو گا۔ آپ مجھ سے کلیجہ مانگ رہے ہیں..... اگر میں کلیجہ آپ کو دے دوں گی تو پھر جیوں گی کیسے؟" اس کا لہجہ قدرے خوشگوار تھا۔

"لیکن اگر آپ کو زندگی کی ضمانت دے دی جائے تو کیا پھر آپ ہماری فرمائش پوری کریں گی۔"

"بالکل..... پھر تو کوئی عار نہیں..... لیکن ایک منٹ ایس پی صاحب آپ نے اپنے ساتھ آنے والوں کا تو تعارف ہی نہیں کرایا۔" ستارہ بیگم کی بات پر خاور ملک بھی جیسے ہوش میں آ گئے۔

مسئلے کی باریکیوں پر سوچتے اور پھر ستارہ بیگم کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے وہ بالکل ہی بھول گئے تھے کہ اس وقت ان دونوں کے علاوہ چار نفوس اور بھی وہاں موجود ہیں جو یکسر خاموش بیٹھے ان کی گفتگو سن رہے ہیں۔ ابھی خاور ملک کچھ بولنے لگے تھے کہ دروازہ کھلا اور غلام عباس ہاتھ میں ٹرے لیے اندر داخل ہوا۔ جس میں اورنج جوس کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے سب کو سرو کیا۔

"بائی جی..... بی بی پوچھ رہی ہیں کہ محفل کب ہونی ہے۔ کیا سازندوں کو بھیجوں؟" غلام عباس ہاتھ میں خالی ٹرے تھامے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"نہیں گھنگھرو! چاندنی کو منع کر دو۔ بیمار تھی وہ اسے کہہ دو کہ محفل نہیں ہو گی۔ اور ہاں ہم ضروری بات کر رہے ہیں۔ اس لیے ذرا خیال رکھنا ادھر کوئی نہ آئے۔" ستارہ بیگم نے کہا تو غلام عباس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر بابر شاہ کی طرف دیکھا۔ اور "جی اچھا بائی جی" کہہ کر باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی ستارہ بیگم دوبارہ خاور ملک کی طرف متوجہ ہوئی۔

"جی ایس پی صاحب! آپ ان کا تعارف کروانے لگے تھے۔"

"دراصل میں ستارہ بیگم! کام تو ان ہی کو تھا..... آپ سے ملنے کے لیے بڑی دور سے آئے ہیں میں تو بس اس شہر میں ان کی میزبانی کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ اسی لیے ان کے ساتھ چلا آیا۔" خاور ملک نے کہا تو ستارہ بیگم نے دلچسپی سے ان چاروں کی طرف دیکھا۔

"کہاں سے آئے ہیں یہ سب؟" اس نے پوچھا۔

"راولپنڈی سے۔" خاور ملک کے بتانے پر جوس کا

گلاس ہونٹوں کی طرف لے جاتے ستارہ بیگم کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے گہری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ پنڈی شہر کا نام سن کر بہت ہلکا سا تاریک سایہ اس کے چہرے پر لہرا کر معدوم ہو گیا تھا اور یہ سایہ صرف بابر شاہ اور خاور ملک کی زیرک نگاہیں ہی دیکھ پائی تھیں۔ یقیناً" اس کا ذہن بڑی تیزی سے کڑیاں ملا رہا تھا۔ لیکن وہ جہاندیدہ عورت تھی اس لیے اپنے اندر اٹھنے والی الجھنوں اور سوالوں کو بڑی خوب صورتی سے چھپا کر مسکرا دی۔

"ہوں....." وہ مبہم انداز میں بڑبڑائی۔

ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بڑی شدت سے ابھرا تھا کہ راولپنڈی میں ہی تو آریان بھی موجود تھی اور وہیں اس کے دونوں جان نثار اس وقت حوالات کی دال روٹی کھا رہے تھے۔ یہ سب کون ہیں۔ ان سب کا اتنی دور اس سے ملنے کے لیے آنا حیرت کا باعث ہی تھا۔ نہ تو وہ فلم اسٹار تھی اور نہ ہی کوئی سیاستدان کہ لاہور میں بیٹھی ہوتی اور پنڈی 'پشاور تک ڈنکا بجتا۔ اسے ان لوگوں کا آریان کے ساتھ کوئی جوڑ محسوس ہو رہا تھا۔

"یہ کامران ہیں میرے چچا زاد بھائی اور اس وقت پنڈی میں ایس پی کی پوسٹ پر تعینات ہیں۔" خاور ملک نے تعارف شروع کیا۔

"ایس پی صاحب! پہلے یہ بتا دیں آپ کی فیملی میں اور کتنے ایس پی ہیں۔" وہ بظاہر خوشدلی سے بولی لیکن دل و ذہن اس وقت بہت سی سوچوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔

"بس فی الحال تو ہم دو ہی ہیں۔ بہرحال یہ ہیں بابر شاہ اور یہ اظہر شاہ دونوں ٹرانسپورٹر ہیں اور یہ بابر شاہ کے فرزند فواد شاہ حال ہی میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد آج کل اپنے کلینک میں مصروف ہوتے ہیں۔" خاور ملک کے تعارف کروانے پر ستارہ بیگم کی چمکدار آنکھوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔

"ٹھیک! اب یہ بتا دیجیے کہ یہ سب مجھ سے کس وجہ سے ملنا چاہتے تھے۔" ستارہ بیگم نے پوچھا تو ایک لمحے کے لیے خاور ملک خاموش ہو گئے۔ ستارہ بیگم کی منتظر نظریں خاور ملک کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"اصل میں مجھے مناسب الفاظ نہیں مل رہے۔ جن کے ذریعے میں اپنا مدعا بیان کروں۔" خاور ملک بولے تو ستارہ بیگم کی آنکھوں میں بڑے عجیب سے تاثرات در آئے۔

"ایسی کیا بات ہے ایس پی صاحب..... آپ ہچکچائیں مت۔ جو بھی بات ہے کھل کر کہیں۔" ستارہ بیگم کے کہنے پر خاور ملک نے بابر شاہ کی طرف دیکھا وہ بھی انہی کی طرف متوجہ تھے۔ غالباً" انہوں نے بابر شاہ کو بات کرنے کا اشارہ کیا تھا کہ ستارہ بیگم کے سوال کے جواب میں وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں گویا ہوئے۔

"ہم آریان کے بارے میں کچھ بات چیت کرنے آئے ہیں۔ وہ اس وقت ہمارے پاس ہے۔"

"ہوں..... پھر۔" اس کی آنکھوں میں الجھا ہوا تاثر لودینے لگا۔

"ہم اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ آپ کے بندے آریان کو پریشان کرتے ہیں۔ پچھلے کچھ دن تو وہ بہت ڈری سہمی سی رہی۔ ان دونوں آدمیوں نے صرف اسے ڈرایا دھمکایا ہی نہیں بلکہ ہمارے گھر پر دھمکی آمیز فون آتے رہے۔ فواد کے کلینک میں بھی انہوں نے توڑ پھوڑ کی اسے زخمی بھی کیا۔ ہمیں مجبوراً" انہیں لاک اپ میں بند کروایا اور آپ سے صرف ایک استدعا ہے کہ اپنے بندوں کو سمجھا دیں کہ وہ بچی کو تنگ کرنا چھوڑ دیں۔ یقیناً" ان دونوں کے کچھ اور ساتھی بھی وہاں موجود ہیں۔" بابر شاہ نے تفصیل سے اپنا مدعا بیان کیا۔

"ہوں! تو آپ چاہتے ہیں کہ میں انہیں واپس بلوالوں۔" وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

"جی ہاں۔" ان کے جواب پر وہ کچھ دیر کو خاموش ہو گئی۔ پھر کچھ لمحے کے توقف کے بعد اسی نے بوجھل سکوت کا پردہ چاک کیا۔

"شاہ صاحب! وہ چڑیا اس علاقے کی آب و ہوا و گرم کی عادی ہے۔ آپ کے ماحول میں نہیں رہ پائے گی۔ میں تو آپ کو ایماندار سمجھی تھی کہ میری امانت کو لوٹانے کی بات کریں گے آپ تو اسے بالکل ہی الگ کرنا چاہتے ہیں۔"

"ستارہ بیگم! وہ آپ کے ماحول کی عادی ہی تو نہیں ہے۔ اگر عادی ہوتی۔ یہاں کی عیش و آرام کی زندگی اسے پسند ہوتی تو وہ کبھی اس جگہ کو چھوڑ کر نہ جاتی اور اب بھی وہ یہاں واپس نہیں آنا چاہتی۔ اسی لیے ہم آپ سے اس مسئلے پر ڈسکس کرنے آگئے ہیں کہ مل بیٹھ کر کوئی حل نکال لیا جائے۔" بابر شاہ رسانیت سے بولے۔

"شاہ صاحب! کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ وہ یہاں اگر واپس نہیں آنا چاہتی تو ہمارے پاس سو طریقے ہیں اسے یہاں واپس لانے کے۔ اس کی ماں ہمارے پاس ہے۔ جس کی زندگی ہی یہیں گزر گئی۔ وہ اسے چھوڑ کر کہاں جائے گی۔ بے وقوف کو ابھی دنیا کی ٹھوکریں نہیں پڑیں ورنہ عقل ٹھکانے آجاتی۔" ستارہ بیگم نے بات کرتے کرتے آخری الفاظ بالکل ہی خود کلامی کے سے انداز میں کہے۔ اس کے انداز میں قدرے ناگواری در آئی تھی۔

"ستارہ بیگم! میرا خیال ہے ان کی بات سن لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔" خاور ملک نے جیسے اسے رام کرنے کی کوشش کی۔

"ایس پی صاحب جو یہ کہنا چاہ رہے ہیں میں سمجھ گئی ہوں لیکن میں اس سلسلے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ یہ..... یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں نا یہ عالیشان مکان 'یہ قیمتی فرنیچر یہ سونے کے زیور..... یہ مہنگے لباس یہ سب میری محنت کی کمائی نہیں اور نہ ہی اس کوٹھے کی ناچنے والیوں میں اتنا دم خم ہے۔ یہ سب کچھ چاندنی کے وجود سے ہے۔ اس کی آواز محض آواز نے لوگوں کو ایسے سحر میں جکڑ رکھا ہے کہ جو ایک بار اس کی آواز سن لیتا ہے وہ بار بار سننے کی چاہ میں یہاں کے چکر لگاتا ہے۔ یہاں لوگ مجرا دیکھنے سے زیادہ اسے سننے آتے ہیں۔ اس کی آواز میں چھپے درد نے میرے لیے خزانوں کے منہ کھول دیے ہیں اور آریان..... آریان ہو بہو اپنی ماں کی کاپی ہے۔ وہی شکل و صورت وہی آواز 'وہی انداز پھر آپ خود ہی بتائیں میں اس سے کس طرح دستبردار ہو جاؤں۔"

"یعنی محض اپنے عیش و آرام کی خاطر آپ اس کو ایک غلط کام پر اکسائیں گی اس کی خداداد صلاحیتوں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گی۔ یہ تو صریحاً" خود غرضی ہوئی نا۔" اظہر شاہ پہلی بار بولے ستارہ بیگم نے خشمگیں نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"آپ غالباً" اظہر شاہ ہیں۔" وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولی۔

"اظہر صاحب! میں یہ سب اپنے عیش و آرام کے لیے کر رہی ہوں یا چاہے خود غرضی کے تحت۔ اس میں بے جا مداخلت مجھے پسند نہیں 'آپ مجھے کچھ بھی سمجھتے رہیں خود غرض 'مطلب پرست 'سنگدل جو بھی مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن بہرحال میں آریان کو چھوڑ کر یہ سب آسائشات نہیں کھونا چاہتی۔ اور نہ ہی کنگال ہونا چاہتی ہوں۔"

"لیکن ستارہ بیگم! ایک محض آریان کے نہ ہونے سے کیا فرق پڑ جائے گا۔" کامران بولے۔

"ہاں فرق تو کچھ خاص نہیں پڑے گا۔ بس میں کنگال ہو کر روڈ پر آجاؤں گی..... اور یہ لوگ جو مجھے بڑی بائی جی..... بڑی بائی جی کہتے نہیں تھکتے۔ میرے آگے پیچھے پھرتے ہیں کل کو ان کی ٹھوکریں میرا مقدر ہوں گی۔ اور بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔" ستارہ بیگم تلخ لہجے میں بولی۔

"لیکن ستارہ بیگم! آپ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے پر مجبور کریں گی تو یہ اس کے ساتھ ظلم ہو گا آریان یہاں واپس نہیں آنا چاہتی۔ ہم نے اسے چار دیواری کا تحفظ فراہم کیا ہے۔ رشتوں کا مان دیا ہے۔ اور وہ اس میں خوش ہے۔ پھر آپ کس لیے اسے یہاں رہنے اور اس ماحول میں رچنے بسنے پر مجبور کر رہی ہیں۔" بابر شاہ بولے۔

"دیکھیے صاحب! یہ جگہ عزت داروں کے لیے ایک گالی اور ہم جیسوں کی جائے پناہ 'یہاں کوئی اپنی

خوشی سے نہیں بیٹھا چاندنی ہے نا۔ بڑی خوب صورت گائیکہ ہے اس کی آواز میں درد کیسے پیدا ہوا دکھوں سے ایک طویل عرصے سے وہ یہاں کی زینت ہے اپنی خوشی سے نہیں مجبوری سے.... چھیا ہے رقص کرتی ہے تو یوں لگتا ہے کائنات جھوم اٹھتی ہے۔ وہ بھی یہاں رہتی ہے۔ ہنستی ہے بولتی ہے۔ پر میں جانتی ہوں وہ ایک عرصے سے دل سے ہنسنا بھول چکی ہے۔ یہ عورتیں جو یہاں رہتی ہیں نا امان میں ہیں۔"

"ستارہ بیگم.... ایں۔" بابر شاہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی شاہ صاحب! ہماری دنیا آپ لوگوں کی دنیا سے بہت مختلف سہی آپ لوگ ہماری دنیا کو غلاظت کا ڈھیر کہتے ہیں۔ یہاں رہنے والے بھی جیتے جاگتے انسان ہی ہیں۔ لیکن یہاں بسنے والوں کے حصے میں آپ کی مہذب دنیا کی صرف نفرت ہی آتی ہے۔ یہاں اجلے کپڑوں والے شریف زادے آتے ہیں تو محض دل بہلانے کے لیے۔ ایک کھلونے سے بھی گئی گزری اوقات ہے ہماری۔ لیکن ہمارے بھی کچھ قاعدے، کچھ قانون ہیں، کچھ اصول ہیں، یہاں آنے والا ہماری مرضی سے چلتا ہے اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔ لیکن آپ کی دنیا میں حیوان کھلے بندوں پھرتے ہیں۔ بھیڑوں کے بھیس میں بھیڑیے پھرتے ہیں۔ بڑے سے بڑا گناہ کر کے بھی شرمسار نہیں ہوتے۔

عزت کو عزت نہیں سمجھا جاتا۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آریان کو چار دیواری کا تحفظ نہیں ملا۔ یہاں اس کی ماں ہے جو اس کا انتظار کر رہی ہے۔ یہ کملا گھنگھرو ہے جسے یہاں کے سب لوگ اس کالے پالک باپ کہتے ہیں۔ (لے پالک باپ کی اصطلاح پر وہ خود ہی مسکرانے لگی) کیا یہ رشتے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ آپ اس کی خوشی کو رہنے دیں اور اسے واپس بھجوا دیں یہ ہمارے اور آپ کے حق میں اچھا ہوگا۔" ستارہ بیگم نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اور اگر وہ نہ آنا چاہے۔" بابر شاہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تو ہمارے پاس بہت طریقے ہیں اسے لانے کے۔ آپ بیچ میں مداخلت نہ کیجیے گا۔ ہم اسے لے آئیں گے۔"

"ستارہ بیگم۔ پلیز ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیے۔ آپ کے پاس لڑکیوں کی کمی تو نہیں۔" کامران نے کہا۔

"ہاں! کمی تو نہیں لیکن آریان جیسے کوئی نہیں۔ اور میری تو وہ ملکیت ہے۔ پھر میں نے اس کا سودا کر رکھا ہے اور ہمارے ہاں زبان کی کتنی اہمیت ہے یہ شاید آپ نہ جانتے ہوں۔"

"ستارہ بیگم! زبان تو آپ نے ہمارے ساتھ بھی کی ہے۔ قول تو ہمیں بھی دیا ہے۔" خاور ملک نے ستارہ بیگم کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا تو وہ بڑے عجیب انداز میں مسکرا دی۔

"ایس پی صاحب! آپ کی فہم کی تو میں پہلے ہی قائل ہو چکی ہوں۔ بہت ہوشیار ہیں آپ جانتے ہیں کس کو کہاں اور کیسے لپیٹنا ہے لفظوں سے کھیلنا خوب آتا ہے آپ کو تو پھر ٹھیک ہے میں نے آپ کے ساتھ زبان کی ہے نا تو تم نہیں زبان کاٹ کر آپ کے سامنے رکھ دوں یا سینہ چیر کر کلیجہ نکال کر پیش کر دوں۔ لیکن مجھے معاف کر دیں، میں آریان کو نظر انداز نہیں کر سکتی اور پھر اس کی ماں بھی کبھی اس کے بغیر رہنا گوارا نہیں کرے گی۔" ستارہ بیگم حتمی انداز میں بولی۔

"تو ستارہ بیگم ہم آریان کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کو بھی تو یہاں سے لے جانے آئے ہیں۔" بابر شاہ نے کہا تو ستارہ بیگم نے ایک جھٹکے سے ان کی طرف دیکھا۔

"آپ کیا ستارہ بیگم کو بالکل ختم کرنے آئے ہیں ایسی ہی بات ہے تو یہ سامنے ٹیبل پر خنجر رکھا ہے۔ گھونپ دیجیے میرے سینے میں۔ لیکن چاندنی اور آریان کو میں نہیں چھوڑ سکتی۔"

"ستارہ بیگم! آپ نے خود کہا کہ وہ مجبور ہیں یہاں اپنی خوشی سے نہیں بیٹھی ہوئیں۔ وہ مجبور ہیں لیکن آپ تو بااختیار ہیں۔ جسے چاہیں قید کر لیں جسے چاہیں آزاد کر دیں۔ پھر یہاں آپ اپنے اختیارات کو کیوں نہیں استعمال کر رہیں۔"

"میں بااختیار کب ہوں.... میں بھی مجبور ہوں.... پیٹ کا جہنم بھرنا ہے مجھے، تن ڈھانکنا ہے اپنا.... زندگی کی گود میں بچی کچھی سانسیں سکون سے گزارنی ہیں۔ ساری زندگی خوشحال گزار کر میں اب بڑھاپا لوگوں کے ٹھڈے ٹھوکریں کھا کر نہیں گزارنا چاہتی۔"

"ستارہ بیگم.... محض اپنی ذات کے لیے آپ ان کی مجبوریوں کا سودا کرتی رہیں گی۔ کیا آپ کا ضمیر آپ کو اس بات پر ملامت نہیں کرے گا۔" بابر شاہ کا لہجہ جھنجھلایا ہوا سا تھا۔ ستارہ بیگم نے بڑے انداز سے نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ ٹھہری۔

"ہم جیسوں کے پاس ضمیر ہوتا ہی کہاں ہے شاہ جی! بکنے والی کیا جانیں غیرت، ضمیر، خودداری اور انا جیسے دلفریب لفظوں کو۔ یہ تو آپ کی مہذب دنیا کی میراث ہیں۔ لیکن کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتی ہوں۔ آپ کس رشتے سے انہیں اپنے گھر میں رکھیں گے.... آریان بچی ہے.... اس ماحول کی غلاظت کا ابھی اس پر ایک چھینٹا بھی نہیں پڑا عزت سے بسانا چاہیں گے تو بس جائے گی۔ لیکن اس کی ماں، اس کو کس حیثیت سے لے جانا چاہتے ہیں۔" بہت گہرے ذو معنی لہجے میں اس نے پوچھا۔

"شاہ صاحب! اس ماحول کی بڑی گہری چھاپ ہے اس پر۔ گھنگھروؤں کی جھنکار کو لوری کی طرح سن کر سونے کی عادی ہے وہ.... لاکھوں دھبے لگے ہوئے ہیں اس کی دامن پر ان دھبوں کو کیسے مٹائیں گے آپ.... انگلیاں اٹھیں گی بہت سی آوازیں اور نگاہیں اس کا تعاقب کریں گی۔ یہاں کی یادیں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی مہذب دنیا کے سنگین رویوں سے کیسے بچائیں گے اسے۔" ستارہ بیگم بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"یہ ہمارا مسئلہ ہے ستارہ بیگم.... آریان کے سر پر ہاتھ رکھ کر میں نے اسے اپنی بیٹی کہا ہے اور اس کی ماں میرے گھر میں میری بہن کی حیثیت سے رہے گی۔"

"شاہ صاحب! آپ کا جذبہ قابل قدر سہی۔ زندگی گزر گئی ستارہ بیگم کی ان کوٹھوں پر کبھی کسی مرد نے کسی طوائف کو بیٹی یا بہن جیسے مقدس رشتے کا مان نہیں دیا۔ لیکن آریان اور چاندنی ہی کیوں.... اس کوٹھے پر اور بھی تو کئی مجبور و لاچار عورتیں ہیں۔ ان میں سے کسی کو بیٹی یا بہن کیوں نہیں بناتے آپ.... کسی طوائف کو عزت دینا ہی مقصود ہے نا.... تو پھر آریان یا اس کی ماں کی شرط ہی کیوں؟ وہ تو کوئی بھی ہو سکتی ہے۔" ستارہ بیگم محض انہیں الجھا رہی تھی۔ درحقیقت اس کا ذہن بہت تیزی سے اس سارے حالات پر سوچ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے سامنے موجود لوگ ریت کی دیوار نہیں جو اس کے لہجے کی سختی سے ہی گر جائے۔

"آپ نے درست فرمایا ستارہ بیگم! ہمارے نزدیک یہاں موجود سبھی عورتیں ہی لائق تعظیم ہیں یقیناً آپ بھی.... لیکن آریان اور اس کی ماں کے سلسلے میں میں صرف یہ وضاحت کروں گا کہ وہ از خود پناہ کے لیے ہمارے پاس آئی تھی۔ عزت سے جینا چاہتی ہے وہ اور اس کی ماں بھی، ہمیں اس نے اپنی ماں کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہے۔ ہم سب لوگوں کی مدد تو نہیں کر سکتے۔ لیکن اس دلدل سے نکلنے کے لیے جس نے سب سے پہلے ہمارا ہاتھ پکڑا ہے اسے تو بچا سکتے ہیں تاکہ انسانیت پر اس کا اعتبار قائم رہ سکے۔" بابر شاہ نے کہا۔

"شاہ صاحب! سب باتیں درست.... لیکن میری بات اب بھی وہی ہے میں آریان اور اس کی ماں کو کسی بھی صورت نہیں چھوڑ سکتی۔" ستارہ بیگم اسی طرح اپنی ہٹ پر قائم تھی۔

"کیسے نہیں چھوڑ سکتیں۔ ہم ہر قیمت پر انہیں یہاں سے لے کر جائیں گے۔" اظہر شاہ جو بڑی دیر سے اس طویل بحث سے جھنجھلائے بیٹھے تھے۔ یکدم

ہی چلا اٹھے۔ ستارہ بیگم کی آنکھوں میں شعلے سے دہک اٹھے۔ اس نے جلتی ہوئی نظریں اظہر شاہ پر گاڑ دیں۔
"کیا مطلب ہے آپ کا ..... کہنا کیا چاہتے ہیں آپ، کون سی قیمت پر۔" وہ برافروختہ ہوتے ہوئے بولی۔
"اظہر یار..... کیا کر رہے ہو؟ تحمل سے یار..... کیوں کیے کرائے پر پانی پھیرنے پر تل گئے ہو۔" بابر شاہ نے اظہر شاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔
"بھائی حد ہوتی ہے کسی بات کی..... اتنی دیر سے سن رہا ہوں فضول میں جھنجٹ پھیلائے بیٹھی ہیں یہ۔ سیدھی صاف بات ہے جب وہ یہاں نہیں رہنا چاہتیں تو یہ آخر کس قانون کے تحت انہیں حبس بے جا میں رکھے ہوئے ہیں۔ بس اب میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے میں دیکھتا ہوں یہ کیسے نہیں جانے دیتیں انہیں۔" اظہر شاہ بالکل ہی آؤٹ ہو گئے تھے۔
"ہوں..... ٹھیک ہے کوشش کر دیکھیں۔" وہ بڑے مطمئن انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے اختیارات کی حدود جانتی تھی اسی لیے بہت پرسکون تھی۔
"ستارہ بیگم چھوڑیے آپ انہیں..... آپ میرے منہ کو دیکھیے۔" خاور ملک کو اظہر شاہ کا یوں معاملے کو بگاڑنا اچھا نہیں لگا تھا۔
"آپ کے منہ کو دیکھ کر ہی برداشت کر گئی۔ ورنہ ستارہ بیگم کے سامنے اونچی زبان بولنے والا ابھی ماں کے شکم سے باہر نہیں آیا۔" وہ آتشیں لہجے میں بولی۔ سلگتی ہوئی نگاہیں ہنوز اظہر شاہ کے تنے ہوئے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔
"تو پھر بتائیں اظہر شاہ صاحب! کون سی قیمت پر آپ انہیں یہاں سے لے جائیں گے۔ اگر طاقت کی بات کر رہے ہیں تو اس کا امتحان ابھی ہو جائے گا اور اگر دولت کی بات کر رہے ہیں نا تو آپ کی سات پشتیں بھی نیلام ہو جائیں تو ستارہ بیگم کی ملکیت میں آئی ہوئی چیز کو نہیں خرید سکتے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے سامنے ٹیبل پر پڑی ڈبیا اٹھا کر انہیں دکھائی اور بولی۔
"یہ محض ایک ڈبیا ہے سگریٹ کی خالی ڈبیا۔ یہ میری ملکیت ہے اگر میں اس کی قیمت پانچ کروڑ لگا دوں تو کیا خرید سکیں گے۔ ہونہہ جانے دیجیے اظہر شاہ صاحب! یوں جذبات میں آ کر اپنا نقصان بھی مت کریں اور ہمارا وقت بھی نہ برباد کریں۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولی تو اظہر شاہ بھڑک اٹھے۔
"اب پھر تم اپنی سی کوشش کر دیکھو اور میں اپنی سی..... میدان چھوڑ کر بھاگوں گا نہیں۔ لیکن تمہیں سبق ضرور سکھا جاؤں گا۔"
"اظہر یار چپ کر جاؤ..... دیکھو میں تمہارا بڑا بھائی..... تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔" بابر شاہ نے باقاعدہ ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔
"نہیں بھائی! یہ عورت اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ غلاظت کے ڈھیر پر بیش قیمت کپڑے پہن کر بیٹھ کر جانے کیا یہ ملکہ بن گئی ہے۔ بڑی پہنچ ہے نا اس کی لے کہیں جہاں تک جا سکتی ہے جائے۔" اظہر شاہ کسی طور ٹھنڈے نہیں ہو رہے تھے۔ ستارہ بیگم کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا۔
"گھنگھرو....." اس نے بلند آواز میں کہا تو غلام عباس جھٹ سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔
"جلال حسین کو بلا کر لاؤ۔" وہ خونی نظروں سے اظہر شاہ کو گھورتے ہوئے بولی۔ تو غلام عباس ایک ثانیے کو ماحول کا جائزہ لے کر جلدی سے باہر نکل گیا۔
"بابر صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ سمجھائیے انہیں ہم یہاں کوئی جھگڑا کرنے نہیں آئے اچھا خاصا سلوک اور طریقے سے مسئلہ حل ہونے والا تھا۔ بیچ میں یہ کیا ہنگامہ شروع ہو گیا ہے۔" خاور ملک ناراض سے لہجے میں بولے۔
"چاچو! پلیز کچھ دیر برداشت کریں۔ یقیناً" مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بس اب کوئی جھگڑے والی بات نہ کیجیے گا۔" فواد بھی بول پڑے۔
"ارے مسئلہ ہی تو حل نہیں ہو رہا۔ اتنی دیر سے خاموش بیٹھا۔ یہی تو دیکھ رہا ہوں۔ نئی سے نئی بات سننے کو مل رہی ہے۔ اب اپنا آپ دکھانا ہی پڑے گا۔ دیکھا نہیں محترمہ نے کرائے کے غنڈوں کو بلایا ہے۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں یہ آخر ہیں کیا چیز۔" اظہر شاہ کرخت لہجے میں بولے۔
"ستارہ بیگم! آپ ہی پلیز تھوڑا تحمل سے کام لیں۔" خاور ملک نے کہا۔
"آخر کس لیے..... کیا سوچ کر انہوں نے اس طرح کی باتیں کیں؟ ستارہ بیگم کو کیا انہوں نے کوئی لاچار عورت سمجھا تھا۔ میری جگہ پر آ کر میرے سامنے بیٹھ کر اس طرح میری توہین کرنے کا حق انہیں کس نے دیا؟"
"اظہر یار اب تم خاموش رہنا۔ ہمیں بات کرنے دو اور ستارہ بیگم ان کی طرف سے میں معافی کا خواستگار ہوں۔ براہ کرم غصہ تھوک دیجیے۔ ہم پرامن طریقے سے اس مسئلے پر بات کرتے ہیں۔" بابر شاہ بولے۔
"میڈم! ہم آپ کی شرائط تسلیم کر کے آپ کی مرضی سے آریان اور اس کی والدہ کو یہاں سے لے جائیں گے۔ آپ پلیز ہمیں اپنی مرضی بتائیں۔" فواد نے کہا تو ستارہ بیگم نے ان کی طرف توجہ سے دیکھا۔
"برخوردار! تم کافی سلجھے ہوئے اور سمجھدار معلوم ہوتے ہو۔ میری مرضی صرف یہ ہے کہ میں تنگی میں زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ اتنے سالوں میں جو کچھ میں نے بنایا ہے جو نام بنایا ـــــ جو شہرت میں نے حاصل کی ہے وہ میں گنوانا نہیں چاہتی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔
"تو کیا آپ یہ سب کچھ شوق میں کر رہی ہیں۔" فواد نے پوچھا۔
"ہاں پہلے تو مجبوری تھی لیکن اب شوق سے کر رہی ہوں۔" ستارہ بیگم نے کہا۔
"اس لیے کہ میں محتاج اور دست نگر ہو کر نہیں جی سکتی۔"
"اور ستارہ بیگم! اگر آپ کے اس شوق کی تکمیل کر دی جائے پھر۔" خاور ملک بول پڑے۔
"کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔" وہ حیرت سے بولی۔
"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو ہر سہولت فراہم کر دی جائے تاکہ آپ کسی کی محتاج نہ رہیں۔ تو کیا پھر آپ ہماری ڈیمانڈ پوری کریں گی۔" خاور ملک کے کہنے پر ستارہ بیگم کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔
"ہوں....." اس نے پرخیال انداز میں ہنکارا بھرا اسی پل غلام عباس دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔
"بڑی بائی جی! جلال حسین آ گئے ہیں..... کیا حکم ہے؟"
"نہیں گھنگھرو! ان سے کہہ دو کہ سب ٹھیک ہے۔" ستارہ بیگم نے ایک نظر خاموش بیٹھے اظہر شاہ پر ڈالی۔ جن کے چہرے کے تاثرات تو کرخت تھے لیکن جانے کیا سوچ کر وہ خاموش بیٹھے تھے۔ غلام حسین نے عجیب سی نظروں سے پہلے ستارہ بیگم کی طرف دیکھا اور پھر سب پر ایک نگاہ ڈالتا وہاں سے چلا گیا۔
"جی ایس پی صاحب! آپ کیا کہہ رہے تھے۔" وہ دوبارہ ایس پی کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ ہماری بات مان جائیں۔" خاور ملک نے کہا۔
"ایس پی صاحب! کیسے مان جاؤں۔ آپ تو میرے ساتھ بالکل ہی دشمنی پر اتر آئے ہیں۔" اس کا انداز تو نرم تھا لیکن ہٹ اپنی جگہ اسی طرح قائم تھی۔
"ستارہ بیگم! گھر آئے ہوؤں کا مان رکھا جاتا ہے اور آپ ہیں کہ ضد پر اڑی ہوئی ہیں۔" خاور ملک کا لہجہ دوستانہ تھا۔
"یہ بھی خوب کہی آپ نے۔ حضور مان دوستوں کا رکھا جاتا ہے دشمنوں کا نہیں اور آپ تو میرے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔ مجھے بالکل خالی دامن، خالی ہاتھ کر کے بھکارن بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ کی مان کر تو میں ذلیل و خوار ہو کر رہ جاؤں گی۔" ستارہ بیگم انکاری انداز میں گویا تھی۔
"اور اگر کوئی ایسا حل نکالا جائے کہ آپ کی بھی

جان چھوٹ جائے۔ آپ بھی عزت کی زندگی گزاریں تو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔" ستارہ بیگم بہت عجیب تاثرات اور عجیب کیفیات کا شکار تھی۔ وہ ایس پی خاور ملک کی بات کچھ سمجھ بھی رہی تھی اور کچھ نہیں بھی۔

"کیوں ناممکن ہے..... آپ اقرار تو کریں۔ طریقہ ہمارے پاس ہے۔ راستہ ہم آپ کو دکھاتے ہیں۔" خاور ملک مستعد سے ہو کر بیٹھ گئے۔ ستارہ بیگم کے نرم لہجے اور رویے نے امیدوں کے چراغ روشن کر دیے۔

"کون سا راستہ؟" وہ قدرے حیرت سے بولی۔

"ایک بنگلہ اور جو کچھ آپ اس پیشے سے کماتی ہیں۔ اس کے بدلے ایک ہی بار آپ کو اتنا دے دیا جائے کہ آپ باقی زندگی نہایت سکون کے ساتھ گزار سکیں تو کیا یہ سودا مہنگا ہو گا؟" خاور ملک نے دولت کی جھلک دکھائی جو ہر طوائف کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

"اب آپ اس بازار کی زبان میں بات کر رہے ہیں۔" وہ مسکرائی۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا تاثر اور آنکھوں میں عجیب سی چمک در آئی تھی۔

"آپ میرے ساتھ کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔"

"آپ اس کو کچھ بھی کہہ لیں بازار کی زبان یا کاروباری ڈیلنگ۔ لیکن ہمارا مدعا صرف یہی ہے کہ ہم ان دو زندگیوں کا بھلا چاہتے ہیں۔" خاور ملک سمجھ رہے تھے کہ بغیر چارے کے یہ شکار پھنسنے والا نہیں ہے۔ اور اب وہ آہستہ آہستہ ٹریک پر آ رہی تھی۔

"ہوں..... تو کیا کر سکتے ہیں آپ؟" اس کے سوال میں چھپا معنی وہاں موجود سبھی کی سمجھ میں آ گیا۔

"ستارہ بیگم ٹینڈر آپ کے ہاتھ میں ہے اور کاروباری نقطۂ نظر سے بولی لگانے کا پہلا حق آپ کا ہے۔" خاور ملک خالصتاً" کاروباری انداز میں بولے۔

"دیکھ لیجیے گا ایس پی صاحب! میری ڈیمانڈ ہو سکتا ہے آپ پوری نہ کر پائیں۔" ستارہ بیگم ہنوز مسکرا رہی تھی۔

"آپ ڈیمانڈ بتائیں ڈیل بعد میں کی جائے گی۔ ہم بارگننگ کے اصولوں سے ناواقف نہیں۔"

"اوکے..... پچاس لاکھ۔" اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے اس کی توقع کے مطابق سامنے موجود سبھی افراد کو قدرے متفکر کر دیا۔

"کیوں ایس پی صاحب!"

"ستارہ بیگم! یہ رقم بہت زیادہ ہے۔ غالباً" آپ کو اندازہ نہیں کہ بابر صاحب جو بنگلہ آپ کے نام کر رہے ہیں اس وقت اس کی ملکیت کم از کم چالیس لاکھ ہے۔ اس طرح تو آپ کی ڈیمانڈ کروڑ کو پہنچ رہی ہے میرا خیال ہے یہ بہت زیادہ ہے۔"

"ابھی تو اظہر شاہ صاحب کہہ رہے تھے کہ ہر قیمت پر انہیں یہاں سے لے جائیں گے اور اب محض پچاس لاکھ ان کے لیے بہت زیادہ ہو گئے۔ چلیے پانچ لاکھ کم کر دیجیے۔"

"ستارہ بیگم یہ تو کچھ زیادہ کم نہ ہوا..... میری خاطر آپ کو کچھ رعایت کرنی چاہیے۔ میرا منہ ہی رکھ لیجیے۔" خاور ملک نے دوسرا راستہ اپنایا۔ ستارہ بیگم مسکرا دی۔

"آخری بات چالیس لاکھ نہ ایک روپیہ کم نہ زیادہ۔"

"ستارہ بیگم آپ کی طرف سے ڈیمانڈ رکھ دی گئی۔ میں بالکل غیر جانبدار فریق ہوں۔ اب فیصلہ میں کرتا ہوں..... کیا آپ سب کے لیے قابل قبول ہو گا۔" خاور ملک نے تائید طلب نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کہیں۔" ستارہ بیگم دھیمی آواز میں بولی۔

"تیس لاکھ روپے کیش۔" خاور ملک نے فیصلہ سنا دیا۔

"ایس پی صاحب! غیر جانبداری کا دعوا کر کے بھی آپ شاہ صاحب کی سائیڈ لے گئے۔ بہرحال آپ کا مان رکھنا پڑے گا۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"بنگلے کی ملکیت کے کاغذات اور تیس لاکھ کیش ایک ہفتہ یعنی سات دن بعد مجھے مل جانے چاہئیں۔ ایک دن بھی اوپر ہو گیا تو یہ ڈیمانڈ ایک کروڑ ہو جائے گی۔" ستارہ بیگم حتمی انداز میں بولی۔

"ہمیں منظور ہے۔" خاور ملک کسی کے بولنے سے پہلے ہی کہہ اٹھے۔

"ان سے بھی پوچھ لیجیے۔" ستارہ بیگم نے اظہر شاہ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ٹھیک ہے ہمیں منظور ہے۔ آج سولہ ستمبر ہے ٹھیک سات دن تئیس ستمبر کو سورج غروب ہونے تک آپ کو رقم اور بنگلے کی رجسٹری مل جائے گی۔" بابر شاہ نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے اس وقت تک یہاں کوئی پروگرام نہیں ہو گا کیونکہ بات طے پا چکی ہے اور اب چاندنی آپ کی امانت ہے۔ آپ اپنی چیز کے پیسے دے جائیے گا اور اپنی چیز لے جائیے گا۔ لیکن یاد رہے صرف سات دن ہیں آپ کے پاس۔ اگر آپ نہ آئے تو یہی سب کچھ دوبارہ شروع ہو جائے گا اور اس کے بعد پھر شاید یہ سب کچھ کبھی ختم نہ ہو۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ آپ اطمینان رکھیں سات دن کافی ہیں انتظامات کے لیے میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا بابر صاحب۔" خاور ملک پہلے ستارہ بیگم اور پھر بابر شاہ سے مخاطب ہوئے۔

"جی ملک صاحب۔" بابر شاہ نے مختصراً" کہا۔

"اوکے تو پھر ڈن۔" خاور ملک نے ستارہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے ڈیل کا اختتام کیا۔

"ڈن۔" ستارہ بیگم نے بھی مہر تصدیق ثبت کر دی۔ بابر شاہ، فواد، خاور ملک، کامران اور اظہر شاہ سبھی کے چہروں پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

"پھر ہمیں اجازت دیجیے۔" خاور ملک اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آخری بات! آپ میں سے کوئی بھی چاندنی کو لینے نہیں آئے گا۔ صرف اس لڑکے کو بھیج دیجیے گا۔" ستارہ بیگم نے ہاتھ سے فواد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ یہی آ جائے گا۔ جانے سے پہلے ایک بات کہنا چاہوں گا ستارہ بیگم! مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ایک اچھا فیصلہ کیا' یقیناً" بہت سی زندگیاں اس ایک فیصلے سے پرسکون ہو جائیں گی۔" خاور ملک نے یہ کہہ کر باہر جانے کے لیے قدم آگے بڑھا دیے۔

"ایس پی صاحب! بہت مشکل فیصلہ ہے یہ۔ زندگی بھر کی خوشیاں اور رفاقتیں آپ کی جھولی میں ڈال دیں۔ طوائف ہوں ناچنے اور بیچنے کی عادت ہے۔ خوشیاں بھی بیچ کر ان کی قیمت وصول کر لی۔" وہ قدرے مضمحل دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سب کمرے سے باہر نکل گئے۔

"گھنگھرو..... اے گھنگھرو۔" ستارہ بیگم نے آواز دی۔

"جی بڑی بائی جی....."

"چاندنی سے کہہ دے کہ تیرے وارث آ گئے ہیں تجھے لینے۔ بدائی کی تیاری کر لے۔ اب کچھ دن یہاں محفلیں نہیں ہوں گی اور کیا خبر یہاں پھر کبھی محفلیں ہوں یا نہ ہوں..... یہ جگہ ویران ہو گئی رے گھنگھرو..... تیری بائی جی بک گئی۔ بڑی مہنگی تھی تیری بی بی..... اسے خریدتے خریدتے، ستارہ بیگم خود بک گئی رے۔" وہ تھکی تھکی آواز میں کہتی تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔

"بڑی بائی جی..... کیا کہہ رہی ہیں آپ..... میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"صبر کر سمجھ جائے گا..... خود ہی سمجھ جائے گا۔ بس تو اتنا کام کر سازندوں اور استاد نواب کو کہہ دے ایک ہفتے کی چھٹی ہے۔ چھمیا اور بالکو کو بھی کہہ دے اور اب جا۔" ستارہ بیگم نے اتنا کہہ کر آنکھیں موند لیں۔ تو غلام عباس خاموشی سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

مغرب کی اذان سے کچھ پہلے چاندنی بستر سے اٹھ

گئی تھی۔ سفید کمخواب کا غرارہ سوٹ پہنے لمبے بالوں میں موتیے کے پھولوں کی لڑیاں گوندھے وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس عمر میں بھی اس کا حسن بے مثال تھا۔ اذانیں ہو گئیں لیکن بائی جی کی طرف سے بلاوا نہیں آیا۔ غلام عباس کسی کام سے اس کے دروازے کے سامنے سے گزرا تو اس نے پکار لیا۔

"کیا بات ہے۔ بائی جی کے مہمان نہیں آئے کیا؟" چاندنی نے پوچھا۔

"آگئے ہیں بی بی۔"

"تو پھر ابھی تک بلاوا کیوں نہیں آیا۔"

"وہ بی بی! بائی جی نے منع کر دیا ہے کہ آج محفل نہیں ہو گی۔ وہ مہمانوں سے کوئی خاص بات کر رہی ہیں۔"

"کیا کوئی خطرناک قسم کے لوگ ہیں۔" چاندنی کو آریان کی فکر پڑ گئی۔ کہیں پھر ستارہ بیگم اس کا سودا تو نہیں کر رہی۔

"ارے نہیں بائی جی! وہ تو بڑے سلجھے ہوئے اور پڑھے لکھے دکھائی دے رہے ہیں۔"

"غلام عباس! کس دنیا میں رہتے ہو۔ ارے یہاں جو جتنا سلجھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اندر سے اسی قدر حیوان ہوتا ہے۔"

"پتا نہیں بی بی! میں کیا جانوں۔" غلام عباس کہہ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

چاندنی ستارہ بیگم کی طرف سے کھٹک گئی تھی۔ وہ ایک بار پہلے بھی اس کی بے خبری میں آریان کا سودا کر چکی تھی اور اب شاید اس نے کوئی اور موٹی آسامی پھانسی تھی۔ پتا نہیں یہ مشکلیں یہ پریشانیاں کب ختم ہونی تھیں۔ اذیتوں کے اس سفر میں اس کی روح تک آبلہ پا ہو چکی تھی۔ لیکن دور تک بس کرب کا لق و دق صحرا تھا اور وہ منزل بے نام و نشان تھی اور اس کی جستجو رائیگاں۔ لیکن اس بار وہ ستارہ بیگم کو دکھا دے گی کہ ایک ماں اپنی اولاد کے لیے کسی بھی حد سے گزر سکتی ہے۔ وہ اپنی جان دے دے گی لیکن ستارہ بیگم کو اس کے مذموم ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دے گی۔ اس نے سوچ لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

گاڑی راولپنڈی کی حدود میں داخل ہو گئی۔ ڈرائیونگ کے فرائض فواد سر انجام دے رہے تھے۔

"شاہ صاحب! آپ کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ کو میری مزید مدد کی تو ضرورت نہیں ہو گی۔ اور ان دو آدمیوں کے بارے میں بھی بتا دیجیے کہ ان کا کیا کرنا ہے۔" ایس پی کامران باہر شاہ سے بولے۔

"بہت بہت شکریہ ملک صاحب۔ آپ کی بدولت ایک بہت بڑا مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو گیا۔"

"حالانکہ اظہر صاحب تو گڑبڑ کر چکے تھے۔" کامران نے مسکراتے ہوئے کہا تو بابر شاہ بھی مسکرا دیے۔

"فواد میاں مجھے لیاقت باغ روڈ پر اتار دینا ایک دو کام نبٹانے ہیں۔" کامران نے کہا۔

"انکل! آفس یا گھر نہ ڈراپ کر دوں آپ کو۔" فواد نے پوچھا۔

"نہیں میں گاڑی منگوا لوں گا موبائل ہے میرے پاس! آپ لوگ بھی کافی تھکے ہوئے ہوں گے۔" ایک جگہ گاڑی روک کر فواد نے ایس پی کامران ملک کو نیچے اتارا۔

"ایک بار پھر بہت بہت شکریہ ملک صاحب! اور ان دونوں کو بھی چھوڑ دیں۔" بابر شاہ نے کہا۔

"شاہ صاحب! تکلیف جانے دیں۔ ہمارے آپس میں کچھ ایسے گئے گزرے تعلقات بھی نہیں اور وہ دونوں بھی آزاد ہی سمجھو۔" کامران ملک نے شیشے کے قریب منہ لے جا کر بابر شاہ سے کہا اور اللہ حافظ کہہ کر پیچھے ہٹ گئے۔ حقیقتاً اس تمام وقت میں ان دونوں ایس پیز کزنز کی کاوشیں قابلِ ذکر تھیں۔

فواد بھی ان تین دنوں میں شدید اعصابی دباؤ کا شکار رہنے کی وجہ سے عجیب سی تھکاوٹ کا شکار تھے۔ گاڑی سادات نگر کے گیٹ سے اندر آئی تو شام

کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سادات نگر روشنیوں سے منور تھا۔ اور اس وقت لان بالکل خالی تھا۔ یقیناً سب ہی اپنے اپنے پورشنز میں تھے۔ گاڑی سے اتر کر وہ اماں بی کے کمرے کی طرف بڑھے۔ اسی وقت انیقہ کسی کام سے باہر نکلی۔ ان تینوں پر نظر پڑتے ہی وہ مارے خوشی کے چلا اٹھی۔

"ماما..... رینی آپی..... چاچو آگئے۔" اور پھر کیا تھا ان کے اماں بی کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے گھر کے سبھی افراد بھی وہیں آ گئے تھے۔ اماں بی بستر پر نیم دراز تسبیح میں مصروف تھیں۔ بابر شاہ اور اظہر شاہ کو ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھیں۔

"بسم اللہ! آگئے میرے بچے۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" اماں بی نے کہا۔ بابر شاہ، اظہر شاہ اور پھر فواد نے اماں بی کے سامنے سر جھکا کے ان کا پیار اور دعائیں لیں۔ کمرا بھانت بھانت کی آوازوں سے بھرنے لگا۔

"فہدی بھائی! آپ ٹھیک تو ہیں نا..... ہم سب بہت پریشان تھے۔ یہ رینی آپی بھی بہت پریشان تھیں۔" انیقہ نے خصوصی طور پر کچھ گھبرائی، کھوئی کھوئی، سمٹائی، امید و بیم کی کیفیت میں گرفتار آریان کے بارے میں کہا۔ فواد نے اس کی طرف دیکھا تو وہ انہی کی طرف متوجہ تھی۔ فواد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک تسلی آمیز اشارہ سا کیا۔

"یار کیا ہے بیٹھنے تو دو کم سے کم سانس تو لینے دو۔" بابر شاہ کچھ گھبرا کر بولے تو یکدم کچھ افراد نے ایک طرف ہٹ کر اماں بی کے بیڈ پر ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔

"توبہ کتنی پریشانی ہو رہی تھی۔ شکر ہے خیر خیریت سے آ گئے۔ میں تو اظہر کی طرف سے فکر مند تھی۔"

"یار پہلے مسئلے کا سوچو..... اظہر وہ چوہدری اسرار اب بھی ہینو خریدنے کو تیار ہو جائے گا؟"

"کون سی والی 7264۔"

"ہاں....."

"اٹھارہ لاکھ دے رہا تھا وہ کیش..... پر شاکر نے کہہ دیا کہ بائیس لاکھ ہونے چاہئیں۔" اظہر شاہ نے بتایا۔

"میرا خیال ہے اس سے بات کر لو اگر اب بھی خریدنے کو تیار ہو تو اٹھارہ میں ہی بیچ ڈالو اور ہاں مری روڈ پر جو میرا پلاٹ ہے وہ بھی کم از کم بیس لاکھ میں تو نکل ہی جائے گا۔ پہلی فرصت میں کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کرو۔ ایک ہفتہ بہت کم ہے۔" بابر شاہ، اظہر کو تفصیل سمجھاتے ہوئے بولے۔

"ارے کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے کیا کھچڑی پک رہی ہے۔" زاہدہ چچی آگے کو جھک کر بابر چچا کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"بابر مسئلے کا بتاؤ کیا بنا؟ حل ہوا یا نہیں۔" شینا پھپھو نے پوچھا۔

"شینا آپی! مسئلہ سمجھیں حل ہو گیا ہے۔ اس عورت نے تیس لاکھ روپے کی ڈیمانڈ کی ہے۔ بس رقم ارینج کرنے میں ایک دو مسائل ہیں۔ آپ دعا کریں۔" بابر شاہ کچھ پر سکون لہجے میں بولے۔ اسی وقت ان کی نظر آریان پر پڑی جو ایک طرف خاموش کھڑی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"آریان بیٹا! پریشان مت ہونا۔ بہت جلد تم اور تمہاری امی ایک دوسرے سے ملیں گی۔ صرف ایک ہفتہ بعد وہ تمہارے پاس ہوں گی۔ تم اب اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر رہو۔ کچھ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں۔ یہ گھر جس طرح مہوش، انیقہ اور روبیہ کا ہے بالکل ویسے ہی تمہارا بھی ہے۔ یوں سمجھو اب کوئی فکر نہیں رہی۔ اذیت کی رات کٹ گئی ہے۔" بابر چچا کی پر شفقت باتوں پر آریان کی پلکیں نم ہونے لگیں۔

"کیا یہ حقیقت ہے یا کوئی خواب۔ کیا وہ محفوظ ہو گئی۔ کیا اس کی امی بھی اس عقوبت خانے سے نجات پا لیں گی۔" یہ سب کچھ اسے بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ اس نے جھلملاتی نظروں سے پہلے بابر شاہ اور پھر فواد کی طرف دیکھا۔ جن کی نظروں میں محبت کے دیے روشن تھے۔

"ارے بیٹا! یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کیسے مانی وہ۔" اماں بی نے بابر چچا سے پوچھا۔

"بہت مشکل سے اماں بی۔۔۔ وہ تو مان ہی نہیں رہی تھی۔۔۔ اتنی مشکل سے منایا اسے۔"

"ارے خاک منایا جیب سے دے کر منایا تو کیا منایا۔ مجھے بولنے دیتے میں دیکھتا کیسے نہیں مانتی۔" اظہر چچا بولے۔

"رہنے دو تم تو آریان اور اس کی امی کے ساتھ ساتھ ہمارا بھی بھٹا بٹھانے والے تھے۔ تمہاری سلطان راہی جیسی بڑھک نے سب کی مٹی پلید کروا دینی تھی۔" بابر شاہ نے مسکرا کر کہا۔

"اب ایسی بھی طاقتور عورت نہیں تھی وہ۔ بس آپ کا منہ مار گیا مجھے۔ ورنہ دیکھ لیتا میں اسے کتنے پانی میں تھی وہ اور وہ اس کے پالتو مسٹنڈے۔" اظہر چچا بولے۔

"یعنی ہمارا خدشہ درست تھا انہوں نے وہاں جا کر فساد کیا نا۔۔۔ اماں بی میں ٹھیک ہی پریشان ہو رہی تھی۔" فیضی چچی بسورتے ہوئے بولیں۔

"تمہاری یہی عادت مجھے اچھی نہیں لگتی۔ فضول کے شکوک شبہات میں پھنسی رہتی ہو اور اللہ کے واسطے کوئی چائے کا کپ پلا دو۔ تھکے ہوئے آئے ہیں سفر سے پر کسی کو ذرا خیال نہیں۔" اظہر چچا مصنوعی ناراضی سے بولے۔

"میں لاتی ہوں چائے۔" شینا پھپھو باہر چلی گئیں۔

سبھی آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ خاص طور پر بابر چچا اور فواد کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کئی من بوجھ ان کے سینے پر سے سرک گیا تھا اور آریان کے لیے بھی یہ لمحے بہت خوش کن تھے۔ آزادی کے احساس نے اس کے وجود کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

☼ ☼ ☼

آنے والے چار پانچ دن بہت مصروفیت کے تھے۔ فواد کلینک کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو کر رقم کا بندوبست کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ فرحاد ملک ان گزرے دنوں میں بالکل گوشہ نشین تھے۔ کبھی کبھار لان کے کسی گوشے میں بیٹھا دکھائی دیتا۔ سارے بچے اسے گھیر لیتے۔ اس کے اردگرد بیٹھ کر گپیں لگاتے۔ کہانیاں سنتے۔ وہ بھی بچوں کے درمیان کچھ لمحے خوشگوار گزار لیتا۔ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتا۔ فواد نے بھی اسے زیادہ ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ ٹھیک ہو رہا تھا۔ اس لیے اس کا تنہا بیٹھ کر اپنی یادوں کو کھنگالنا ضروری تھا۔

آج ستارہ بیگم کا دیا ہوا وقت پورا ہو رہا تھا۔ رقم کا بندوبست ہو چکا تھا۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ جب بابر چچا فواد کے ہمراہ اماں بی کے کمرے میں آئے۔ اماں بی ہاتھ میں کوئی وظائف کی کتاب لیے پڑھنے میں مشغول تھیں۔ جبکہ آریان اور شینا پھپھو ان کے کمرے کی جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی تھیں۔

"اماں بی! فواد جا رہا ہے دعا کیجیے گا۔" بابر چچا نے انہیں مخاطب کیا تو انہوں نے کتاب پر سے نگاہیں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا۔ فواد نے اپنا سر ان کے آگے خم کیا تو انہوں نے کتاب ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھوں میں ان کا چہرہ تھام لیا۔ پیشانی پر کپکپاتے ہونٹ رکھے اور پھر ہٹا لیے۔

"اللہ کی امان میں جاؤ میرے بچے اللہ تمہیں کامیاب کرے۔" ان کے ہونٹوں سے دعا نکلی۔

"یہ بنگلے کی رجسٹری اور یہ تیس لاکھ روپے۔ بہت احتیاط سے جانا۔" بابر چچا نے ایک بیگ اور ایک فائل ان کے ہاتھ میں تھما دی۔ اور پھر ان کے ساتھ چلتے ہوئے باہر نکل آئے۔ آریان بھی تیزی سے پیچھے لپکی۔ بابر شاہ فواد کو گاڑی تک چھوڑ کر پلٹ گئے تو آریان ہمت کر کے آگے بڑھی۔ فواد اس کے انتظار میں گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ان کے قریب چلی آئی۔

"ریئی! کیا تم کچھ نہیں کہو گی۔" فواد پہلی بار بے تکلفی سے مخاطب ہوئے۔

"میں۔۔۔ میں انتظار کروں گی۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"کس کا؟" لہجے کی طرح نظریں بھی شوخی سے اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

"امی کا۔" وہ ایک لمحے کو رک گئی۔

"اور۔۔۔ اور آپ کا بھی۔" یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تیزی سے اندر کی طرف بھاگ گئی۔ فواد کی نظریں بھاگتی ہوئی آریان کی لہراتی سیاہ چوٹی پر ٹکی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ تھی۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئے۔ انہیں بائی روڈ جانا تھا اس لیے وقت کم تھا۔ گاڑی مناسب رفتار سے چل رہی تھی اور فواد گزشتہ چند ماہ کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ زندگی اتفاقات کا ایک بحر بیکراں ہے۔ جس لڑکی کو کچھ عرصہ قبل تک انہوں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ آج محض اس کی خاطر وہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھے۔ ان چند ماہ میں پے در پے اتنے عجیب واقعات ہوئے تھے کہ وہ جتنا سوچتے حیران ہوتے جا رہے تھے۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے وہ لاہور پہنچ گئے۔ شاہی محلہ کے باہر گاڑی کھڑی کر کے انہوں نے وہ بیگ اور کاغذات کی فائل ہاتھوں میں تھامی اور گاڑی کا دروازہ لاک کر کے باہر نکل آئے ان کے قدموں میں محسوس کی جانے والی تیزی تھی۔ سرخ لکڑی کا جالی دار دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں زینہ طے کر گئے۔ منقش دروازہ بھی کھلا ہوا تھا جیسے کسی کے انتظار میں جان بوجھ کر کھلا چھوڑ رکھا ہو۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ لاؤنج کی دیدہ زیب سجاوٹ ویسی کی ویسی تھی۔ لیکن انہیں اندر داخل ہوتے ہی ماحول پر طاری یاسیت فوراً محسوس ہو گئی۔ ایک طرف صوفے پر ستارہ بیگم بڑے بے ترتیب سے حلیے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ شکن آلود لباس، بے ترتیب بال اور نیم خوابیدہ آنکھیں۔ اس نے کھٹکے کی آواز پر سامنے میز پر رکھے ہوئے مشروب پر سے نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے سرخی مائل ہونٹوں پر آئی۔

"آؤ۔۔۔ جوان۔۔۔ آؤ میں جانتی تھی تم ضرور آؤ گے۔۔۔ بڑے وقت کے پابند ہو نہ ایک لمحہ ادھر نہ ایک ادھر۔۔۔ ستارہ بیگم نے ان سات دنوں میں زندگی جی لی۔ پتا نہیں کیوں ایسا لگتا ہے جیسے وجود کا کوئی حصہ کھو گیا ہے۔" اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی یقیناً اس وقت وہ نشے میں تھی۔ فواد نے آگے بڑھ کر فائل اور بیگ اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔

"میڈم یہ بنگلے کی رجسٹری اور ملکیت کے کاغذات اور یہ بیگ میں پورے تیس لاکھ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے آپ کی ڈیمانڈ پوری ہو چکی ہے۔ اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کیجیے۔" فواد سلجھے ہوئے انداز میں بولے۔

"گھنگھرو۔۔۔ ادھر آ۔" ستارہ بیگم کی آواز پر غلام عباس تیزی سے آتا دکھائی دیا۔

"جا۔۔۔ چاندنی سے کہہ تیرے وارث آ گئے تجھے لینے۔۔۔ ارے کیسی خوش نصیب ہے مان بھرے رشتوں کا ساتھ مل گیا اسے۔ پر ٹھہر۔۔۔ ایک منٹ ٹھہر۔۔۔ ہمیشہ تو جاتا ہے نا اسے بلانے پر آج آخری بار میں جاتی ہوں اس کے پاس۔ آؤ برخوردار۔" وہ پہلے غلام عباس سے اور پھر فواد سے مخاطب ہوئی پھر صوفے سے اٹھی تو اس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ بہت آہستہ روی سے چلتی ایک کمرے میں داخل ہوئی تو فواد اور غلام عباس بھی اس کے ہمراہ اندر داخل ہو گئے۔

"اری چاندنی۔۔۔ ارے خوش بخت دیکھ تو کون آیا ہے؟" چاندنی سنگھار میز کے آئینے کے سامنے بیٹھی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔

"کون ہے بائی جی؟" چاندنی نے پلٹ کر دروازے میں کھڑے اس سلجھے ہوئے سوٹڈ بوٹڈ جوان کو دیکھا جو اس سے پہلے اسے کبھی اس نے یہاں نہیں دیکھا تھا۔

"ارے تیرے وارثوں میں سے ہے۔ تجھے لینے آیا ہے۔ تجھے اس کے ساتھ جانا ہے۔"

"کیا مطلب بائی جی؟ کہاں جانا ہے مجھے۔۔۔؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"ارے گھنگھرو تو نے اسے کچھ نہیں بتایا رے۔"

"نہیں بڑی بائی جی! میں نے بی بی کو کچھ نہیں بتایا۔"

اس لیے کہ اس وقت پتا نہیں تھا کہ یہ کامیاب بھی ہو سکیں گے یا نہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سات دن تک امید کا ہاتھ تھام کر چلتے چلتے بی بی ناامیدی کی ٹھوکر کھا جائیں۔ بہت تکلیف ہوتی ہے ایسے۔"

"ارے گھنگھرو تیری بھی ہر بات نرالی ہے۔ چل پھر اب بتا اس کو دیکھ کیسے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی ہے میری طرف۔" ستارہ بیگم پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

"بی بی یہ فواد صاحب ہیں.... انہی کے گھر میں آریان نے پناہ لی تھی اور اس دن یہی آئے ہوئے تھے بڑی بائی جی کے پاس.... اور آج بڑی بائی جی کی ڈیمانڈ پوری کر کے یہ آپ کو لینے آئے ہیں۔"

"میں اب بھی کچھ نہیں سمجھ پا رہی۔"

"میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔" ستارہ بیگم کے ساتھ آنے والا نوجوان آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"آریان ہمارے گھر میں ہے گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے اور اب آپ بھی میرے ساتھ چلیں گی۔"

"بائی جی! کیا یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" چاندنی متحیر سی ستارہ بیگم کی طرف پلٹ کر بولی۔

"ہاں یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں چاندنی.... ارے تو تو نصیبوں والی ہے کہ تیری سر پر کوئی آنچل دینے والا ہے۔ کوئی اپنے گھر میں تجھے مان سمان کے ساتھ لے جانے والا ہے۔ تیرے آنے کے بعد میرے کوٹھے کے مقدر سنورے تھے اور اب جاتے جاتے بھی تو میری خواہشوں کی گود بھر کے جا رہی ہے۔ صرف ایک تیرے وجود سے میں نے زندگی کے اتنے سال سکھ پایا۔ جا چاندنی اس کوٹھے کے مقدر میں اندھیرے لکھ جا۔ اس گھر میں جا کے روشنی پھیلا جہاں تیرے وجود کو اعتبار اور محبت بخشی جائے۔" ستارہ بیگم اتنا کہہ کر باہر نکل گئی۔ تو فواد نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"میرے ابو نے آپ کو بہن کہا ہے کیا اس ناتے میں آپ کو پھپھو کہہ سکتا ہوں۔" فواد کے منہ سے یہ مان بھرا لفظ سن کر چاندنی کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھپھو! ابو خود آپ کو لینے کے لیے آتے لیکن ستارہ بیگم نے انہیں منع کر دیا۔ صرف مجھے آنے کی اجازت ملی۔ وہ سب بہت بے چینی سے آپ کے منتظر ہیں خاص طور پر آریان۔" آریان کا نام لیتے ہوئے ان کے ہونٹ خود بخود مسکرا اٹھے۔

"چلیے پھپھو...." چاندنی کے لیے یہ مژدہ جانفزا تھا۔ اسے رہائی مل رہی تھی۔ زندگی کی اس رائیگاں مسافت کو منزل نصیب ہونے والی تھی۔ اس نے ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی شکن آلود لباس پر اچھی طرح چادر اوڑھی اور ان کے ساتھ باہر نکل آئی۔ ستارہ بیگم لاؤنج میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

"چاندنی.... اپنے ہاتھوں سے ساری بتیاں تو بجھا دیتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ روشنی کو دیکھ کر میں پھر بھٹک جاؤں۔ اب میرا سفر بھی تو ختم ہونا چاہیے۔ بہت عرصہ گزر گیا ستارہ بیگم کو لوگوں کے دلوں پر راج کرتے۔ اب گمنامی چاہتی ہوں۔" چاندنی ستارہ بیگم کی بات سن کر اس کے قریب چلی آئی۔

"بائی جی کیا میں چلی جاؤں۔" وہ بے یقینی سے بولی۔

"ہاں جانا تو ہے تجھے۔"

ستارہ بیگم نے کہا تو چاندنی نے فواد کے ساتھ قدم آگے بڑھائے پھر کچھ سوچ کر ذرا فاصلے پر کھڑے غلام عباس کی طرف بڑھی۔

"غلام عباس! تم بھی چلو گے نا میرے ساتھ۔"

"نہیں بی بی! ہمارا سنگ یہیں تک تھا۔ آگے تو راستے بھی جدا ہیں اور منزلیں بھی۔ میری منزل بڑی دور ہے۔ استاد کہتا ہے چشمے کو سامنے دیکھ کر پیاس بجھا لو گے تو جستجو ختم ہو جائے گی۔ چشمے کو دیکھ کر پیاسے ہی آگے بڑھ جاؤ اور پیاسا غلام حسین چشمے کو چھوڑ کر آگے بڑھنا چاہتا ہے بی بی۔ جستجو کرنی ہے کچھ ڈھونڈنا ہے۔"

"غلام عباس! آج تو بتا ہی دو کہ تمہارا استاد کون ہے؟"

"بی بی! کیوں بار بار یہ سوال پوچھتی ہیں صد شکر وہ آپ کا استاد نہ ہوا۔ جائیں آپ کی منزل آپ کا

انتظار کر رہی ہے۔ رانی بٹیا کا بہت خیال رکھیے گا۔ زندگی سے مہلت ملی تو اس سے ملنے ضرور آؤں گا۔"

غلام عباس نے سر جھکا لیا۔ چاندنی فواد کے ہمراہ باہر نکل گئی دہلیز پر بکھرے ہوئے پھول اس کے پیروں کے نیچے آ کر چرمرا گئے۔

"گھنگھرو! تو کہاں جا رہا ہے.... کیا تو بھی مجھے چھوڑ جائے گا۔"

"بڑی بائی جی! بہت عرصہ گزر گیا ماں کا حکم مانتے ہوئے! اب استاد کا حکم ماننے کی باری آئی ہے۔ میں یہاں نہیں رک سکتا بڑی بائی جی! مجھے بھی اجازت دیجیے۔" غلام عباس نے دونوں ہاتھ باندھ کر التجا کرنے والے انداز میں کہا اور پھر پلٹ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

ستارہ بیگم کی پتھر آنکھ سے شاید پہلی بار آنسو نکلا اور اس کے گال سے ہوتا ہوا گریبان میں غائب ہو گیا۔ پہلی بار تنہائی نے اس کے دل پر دستک دی تھی اور آج وہ اسی تنہائی میں خود کو تلاش کر رہی تھی۔ اس کی نگاہیں پھولوں کی ان مسلی ہوئی پتیوں پر ٹکی ہوئی تھیں جنہیں چند لمحے پہلے چاندنی اور پھر غلام عباس کے پیروں نے کچلا تھا۔

☆ ☆ ☆

راولپنڈی کی مصروف ترین شاہراہ پر گاڑی کی رفتار خود بخود ہلکی پڑ گئی۔ چاندنی کی نگاہیں آزاد، بے فکرے چہروں کو بہت حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟" فواد نے پوچھا۔

"پتا نہیں بیٹا! اس وقت تو مجھے اپنے محسوسات کا کچھ پتا نہیں۔ ایک عجیب بے یقینی کی سی کیفیت ہے۔ گھٹن زدہ ماحول میں زندگی کے اتنے سال گزارنے کے بعد کھلی آب و ہوا نے حواس سلب کر لیے ہیں۔" چاندنی کا لہجہ سوگوار اور دھیما تھا۔

"جس طرح آپ نے آریان کو اس ماحول سے دور رکھا۔ آپ خود بھی تو کوشش کر سکتی تھیں۔"

"نہیں.... میں ستارہ بیگم کی خریدی ہوئی چیز تھی اس کی مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتی تھی لیکن آریان اس کی ملکیت نہیں تھی۔ اس کی تربیت میں نے اپنی مرضی سے کی اور اس میں غلام عباس نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ لیکن بیٹا! اس سب کے باوجود میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس دنیا کے لوگ ہمیں کبھی قبول نہیں کریں گے۔ تمہارے ابو کی بڑائی ہے یہ کہ انہوں نے ایک حرماں نصیب، تہی داماں عورت کو بہن جیسے پاکیزہ رشتے سے نوازا لیکن لوگ تمہارا جینا بھی حرام کر دیں گے۔ آریان کو بھی کسی اچھے گھر اور اچھے خاندان کے لوگ قبول نہیں کریں گے۔"

"نہیں پھپھو! آپ ذہن سے سب خدشات نکال دیں۔ ابو نے دل سے آپ کو بہن کہا ہے اور وہ ہمیشہ ایک بھائی کی حیثیت سے ہی آپ کا خیال رکھیں گے اور جہاں تک آریان کی بات ہے تو کچھ دن پہلے میرے ابو اور بڑی اماں کے درمیان اس مسئلے پر گفتگو ہو چکی ہے۔ بڑی اماں نے آپ کی آمد تک کے لیے پروگرام ملتوی کر دیا تھا کہ آپ آ جائیں تو آپ کی مرضی اور رائے سے میرا اور آریان کا رشتہ طے کر دیا جائے۔" فواد بڑی بے تکلفی سے بولے۔ یقیناً" چاندنی کی نرم خو طبیعت سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ چاندنی ان کی بات پر مسکرا کر گاڑی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ جانے پہچانے راستوں پر اس کی نگاہیں پھسل رہی تھیں۔ گاڑی ایک بہت بڑے گیٹ کے سامنے روک کر فواد نے ہارن دیا۔

"یہ.... یہ۔" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن زبان نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ فواد کی بھرپور توجہ سامنے تھی۔ گیٹ کھل چکا تھا۔ گاڑی آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی سادات نگر کے اندر داخل ہو گئی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے لیکن سادات نگر میں تو جیسے دن نکلا ہو۔ انہوں نے گاڑی پورچ میں روک کر ان کی طرف دیکھا۔ گھر کے سبھی افراد وہاں موجود تھے۔ حتیٰ کہ اماں بی بھی جو اس وقت سو چکی ہوتی تھیں سب کے ہاتھوں میں پھولوں کی پلیٹیں تھیں جو یقیناً" چاندنی کے استقبال کے لیے تھیں۔

"دیکھا پھپھو! میں نہ کہتا تھا کہ سب بہت شدت سے آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ دیکھیے آپ کے استقبال کے لیے سب کے ہاتھوں میں پھول ہیں۔ سادات نگر میں کتنی روشنی ہے۔" فواد نے کہا لیکن وہ تو اس وقت کسی سکتے کی سی کیفیت میں سامنے ہنستے بولتے، کھلتے مہکتے چہروں کو دیکھ رہی تھی۔ روشنیوں میں نہائے ہوئے یہ محبت و اپنائیت سے لبریز چہرے کس قدر خوب صورت دکھائی دے رہے تھے۔ فواد گاڑی سے اتر کر لان کی طرف بڑھے پھر جیسے کچھ یاد آنے پر پلٹے۔ وہ ابھی تک گاڑی میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

"آیئے پھپھو....." انہوں نے دروازہ کھول کر اسے باہر آنے کو کہا۔ لیکن اس کے وجود میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی وہ کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت نظروں سے سامنے دیکھے جا رہی تھی۔

"آیئے نا پھپھو..... آیئے۔" فواد نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے گاڑی سے باہر نکلنے میں مدد دی۔

آریان بے قراری سے آگے بڑھی لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ فواد اس کا ہاتھ تھامے نیم اندھیرے میں سے یکدم روشنیوں میں آئے تھے اور اس کے روشنی میں آتے ہی جیسے وقت کی رفتار تھم گئی تھی۔ اماں بی کے ہاتھ سے تسبیح پھسل گئی۔ ایک سکوت ماحول پر محیط ہو گیا۔ سب کے قدم یوں زمین میں گڑ گئے جیسے کسی ساحر نے سحر پھونک کر سب کو پتھر بنا دیا ہو۔ اگر ان کے وجودوں میں زندگی کے کوئی آثار تھے تو وہ صرف خوابیدہ سینوں میں دھڑکنوں کا ارتعاش تھا جو ان کے زندہ ہونے کا ثبوت تھا۔

بچے اپنے بڑوں کی اس عجیب و غریب کیفیت سے ہکا بکا نظر آ رہے تھے اور آریان وہ الگ اپنی جگہ ساکت کھڑی کبھی چاندنی اور کبھی سادات نگر کے مکینوں کو دیکھے جا رہی تھی اور سادات نگر کے مکینوں کی حالت جیسے دگرگوں تھی۔ دماغوں میں آندھیوں کے جھکڑ سے چل رہے تھے۔ ان کے سینوں کے اندر گویا طوفان برپا تھے اور وجود جیسے زلزلوں کی زد میں تھے۔ سب کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"مم..... مسرت....." فضا میں تنا ہوا سکوت ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

بالکل ایسے ہی جیسے بلندی سے شیشہ زمین پر گرے اور ایک چھناکے سے چکنا چور ہو جائے۔ اسی طرح شہنا پھپھو کی آواز نے جیسے مہیب سناٹے کی چادر چیر کر رکھ دی۔ اماں بی نے لڑکھڑا کر لان چیئر کا سہارا لیا۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں شناسائی کے ساتھ ہی کرب و اذیت کا ایک بحر بیکراں ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ سب اسی طرح کھڑے تھے کہ اظہر شاہ اور بابر شاہ تیزی سے آگے بڑھے۔ انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر مسرت جہاں یوں خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹی جیسے وہ اسے فنا کر دالیں گے۔ جیسے اسے مذبح خانے لے جایا جانے والا ہو۔

"میں 'میں' نہیں 'میں' خود نہیں 'آ' آپ 'میں' نہیں..... آئی 'آپ' آپ لے..... لے کر آپ۔" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بے ربط انداز میں بولیں۔

"مسرت جہاں..... ٹھہرو۔" بابر شاہ اس کی کیفیت سے گھبرا کر بولے۔

"نہیں..... نن..... نہیں..... میں۔"

"مسرت جہاں ٹھہرو..... رک جاؤ۔" بابر شاہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں کندھوں سے تھام لیا۔

"مم..... میں سچ 'سچ کہہ رہی ہوں 'میں نہیں آئی' آپ خود۔" وہ عجیب ہذیانی انداز میں بولیں۔

"ہمیں پتا ہے تم خود نہیں آئیں..... ہم لے کر آئے ہیں تمہیں..... ہوش کرو مسرت جہاں۔" لیکن ان پر تو جیسے ہیجان طاری تھا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے گیٹ کے قریب پہنچ چکی تھیں اور مسلسل خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھیں۔ اظہر شاہ اور بابر شاہ انہیں بازوؤں میں سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"مسرتی..... تم آ گئیں اچھا ہوا کیونکہ تم نے یہیں آنا تھا۔ تمہاری جگہ یہیں تھی۔ ہمیں معاف کر دو۔ زیادتی تو ہم نے کی تھی تم سے..... ہوش کرو مسرتی..... کیا کر رہی ہو اب تو تم اپنوں میں آ گئی ہو۔ دشمنوں میں تو نہیں۔ ہوش کرو میری جان۔" شہنا پھپھو نے ان کے چہرے پر آنے والے بال پیچھے کرتے ہوئے بہت محبت سے بولیں۔ لیکن مسرت جہاں ہوش میں ہی کہاں تھیں۔ بابر شاہ کی بانہوں میں مچلتے ہوئے مسلسل یہی تکرار کر رہی تھیں۔

"مجھے چھوڑ دو..... میں نے یہاں نہیں رہنا..... مجھے چھوڑ دو..... مجھے معاف کرو۔"

وہ سب جو مسرت جہاں کے وجود سے نا آشنا تھے۔ اور آج پہلی بار انہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کا اس گھر سے تعلق اور ربط تو جان چکے تھے۔ لیکن کسی نے مداخلت نہیں کی۔ سبھی کے عالم عجیب تھے۔

"مسرت تمہارا کوئی قصور نہیں..... پھر تم تو اپنے کیے سے زیادہ کفارہ ادا کر چکی ہو۔ ہم میں سے کسی کے دل میں تمہارے لیے کوئی میل نہیں۔" اظہر شاہ مسرت جہاں سے مخاطب تھے۔ لیکن مسرت جہاں ان کی آواز سے بے خبر ہو چکی تھیں۔ شدید ہیجان اور غیر متوقع صورت حال نے ان سے ان کے حواس چھین لیے تھے۔

وہ بے ہوش ہو کر بابر شاہ کے بازوؤں میں جھول گئیں۔ بابر شاہ انہیں اندر لے آئے۔ سبھی ارد گرد جمع تھے لیکن یوں جیسے بے زبان ہوں۔ ماحول پر طاری سکوت میں بس سب کی خوف زدہ سانسوں کا دھیما دھیما ارتعاش تھا۔ آریان پریشان سی کھڑی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"فواد..... کچھ کرو..... جلدی۔" بابر شاہ عجلت میں بولے۔ مسرت جہاں کو اماں بی کے بستر پر لٹا دیا۔ فواد اپنا بیگ اٹھا کر لے آئے۔ ہارٹ بیٹ چیک کرنے کے بعد انہوں نے ایک انجکشن لگایا۔

"ابو! کوئی مسئلہ نہیں بس ذہنی دھچکہ برداشت نہیں کر پائیں۔ سکون آور نیند کا انجکشن لگا دیا ہے۔ اٹھیں گی تو بہتر ہوں گی۔" فواد نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میرا خیال ہے آپ سب بھی اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیں۔ آرام کریں۔ رات کافی گزر چکی ہے۔" بابر چچا کے کہنے پر سب آہستہ آہستہ سرکنے لگے۔ اب کمرے میں بابر چچا، شہنا پھپھو اور اماں بی رہ گئی تھیں۔ رات گزر گئی۔ لیکن مسرت جہاں کے سوا کسی کی آنکھیں بند ہوئیں اور نہ کوئی سو سکا۔ اماں بی کی نظریں مسرت جہاں کے خوب صورت لیکن تھکے ہوئے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

آج سے اکیس سال پہلے سترہ اٹھارہ سالہ مسرت جہاں اور آج کی مسرت جہاں میں کتنا فرق تھا۔ ایسی ہی ایک اندھیری رات میں وہ سادات نگر کی دہلیز پار کر گئی تھیں۔

اکیس سال بعد ایک رات اور ان سب کی زندگیوں میں آئی تھی۔ جو ملن کی رات تھی۔ بہت ہولے ہولے ان کی پلکوں نے جنبش کی۔ اماں بی کے متحرک ہاتھ تسبیح پر رک گئے اور ہونٹ ورد کرتے کرتے ساکت ہو گئے۔ اگلے ہی پل انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے تک ان کی آنکھوں میں اجنبیت کا تاثر تھا۔ پھر جیسے ہی ماحول سے آشنائی ہوئی۔ ان کے چہرے پر رات والی وحشت نے ایک بار پھر پنجے گاڑ لیے۔ وہ اٹھ بیٹھیں لیکن اس بار اماں بی نے انہیں کچھ کہنے نہ دیا۔ بس اپنے ناتواں بازوؤں میں بھر کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ تو مسرت جہاں ایک مدت کے بعد ماں کا لمس پاتے ہی بکھر گئیں اور ان کے وجود میں سمٹ کر کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آج وہ اپنے اندر کا سارا دکھ آنسوؤں کے راستے باہر نکالنا چاہتی تھیں یا آج پوری کائنات اپنے آنسوؤں میں ڈبونا چاہتی تھیں۔ ان کے یوں بلک بلک کر رونے کی آواز سن کر باقی سب بھی کمرے میں آ گئے۔ روتے روتے ان کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اور ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

"رو لو..... رو لو مسرت جہاں..... ان آنسوؤں کو بہا دو۔ جو تمہارے دل پر بوجھ ہیں۔ اپنی روح کے تمام زخم دھو لو ان آنسوؤں سے آج کے بعد تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں آنے چاہئیں۔" بابر شاہ نے آگے بڑھ کر مسرت جہاں کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"مسرت جہاں قصور، تمہارا نہیں تھا۔ ہماری بھی غلطی تھی۔ ہمارے رویے، ہماری انا، ہمارا پیدا کردہ ماحول ہی غلط تھا۔ ہمیں جلد ہی پتا چل گیا تھا کہ تمہارے اس قدم کے پیچھے ہماری خطائیں ہیں۔ بس اب تم بھی ذہن سے سب کچھ نکال دو۔" بابر شاہ نادم سے لہجے میں بولے۔

"لیکن بھائی میں یہاں نہیں رہ پاؤں گی..... میرا داغدار وجود اس گھر کے تقدس کو بھی میلا کر دے گا۔" مسرت جہاں کا سر بھی جھکا ہوا تھا اور نگاہیں بھی اور لہجے میں دل میں ترازو ہو جانے والا کرب تھا۔ اماں بی کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"اب اگر دوبارہ تم نے ایسی بات کی تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔" اماں بی کی بات سن کر مسرت جہاں نے چونک کر سر اٹھایا۔ لیکن اس مقدس چہرے پر ان کے لیے غصہ نہیں ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ پھر ان کی نگاہیں اپنے بھائیوں کی طرف اٹھ گئیں۔

جن کے چہروں پر شرمندگی، تاسف، محبت، اپنائیت اور جانے کون کون سے تاثرات رقم تھے۔ بچوں کے چہروں پر الگ عقیدت و احترام، محبت اور امید و بیم کے تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔ مسرت جہاں تو ایک عرصہ ہوا۔ رشتوں کی آسودگی کو بالکل ہی بھول چکی تھیں۔ وہ تو ایک ایک رشتے کو ترسی ہوئی تھیں اور یہاں کتنے ہی رشتے جیسے ان کے منتظر تھے۔ ان کی محبت اور توجہ کے محتاج۔ وہ اماں بی سے ایک بار پھر لپٹ گئیں۔ اماں بی کو اپنی بیٹی اور مسرت کو اپنی بیٹی مل گئی تھی غبار چھٹ گیا تھا۔ سب کچھ ڈھل گیا تھا۔ فضا میں تناؤ اور کشیدگی چھٹنے لگی تھی۔

ایک مدت بعد بچھڑے ملے تھے سو سارا دن ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شام کے وقت سب لان میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ مسرت جہاں کے لیے بھی کے چہروں پر محبت تھی۔ یوں لگتا تھا۔ اکیس سال پہلے کا وقت پلٹ آیا تھا۔ بھائیوں کی وہی محبت لوٹ آئی تھی۔ مسرت جہاں بھی جیسے درمیانی عرصہ کی ساری اذیت بھول کر محبتوں کا نیا جہان سمیٹ لینا چاہتی تھیں۔ بابر شاہ اور اظہر شاہ تو کسی کام سے باہر چلے گئے تھے اور جاتے جاتے ایک نیا شوشا چھوڑ گئے تھے۔

"مسرت جہاں تمہارے لیے ایک اور سرپرائز بھی ہے۔" ان کے لاکھ پوچھنے پر بھی انہوں نے نہیں بتایا۔ یہ کہہ کر چلے گئے کہ ابھی نہیں کل صبح اور وہ خاموش ہو گئیں۔ باتوں باتوں میں فرجاد ملک کے بارے میں بھی بابر چچا نے ساری بات تفصیل سے پوچھ لی تھی۔

صبح کی نماز ادا کر کے مسرت جہاں اماں بی کے بستر میں دبکی ہوئی تھیں جب کمرے کا دروازہ کھلا اور بابر شاہ اندر داخل ہوئے اور اونچی آواز میں بولے۔

"آجاؤ بھئی..... سارے اندر آجاؤ بمعہ سرپرائز کے۔" اور اس بار جب دروازہ کھلا تو سب سے پہلے اندر داخل ہونے والی شخصیت کو دیکھ کر مسرت جہاں کی پلکیں جیسے ساکت ہو گئیں۔ ان کے چہرے پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا اور آنے والے کی کیفیت بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

"فر..... فرجاد....." مسرت جہاں کے ہونٹ بہت ہولے سے وا ہوئے اور خوشبو کی طرح یہ نام ان کے ہونٹوں سے ادا ہوا۔ فرجاد ملک بہت دھیمے دھیمے چلتے ہوئے ان کے بالکل قریب آٹھہرے۔ اور اگلے ہی پل انہوں نے بڑھ کر مسرت جہاں کے پیر تھام لیے۔

"مسرت جہاں! مجھے معاف کر دو۔" ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا اور مسرت جہاں نے جیسے تڑپ کر اپنے پاؤں پیچھے ہٹا لیے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ..... کیوں گناہ گار کر رہے ہیں مجھے؟"

"مسرت جہاں..... زندگی بھر سکھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ تمہاری جھولی خوشیوں سے بھرنے کی تمنا کی تھی میں نے۔ لیکن جانے اوپر والے کو منظور کیوں نہ ہوا۔ تمہاری جھولی غموں اور کانٹوں سے بھر گئی۔ لیکن مسرتی خدا گواہ ہے کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ میرے ساتھ فیاض نے دھوکا کیا۔ اس نے تو مجھے مار ہی دیا تھا۔ لیکن قسمت میں تم سے دوبارہ ملنا لکھا تھا۔ جو میں خود فراموشی کی کیفیت میں بھی زندہ رہا۔ دنیا والوں کے پتھر سہتا رہا لیکن جیتا رہا۔ شاید تمہاری محبت کی تڑپ مجھے زندہ رکھے ہوئے تھی۔ لیکن پھر بھی..... پھر بھی مسرت جہاں میں تم سے معافی مانگتا ہوں..... تمہارے ساتھ ہونے والے ہر ظلم کی وجہ میں ہوں۔"

"ایسا مت کہیں میں نے کب گزرے ماہ و سال کا حساب مانگا۔ میں جانتی ہوں کہ آپ بے قصور ہیں۔ آپ کی کوئی غلطی نہیں۔" مسرت جہاں کے لہجے میں اضطراب تھا اردگرد موجود سبھی افراد ان دونوں کو دیکھ رہے تھے اور وہ تو جیسے اطراف سے بے خبر بس ایک دوسرے میں گم تھے۔ ان کی اس محویت میں مخل ہونا وہاں موجود کسی کو ٹھیک نہ لگا سو ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ بچوں کو بھی گھور گھور کر وہاں سے باہر نکالا گیا۔

"مسرتی! تمہاری محبت سے دور رہ کر میں دنیا میں بس دربدر ہی رہا۔ میں جی تو نہیں رہا تھا۔ صرف سانس لے رہا تھا اور میری ہر سانس اس پاگل پن میں بھی صرف تمہارے لیے آتی جاتی رہی۔" فرجاد تشنہ لہجے میں بولے۔

"میں بھی تو تڑپتی رہی..... اکیس سال تک آپ تو ہوش و خرد سے دور تھے نا فرجاد لیکن میں ہوش میں تھی..... ہر آتی جاتی سانس ایک قیامت بن کر وجود کو زخماتی تھی میں تھک گئی تھی فرجاد! لیکن فیاض کے بتانے کے باوجود کہ آپ مر چکے ہیں مجھے یقین نہیں تھا امید تھی کہ میں اپنی محبت سے ضرور ملوں گی ایک بار صرف ایک بار ہی سہی لیکن آپ سے ملنے کی آرزو اور امید نے مجھے حوصلہ دیے رکھا کہ میں اپنی عزت کو بچا کر ایک غلیظ جگہ سے ویسی ہی پاک اور صاف آگئی۔ جہاں کی غلاظت کے چھینٹے بہت بچ کر گزرنے والوں پر بھی پڑ جاتے ہیں۔" مسرت جہاں کی بات کے اختتام تک فرجاد نے ان کے ہاتھ تھام لیے مسرت جہاں چونک کر اردگرد دیکھنے لگیں۔

"یہ سب کیوں چلے گئے؟"

"سبھی بہت عقلمند ہیں..... سمجھتے ہیں۔" انہوں نے آگے بڑھ کر مسرت جہاں کو بانہوں میں بھر لیا۔ اس مضبوط حصار میں مقید ہو کر ایک طویل عرصے بعد مسرت جہاں نے پرسکون ہو کر پلکیں موند لیں۔ ان کی تھکی ہوئی روح کی مسافت مکمل ہو گئی تھی۔ اکیس سال کے کرب و اذیت کا اختتام ہو گیا تھا۔

"فرجاد..... اتنا عرصہ کہاں رہے؟" مسرت جہاں نے ان کے سینے پر سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

"استاد کی ٹھوکروں میں رہا۔" وہ مسکرا کر بولے تو مسرت جہاں نے چونک کر سر اٹھایا۔

"کیا مطلب؟"

"بھئی کہتے ہیں نا کہ زمانہ استاد ہوتا ہے تو زمانے کی ٹھوکروں میں رہا۔ لیکن تم کیوں چونکیں؟"

"بس یونہی استاد سے کچھ یاد آگیا تھا۔" مسرت جہاں کھوئے کھوئے لہجے میں بولیں۔

"کیا.....؟"

"جس جگہ میں رہتی تھی نا..... وہاں ایک شخص تھا غلام عباس سارے اسے گھنگھرو کہہ کر بلاتے تھے بڑی عجیب عجیب باتیں کرتا تھا وہ میں آج تک نہیں سمجھی وہ مجھے کہا کرتا تھا بی بی میرے استاد نے مجھے بڑا مشکل سبق دیا ہے۔ وہ پڑھتے پڑھتے میری مسافتیں طویل ہو گئی ہیں پر میں جانتا ہوں میرے سامنے منزل نہیں آئے گی لیکن مجھے یونہی سفر کرتے رہنا ہے۔ پتا ہے فرجاد وہیں پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا لیکن اس ماحول میں جذب نہ ہو سکا آپ کے منہ سے استاد کا لفظ سنا تو میں چونک پڑی۔" مسرت جہاں نے کہا تو فرجاد کے چہرے پر ایک گہری آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"سمجھ گیا۔ جانتی ہو اس کا استاد کون تھا؟"

"نہیں! میں نے ان اکیس سالوں میں بارہا اس سے یہی سوال کیا تھا لیکن اس نے ہر بار یہی جواب دیا کہ ابھی وقت نہیں آیا اور اب جب فہدی مجھے لے کر آ رہا تھا تو میرے سوال کرنے پر اس نے یہی کہا کہ بی بی بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ سمجھ جائیں گی۔"

"تو کیا تم سمجھیں۔"

"نہیں ....." ان کے نفی میں سر ہلانے پر فرجاد ملک نے ہولے سے ان کا سر تھپتھپایا۔

"ارے پگلی..... عشق کر کے بھی نہ سمجھیں تم..... لیکن ٹھوکریں کھا کر میں سمجھ گیا۔ وہ عشق کا شاگرد تھا۔ عشق کا سبق پڑھنے والا۔" اور مسرت جہاں کی نگاہوں کے سامنے جیسے سارے پردے ایک ایک کر کے اٹھ گئے۔ اس کی ہر بات کا مفہوم انہیں سمجھ آنے لگا ان کی پلکوں سے عقیدت کے دو آنسو غلام حسین کے نام پر اور فرجاد ملک کے کشادہ سینے میں گم ہو گئے۔

"آپ دونوں نے تو مجھے بھلا ہی دیا۔" دستک دے کر آریان اندر آ گئی تو۔ فرجاد نے آگے بڑھ کر اسے درمیان میں بٹھالیا۔

☼ ☼ ☼

فرجاد ملک نے اماں بی سے جانے کی اجازت طلب کر لی۔ اماں بی نے انہیں اس شرط پر جانے کی اجازت دی کہ وہ کہیں اور نہیں بلکہ سلطان پور اپنی حویلی میں جا کر رہیں گے۔ فرجاد ملک ان کی محبت کے آگے مجبور ہو گئے۔ اماں بی نے حویلی مسرت جہاں کے نام کر دی تھی وہ اپنے حصے کی تمام جائیداد آریان کے نام کر دی تھی۔ بابر شاہ ان کے جانے سے چند دن پہلے حویلی کی حالت ٹھیک کروانے کے لیے چلے گئے۔

اور آج وہ سادات نگر سے رخصت ہو کر جا رہے تھے۔ سبھی انہیں گیٹ تک رخصت کرنے آئے۔ بابر شاہ واپس آ چکے تھے اور اب فرجاد اور مسرت جہاں کو وہاں چھوڑنے کے لیے جانے کا فریضہ اظہر شاہ نے اپنے سر لے لیا۔

"مسرتی وہاں جا کر بھول نہ جانا..... جلدی جلدی چکر لگایا کرنا۔ ہم بھی بہت جلد آئیں گے۔" زاہدہ چچی نے معنی خیز نظروں سے آریان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو مسرت جہاں سمجھ کر مسکرا دیں۔

"ضرور بھابھی کیوں نہیں..... میں آپ سب کا انتظار کروں گی۔" مسرت جہاں کی نگاہوں میں فواد کے لیے پیار تھا۔ اور فواد وہ سامنے گاڑی سے پشت ٹکائے یک ٹک آریان کو دیکھے جا رہے تھے۔ جوان کی پر شوق نگاہوں سے بچنے کے لیے مسرت جہاں کی آڑ لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ فرجاد ملک نے ایک نظر آریان کے چہرے پر پھیلتے رنگوں کو دیکھا اور پھر فواد کی بے تاب نظروں کو محبت کرنے والے دور سے محبت کی خوشبو کو پہچان لیتے ہیں اور فرجاد ملک خود بے شک اسیر موسم ہجراں رہے تھے لیکن اپنے بچوں کو تو وہ اسیر ہونے سے بچا سکتے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر فواد کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"فہدی! تمہاری پھپھو کے ذریعے تمہارا پیغام مجھ تک پہنچ چکا ہے۔ ہم تمہارے منتظر رہیں گے۔ تمہاری ایک امانت ہے ہمارے پاس جب چاہو آ کر لے جانا۔" ذو معنی انداز میں کہہ کر وہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ آریان اور مسرت جہاں سب سے گلے ملنے کے بعد گاڑی کی طرف آئیں۔

"رینی..... میرا انتظار کرو گی نا..... زیادہ نہیں بس چند دن۔" فواد نے میٹھی سی سرگوشی کی اور آریان اثبات میں سر ہلا کر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

فرجاد ملک اور مسرت جہاں کی مسافت دم توڑ چکی تھی اور منزل ان کے پیروں کے نیچے تھی۔ فواد ابھی منزل سے چند قدم دور تھے۔ لیکن صبح نو کا انتظار اتنا جان لیوا ابھی نہیں ہوتا اور ان میں حوصلہ تھا۔ یہ چند قدم کا فاصلہ پاٹنے کا کہ اس کے بعد تو ہر قدم پر ان کے ہمراہ آریان کو ہونا تھا۔ ایک طمانیت بھری سانس سینے میں اتار کر انہوں نے گاڑی کو گیٹ سے باہر جاتے دیکھا اور مسکرا کر واپس ہوئے۔ کبھی کبھی وقتی دوری کتنی حسین رفاقت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

☼ ☼

شاہدہ ملک

ناولٹ

سرخ گلابوں سے سجا کمرہ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ مختلف تھکا دینے والی رسوم کے بعد اسے لاؤنج میں صوفے پر بٹھا دیا گیا تھا۔ دولہا کی رشتہ دار عورتیں اور چند بچیاں اس کے اردگرد بیٹھی چہک رہی تھیں۔ اسی ماحول میں کھانا سرو کیا گیا تھا اور پھر وہ تمام اسے تھام کر اوپر اس کے کمرے میں لائی تھیں۔ شدید تھکن اور احساسات پر جمی برف کی بدولت وہ مکمل طور پر نہ سہی مگر کچھ نہ کچھ اردگرد سے بے خبر ضرور تھی۔ شوخ اور چنچل ہنسی مذاق کو غائبانہ طور پر سنتے ہوئے نہ جانے کیا وقت ہوا تھا جب رحمت بوا نے کمرے میں انٹری دی تھی۔

"چلو بھئی بچیو! کمرہ خالی کردو' دلہن رانی تھک گئی ہوگی' اب اسے آرام کرنے دو۔" انہوں نے گویا سب کو کمرہ خالی کرنے کا اشارہ دیا تھا۔ آن کی آن میں وہ سب آگے پیچھے کمرے سے نکل گئیں تو رحمت بوا کے جانے کے بعد وہ تکیے سے ٹیک لگا کر ذرا ایزی ہو کر بیٹھ گئی اور کمرے کا بغور جائزہ لینے لگی۔ پھولوں کی سجاوٹ بڑے ماہرانہ انداز میں کی گئی تھی۔ دل ہی دل میں سراہتے ہوئے اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی' گھڑی کی سوئیاں رات کے دوسرے پہر کو الوداع کہہ رہی تھیں۔ اسے تنہا کمرے میں بیٹھے ہوئے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ آنکھوں میں اترتی نیند پپوٹوں کو باہم گلے ملنے پر مجبور کر رہی تھی۔ دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا اور وہ یک دم ہی سنبھل کر بیٹھ گئی تھی۔

"ہم بولیں محبت کی زبان۔" اندر آنے والا دروازہ بند کرکے مڑا تو کمرے کی خاموشی کو موبائل کی گنگناہٹ نے توڑ دیا تھا۔

"ہیلو!" وہ موبائل کان سے لگائے ٹیرس پر کھلنے والا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔

"ارے جان بتایا تو تھا کہ میں کتنا بزی ہوں۔ بھانت بھانت کے لوگوں کو اٹینڈ کرنا اور پھر تمام تقریبات کی ذمہ داری بھی تو مجھ پر ہے۔" مخفی دروازہ بند ہونے سے قبل سماعتوں سے ٹکرانے والے الفاظ عروسی جوڑے میں ملبوس مہرالنسا کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھے۔ شیرینی میں ڈوبا لہجہ گواہ تھا کہ اس کا مخاطب کون ہے؟

"ارے آپ ابھی تک یوں ہی بیٹھی ہیں چینج کرلیں نا پلیز۔" پون گھنٹے کے بعد وہ کمرے میں لوٹ آیا تھا اور اسے وہیں بیٹھے دیکھ کر جیسے حیران ہوا تھا۔ وہ بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔ اتنا تو جان چکی تھی کہ آج شب کا کوئی پل اسے سراہے گا نہیں۔ مگر پچھلے کچھ عرصے سے دل پر اتنے عذاب لمحے اترے تھے کہ بیٹھے بیٹھے اردگرد سے بے نیاز ہو جانا اس کی فطرت بن چکی تھی۔

"اف اوہ' یہ چارجر کہاں گیا؟" چینج کرکے واپس آئی تو چیزوں کی اٹھا پٹخ کرنے کے دوران وہ خود کلامی کرتے ہوئے مایوس ہو کر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"یہ ہر قدم پر زندگی مجھے نئے امتحان سے کیوں دوچار کردیتی ہے؟" کمبل کے اندر اپنے وجود کو گم کرتے ہوئے اس نے آنکھوں میں اترنے والی نمی سے سوال کیا تھا۔ زندگی اسے جس مقام پر لے آئی تھی کم از کم اتنا تو تجربہ ہو گیا تھا کہ احتجاج ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا' سو اس نے بھی صبر اور خاموشی سے ہتھیار ہاتھ میں لے کر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑنے کا سوچ لیا تھا۔ اپنی کم مائیگی کے احساس سے ایک آنسو پلکوں کی اوٹ سے نکل کر تکیے میں گم ہوا تھا۔ کمرے کی روشنی تاریکی میں بدلی اور ٹیبل لیمپ کی ہلکی سی روشنی نے کمرے میں اجالا بکھیر دیا تھا۔ ذہنی انتشار کے باوجود نیند کی دیوی مہربان ہونے کو تھی جب اسے اپنے کندھے پر انجانے سے لمس کا احساس ہوا تھا۔ جس نے اگلے ہی لمحے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

باغ میں جھولا جھولتے ہوئے جب کچے انگور کھا کھا کر گلا درد کرنے لگا تو اس نے گل سے التجا کی۔

وہ درخت پر چڑھ کر تھوڑے سے پھل توڑ لائے' مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"تم خود کیوں نہیں چڑھ جاتیں لالہ کو پتا چل گیا تو میری خیر نہیں ہوگی۔" اس نے معقول جواز پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اچھا تو کیا تمہارے لالہ نے مجھے دیکھ لیا تو کچھ نہیں کہیں گے۔" مہرالنسا نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں۔ انہوں نے مجھ سے تو تمہارے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی' پھر میں کیا جانوں۔" گل نے لاپروائی سے کندھے اچکا دیے تھے۔

"چلو واپس گھر چلتے ہیں۔" اس کی بات نے مہو کے لہجے میں کڑواہٹ گھول دی تھی۔ اسے نا صرف غصہ آیا تھا بلکہ وہ خاصی اداس بھی ہو گئی تھی۔

"نہیں یار اتنا مزا آرہا ہے تھوڑی دیر اور رکتے ہیں۔" گل ایک مرتبہ پھر جھولے پر بیٹھ کر ہوا سے باتیں کرنے لگی' مگر مہو چپ چاپ اٹھ کر چل دی تھی۔

"ارے ارے کدھر چلیں مہو۔" اس نے یک دم جھولا روک کر اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے کہا اور چند قدم آگے جا کر اسے روک لیا تھا۔

"تم تو اتنی سی بات پر ناراض ہو گئیں' چلو میں تمہارے لیے پھل توڑ کر لاتی ہوں۔ اب مان بھی جاؤ نا۔" گل غالباً اس کی ناراضی کی وجہ یہ ہی سمجھ پائی تھی۔ سو منت سے اسے راضی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بادل ناخواستہ مہو کو بھی رکنا پڑ گیا تھا۔ چند منٹ کے اندر گل جھولی بھر کر پھل توڑ لائی تھی اور وہ دونوں نالے کے اس حصے کی طرف چل دی تھیں۔ جہاں وہ آبشار کی شکل اختیار کرتا تھا۔ پھل دھوتے ہوئے اونچی آواز میں دنیا جہان کی باتیں ہو رہی تھیں۔ جب کتے کے بھونکنے کی آواز پر ان دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ گندمی رنگت اور سنہرے بالوں والا وہ شخص کتے کی زنجیر پکڑے ان سے چند قدم کے فاصلے پر آن کھڑا ہوا تھا۔

"مجھے تھوڑا سا پانی چاہیے۔"

"تو پھر؟" مہو نے قدرے ناگواری سے سوال کیا تھا۔

"مجھے اس بوتل میں پانی بھر دیں گی آپ؟" اس نے شائستگی سے سوالیہ انداز میں کہتے ہوئے بوتل ان کی طرف بڑھائی تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے اس گاؤں کے لوگ پینے کا پانی بھرنے آتے تھے۔ یہاں جانوروں کے آنے کی قطعی ممانعت تھی۔ غالباً وہ بھی یہ بات جانتا تھا' تب ہی اس قدر دور کھڑا تھا۔ مہو نے بوتل اس کے ہاتھ سے لے کر آبشار سے بھری اور اس کی طرف واپس بڑھا دی تھی' مگر اس کے انداز میں خاصی ناگواری تھی اور اس کی وجہ اس اجنبی کی وہ نظریں تھیں جن سے وہ گل پاشہ کو دیکھ رہا تھا۔

"کون ہے یہ؟" اس کے جانے کے بعد گل پاشہ نے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں کہیں باہر سے آیا ہوگا۔" مہو نے بے رخی سے جواب دیا تھا۔

"نہیں لگتا تو یہیں کا ہے ورنہ اسے پتا نہ ہوتا کہ پینے کا پانی کہاں سے لیتے ہیں۔" گل پاشہ نے اندازہ لگایا تھا۔ جس کی تصدیق چند دن بعد ہی ہو گئی تھی۔ جب چھت سے کپڑے اتارتے ہوئے یوں ہی اس کی نظر باغ کی طرف اٹھی تھی۔ اور اس نے اس شخص کو فیروز لالہ کے ساتھ پھرتے دیکھا تھا۔ اور بعد میں گل کے پوچھنے پر انہوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ خان بابا کا نواسہ کیپٹن شاہ میر ہے۔ جو چکوال سے آیا ہے اور یہاں اکثر اس لیے نظر آتا ہے کہ قریبی شہر میں اس کا ٹرانسفر ہوا ہے۔ لہٰذا ویک اینڈ پر تو ضرور آتا ہے۔ ٹھیک ایک ماہ بعد گل کی اس سے ملاقات اپنے گھر پر ہوتی تھی۔ جب وہ لالہ سے ملنے آیا تھا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چائے پینے کے بعد چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"گل تم یہاں اکیلی بیٹھی ہوگی۔" کچے انگور کے چٹخارے لیتے ہوئے گل نے اسے اطلاع دی تھی۔

"کیوں؟" وہ چونک پڑی تھی۔

"میں نے کل پنڈی جانا ہے لالہ کے ساتھ۔ میرا یونیورسٹی میں انٹری ٹیسٹ ہے۔"

"تو کیا اب تم یونیورسٹی میں بھی داخلہ لوگی۔" مہو نے کچھ اچنبھے سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے تفاخر سے سر ہلایا۔

"چاچا نے اجازت دے دی تمہیں؟" مہو کو ایک نیا نکتہ سوجھ گیا۔

"جب لالہ نے کہہ دیا تو تمہارے چاچا کون ہوتے ہیں روکنے والے۔" اس نے کچھ اکڑ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"یونیورسٹی میں تو لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں۔" مہو نے کچھ برا سا منہ بنایا۔

"میں اس یونیورسٹی میں داخلہ لوں گی جناب جہاں صرف لڑکیاں پڑھتی ہیں۔"

"یعنی ویمن یونیورسٹی؟"

"ہاں اور ویمن یونیورسٹی کا تو میں نے خود لالہ سے کہا ہے کیونکہ میری دو دوستیں بھی وہاں داخلہ لے رہی ہیں۔ ورنہ لالہ کہتے ہیں یہ تو کو ایجوکیشن کا کیڑا بیمار ذہن کے لوگوں میں کلبلاتا ہوگا۔ اچھا انسان کسی بھی ماحول میں چلا جائے اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"تم اتنا پڑھ کر کیا کروگی؟"

"اتنا کون سا بھئی یہ ماسٹرز کوئی اتنا زیادہ پڑھنا تھوڑی ہوتا ہے لالہ کہتے ہیں کہ کیمسٹری میں ماسٹرز کرنے کے بعد وہ مجھے ایم فل اور پی ایچ ڈی بھی کروائیں گے۔"

"مگر ایم فل اور پی ایچ ڈی کا تو خرچہ بھی بہت ہوتا ہے۔" مہو اپنی اندرونی کیفیت کو چھپائے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں میں نے بھی لالہ سے کہا تھا مگر وہ کہہ رہے تھے کہ اعلا تعلیم کا خرچہ ان کی پے سے کم ہی ہوتا ہے۔ اور یوں بھی زمینوں کی آمدنی اتنی زیادہ ہوتی ہے وہ کب کام آئے گی۔"

"اتنا عرصہ تمہارے لالہ اپنی تنخواہ تم پر خرچ کرتے رہیں گے۔" وہ اندر ہی اندر جل بھن گئی تھی۔

"صرف تنخواہ کی کیا بات ہے میرے لالہ میرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ وہ بہت پیار کرتے ہیں مجھ سے۔" گل چہرے پر اپنے لالہ سے عقیدت کے ہزاروں دیپ جلائے کہہ رہی تھی۔

"سنو مہو لالہ کو پڑھے لکھے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں تم بھی کچھ پڑھ لو نا کم از کم پرائیویٹ ہی سہی۔" گل نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا تھا کہ مہو فیروز سے منسوب تھی۔

"میرا بس چلے تو ایم فل اور پی ایچ ڈی تو میں تمہیں ایسا کرواؤں کہ ہمیشہ یاد رکھو۔" مہو دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"کہاں کھو گئیں۔" گل اپنی بات کے جواب میں مہو کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں... ہاں کہیں نہیں کچھ نہیں تم کیا کہہ رہی تھیں۔" مہو چونک کر حقیقت کی دنیا میں واپس آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ایکسکیوز می آپ مہوز کی سسٹر ہیں نا۔" وہ مہو کا انتظار کر رہی تھی جب آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"شاہ میر بھائی السلام علیکم!" وہ چونک کر مڑی اور سامنے کھڑے شاہ میر کو سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! اس کا مطلب ہے میں نے ٹھیک پہچانا ہے۔ مہوز سے ملنے آیا تھا تو آپ کے ہاتھ کی چائے پی تھی۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کیسے ہیں آپ؟" گل نے اعتماد سے حال احوال دریافت کیا تھا۔

"بالکل ٹھیک مہوز کب تک آرہا ہے؟"

"ابھی تو پچھلے ہفتے ہی گئے ہیں کہہ رہے تھے کہ اب کی بار عید پر ہی آئیں گے۔"

"آپ یہاں کیا کرتے پھر رہے ہیں۔" خاموشی کے مختصر سے وقفے سے نکل کر گل پوچھ رہی تھی۔

"میں خان بابا کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔ سب بتا رہی تھیں کہ وہ اس طرف کو نکلے ہیں پتا نہیں کہاں غائب ہوگئے۔" آخری جملہ اس نے خود کلامی کے انداز میں ادا کیا تھا۔

"میں نے تو انہیں اس طرف نہیں دیکھا خان بابا کا کیا پتا راستے میں کوئی جاننے والا مل گیا ہوگا تو مصروف ہوگئے ہوں گے۔" گل نے کہا تھا۔

"او کے میں چلتا ہوں۔" شائستگی سے کہتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا تھا گل بے دھیانی سے اسے آگے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

"یہ کون ہے؟ اور تم سے کیا کہہ رہا تھا؟" اسی وقت مہو آن پہنچی تھی۔

"یہ بھائی کا کورس میٹ ہے غالباً کچھ ایسا ہی بتا رہا تھا۔ گھر پر بھی ایک دن ان سے ملنے آیا تھا۔" گل نے لاپروائی سے جواب دیتے ہوئے اچھل کر شاخ پکڑی تھی جبکہ مہو کی نظریں اس کے چہرے پر کچھ کھوج رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

آج گل کو شاہ میر کے ساتھ بات کرتے ہوئے دیکھ کر مہو کے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لیا تھا۔ اس کے دل میں اپنی اس دوست چچازاد ہونے والی نند اور بھابھی کے لیے نفرت کی ایک چنگاری سلگ رہی تھی۔ اس کی وجہ کبھی تو اسے سمجھ آتی تھی اور کبھی یوں ہی وہ اس کی نفرت میں اپنے آپ سے الجھے جاتی کیا تھا گل میں جو اس میں نہیں تھا۔ مگر وہ اس کے مقابلے میں خود کو بہت کمتر محسوس کرتی تھی۔ اور یہ ہی احساس کمتری اسے کڑھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ گل پاشہ اسے کب سے بری لگنے لگی تھی۔ اگر وہ سوچتی تو بہت سی بے بنیاد باتیں اور لایعنی سوچیں ذہن کے در پر دستک دینے لگتیں۔ اور بہت سے واقعات سوچ کی سطح پر ابھرنے لگتے تھے جو وقتاً فوقتاً جنم لیتے رہے تھے۔

"گل... گل... گل پاشے۔" مہو بہت زیادہ اونچا جھولا جھول رہی تھی۔ اور گل قریبی درخت کے تنے پر بیٹھی کینو سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جب مہوز نے خاصی دور سے گل کو آواز دی تھی۔

"لالہ۔" گل خوشی سے تقریباً چیختے ہوئے اس کی طرف بھاگی تھی۔

"لالہ آپ کب آئے اور یوں اچانک۔" اس کے قریب جا کر وہ پھولی سانسوں سے پوچھ رہی تھی۔

"جھلی!" اس نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی تھی۔

"ساری باتیں یہیں کھڑے پوچھ لوگی۔"

"ہائے لالہ آپ کو اپنے سامنے پا کر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ بتا نہیں سکتی۔" مہو جھولا روک کر ان کی باتیں سنتی رہی۔

"میں ابھی پہنچا ہوں اماں کے بتانے پر یہاں چلا آیا۔ پتا تھا میری جھلی بہن جھولے سے لٹکی ہوگی۔" وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔ دونوں باتیں کرتے کرتے مڑ گئے تھے۔ جبکہ مہو جھولے پر بیٹھے انہیں ساکت نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بات کرنا تو کجا مہوز نے اس کی طرف دیکھا تک نہ تھا۔ وہ مہوز جس سے وہ دو سال کی عمر میں منسوب کر دی گئی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کے درمیان اس رشتے میں آزادانہ میل جول اور بات چیت کا رواج نہ تھا۔ مگر زبیر خان بھی تو تھا گل پاشہ کا منگیتر۔ اس کا چھوٹا بھائی گل کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں روشنیاں سی بھر جاتی تھیں۔ بڑوں کے سامنے تو وہ مخاطب ہوتا تو بھی اس کی گفتگو کا مرکز و محور گل ہی رہتی تھی۔ اگرچہ گل نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کی تھی مگر کوئی بھی عید یا تہوار ہوتا تو اسے اس وقت تک چین نہیں پڑتا جب تک وہ اسے دیکھ نہ لیتا۔ مہو بھائی کی تمام بے چینیوں کو محسوس کر کے مہوز سے مقابلہ کرتی تو اندر ہی اندر گھلنے لگتی تھی۔ اور پھر مہوز کا گل کی ذات پر حد سے زیادہ توجہ دینا اس کے تمام تر معاملات کی نگرانی کرنا۔ وہ بہن کے حوالے سے جو خواب دیکھتا تھا وہ من و عن مہو تک پہنچتے تو وہ سلگ کر رہ جاتی۔

مہو کے ماموں بے اولاد تھے۔ انہوں نے مہوز کی پرورش اور تعلیم کا بیڑہ اس وقت اٹھایا تھا جب وہ پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ وہ آرمی میں جونیئر آفیسر

تھے۔ لہٰذا انہوں نے ہمیشہ اپنی توجہ اس بات پر مرکوز رکھی کہ مہوز کو آرمی میں جانا ہے۔ نتیجتاً آج وہ آرمی میں خاندان کا پہلا آفیسر تھا۔ اگرچہ زمینوں کی آمدن بہت تھی مگر تعلیم اور آفیسر شپ کے تڑکے نے اسے پورے خاندان میں ممتاز کر دیا تھا۔ مہو کا قدرتی طور پر پڑھائی کی طرف رجحان کم تھا۔ حالانکہ بابا جان نے بہت کوشش کی کہ وہ گریجویشن کر لے۔ مگر ایف اے کی انگلش میں دوبار سپلی آنے کے بعد اس نے مزید پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ گل خوب صورتی کے علاوہ اس معاملے میں بھی اس سے برتر تھی۔ وہ گریجویشن اچھے نمبروں کے ساتھ کرنے کے بعد کیمسٹری میں ماسٹرز کرنے کا ارادہ رکھتی تھی اور مہو کو لگتا' وہ زندگی بھر اس سے برتر ہی رہے گی۔ گل کی کامیابیاں اس کے اندر نفرت اور حسد کے پودے کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتیں۔ مہو کے دل میں کئی مرتبہ خیال آتا کہ مہوز کی تمام تر توجہ اور سوچ بہن کے گرد مرکوز رہتی ہے "اگر وہ نہ ہوتی تو یقیناً"....

اپنی بے وقوفی میں اسے کبھی یاد نہ رہا کہ ہر رشتے اور تعلق کی اپنی اپنی اہمیت ہوتی ہے اور کچھ رشتے اپنے تعلق کے اظہار کے لیے مناسب وقت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ گل فطرتاً" کچھ معصوم طبیعت کی تھی اور وہ دونوں ہمہ وقت ساتھ ساتھ رہا کرتی تھیں۔ مگر کبھی کبھی وہ اس کی پرخاش کو محسوس کرتی' مگر اس کا سبب نہ جان پاتی' تب دونوں میں دوبدو مقابلہ ہو جاتا تھا' کسی بھی چھوٹی سی بات پر۔

"میں دو بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔" مہو کہتی۔

"تمہارے دونوں ایویں سے بھائی.... میں اپنے بھیا کی لاڈلی بہن ہوں' میرے لالہ کیپٹن ہیں' آرمی آفیسر۔" گل فرضی کالر سیدھے کر کے کھلکھلاتی۔

"بڑا آیا تمہارا اکھنا بھائی کیپٹن۔" مہو اتنی ہی فضول بات کرتی۔

"ہائے تم ایسے کیوں کہہ رہی ہو' تمہیں تو فخر کرنا چاہیے "آخر کو وہ تمہارے مجازی خدا ہوں گے۔" گل سیز فائر کا اعلان کر دیتی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے فخر کرنے کی۔" مہو الگ راستے پر چل پڑتی۔

"ناراض ہو کر کہاں چلیں' میں نے کچھ غلط کہا ہے کیا۔ اتنا کم عمر' خوب صورت آفیسر بندہ ہر کسی کا نصیب نہیں ہوتا۔"

"کم عمر سے تمہاری کیا مراد ہے؟" اب کے وہ رک کر پوچھ رہی تھی۔ مہوز اس سے دو سال چھوٹا تھا' سو وہ اس طنز کو بخوبی سمجھتی تھی۔

"کچھ بھی نہیں' میرا مطلب ہے جو اتنی کم عمر میں آفیسر بن جائے۔" گل بات بدل کر ہنستی چلی جاتی۔

☼ ☼ ☼

"بھر جائی مہوز کا فون ہے۔" وہ اماں کے کپڑے سلائی کر رہی تھی۔ جب فیروز چاچا نے دیوار کے دوسری طرف سے آواز لگائی تھی۔

"اماں لالہ کا فون ہے' میں سن کر آتی ہوں۔" وہ کہہ کر جلدی سے باہر نکلی تھی' پیچھے سے اماں دوپٹہ سر پر لینے کی ہدایت کرتی ہی رہ گئیں۔

"ہاں پتر پانی کی حالت بڑی خراب ہے' بارش ہوئی نہیں اور ہماری باری بھی ہفتے میں ایک دن ہی ہوتی ہے۔" فیروز چاچا کہہ رہے تھے۔

"یہ لو پتر گل سے بات کرو۔" انہوں نے فون اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"جی لالہ میں بالکل ٹھیک ہوں' حال احوال نہیں پوچھیں' جلدی سے بتائیں میرا ایڈمیشن ہوا یا نہیں۔" وہ پھولی سانسوں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

"اف اوہ لالہ! میرا دم نکل جائے گا۔" دوسری طرف غالباً" وہ اس کی بے چینی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"کیا سچ؟" وہ خوشی سے چیخ اٹھی تھی۔

"آپ کی بہن ہوں' کوئی ایسی ویسی تھوڑی ہوں۔" وہ خوشی سے کالر کھڑے کر رہی تھی۔

"پتر بات ختم ہو جائے تو میری بھی بات کروانا۔" فیروز چاچا کو کوئی بھولی ہوئی بات یاد آئی تو وہ ایک مرتبہ پھر فون کے پاس آن کھڑے ہوئے تھے۔ سو وہ ریسیور انہیں پکڑا کر مہو کے پاس آ گئی جو چولہے پر بیٹھے ہانڈی چڑھا رہی تھی۔

"مہو پتا ہے لالہ کہہ رہے تھے میرا نام میرٹ لسٹ میں دوسرے نمبر پر آیا ہے' میں اتنی خوش ہوں' تمہیں بتا نہیں سکتی' پتا ہے لالہ بھی اتنے خوش تھے نا....

کیا بات ہے مہو' تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟ تم نے مجھے مبارک باد بھی نہیں دی۔" اپنی کہتے ہوئے اسے خیال آیا تو وہ پوچھنے لگی تھی' مہو چولہے میں جھک کر پھونکیں مارنے لگی تھی۔

"مہو کی بچی میں کیا کہہ رہی ہوں۔" وہ چڑ کر پوچھ رہی تھی۔

"آں... ہاں مبارک ہو بہت بہت۔" مہو اپنے خیال سے چونک کر کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ٹھک ٹھک ٹھک' دیوار کے دوسری طرف سے نشریاتی رابطہ ہوا تھا اور اس کا مطلب گل پاشہ کی طرف سے یہ پیغام تھا کہ وہ باغ میں جا رہی ہے۔ لہٰذا مہو نے جوتی اٹھا کر جواباً" پیغام نشر کیا کہ وہ بھی چل رہی ہے۔ اور ابھی باہر نکلی ہی تھی کہ بیٹھک سے زبیر نکلتا نظر آیا تھا۔

"مہو جلدی سے دو کپ چائے بنا دو' بابا کے دوست آئے ہیں۔" بادل ناخواستہ جلدی جلدی آگ جلا کر وہ چائے بنانے لگی تھی۔ گل گھر سے نکل کر عقبی طرف سے پگڈنڈی سے گزر کر باغ میں پہنچتی تھی' جبکہ مہو اماں کے کمرے کی بغیر سلاخوں والی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر پچھلی طرف کود جاتی تھی۔ چائے بنا کر وہ کھڑکی کے پٹ کھول کر چھلانگ لگانے کو تھی کہ اس کی نظر باہر کی سمت اٹھی اور وہ دیکھتی ہی رہ گئی۔ پگڈنڈی سے نیچے اتر کر یقیناً" وہ گل ہی تھی جو کسی سے بات کر رہی تھی۔ یک دم مہو کی تمام حسیات بے دار ہوئی تھیں' اس نے کن انکھیوں سے کمرے میں موجود اماں کی طرف دیکھا تھا۔

"اماں... اماں ذرا بات سنیں۔" اس نے وہیں کھڑے کھڑے انہیں آواز لگائی تھی۔

"کیا بات ہے؟" وہ تکیے پر غلاف چڑھاتے ہوئے مصروف انداز میں بولی تھیں۔

"ادھر آئیں جلدی سے۔" مہو کے دل میں عرصے سے جو لاوا ایک رہا تھا وہ آج پھٹنے ہی والا تھا۔

"ہاں بول۔" اماں پاس آ گئی تھیں۔

"وہ دیکھیں گل کو کس دیدہ دلیری سے جوان لڑکے سے باتیں کر رہی ہے۔"

"کیا مطلب ہے مہو تیرا؟" اماں کچھ حق دق ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

"اماں میں گل کو کئی مرتبہ اس لڑکے کے ساتھ چھپ کر باتیں کرتے دیکھ چکی ہوں' جھولے کے پاس ہی دونوں ملتے ہیں۔"

"ہائے میرے ربا' تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" انہوں نے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

"میں نے سوچا آپ میری بات پر یقین کریں گی یا نہیں؟" مہو نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا تھا' اس کا تیر نشانے پر جا لگا تھا۔

"آئے ہائے گل کلاں کو یہ گند ہمارے سر ہی منڈھا جائے گا' بتاتی ہوں تیرے ابا کو آج ہی۔" اماں بول رہی تھیں اور مہو کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ گل کے کردار پر پڑنے والے چھینٹے اسے کس قدر پاتال میں گرا سکتے تھے کہ شاید وہ سر اٹھا کر مہو کو دیکھنے کے قابل بھی نہ رہتی اور یقیناً" مہوز بھی اپنی لاڈلی کے مستقبل کے سارے منصوبوں پر چار حرف بھیج دیتا۔

"گل تم باغ میں آتے ہوئے راستے میں کس کے ساتھ بات کر رہی تھیں۔" اماں ادھر ادھر ہوئیں تو تھوڑی ہی دیر بعد وہ گل کے ساتھ تھی۔

"کب؟" اسے تو کچھ یاد بھی نہیں تھا۔

"جب آج تم ادھر آ رہی تھیں تو...."

"اچھا اچھا... ملکو چاچے کے گھر کا پوچھ رہا تھا' جوان کی بیٹی کی پنڈ میں شادی ہوئی ہے' اس کے سسرالی

رشتہ داروں میں سے تھا شاید۔" گل نے اپنی ازلی سادگی سے اس کی بات پر غور کیے بغیر تمام تر تفصیل بتا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

مہو نے اماں پر زور دیا تھا کہ وہ افشاں چاچی کو بیٹی کے کرتوت بتائیں' بات عورتوں سے ہوتی ہوئی مردوں تک پہنچی تھی اور پھر اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا دونوں خاندانوں کے درمیان' فیروز علی کو سکینہ بیگم نے پہلے ہی اتنا بھڑکا دیا تھا کہ انہیں بھتیجی کے غلط چال چلن میں سارا قصور اپنے بھائی شہروز اور بھتیجے مہوز کا نظر آرہا تھا' جنہوں نے اسے تعلیم کے نام پر کھلی چھٹی دی ہوئی تھی۔ شاید زندگی میں پہلی مرتبہ دونوں بھائیوں کے درمیان تلخ کلامی ہوئی تھی۔ زبیر کو یہ بات ماننے میں کچھ تامل تھا' مگر اسے ماں نے ڈانٹ کر چپ کرا دیا تھا اور دیور اور مہوز کے سامنے اعلانیہ کہا

"انہوں نے خود کئی دفعہ گل کو غیر لڑکے سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ بلکہ ابھی دو روز پہلے ہی وہ باغ کے کونے میں کھڑی کسی کے ساتھ گپ لگا رہی تھی' ایسی بدکردار لڑکی کو....."

"خبردار..... خبردار اگر کسی نے میری بہن کے بارے میں مزید ایک لفظ بھی کہا تو میں اس کی زبان کھینچ لوں گا۔" مہوز کی برداشت جواب دے گئی تو وہ چیخ اٹھا تھا۔

"چلیں جی انھیں بیٹی کی جوانی سنبھالی نہیں جاتی اور لگے ہیں ہمیں الزام دینے۔" سکینہ بیگم نے شوہر کو ٹہوکا دیا تھا۔ مہوز کی نظریں کھلے دروازے سے اندر جاتی گل پر پڑیں' تھر تھر کانپتی فق چہرے کے ساتھ یہ تمام تر جھگڑا دیکھ رہی تھی۔

"گل..... گل۔" مہوز نے اس کے قریب جا کر پکارا تھا۔

"لالہ..... لالہ' میں چاچی۔" اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ کر نکلے اور اگلے ہی لمحے وہ مہوز کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔

فیروز' شہروز اور صفیہ تین بہن بھائی تھے۔ گل پاشہ اور مہوز خان' شہروز علی خان کی اولادیں تھیں' جبکہ فیروز کے ہاں مہر النسا اور زبیر خان کے علاوہ تیسرا اور چھوٹا بیٹا اکمل خان دماغی طور پر ابنارمل تھا۔ صفیہ کی ایک ہی بیٹی تھی' ان کے ہاں خاندان سے باہر شادیاں کرنے کو اچھا نہ سمجھا جاتا تھا۔ سو دونوں بھائیوں کے درمیان زبانی طور پر جو فیصلہ ہوا اس میں مہوز اور مہر النسا کی نسبت طے پائی اور گل پاشہ اور زبیر خان کا مستقبل ایک دوسرے سے منسوب کرنے کا تھا۔ صفیہ کی بیٹی گلنار کی اپنے چچا کے بیٹے حسیب کے ساتھ منگنی ہو چکی تھی۔ ان کے درمیان عمر کا ایک واضح فرق تھا۔ مگر یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ اس سے قبل بھی اس طرح کے بے جوڑ رشتے طے کیے جاتے رہے تھے۔ پھوپھو صفیہ اور گل کی ماں افشاں کی آپس میں بہت بنتی تھی' جبکہ مہو کی ماں سکینہ کا مزاج ان دونوں سے میل نہ کھاتا تھا۔ صفیہ کی ہمیشہ سے کوشش رہی تھی کہ وہ کوئی ایسی تدبیر کرے کہ گلنار کا رشتہ مہوز کے ساتھ ہو جائے' عورتوں کے چھوٹے موٹے اختلافات اپنی جگہ مگر دونوں بھائیوں کے درمیان جو فیصلہ ہوا تھا اس سے کسی کو بھی ہٹانا پہاڑ کو گرانے کے مترادف ہوتا' مہو اور اس کی ماں بھی صفیہ کی اس کوشش سے بے خبر نہ تھیں۔ اور دل ہی دل میں اس بات پر کڑھا کرتیں کہ مہوز کی خوب صورتی' اس کی تعلیم اور روشن مستقبل ہی وہ خوبیاں ہیں جن کی بنیاد پر افشاں بیگم کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ صفیہ اور گلنار اس کے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔ مہو اور اس کی ماں کی چھوٹی چھوٹی باتیں تو نظر انداز کر دی جاتی تھیں۔ مگر اب انہوں نے جو الزام گل پاشہ پر لگایا تھا وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھا۔ سو دونوں خاندانوں میں شدید ناچاقی پیدا ہوئی اور ملنا جلنا بند ہو گیا۔

ایک خلافِ معمول بات یہ ہوئی کہ صفیہ نے پرانی روش کو ترک کر کے مہو اور اس کی ماں سے روابط استوار کرنا شروع کر دیے تھے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ اس نے افشاں بیگم سے باتوں باتوں میں یہ معلوم کر لیا تھا کہ اس تمام جھگڑے کے باوجود

نا صرف..... شہروز علی خان اپنی زبان پر قائم ہے بلکہ اگلی فصل اٹھانے کے بعد مہوز کی شادی کرنے کا بھی ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے بدلتے رنگ اور سوچ کو مہو بھانپ چکی تھی اور اپنے بچھائے کھیل کی بساط پر جمے مہرے تبدیل کرنے کا بھی سوچ چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مہو تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔" سکینہ بیگم اس کی بات سن کر بھنا گئی تھیں۔

"اوہو' اس میں دماغ خراب ہونے والی کون سی بات ہے' زبیر اور گلنار کی شادی کرنے کا ہی تو کہا ہے میں نے۔" مہو اپنے پلان پر بہت مطمئن تھی۔

"اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی تیرے ابا اور چاچا اپنی زبان پر قائم ہیں اور تو....."

"وہ اپنی زبان پر قائم ہیں تو صفیہ پھوپھو نے ہمارے آگے پیچھے پھرنا شروع کیا ہے ناں۔"

"کیا مطلب ہے تیرا مہو۔" سکینہ بیگم زچ ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

"مطلب یہ اماں کہ اگر شہروز چاچا اپنی رشتے والی بات سے پھر جاتا تو صفیہ پھوپھو ہمیں گھاس نہ ڈالتیں۔ مگر ادھر تو اس نے دیکھ لیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں' اس لیے اب یہاں قسمت آزمائی کر رہی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ بھی یہ ہی چاہتی ہے' یعنی زبیر اور گلنار کی شادی۔" صفیہ بیگم کو اس کھیل کی کچھ سمجھ آ رہی تھی۔

"تو اور کیا اماں اس نے دیکھ لیا ہے کہ مہوز تو اسے ملنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا زبیر بھی برا نہیں' اس طرح گلنار کو اپنے چاچے کے کم سن بیٹے کے انتظار میں بال سفید نہیں کرنے پڑیں گے۔"

"تیرا کیا بنے گا نامراد' تیری اس بات نے مجھے تو گھما کر رکھ دیا ہے۔"

"میرے اور مہوز کے رشتے پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔" وہ پراسرار انداز میں مسکرائی تھی۔

"بس یہ ہو گا اور گل کی شادی زبیر کے بجائے اکمل سے ہو جائے گی۔"

"اکمل سے..... جس کا ذہن ہمیشہ کسی آٹھ سال بچے کا رہے گا' تیرا چاچا اپنی پڑھی لکھی بیٹی کا رشتہ اسے کیوں دینے لگا۔ چل ہٹ پرے ہر وقت ذہن میں فتور کا کیڑا گھسا رہتا ہے۔"

"اف اوہ اماں' پیاری اماں غور تو کر' اسے یہ رشتہ مجبوراً "کرنا پڑے گا" کیونکہ اکمل ہی خاندان کا واحد بر رہ جائے گا اور پھر خاندان سے باہر بیٹی بیاہنے کی بے غیرتی وہ کیوں کرے گا۔" سکینہ بیگم سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

"مگر ہم اتنا بکھیڑا کیوں کریں؟"

"اماں اس طرح چاچی افشاں اور گل کبھی بھی ہمارے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہیں گی' اور چاچا کے خاندان کو ہم پر جو برتری حاصل ہے وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی' یوں بھی اب تو گل بدنام ہو ہی چکی ہے۔"

"اماں! یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟" زبیر خان تو ساری بات سن کر بدک گیا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں بیٹا' تو بھی غور کر تو ہی ہمارے فائدے کی بات ہے۔"

"ہمارا اس میں کیا فائدہ ہے؟" اس نے سر کو ہاتھ پر گرا لیا تھا۔

"تو جانتا ہے ناکہ تیری چاچی افشاں اور صفیہ پھوپھو ہمارے خلاف محاذ بنائے رکھتی ہیں۔ صفیہ کی بیٹی سے شادی کرنے کے بعد وہ تو ہمارے دباؤ میں آجائے گی' اور افشاں کی اکڑ بھی ختم ہو جائے گی۔"

"مگر اماں میں گلنار سے شادی نہیں کروں گا۔" اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"تو پھر کس سے کرے گا؟" مہو سامنے آ گئی تھی۔

"اسی سے جو میری منگ ہے۔" اس کا لہجہ اٹل تھا۔

"اچھا تو تجھے اس بدکردار لڑکی کو اپنانے کی ضد ہے'

جو چھپ چھپ کر مردوں سے ملتی ہے۔"

"وہ ایک غلط فہمی تھی۔" وہ گل کے کردار کے بارے میں کچھ بھی غلط ماننے کو تیار نہ تھا۔

"ہائے بیٹا کیسی باتیں کرتے ہو' میں نے اسے خود کئی مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" اب کے سکینہ بیگم خود میدان میں کود پڑی تھیں۔ زبیر کے چہرے پر تاریکی چھا گئی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کسی شدید کرب سے گزر رہا ہے۔

"اور اپنی غلط حرکتوں کی وجہ سے وہ پورے گاؤں میں بدنام بھی ہے' ہمیں تو کوئی اس لیے نہیں بتا تا کہ وہ ہمارے چاچی کی بیٹی ہے۔" گل کے کردار پر چھینٹے اڑا کر ہی وہ اسے نیچا دکھا سکتی ہے' سوایک مرتبہ پھر ٹکرا لگا رہی تھی۔

"تو اندر جا مہو۔" تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا تھا۔

"اماں ایک بات میں آپ کو بتادوں' اگر ہم نے گل کا رشتہ نہ لیا تو مہو کا رشتہ بھی چاچا لوگ نہیں لیں گے۔" اب اسے صرف بہن کے مستقبل کی فکر تھی۔ دروازے کی آڑ میں کھڑی مہو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ در آئی تھی۔

"ارے بیٹا کیوں نہیں لیں گے گل کا رشتہ' ضرور لیں گے مگر اپنے اکمل کے لیے۔"

"یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے چاچا مان جائے گا۔"

"چاچے کا تو باپ بھی مانے گا۔" مہو نے باہر آتے ہوئے جوش سے جواب دیا تھا۔

"گل یوں بھی اپنے کچھنوں سے بدنام ہو چکی ہے اور پھر خاندان میں کون ہے جو اس کا رشتہ کرے گا۔ مجبوراً" اسے ہماری ہی بات ماننی ہوگی۔"

"ابا مان جائے گا؟"

"پہلے تو تجھے اس کے سامنے انکار کرنا ہوگا کہ گل کی بدنامی کی وجہ سے تو اس سے شادی کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کے بعد میں سمجھا بجھا لوں گی۔" سکینہ بیگم نے تسلی دی تھی اور مہو اپنے پلان پر بہت خوش تھی' اس بات سے بے خبر کہ کاتب تقدیر ایک نیا فیصلہ رقم کرنے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

گلنار اور زبیر کا نکاح انتہائی سادگی سے ہوا۔ اور نکاح کے وقت تک یہ بات انتہائی خفیہ رکھی گئی' مہو اور اس کی ماں کا خیال تھا کہ یہ خبر سن کر شہروز علی کا پورا خاندان ان کے قدموں میں دوڑا چلا آئے گا۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا' البتہ مہو اور مہوز کی نسبت ختم کرنے کا سندیسہ پہنچا دیا گیا تھا اور شاید اس خاندان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی نے رسم و رواج کو رد کرنے کا اعلان کیا تھا۔ شہروز علی خان نے کہا تھا کہ وہ بیٹے اور بیٹی دونوں کی شادی خاندان سے باہر کرے گا۔ الٹی آنتیں کچھ یوں گلے پڑ گئی تھیں کہ معاملے کو سلجھانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ تب برادری کے چند افراد کو منت سماجت کے لیے بھیجا گیا تھا۔

"میرے بھائی نے مجھے ہر طرح سے ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے۔" شہروز علی کا موقف تھا۔

"دیکھو شہروز' ہم مانتے ہیں کہ اس نے غلطی کی ہے' اسی لیے تو ہم آئے ہیں۔" چاچا ملک دین نے اپنی زبان کھولی تھی۔

"اور اس نے جو غلطیاں کیں ان کی وہ تم سے معافی مانگنے کے لیے تیار ہے۔" چوہدری فتح محمد کا کہنا تھا۔

"اس نے جو کیا سو کیا' مگر اس کی بیوی نے میری بیٹی پر الزام لگانے کی کوشش کی اور یہ بھی کہا کہ میں اس کا رشتہ ایک پاگل سے کردوں۔" شہروز علی خان کی آواز میں نمی گھل گئی تھی۔

"جو ہو چکا' جو کہا جا چکا' اس پر سیاہی پھیرو' اب پچھلی باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں' آئندہ کی سوچو' جو ہوا' غلط ہوا' آئندہ ایسا کچھ نہیں ہونا چاہیے' اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ جو رشتہ داریاں جڑ سکتی ہیں ان میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔" چوہدری فتح محمد کہہ رہا تھا۔

"رشتوں کو توڑنے کی ابتدا میرے بھائی نے کردی اب بھلا کون سی رشتہ داریاں جڑ سکتی ہیں۔"

"اس نے جو کم ظرفی کی سو کی' مگر اب تم اپنا ظرف بڑا کرو اور اپنے بیٹے کی منگ کو بیاہ لاؤ' یہ ہم بڑوں کی تم سے التجا ہے۔" چاچا ملک دین نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو شہروز علی خان سوچ میں پڑ گئے تھے۔

"چاچا جو کچھ ہوا اس کا مجھ سے زیادہ میرے بیٹے کو رنج ہے اور پھر یہ تو اس کی زندگی کا معاملہ ہے' اس سے مشورہ کیے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" سوچ کے دائرے سے نکل کر انہوں نے کہا تھا۔

"یہ بات تو درست ہے' پھر تو اس سے صلاح مشورہ کر لے۔" انہوں نے کھلے دل سے کہا تھا۔

"اگلے ہفتے وہ چھٹی پر آرہا ہے' اس سے پوچھ کر میں آپ لوگوں کو جواب بھجوا دوں گا اور آپ میرے بڑے ہیں' بار بار آکر مجھے شرمندہ نہ کریں۔"

"تم دونوں بھائیوں میں صلح صفائی ہو جائے ہمارے لیے اس سے بڑی کوئی بات نہیں' ہمارا تو اپنا گھر ہے' دل چاہے گا تو سو بار آئیں گے۔" انہوں نے پگڑی سر پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" مہوز ان کی بات سن کر دنگ رہ گیا تھا۔

"بیٹا برادری کے لوگ میری منت کر رہے ہیں۔"

"چاہے کچھ بھی ہو بابا میں آپ کی بھتیجی سے شادی نہیں کروں گا۔" اس کا انداز دو ٹوک تھا۔

"بیٹا میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں' یہ ہی نا کہ ہم سب کچھ بھلا کر نئے رشتوں کی بنیاد رکھیں' نہیں بابا ہرگز نہیں۔

آپ جانتے ہیں آپ کی خاطر' خاندان کی خاطر میں نے آپ کا ہر فیصلہ قبول کیا تھا۔ چاچا کی بیٹی مجھ سے عمر میں بڑی تھی اور باوجود اس کے کہ میں جانتا بھی تھا زبیر خان زندگی بھر زمینداری اور پولٹری فارمنگ کرتا رہے گا۔ اس کا میری بہن سے کوئی جوڑ نہیں' مگر دل سے تمام فیصلوں کو قبول کیا تھا۔ مگر انہوں نے کیا' کیا ہمیں اور ہماری عزت کو تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔"

"بیٹا پچھلی باتوں کو بھول جانے میں بھلائی ہے۔"

"نہیں بابا اگر کوئی نیا رشتہ جڑا بھی تو پچھلی باتیں ہی اس میں زہر گھولتی رہیں گی اور وہ کبھی نہیں نبھ سکے گا۔ کم از کم میں تو ان لوگوں کو قطعی برداشت نہیں کر سکتا جنہوں نے ہمیں ذلیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور میری بہن کے پاک دامن پر تہمتیں لگائی ہیں۔" وہ غصے سے دھم دھم کرتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

دونوں گھروں کے درمیان مشترکہ دیوار کے دوسری طرف اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کی منتظر مہو بے دم ہو کر سیڑھیوں پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے جس بے کلی نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا آج وہ حقیقت کا روپ دھارے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ "مہوز اس کا نہیں تھا۔" اس نے اپنی کم عقلی کے سبب اسے کھو دیا تھا۔ جب تک وہ اس سے منسوب تھا وہ اس کے سائے سے بھی جیلس ہوتی تھی۔ اور اب وہ اتنی دور جا کر کھڑا ہوا تھا کہ اگر دیکھنا بھی چاہتی تو طویل فاصلہ اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ بھر دیتا تھا۔ ہچکیوں سے روتے ہوئے اس نے خود سے اعتراف کیا تھا۔ وہ مہوز سے شدید محبت کرتی ہے' مگر اب وہ دونوں دریا کے دو کنارے تھے۔

☼ ☼ ☼

"مہو' مہو اب اگر ایسی بکواس کی تو نے باپ اور بھائی کے سامنے کی تو وہ تیری ہڈیاں توڑ دیں گے۔"

"کیوں اماں یہ میری زندگی کا فیصلہ ہے۔" وہ ہٹ دھرمی سے گویا ہوئی تھی۔

"تو اپنی زندگی کا فیصلہ کر چکی ہے اور تیرے فیصلے نے میرے پورے گھر کو ڈبو کر رکھ دیا ہے۔"

"اماں' میری بات تو آرام سے سن لے۔" وہ آزردہ ہوگئی تھی۔

"دیکھو مہو بات تو تجھے میری سننی پڑے گی اور وہ بھی بہت غور سے۔ مہوز کی شہر میں کسی لڑکی سے منگنی ہو رہی ہے۔ اب ہماری عزت اسی میں ہے کہ کم از کم

اس کی شادی سے پہلے ہی ہم تجھے رخصت کردیں۔"

"کچھ وقت انتظار بھی تو کیا جاسکتا ہے۔" پتا نہیں کیوں اس کا دل اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا کہ کوئی معجزہ ہو جائے گا۔

"کس بات کا انتظار۔" اماں نے تعجب سے اس کی شکل دیکھی تھی۔

"مہوز کی نسبت سے تو ستائیس سال کی ہوگئی۔ اب بڑی مشکل سے اللہ اللہ کرکے اتنا اچھا رشتہ آیا ہے تو یہ موقع بھی گنوادیں۔" اماں کی بات پر اس کا سر جھک گیا تھا۔

"جو کچھ ہوا ہمارے حق میں غلط ہوا۔ گل تو ابھی بائیسویں سال میں لگی ہے' اتنی اچھی شکل و صورت کے ساتھ پڑھ بھی رہی ہے اور مہوز تو افسر بھی بن گیا ہے۔ اسے تو اچھے سے اچھا رشتہ بھی مل جائے گا' ایک ہم ہیں کہ تیری ضد کی وجہ گلنار جیسی بھابھا کٹنی کو بیاہ لائے اور تیرا ابھی ٹھکانہ نہیں رہا۔" اماں فریم اور سوئی دھاگہ پرے رکھ کر افسوس کے انداز میں اسے سمجھانے بیٹھ گئی تھیں۔

اور اس روز مہو کو اس مہر النساء پر بہت رشک آیا تھا۔ جو مہوز سے منسوب تھی۔ کیا کوئی جادو کی چھڑی ایسی تھی کہ وہ وقت کو گھما کر پیچھے لے جاتی۔ اور اس حسین سپنے کو دوبارہ دیکھنے لگتی جو اس کا اپنا تھا۔ تمام تر یقین کے ساتھ' اس نے دل شکستگی کے ساتھ سوچا تھا۔ دنیا میں کچھ بھی ممکن تھا مگر مہوز اس کا نہیں ہو سکتا تھا۔ آج اسے یقین ہو چلا تھا' کیونکہ اس نے اپنے اور مہوز کے خوب صورت تعلق کو قبل از وقت روایتی رشتوں کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے لیے اچانک ہی فراز چوہدری کا رشتہ آیا تھا اور اماں' ابا کو یہ رشتہ امداد غیبی کی مانند ہی لگا تھا۔ حق نواز چوہدری' ابا کے پرانے دوست تھے۔ کچھ عرصے سے فالج کا شکار گھر میں بند تھے۔ بیوی کے انتقال کے بعد ان کی تمام امیدوں اور خوابوں کا مرکز ان کا اکلوتا بیٹا فراز تھا۔ فیروز علی ان سے یوں ہی ملنے گئے تھے' اور جب انہیں دونوں بھائیوں کی ان بن کا پتا چلا تو انہوں نے مہو کے لیے بات کی تھی۔ اماں' ابا کے سر سے بوجھ سرک گیا تھا۔ مہو کے دل کا بوجھ کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ اور پھر وہ رخصت ہو کر چوہدری ہاؤس آگئی تھی۔ یہاں آکر اسے ایک اور تلخ حقیقت کو سہنا پڑا تھا۔ فراز چوہدری اس کا نہیں تھا۔

امنگوں اور آرزوؤں کی وہ رات ڈھیروں ڈھیر خدشات اس کی جھولی میں ڈال کر رخصت ہو چکی تھی۔ صبح جب وہ سنگھار میز کے سامنے آن بیٹھی تو گزری رات کا کوئی بھی خوشگوار عکس اس کے چہرے پر نہیں تھا۔ البتہ بے یقینی کی کیفیت اور سوگواری کا احساس اس کا چہرہ ان ہی کیفیات کا غماز تھا۔ فراز ابھی تک سو رہا تھا' وہ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بالوں کو برش کرتی رہی۔

"ہم بولیں محبت کی زبان۔" اگلے ہی لمحے موبائل کی گنگناہٹ پر اس نے کروٹ بدلی اور موبائل آن کر کے کان سے لگایا تھا۔

"ارے جانو تم سے بات کرتے ہوئے موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی تھی۔ چارجنگ پر لگا کر ذرا سا لیٹا تو ابھی آنکھ کھلی ہے۔" بالوں میں برش کرتے ہوئے ہاتھ تھم گئے تھے۔ بات کرتے کرتے وہ ایک مرتبہ پھر ٹیرس پر چلا گیا تھا۔ خاصی دیر کے بعد رحمت بوا ناشتا ٹیبل پر لگا کر باہر گئیں تو فراز بھی تیار ہو کر آچکا تھا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک جیولری بکس ٹیبل پر مہو کے سامنے رکھ دیا تھا اور فراز کے جانے کے بعد اس نے خاموشی سے اٹھا لیا تھا کہ اسے ابھی بہت سے سوالوں کے جواب بھی تو ڈھونڈنا تھے۔

☼ ☼ ☼

"گل تمہاری تیاری ہوگئی۔" بیٹھک میں جلدی جلدی سامان پیک کرتے ہوئے مہوز نے اسے آواز لگائی تھی۔

"جی لالہ آپ کے کپڑے بھی پریس ہو گئے آپ

بھی تیار ہو جائیں نا۔" گل نے جواب دیا تھا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی تو مہوز نے دروازہ کھولا تھا۔

"تم تیار نہیں ہوئے ابھی تک۔" شاہ میر اندر آتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"بس تھوڑی سی دیر ہے۔" وہ جلدی سے گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ شاہ میر ریک سے کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ تبھی لائٹ چلی گئی اور کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا اتر آیا تھا۔

"گل رانی ذرا چائے کا ایک کپ تو بنادو۔" مہوز نے کپڑے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے نیا حکم جاری کیا تو وہ منہ بنا کر چائے کا پانی چولہے پر رکھنے لگی تھی۔

"یہ لیں چائے لالہ ویسے آپ ہر دو گھنٹے بعد چائے نہ پئیں تو آپ کا گزارہ نہیں ہو پاتا۔" وہ چائے کا کپ کو فتے میز پر پٹخ کر کہہ رہی تھی۔

"یہ اندھیرے میں کیوں بیٹھے ہیں لائٹ نہیں ہے تو پردے ہی ہٹا دیں۔ اس لائٹ کا بھی پتا نہیں چلتا۔ ابھی تو ابھی چلی بھی گئی۔" کھڑکی سے پردے ہٹاتے ہوئے وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی۔

"ارے آپ! وہ لالہ کہاں گئے؟" دن کا اجالا کمرے میں پھیلتے ہی اس نے صوفے پر براجمان شاہ میر کو بغور اپنی طرف دیکھتے پایا تھا۔ اور اب بے اختیار پزل ہو کر پوچھ رہی تھی۔ کھڑکی سے آنے والی سورج کی کرنوں سے منور دودھیا رنگت اور سیاہ آنکھوں میں خفت لیے۔ اپنی ازلی معصومیت کے ساتھ وہ اس کے دل میں اترتی چلی گئی تھی یا پہلے سے وہیں براجمان تھی۔ شاہ میر کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔

"یار دو گھنٹے میں تو ہم آرام سے یونٹ میں پہنچ جائیں گے۔" مہوز تولیے سے سر کو رگڑتا ہوا باتھ روم سے برآمد ہوا تھا۔

"ارے گل یہ تم کیا خالی چائے اٹھا کر لے آئیں کچھ۔۔۔"

"رہنے دو بھئی اس وقت کچھ موڈ نہیں ہے یہ بھی ان کی مہربانی ہے کہ بے وقت چائے پلادی۔" وہ پر مژدہ سی مسکراہٹ چہرے پر بکھیر کر بولا تھا۔ گل باہر نکل گئی تھی۔

"گاڑی کہاں کھڑی کی ہے؟" مہوز چند کتابیں بیگ میں ٹھونستے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"گلی کے موڑ پر اندر تو ٹرن لینا مشکل ہو جاتا۔"

"چلو تم یہ بیگ اٹھا کر گاڑی میں رکھو۔" مہوز کے کہنے پر وہ باہر نکل گیا تھا۔

"یہ بیگ بھی گاڑی میں رکھو۔" وہ گاڑی میں سامان رکھ رہا تھا جب مہوز ایک اور بھاری بیگ اٹھا کر لے گیا تھا۔ اور پیچھے مڑ کر نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔

"چلو بھئی بیٹھو پہلے بھی دیر کروادی ہے۔"

"یار گل کو آنے دو نا اسے بھی ہاسٹل چھوڑنا ہے۔" مہوز کے کہنے پر اس کا دل پتا نہیں کیوں مزید بوجھل ہو گیا تھا۔

"ڈرائیونگ تم کرو میرا موڈ نہیں ہے۔" چابی مہوز کی طرف اچھال کر وہ پینجر سیٹ پر آکر بیٹھ گیا اور سیٹ کی بیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ گل پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ چکی تھی۔

"کیا بات ہے شاہ میر تم کچھ پریشان ہو؟" مہوز نے گاڑی سڑک پر ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں یار بس ذرا سر میں درد ہے۔" اس نے نگاہیں گزرتے منظر پر جما دی تھیں۔

"یہ لڑکی جو چند لمحوں کے لیے میری ہم سفر بنی ہے۔ میری دسترس سے بہت دور ہے۔ پھر میں اسے دیکھتے ہی اپنے سارے اختیار کیوں کھو دیتا ہوں۔ اسے دیکھتے ہی میرا دل آنکھوں میں کیوں اتر آتا ہے۔ میری نگاہ اس کے ایک ایک نقش کو اس قدر بے قرار ہو کر کیوں چومتی ہے۔" دو گھنٹے کے سفر میں وہ مسلسل یہی سوچتا رہا تھا اس کا دل اس کے تمام سوالوں کا ایک ہی جواب دے رہا تھا۔ جسے ماننے سے شاہ میر مسلسل انکاری تھا۔

فاطمہ جناح یونیورسٹی کے گیٹ پر اس نے گاڑیوں کے ہجوم پر نظریں جمائے اس بات سے بے خبر رہنے کی پوری کوشش کی کہ کب وہ گاڑی سے اتر گئی تھی۔

مگر شاہ میر کا دل ان تمام لمحوں کا گواہ تھا جو گل کے ساتھ سفر کرتے ہوئے اس نے ایک ایک کرکے گنے تھے۔ پر سارے منظر اتنے بے رنگ اور پھیکے کیوں ہیں؟ مری کے بلند و بانگ کوہساروں سے گزرتے ہوئے اس نے خود سے سوال کیا تھا۔

"ان کی فیملی میں وٹے سٹے کے رشتے طے ہو چکے ہیں۔" ایک مرتبہ مہوز کی کہی ہوئی بات بار بار اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔ اس وقت تو اس نے مہوز کی بات بغیر کسی توجہ کے سنی تھی مگر اب وہی بات زندگی کی سب سے تلخ حقیقت بن کر چبھ رہی تھی۔

یونٹ کے گیٹ پر پہنچنے تک اس نے اپنے ذہن سے تمام تر خیالات کو جھٹک دینے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ تقدیر کے تانے بانے انسانی ارادوں اور سوچوں سے ماورا ہوتے ہیں۔ اگر وہ جان لیتا کہ وہ طے شدہ رشتے جن کا سالوں پہلے مہوز نے ذکر کیا تھا ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔ تو شاید آنکھوں میں اترنے والی پرچھائیوں کو خواب بننے سے نہ روکتا۔

☼ ☼ ☼

گلنار کی گود بھرائی کی رسم اور پورے خاندان کی دعوت تھی۔ اماں نے بطور خاص اسے جلدی آنے کو کہا تھا فراز کی رہائش اسلام آباد میں تھی مگر وہ ہر ویک اینڈ پر گھر آتا تھا۔ مہوز نے اسے فون پر یاددہانی بھی کروادی تھی۔ اس کے اور فراز کے تعلقات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں مگر اماں اور ابا کو وہ خدشوں کے دیار میں نہیں دھکیلنا چاہتی تھی۔ مسکلاوے کی رسم کے بعد فراز نے اس کے میکے کا رخ نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اس کی خواہش تھی کہ اس تقریب کے بہانے ہی وہ اسے اپنے ساتھ لے جائے 'نواز چاچا اسے خود دو مرتبہ کال کر چکے تھے۔ مگر وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔

وہ تیار ہو کر ٹیرس پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔
"اب تک تو تمام مہمان آچکے ہوں گے۔" دل ہی دل میں قیاس کرتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر گیٹ پر نظر ڈالی تھی۔ تبھی فراز کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی۔ وہ جلدی سے چائے بنانے کچن میں چلی گئی تھی۔ اندر آکر وہ سلام کرنے باپ کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اور پھر تھوڑی دیر میں نواز صاحب کی غصیلی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔

"یقیناً" وہ اس کے اس قدر دیر سے آنے پر ناراض ہو رہے تھے۔ پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے نکل کر اس نے ایک مرتبہ پھر باہر کا رخ کر لیا تھا۔ مہو نے بھاگ کر اسے روکنا چاہا مگر تب تک وہ گاڑی گیٹ سے نکال کر جا چکا تھا۔ وہ وہیں لان میں کرسی پر بیٹھ کر آنسو بہاتی رہی حتیٰ کہ اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا تھا۔

مہو نے سر اٹھایا رحمت بوا اس کے قریب کھڑی تھیں۔ مہو کو ان کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ چوہدری صاحب کی دور پرے کی رشتہ دار ہیں جو اکلوتی بیٹی اور داماد کی حادثاتی موت کے بعد اپنے چار سالہ نواسے کے ہمراہ چوہدری صاحب کے پاس آئی تھیں اور غالباً" دس سال گزارنے کے بعد یہیں پر مقیم تھیں۔

"آنسو کسی مشکل کا حل نہیں ہوا کرتے بہو رانی۔" وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"چوہدری صاحب کے اپنے خاندان میں کئی لڑکیاں تھیں مگر ان کا خیال تھا کہ کوئی میچور اور سمجھدار لڑکی ہی فراز کو واپس لا سکتی ہے۔"

"کیا مطلب وہ جانتے تھے کہ ......" مہو نے حیرت سے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"بہت اچھی طرح سے اور ان کا ہی نہیں میرا بھی خیال تھا کہ فراز اس گندگی سے نکل آئے گا مگر اس نے تو ہمارے سارے اندازوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ غضب خدا کا کل کی گھر آئی دلہن کو چھوڑ کر وہ اس آوارہ عورت کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔" اسے بتاتے ہوئے رحمت بوا خود کلامی کرنے میں مگن ہو گئی تھیں۔

"بہو برا نہ مانو تو ایک بات کہوں" اس میں کچھ قصور تمہارا بھی ہے تم اسے اپنے ساتھ مصروف رکھو گھومنے پھرنے کے بہانے اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ مگر یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے وہ گھر آتا ہے تو بھی وہ عورت اس کے کان سے چپکی رہتی ہے۔"

"وہ ہے کون؟" مہو اس کے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتی تھی اور رحمت بوا بھی اسے تمام تر تفصیلات بتانے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا خیال ہے برخوردار؟ اب اس گھر میں کوئی رونق ہونا چاہیے؟" فراز کو بہت اچھی جاب مل چکی تھی ویک اینڈ پر وہ گھر آیا تو چوہدری صاحب نے اس سے پوچھا تھا۔

"جی بابا جان۔"

"تو پھر ڈھونڈیں کوئی دولہن تمہارے لیے۔ یا پھر کوئی پسند ہے تو وہ ہی بتا دو۔"

"بابا جان' وہ ایک لڑکی ہے تو میں اسے اور اس کی فیملی کو اچھی طرح سے جانتا ہوں اگر آپ میرے ساتھ اس کے گھر چلیں۔" فراز نے بھی اپنی بات ان تک پہنچانے میں دیر نہ کی تھی۔

"تو یوں کہو نا دلہن تم اپنے لیے ڈھونڈ چکے ہو۔"

"بس ایسے ہی سمجھیں مگر آخری فیصلہ تو آپ کا ہی ہوگا۔" اس نے اعتماد سے مسکرا کر کہا۔

"اور اگر وہ مجھے پسند نہ آئی تو؟" چوہدری صاحب شرارت سے پوچھ رہے تھے۔

"مجھے یقین ہے وہ آپ کو بہت پسند آئے گی۔"

"اچھا اتنا یقین ہے چلو پھر دیکھ لیتے ہیں۔" وہ ہنس دیے تھے۔

"کوئی یونیورسٹی وغیرہ کا چکر ہے کیا۔"

"نہیں یونہی ایک دفعہ ملاقات ہوئی تھی۔"

"اچھا تو پھر کب چلنا ہے۔ بھئی میں تو اب زیادہ دیر تک یہ تنہائی برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ خاصے بے چین ہو رہے تھے۔

"میں غزل سے پوچھ کر آپ کو بتا دوں گا۔"

اور پھر چوہدری حق نواز بہت خوشی اس کے گھر گئے تھے۔ مگر لڑکی کی ماں سے مل کر انہیں شدید دھچکا لگا تھا وہ ماضی کی شاہانہ بائی تھی جس سے چوہدری نواز کے ایک دوست کی بربادی کی کہانی جڑی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس نے اپنا طرز رہائش تبدیل کر لیا تھا۔ وہ وہاں سے چائے پیئے بغیر ہی اٹھ آئے تھے۔ فراز ان کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مگر وہ جانتے تھے کہ شاہانہ بائی کی بیٹی کو فراز چوہدری سے محبت کیوں ہوئی اس محبت کا پس منظر یقیناً" اس کی مضبوط معاشی حیثیت تھی۔ غزل اور اس کی ماں کا رہن سہن گواہ تھا کہ اب بھی انہوں نے خود کو بدلا نہیں تھا بس ذرا طور طریقے بدل لیے تھے۔

چوہدری صاحب شاہانہ بائی کی بیٹی کو بہو بنا کر فراز کی زندگی برباد نہیں کر سکتے تھے۔ اور فراز 'غزل کے علاوہ کسی سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ فراز اسلام آباد میں تھا جب اسے رحمت بوا کی کال موصول ہوئی کہ چوہدری صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ بھاگم بھاگ گھر پہنچا مگر وہاں ایک نئی پریشانی نے آن گھیرا تھا۔ چوہدری صاحب کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ رہی تھی۔ مگر انہوں نے خوراک اور دوا کی ہڑتال کر رکھی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ اکلوتے بیٹے کی خوشیاں نہیں دیکھ سکتے تو انہیں زندہ رہنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ جیت بالآخر ان کی ہوئی۔ باپ کو یوں مایوسی کی باتیں کرتے دیکھ کر فراز نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اور وہ ان کی پسند سے شادی کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ چوہدری صاحب کا خیال تھا کہ شادی کے بعد اس کا پیچھا غزل سے خود بخود چھوٹ جائے گا۔ مگر یہ ان کی خام خیالی تھی۔ فراز کو کمپنی کی طرف سے ایک سال کے لیے سنگاپور بھیجا جا رہا تھا۔ اور ان کے خیال میں یہ اس کے لیے اچھا ہی تھا۔ سو چوہدری صاحب نے بخوشی اجازت دے دی۔

☼ ☼ ☼

"شاہ میر سدھر جاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" آج چھٹی تھی اور اس کا ارادہ دیر تک سونے کا

تھا مگر صبح ہی صبح آپی نے فون کر کے اس کے سارے پروگرام کا بیڑہ غرق کر دیا تھا اسے کنوینس کرتے ہوئے وہ دھمکیوں پر اتر آئی تھیں۔

"اب بھی وقت ہے اگر کوئی لڑکی پسند ہے تو بتاؤ مجھے ورنہ میں خود ہی کوئی جل ککڑی ڈھونڈ لوں گی۔" جواباً" وہ خاموش رہا تھا۔

"اب منہ میں گھنگھنیاں کیوں ڈال لی ہیں۔" وہ زچ ہو کر کہہ رہی تھیں۔

"اپنی کوئی پسند ہے تو بتاؤ مجھے۔" وہ اور مہوز ایک ہی کمرہ شیئر کرتے تھے اس کی نیند خراب ہونے کے ڈر سے وہ باہر آ گیا تھا اور جنگلے سے پرے پہاڑ کے دامن میں درخت سے لٹکتے بندروں کے جوڑے پر نظریں جمائے انہیں سن رہا تھا۔

"ہاں ہے تو۔" اسے آپی کو تنگ کرنے کا خیال آیا تھا۔

"سچ کون ہے؟" ان کے لہجے میں ڈھیروں اشتیاق در آیا تھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

"کہاں رہتی ہے یہ تو پتا ہو گا۔" وہ کچھ سمجھ گئی تھیں۔

"میرے سامنے ہی تو ہے۔" وہ انتہائی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"تو پھر میری بات کراؤ۔ میں پوچھتی ہوں اس سے۔"

"پتا نہیں وہ آپ سے بات کرنا چاہے گی یا نہیں۔ اور پھر اس کے ساتھ بھی کوئی ہے وہ مائنڈ نہ کر جائے۔"

"آخر تم کہاں کھڑے ہو اور کس کی بات کر رہے ہو۔"

"آپی ـــ میس میں کھڑا ہوں اور جنگلے کے باہر ایک بندر اور بندریا کھڑے ہیں ان کی بات کر رہا ہوں۔" اس نے انتہائی معصومیت کے ساتھ کہا تھا۔

"شاہ میر گھٹیا انسان۔" آپی کے چیخنے پر وہ ہنسنے لگا تھا۔

"آپی دراصل بات یہ ہے کہ میرے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں ہے۔" اب وہ انتہائی بے چارگی سے گویا ہوا تھا۔

"آج ہی میں مری آ رہی ہوں اور آ کر دیکھتی ہوں کہ تمہارے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہے یا نہیں۔" وہ یقیناً" اس پر دانت پیس رہی تھیں۔

"آپی پلیز لسن می سنا ہے کہ ہمارے یونٹ کو یو این او مشن کے لیے سلیکٹ کیا جا رہا ہے۔ آئی پرامس اس کے بعد میں آپ کی بات مان لوں گا۔" اس نے بڑی گول مول بات کی تھی۔

"سلیکشن فائنل ہونے پر یا مشن اوپل کرنے کے بعد؟" وہ بھی آخر اس کی بڑی بہن تھیں انہیں چکو دینا کون سا آسان تھا۔

"جب بھی آپ کا دل چاہے۔" وہ گڑبڑا گیا تھا۔

"مشن اوپل کرنے کے بعد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم کم از کم ایک سال کے لیے غائب ہو جاؤ گے۔ اور جہاں تک سلیکشن فائنل ہونے کا تعلق ہے۔ تو یہ بھی بالکل ناممکن ہے۔ ایسے کئی چکر تم مجھے پہلے بھی دے چکے ہو۔ اب میں ایک مہینے کے لیے آئی ہوں۔ اور کچھ نہ کچھ کر کے ہی جاؤں گی۔" آپی نے جوش سے کہتے ہوئے یقیناً" سامنے ٹیبل پر ہاتھ مارا تھا جس کی آواز سے بخوبی سنائی دی تھی۔

"اچھا آپی ابھی تو میں مجھے ناشتا کرنا ہے۔ کچھ انرجی ملے تو میں آپ کی بات پر بھی غور کرتا ہوں۔"

"چلو ٹھیک ہے میں آدھے گھنٹے تک کال کرتی ہوں پھر مجھے فائنل جواب دینا۔" شارٹ نوٹس کا سن کر اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے فون آف کر کے بیڈ پر پھینکا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر بغیر ناشتا کیے باہر نکل گیا تھا۔

مال روڈ اور پھر نتھیا گلی کا چپا چپا گاڑی کے پہیوں تلے روند کر اور ڈھیروں پیدل آوارہ گردی کر کے بھی بھوک اور پیاس کا کوئی احساس نہ جاگا تو اس نے گاڑی کا رخ بلا ارادہ ہی موڑ دیا تھا اور ایک لانگ ڈرائیو کے بعد وہ مین یونیورسٹی کے گیٹ پر تھا۔

گیٹ پر کھڑے گارڈ سے پہلے تو اس نے ہاسٹل کے بارے میں پوچھنے کا سوچا مگر پھر سوچتا ہی رہا تھا۔

"میں کیا کہوں گا اس سے؟ اور کچھ بھی کہنے کا فائدہ۔" دل کا جواب مثبت اور دماغ کا نفی میں تھا۔

"اور مہوز کو پتا چلا تو میں اس کی نظروں میں کس قدر گر جاؤں گا۔" اس نے گاڑی بالآخر واپس موڑ لی تھی جب وہ واپس پہنچا تو دن اپنے اختتام کے بعد رات سے گلے مل رہا تھا۔

"گندے انسان نظر نہیں آتا کیچڑ سے بھرے بوٹ کمبل کے اوپر رکھ کر پڑے ہو۔" مہوز اس کے بیڈ پر ایک جہان بکھرائے کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ شاہ میر اس کے بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹ گیا تھا۔ اس کی دہائی پر جوتے ذرا سا پرے کر کے وہ ہنوز اسی پوزیشن میں پڑا رہا تھا۔

"اپنی گاڑی کی چابی مجھے دو۔ پورا دن آوارہ گردی کر کے آئے ہو اب تو تمہیں کہیں جانا نہیں ہو گا؟" مہوز اس سے کہہ رہا تھا۔

"تمہاری کھٹارا کہاں ہے؟"

"فیوڑ ہے اسے ہسپتال (ورکشاپ) میں ایڈمٹ کروا کر آ رہا ہوں۔" اس کے اور مہوز کے درمیان بات چیت کا انداز یونہی ہوا کرتا تھا۔ وہ تیار ہوتے ہوئے مسلسل گنگنا رہا تھا۔

"تیری بلیو جرسی کہاں ہے، جو تیری آپی دبئی سے لائی تھیں۔" مہوز الماری میں کافی دیر تک سر دیئے رہنے کے بعد اس سے پوچھ رہا تھا۔

"بیگ میں ہو گی؟" اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

"ویسے تو جا کہاں رہا ہے۔" شاہ میر نے کروٹ بدل کی اس کی تیاری کو بغور دیکھا تھا۔

"مجھے مینا نے ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔" وہ اپنی تیاری میں مگن ہو کر اسے بتا رہا تھا۔

"یہ مینا شینا کے ساتھ فلرٹ کر کے تم اپنے ساتھ کچھ اچھا نہیں کر رہے۔ کرنل سلیم کو خبر ہو گئی تو...." شاہ میر نے اسے وارن کرنا چاہا تھا۔

"کرنل صاحب کو خبر ہے اور جناب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس نے مجھے گھر پر انوائٹ کیا ہے میں کرنل صاحب اور ان کی بیگم سے ہی ملنے جا رہا ہوں۔" مہوز کے کہنے پر وہ چونک کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو تمہاری وہ کزن جس سے تمہاری انگیجمنٹ۔"

"میری کزن تو اب چوہدریوں کے بچے پال رہی ہو گی۔ ویسے دیکھو یہ جرسی مجھ پر سوٹ کر رہی ہے نا؟" مہوز لاپروائی سے کہتے ہوئے اس سے اپنی رائے لینے لگا تھا۔

"آں ـــ ہاں بہت اچھی لگ رہی ہے۔" وہ غائب دماغی سے کہہ کر سوچنے لگا تھا۔

"پھر تو ـــ گڑیا ـــ میرا مطلب ہے تمہاری سسٹر کی بھی ـــ تمہارا کزن اس کی انگیجمنٹ ـ" وہ اپنے مطلب کی بات پوچھتے ہوئے ہکلانے لگا تھا۔ مہوز اپنے فیملی میٹرز کبھی بھی ڈسکس کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔

"یار جھگڑا ہوا تھا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اب تو خوشی غمی میں شرکت بھی نہیں رہی۔" مہوز اکتا کر کہہ رہا تھا۔

"یہ تم شلوار قمیص میں کیوں جا رہے ہو کوئی اچھا سا سوٹ پہنو یار۔" شاہ میر نے اسے مشورہ دیا تھا۔

"میں ٹھہرا ایک دیہاتی آدمی جیسا ہوں ویسا ہی خود کو پیش کروں گا۔ اور ابھی تو کرنل صاحب کو یہ بھی بتانا ہے کہ ان کی مینا کو گاؤں میں جا کر لکڑیاں بھی پھونکنی ہوں گی اور اپلے بھی تھاپنے ہوں گے۔" مہوز ہنس کر کہہ رہا تھا۔

"اس سچ کے جواب میں انہوں نے انکار کا کڑوا سچ تمہارے منہ پر مار دیا تو؟ ویسے کہو تو میں چلوں تمہارے ساتھ سفارش کر دوں گا۔ اپنی زبان میں بڑی تاثیر ہے اچھے اچھوں کو رام کر لیتے ہیں ہم۔" یک دم ہی وہ چہکنے لگا۔

"یار تجھے دیکھ کر مجھے ایک خیال آتا ہے آج کل؟" مہوز نے اسے گہری نظر سے دیکھا تھا۔

"کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ تجھے کوئی چوٹ

لگی ہے۔ تیرے ساتھ کوئی ناکام قسم کا حادثہ ہوا ہے۔ اور ابھی ابھی یوں لگ رہا ہے کہ آپی نے بالا آخر میرے لیے کوئی بھابھی تلاش کر ہی لی ہے۔" وہ مہوز کے اندازوں پر حیرت زدہ ہو گیا تھا۔

"تمہاری بات کسی حد تک درست ہے۔" وہ بھرپور انداز میں مسکرا دیا تھا۔

"میرے بس میں نہیں کہ میں ہوا میں اڑوں۔" مہوز کے جانے کے بعد وہ گھسے پٹے زنانہ گانے کا بیڑہ غرق کرتے ہوئے آپی کا نمبر ڈائل کرنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

چوہدری حق نواز کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ اور اٹھارہ گھنٹے آئی سی یو میں رہنے کے بعد انھوں نے آنکھیں موند لی تھیں فراز ان کی بیماری کی اطلاع سنتے ہی بھاگا آیا تھا۔ لوگوں کی آمدورفت کم ہوتے ہی وہ زمین جائیداد کے معاملات میں الجھ گیا تھا۔

"جانو کہا نا تمہارے ڈاکومینٹس تقریباً" مکمل ہی ہیں۔ ایک ڈیڑھ ماہ تک تمہارا ویزہ بھی لگ جائے گا۔"

وہ لان میں کھڑا فون پر بات کر رہا تھا اور کھڑکی کے ساتھ کھڑی مہو کی تمام تر حسیات بے دار ہو گئی تھیں۔ پھر اس نے فراز کے بیگ کی تلاشی لی تھی۔

"یہ مجھے دے دو اور آئندہ میری کسی چیز کو ہاتھ لگانے اور تلاشی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ کاغذات ابھی اس کے ہاتھ لگے تھے اور وہ سرسری سا دیکھ پائی تھی۔ نہ جانے کب فراز پیچھے سے اس کے سر پر آ کھڑا ہوا اور کاغذات اس کے ہاتھ سے اچک لیے تھے۔

"میں آپ کی بیوی ہوں فراز آپ کے بارے میں سب کچھ جاننے اور پوچھنے کا بھی حق رکھتی ہوں۔" آج اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہونے کو تھا۔

"یہ بات تو میں جانتا ہوں کہ تم میری بیوی ہو ورنہ ہم نکاح کے بغیر عورتوں کو گھروں میں نہیں رکھتے۔" وہ بڑے سکون سے کہہ رہا تھا۔

"تو پھر مجھے بتائیں کہ یہ عورت کون ہے۔ جسے آپ نے اول روز سے میرے سر پر مسلط کر رکھا ہے؟"

"پہلے تو تم اپنی یہ غلط فہمی دور کر لو کہ یہ تمہارے سر پر مسلط ہے۔ بلکہ تم اس پر مسلط ہوئی ہو۔"

"کیا مطلب؟" اس کے سر پر آسمان ٹوٹنے کو تھا۔

"یہ میری بیوی ہے اور اس سے شادی میں نے اپنی محبت سے مجبور ہو کر کی تھی۔ اپنی دلی رضا مندی اور خوشی کے ساتھ۔"

"تو پھر مجھے کیوں یہ...؟" دکھ اور غصے کے باعث وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکی تھی۔

"تم بابا جان کی خواہش اور ضد کی بدولت اس گھر میں آئی تھیں۔ اور تمہارے حقوق سے میں نے کبھی روگردانی نہیں کی۔ باقی رہا غزل کا معاملہ تو تم اس سے مقابلہ نہ ہی کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔"

اس کی بات سن کر زرد چہرے اور سن ہوتے جسم کے ساتھ بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ فراز تھوڑی دیر اپنی چیزوں کو الٹ پلٹ کرتا رہا۔ اور پھر اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"مہر النساء تم اس گھر میں بابا جان کی خواہش پر آئی تھیں۔ اور تمہیں یہاں سے نکال کر میں ان کی روح کو تکلیف پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم نے بابا کی بہت خدمت کی اس لیے میں تمہاری بہت قدر کرتا ہوں۔ میں نے اپنا سنگا پور کا پیریڈ ایکسٹینڈ کرا لیا ہے۔ زمینوں کے معاملات کے لیے منشی سے خود ہی رابطے میں رہوں گا۔ مارکیٹ کا کرایہ وہ ہر ماہ باقاعدگی سے دے جایا کرے گا اس کے علاوہ بھی میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں کچھ مزید رقم ٹرانسفر کروا دی ہے۔ اس لیے تمہیں اور رحمت اں کو کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔"

وہ گویا اس پر احسان کرتے ہوئے اسے اپنی زندگی سے نہ نکالنے کا عندیہ دے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈھولک کی تھاپ اور بابل کے گیت سنتے ہوئے

فیروز علی کی آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔ جنہیں چھپانے کے لیے وہ بار بار دیوار کی طرف منہ کر لیتے تھے۔ مہو چولہے پر ہانڈی چڑھائے آٹا گوندھ رہی تھی۔ وہ ایک ہفتے کے لیے میکے میں رہنے آئی تھی۔ جب اپنی بنجر اور بے کیف زندگی سے اس کا دل گھبراتا تو یہیں کا چکر لگانے آ جاتی تھی۔ گزرتے چار سالوں میں اماں کا دم خم کم ہوتا رہا اور وہ چارپائی سے لگ گئے تھے۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا انہیں بھائی کی جدائی کا غم اندر ہی اندر چاٹ رہا ہے۔

دیوار کی دوسری طرف بارات آ چکی تھی۔ آج گل کی شادی تھی۔ وہ گل جو کبھی ان کے بیٹے کی منگ تھی۔ جس کا نصیب وہ اپنے گھر سے جوڑنا چاہتے تھے۔ سوان کے دل کا غبار آنکھوں میں آنسو بن کر مچل رہا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی شہروز کی لاڈلی آج پرائے دیس جا رہی تھی وہ اتنے افسردہ مہوز کی شادی پر بھی نہ تھے وہ انہیں کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ تبھی زور شور سے ہونے والی فائرنگ اور گیتوں میں آنے والی شدت سے اس نے اندازہ لگایا کہ بارات اب رخصت ہونے کو ہے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی اور جنگلے کے پیچھے سے دیکھنے لگی جہاں سے صحن کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ مہوز دلہن بنی گل کو تھام کر گاڑی میں بٹھا رہا تھا۔ اور شہروز چاچا پگڑی کا پلو آنکھوں پر رکھے اس صوفے پر بیٹھے تھے جہاں سے بابل کی دہلیز چھوڑنے کے لیے گل نے اپنے سفر کی ابتدا کی تھی۔ اس نے آف وائٹ سوٹ پر سیاہ واسکٹ پہنے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے شاہ میر کو فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھتے دیکھا تو گل کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی تھی۔ جس نے مہوز کے حوالے سے اسے کہا تھا۔

"تمہیں تو فخر کرنا چاہیے۔ مہو کہ ایسا شاندار بندہ تمہارا نصیب ہے۔"

نصیب تو گل کا تھا کہ وہ میجر شاہ میر جیسے بندے کی ہمراہی پر رشک کرتی۔ گل کو دیکھ کر شاہ میر کی آنکھیں کیسے جگمگ کرتی تھیں۔ یہ آج بھی مہو کو اچھی طرح یاد تھا۔ یا پھر خوش قسمت تو مینا سلیم تھی۔ جو آج میجر مہوز خان کی ہم سفر تھی۔

مہوز، گل حتیٰ کہ گلنار اور زبیر بھی اپنی زندگیوں میں خوش اور مطمئن تھے۔ صرف وہ تھی جو اپنے غلط عمل اور بری نیت کے پھل میں بدنصیب ٹھہری تھی۔

گاڑی گیٹ سے نکل رہی تھی اس پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اور جنگلے سے سر ٹکائے مہو کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ بارات اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

☼ ☼ ☼

آپی اسے ایزی ہونے کی ہدایت کرتی ہوئی باہر چلی گئی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں دروازے پر کھٹکا ہوا تو اس نے سنبھل کر بے اختیار ہی دوپٹہ کھسکانے کی کوشش کی مگر دوپٹہ بری طرح پن اپ ہونے کی وجہ سے ناکام ہو گئی تھی۔ سو یونہی بیڈ شیٹ کے پھولوں پر نگاہ جمائے رکھی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" شاہ میر سلام کرتا ہوا اس کے سامنے ہی ٹک گیا تھا۔ گل کے ہونٹوں کی بے آواز جنبش سے بمشکل ہی اس نے جواب کا اندازہ لگایا تھا۔

"گل لالہ آپ ہاتھ تو ادھر لائیں ذرا۔" مخملی کیس سے رنگ نکال کر اپنا ہاتھ پھیلائے وہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔ گل نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"گل رخ آج میں آپ کو......" اس کے ہاتھ میں رنگ پہناتے ہوئے دوسری مرتبہ اس کا نام غلط لے رہا تھا۔

"میرا نام گل پاشہ ہے۔" اس نے بے اختیار ہی تردید کی اور پھر بے اختیار پچھتا بھی گئی بھلا ایسی ایفی شنسی دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔

"بھئی تم تو بولتی بھی ہو ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ مہوز نے دھوکے سے گونگی لڑکی مجھے پکڑا دی۔" شاہ میر دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے شرارت سے گویا ہوا تھا۔

"ویسے گل پاشہ کہیں یا گل ہزارہ کوئی پابندی ہے کیا؟ ہمارا تو دل چاہے گا جناب تو آپ کو گل چاندنی۔

گل رعنا، گل مخملی اور گل مہندی بھی کہیں گے۔ گلاستہ، گلشن یا گلستان بھی پکار لیں گے اور کبھی کبھار گل فروش اور گل جھڑنا بھی کہہ سکتے ہیں۔" گل بے ساختہ مسکرائی تھی۔

"پتا ہے گل تم سے ملنے کے بعد پورے ڈیڑھ سال تک میں تکیے میں منہ چھپا کر روتا رہا یہ سوچ کر کہ تم انگیجڈ ہو۔ بھلا مجھ سا مسکین بھی کوئی ہوگا۔" گل کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ ایک وہم جو اسے اکثر ستاتا تھا کہ اگر شاہ میر کو اس کی انگیجمنٹ ختم ہونے کی وجہ معلوم ہو گئی تو وہ نہ جانے کیا سمجھے گا آج اس کے سامنے یقین بن کر آن کھڑا ہوا تھا۔

"پھر تو آپ کو یہ بھی پتا ہو گا کہ وہ انگیجمنٹ کیوں ختم ہوئی تھی چچی اور مہو۔" دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے تمام تربات اسے خود بتانا چاہی تھی۔

"خبردار، خبردار جو اپنی فیملی کے فضول قسم کے تنازعات مجھے بتا کر میرا خوب صورت وقت برباد کرنے کی کوشش کی مجھے مہوز سب کچھ بتا چکا ہے۔" شاہ میر نے اس قدر ہلکے پھلکے انداز میں کہا کہ اس کے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"گل رخ ویسے اچھا ہی ہوا کہ تمہاری چچی کو وہ تھرڈ کلاس آئیڈیا سوجھا ورنہ میں تو ساری عمر کمبل میں منہ چھپائے روتا ہی رہتا۔" بات کرتے کرتے وہ اس کے اس قدر قریب آ چکا تھا کہ گل کے دل کی دھڑکنیں بھی غیر متوازن ہونے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"بھورانی ذرا اندر آؤ۔" شام کا ملگجا اندھیرا اجالے کو نگل رہا تھا۔ وہ پھولوں کی باڑ کے درمیان کرسی پر کب سے ایک پوزیشن میں بیٹھی تقدیر اور تدبیر کے فلسفے میں الجھی اپنی زندگی کے خسارے گن رہی تھی۔ جب رحمت بوا نے اسے بڑے جوش سے آواز دی تھی۔ کب گیٹ پر ٹیکسی آن کر رکی اور کب کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے ماضی میں جھانکتے رہنا ہی اس کا معمول تھا۔ اور جب وہ ایسا کرتی تو اس کے سر سے درد کی ٹیسیں اٹھنا شروع ہو جاتی تھیں۔ باقاعدگی سے دوا استعمال کرنے کے باوجود یہ درد بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے کسی سائیکاٹرسٹ سے کنسلٹ کرنے کو کہا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی۔ دنیا کا کوئی ڈاکٹر کوئی سائیکاٹرسٹ اس کا علاج نہیں کر سکے گا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنی زندگی کی غلطیوں کو دہرانے پر مجبور تھی۔

کچھ دیر کے بعد اسے رحمت بوا کے بلاوے کا خیال آیا تو وہ اٹھ کر اوپر چلی آئی تھی۔ مگر اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک گئی تھی۔ اس کے بیڈ پر ایک چھوٹی سی بچی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے غوغاں کر رہی تھی اور قریب ہی فراز اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

"مہرالنساء۔" کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس کر کے اس نے سر اٹھا کر گھٹی گھٹی آواز میں اسے پکارا تھا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور حیرت سے لیٹی ثریا کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"میں بکھر گیا ہوں مہرالنساء ٹوٹ گیا ہوں، جس کی وجہ سے میں نے بابا جان کی حکم عدولی کی، تمہیں ویران اور تنہا کر دیا، آج اس نے میرے ساتھ کیا کیا۔ میں نے اس کی ہر خواہش کو پورا کیا۔ اس کی ماں کے ہر مطالبے کو تسلیم کیا مگر جب اسے مجھ سے زیادہ دولت مند ملا تو اس نے میرے سامنے ہی...

وہ میری بیٹی کو بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ وہ اسے بھی اپنے جیسا بنا دیتی۔ مگر میں اسے یہاں لے آیا ہوں تمہارے پاس، تم اس کی تربیت کرو گی، میری بیٹی کو، مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم اسے اپنے جیسا بناؤ گی نا۔"

وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنا سر ان کے اوپر رکھے آنسو بہا رہا تھا اس سے عہد لے رہا تھا۔ رحمت بوا دروازے پر چائے لیے کھڑی تھیں۔ مہو نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ انہوں نے سر ہلا کر اسے اشارہ کیا تھا۔ فیصلہ تو وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنے ہاتھ چھڑا کر بیڈ پر لیٹی ثریا کو اپنی گود میں بھر لیا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔ جو سیاہ چمکتی آنکھوں سے بڑے غور سے مہو کو دیکھ رہی تھی۔

زندگی ایک ڈھب اختیار کر گئی تھی۔ مگر اب بھی اس کے دل میں ایک پھانس باقی تھی۔ اس نفرت کی جو اس نے گل اور مہو زئی محبت سے کی تھی۔ جو طویل عرصے کے لیے اس کی زندگی کا حاصل بن کر اس کے دامن میں کانٹے بھر گئی تھی۔ وہ نفرت جو شہروز علی اور فیروز علی کی محبت کو تلوار بن کر کاٹ گئی تھی۔ جو دونوں بھائیوں کے دلوں کو دکھ کی دھیمی دھیمی آنچ میں سلگائے رکھتی تھی۔ شادی کے بعد جب وہ میکے رہنے آتی تو ابا کو راتوں کو نقہ گڑگڑاتے ہوئے خود کلامی کرتے وہ سنتی تھی اور اس کا اپنا دل بھی درد کی جوت میں جلنے لگتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ ابا کو اماں سے کہتے سنا تھا۔ وہ عید کی نماز سب سے آخری صف میں کھڑے ہو کر پڑھتے تھے تاکہ نماز ختم ہوتے ہی جلدی سے گھر کو نکل لیں اور اپنے بھائی کا سامنا کرنے سے بچ جائیں۔ پھر ایک روز یہ پھانس بھی نکل گئی تھی۔

موسم گرما کا حبس بھرا دن تھا۔ حتیٰ کہ دوپہر تک بادل بننے لگے اور شدید موسم کی گرمی کو ٹھنڈی ہوا نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ ننھی صدف کو لے کر فراز کے ساتھ میکے آئی ہوئی تھی۔ صدف نے چلنا سیکھا تھا اور وہ نچلا بیٹھنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ انار توڑنے کی ضد کر رہی تھی۔ سو مہو اسے اٹھائے انار کے پیڑ کے پاس کھڑی تھی تاکہ وہ اس شغل میں مصروف رہے فراز، زبیر اور اماں، ابا صحن میں چارپائیاں بچھائے شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جب ملکو چاچا کی آمد ہوئی تھی۔ اور ان کے ہاتھ شہروز چاچا نے سندیسہ بھجوایا تھا۔ کہ وہ حج پر جا رہے ہیں۔ اور جانے سے قبل بھائی سے ملنے اس کے گھر آنا چاہتے ہیں۔

"بہت اچھا موقع ہے کہ آپ لوگ پچھلی رنجشوں کو بھول جائیں۔ آخر کب تک آپ اپنے خونی رشتوں سے منہ موڑے رکھیں گے۔" فراز نے رائے دی تھی۔

اماں ابا کی نظریں مہرالنساء کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

"ملکو چاچا۔ ان سے کہیں کہ ان کا اپنا گھر ہے وہ جب چاہیں آ جائیں۔ اور ہاں ہم خود بھی انہیں مبارکباد دینے اور ملنے ان شاء اللہ آج شام کو ہی آئیں گے۔" فیروز علی کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ جسے مہرالنساء نے خاص طور پر محسوس کیا تھا۔ زندگی کے امتحان میں اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ جو لمحہ موجود ہے وہ مستقبل کے اندیشوں اور ماضی کی تلخیوں کو اس لمحے میں گھول کر برباد کر دینا انسان کی بہت بڑی غلطی ہوتی ہے اور وہ یہ غلطی دہرانے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ چنگاری کو ہوا دی جائے تو وہ شعلہ بن کر سب کچھ جلا ڈالتی ہے۔ جبکہ اسے دبا دیا جائے تو وہ راکھ کے ڈھیر کا حصہ بن کر بے ضرر ہو جاتی ہے۔

وہ اپنے فیصلے پر مطمئن ہو کر ننھی صدف کو گدگدانے لگی جو خوش ہو کر قلقاریاں مار رہی تھی اور اس کی ہنسی سے پورا صحن گونج رہا تھا۔

☼ ☼

بلا عنوان

راحت سمیرا ایاز

"کیا ملا مجھے اس زندگی کو جی کر کہ جس کے بعد اب کوئی امنگ کوئی خواہش نہیں رہی اور کیا نہیں کیا میں نے..... دس سال..... دس سال کی عمر سے جو محنت اور جو جان توڑ کوششیں اس زندگی کو جینے کے لیے میں نے کی ہیں اب..... اب میرے لیے ایک وبال بن گئی ہیں' سزا بن گئی — یہ زندگی میرے لیے۔" دھوپ کی تیز تپش جو سرد ماحول کو گرماتی وجود کو سکون دے رہی تھی مگر اس کی سوچوں میں جو جوار بھاٹا پک رہا تھا اس کے لیے یہ دھوپ جون کی گرم لو کی طرح تھی جو ہر مسام میں اترتی سوئی کی طرح چبھ رہی تھی۔

اس نے ایک ساتھ چار بلاک اٹھائے اور ایک طرف بنی سیڑھیوں پر چڑھتا گیا۔ یہ ایک سائٹ ایریا تھا جہاں سینکڑوں لوگ مٹی دھول میں اٹے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے ان میں سے ایک وہ بھی تھا زہریلی سوچوں کے ہمراہ.....

"باپ..... جس نے کبھی یہ نہ پوچھا کہ گھر میں کسی چیز کی ضرورت ہے یا نہیں بس اپنی ہی فکر اور اپنی ہی زندگی کی مستیوں میں مگن پان' چائے یا دوستوں کی محفل اور اپنی ہی غرض کے لیے فقط اپنے لیے گھر کا رخ کیا اور اس آوارگی میں بیوی اور بچوں کا کہیں احساس نہ تھا اس بے رخی و بے اعتنائی کا بدلہ ماں نے ان کی زندگی کے ایک ایک لمحے سے لیا ایک چھوٹا بھائی اور دو بہنیں اور وہ خود..... آدھا آدھا دن اور کبھی پورا دن رات بھوک محسوس کرتے' مار کھاتے اور کسی اندھیرے کونے میں سمٹے ہر موسم کا عذاب سہتے.....

کیا کسی کا بچپن ایسا بھی آزردگی سے گزرتا ہے خواہش 'لاڈ' مان کچھ بھی بچپن کے سکے جیسے گول پیالے میں نہیں — کیا گزارا ہوگا کسی نے ایسا بچپن ایسا دور.....!"

دوسری منزل پہ پہنچ کر اینٹیں رکھیں تو ایک اینٹ شاید کسی سوچ کے جوار بھاٹے میں سلگتے سوال کے جا گرنے سے زمین پہ پہنچتی — تو چیخ کر رہ گئی۔

حساب کتاب کرتا ٹھیکیدار فوراً متوجہ ہوا۔

"اوئے (گالی) ایک ایک اینٹ کی قیمت ہوتی ہے۔ تیرا باپ بھرے گا سالے..... ہاتھوں میں جان نہیں ہے تو کیوں آتا ہے یہاں تیرے تو....." تذلیل و حقارت بھرا لہجہ اور انسان کی عزت و نفس کو چیرتے الفاظ..... وہ خالی خالی نگاہوں سے تکتا سر جھکا گیا بے قیمت انسان کی طرح۔

"روکنے والی زبان تو وہ ہوتی ہے۔ جس کے تن پہ شاندار کپڑا اور چہرے پہ خوشحالی کی چمک ہوتی..... پھر عزت نفس اور خودداری کا احساس اسے اس شخص کو جان سے مار ڈالنے پر مجبور کر دیتا مگر یہ بے بسی تو میری زندگی نے مجھے دی ہے۔ جس نے میرے لیے ذلتوں کے باب کھول دیے۔" وہ بغیر کچھ بولے تحقیر آمیز اس جملے کو پورا سنے بغیر نیچے اتر آگیا۔ نیچے آ کر ریت' بجری' پانی اور مٹی کے گارے کو بیلچے سے مکس کرنا شروع کر دیا۔

"اور یہ ذلت بھری زندگی تو تب سے شروع ہے جب باپ کی حد درجہ لاپروائی اسے سڑکوں پہ لے آئی اور پھر دس سال کی عمر سے دس سال تک وہ زمانے کی ہر سختی ہر ذلت اپنے دامن میں بھرتا گیا..... کچرا اٹھانے سے لے کر گاڑیوں کے شیشے صاف کرنے اور کسی ہوٹل پہ گاہکوں کی گندی اور غلیظ باتوں کو برداشت کرنے سے لے کر اپنے مالکوں کی مار تک کھائی..... کس وجہ سے؟ فقط اس زندگی کی وجہ سے؟ کیا زندگی میں خوشی اطمینان اور سکون ہم ذلتوں بھری زندگی سے فقط چھن بھی نہیں سکتے کیا یہ ہمارے لیے نہیں؟ کیا ان راحت بھرے لفظوں کے چند دانے بھی انہیں نہیں مل سکتے تھے۔" ایک اور سوال کی چنگاری جوار بھاٹے میں جا گری..... گرمائش بڑھنے لگی۔

"او یار..... جلدی کر' آج یہ دیواریں اٹھ جائیں گی تو ٹھیکے دار صاحب نے کہا ہے کہ کل چھت کی بھرائی کریں گے۔" اس کے کندھے پہ ہاتھ مارتے وہ اطلاع دے کر چلا گیا شاید وہ اس اطلاع کو دینے ہی اس تک آیا تھا اور اس کی سوچوں کو انجانے میں دھکا گیا ہاتھ روکے وہ جلن بھری نظروں سے اسے جاتا دیکھنے لگا۔

"چھت..... ہاں چھت ایک سائباں....." راحت

بھرے ان لفظوں کی اصل شکل جس کو اس نے اپنے خاندان کے افراد سے حاصل کرنا چاہا مگر جانتا نہ تھا کہ اس کے نصیب کا کٹورا ذلتوں سے بھرنے کو بے تاب تھا..... باپ کی آوارگی کی داستانوں و بے اعتنائیوں کے نشتروں کا وہ کبھی عادی نہیں ہو سکا تھا۔ ہربار نئے سرے سے تکلیف ابھرتی، شرمساری ہوتی اور وہ سوچتا کہ وہ کبھی ایسا باپ نہیں بنے گا۔ اپنے بچوں، اپنے خاندان کو ایک پرسکون و محبت بھری زندگی دے گا۔ انجانے میں وہ ایک خواب گھروندہ بناتا چلا گیا۔ جو اسے بے چین سا کر دیتا اس وقت کی آرزو اس شدت سے ابھرتی کہ اسے اپنے چھوٹے بہن بھائی اپنے بچوں جیسے لگتے..... اور ایسے میں اس کی محنت بڑھ جاتی اور وہ ان کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا سکون دینا چاہتا انہیں مگر وہ اس جیسے نہیں تھے۔

وہ عادی ہو گئے تھے ایسی زندگی کے..... جو ہر طرح سے تشنہ تھی جس میں ذلت، شور، شرابا اور مار پیٹ سب کچھ تھا اور یہ سب چیزیں ان کی زندگی کے لیے جیسے نشہ کی سی حیثیت رکھتی تھیں وہ انہی میں مدہوش تھے..... ان کے لیے عزت بھری زندگی کا خواہش مند تھا مگر وہ اسی میں خوش تھے اگر انہیں کسی چیز سے مطلب تھا تو اس کے لائے گئے ان پیسوں سے جس سے ان کے پیٹ کا ایندھن جلتا رہتا ورنہ وہ ان کے کسی کام نہ تھا..... وہ بے بسی سے انہیں دیکھتا تھا پھر سوچتا کہ اگر ان کا مطلب پیسے سے ہے تو کوئی بات نہیں اور وہ ان پیسوں کے حصول کے لیے مقدور بھر کوشش کرنے لگا نتیجتاً" ذلتوں میں ہی اضافہ ہوا کہ وہ کوئی عزت ماب گھرانے کا چشم و چراغ نہ تھا اور نہ ہی پڑھا لکھا..... اسی لیے وہ ہر طرح سے اپنی عزت و نفس پر پیر رکھتا، تحقیر و ذلت سے بھرے الفاظوں کو برداشت کرتا اور ہر طرح سے محنت کرنے کی کوشش کرتا مگر جو خوشی وہ ان کے چہروں سے چھلکتی دیکھنا چاہتا تھا وہ اسے نہیں ملتی سو وہ بے بسی کی زندگی کو بکھرنے سے جوڑتا اور خاموش ہو جاتا مگر ان کی اندر تو نفسانی خواہشوں کا انبار تھا اتنا کہ وہ ہر غلط قدم کو پیچھے چھوڑ دیں گے یہ اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔

اس کی دونوں بہنیں رات کی اندھیری تاریکی میں اپنے نفس کی منہ زوری پر گھر سے بھاگ گئیں اور بھائی اس نے آوارگی کی ہر حد پار کر دی اس نے شراب اور چرس جیسی غلاظتوں کو زندگی کا محور بنا لیا اور اس کی زندگی کا مقصد، وہ خواب گھروندہ کی تعبیر پوری ہونے سے پہلے بری طرح ٹوٹ گئی۔

کیا ان کے لیے نفس اور پیسے کی خواہش اس قدر اہم تھی..... ؟ اور وہ جو ان کے لیے عزت بھری زندگی کو محور بنا گیا تھا وہ کچھ نہیں..... وہ کچھ نہیں تھا ان کے لیے..... غیرت و عزت بھری زندگی کو وہ ٹھوکر مار گئے تھے..... وہ بری طرح ٹوٹا تھا ہر محنت بے کار گئی تھی..... یہ کیسے ماں جائے تھے اس کے۔" تیز ہوا چلی، مٹی اور دھول اس کی سانسوں میں گھستی چلی گئی۔ اس کا سانس رکنے لگا جیسے ذلتوں کا پیالہ بھرا تھا اور اس کی گھٹن سے اس کا سانس رکنے لگا تھا۔

سب کچھ بکھر گیا تھا اور وہ بھی ٹوٹ کر بکھر جاتا جو اگر ماں بہنوں اور بھائی کے جانے کے بعد اس کے کندھے پہ سر رکھ کر نہ روئی ہوتی تب اسے اک لمحہ احساس ہوا کہ وہ ہے اس کا وجود بھی ہے لیکن اس کا باپ دمے کا مریض بن چکا تھا اور ماں بے حد بوڑھی..... ان دو لوگوں کی آنکھوں میں ہر وقت خوف و ہراس سا رہتا..... اکیلے رہ جانے کا خوف..... عمر رفتہ بیت گئی تھی، وقت کا پہیہ گھوم چکا تھا۔ جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہو گئی تھی ہر مستی اور مگن، زندگی وقت کے پہیے کے نیچے آکر کچل گئی تھی اور اب اک لاچاری ان کمزور جسموں پہ حاوی تھی جو کسی جوان و مضبوط سہارے کی متمنی تھی اور وہ بھی اس کا جوان و مضبوط سہارا چاہ رہے تھے یہ ان کی خود غرضی تھی ان کا مطلب تھا یا حق بنتا تھا ان کا..... وہ کچھ بھی سوچے بغیر ایک بار پھر خود کو جوڑنے لگا اور اس جوڑنے کے عمل میں وہ ایک بار پھر لرزتے کانپتے دل سے خواب گھروندے کی تعبیر رکھنے لگا..... ایک یہی تو زندگی کا حاصل تھا ایک مقصد تھا..... مگر پچھلی چوٹ کا زخم ایسا تھا کہ خون جم جانے کے باوجود بھی کبھی ایسے رستا تھا جیسے چوٹ تازی ہو۔ ظہر کا وقت ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ شام کی سلونی کرنیں سورج کی گرم آغوش سے لپٹنے لگی تھیں۔

ہر ماں سانولی سی رنگت ہی کی حامل اس لڑکی کو اس کی زندگی میں لے آئی اور وہ ہر وقت بے یقین سا رہتا کہ اس گھر کی پچھلی تاریخ کے بعد اتنی جلدی یہ واقعہ اس کی زندگی میں رونما ہو گا اس کی نئی زندگی میں یہ بے یقینی ایسی تھی کہ وہ خوش بھی نہ ہو پایا..... اور ایسا تو اس کے ساتھ ہمیشہ ہی ہوتا تھا اس کی زندگی میں ہر واقعہ ایسے رونما ہوتا کہ اول تو خوشی، سکون ہوتا ہی نہ تھا اور اگر بھولے بھٹکے لمحے خوشی کے اس کے مقدر میں آنے لگتے تو کبھی بے بسی و خاموشی اور کبھی یہ بے یقینی اس راہ میں آ کھڑی ہوتی۔ اس کے اطراف لوگ کام چھوڑ کر کھانا نکال کر کھانے لگے تھے مگر وہ یونہی اس مٹی کے گارے کے پاس بیٹھا رہا..... بھوک و پیاس کی حدت سے بے نیاز.....

اور بے یقینی تو اسے تب بھی ہوئی تھی جب دو معصوم فرشتے ایک ساتھ اس کے کچے آنگن میں اترے مگر یہ دیکھنے کو اس کی ماں نہیں رہی تھی وہ تو اس رات ایسی سوئی کہ صبح اس کے وجود کے دو ٹکڑے آسمان سے اس کے لیے اترے اور وہیں اس کی ماں نے رخت سفر باندھ لیا ایک بار پھر خوشی اور سکون کی جگہ آنسوؤں نے لے لی..... ہاں تب وہ دل کھول کر رویا مگر زندگی سے نفرت اس نے پھر بھی نہیں کی تھی جو آج اس کے وجود کو گرمائے دے رہی تھی اس کی وجہ زندگی سے ہر رشتے کا ٹکل جانا یا ساتھ چھوڑ دینا نہیں تھا اس کی وجہ تو وہ سکے سانولی پیالہ تھا..... جو ذلتوں سے ویسے ہی بھرا تھا اور اب چھلکنے کو بے تاب تھا..... جسے وہ اپنے تئیں جھٹلا رہا تھا وہ مجسم حقیقت بنا اس کی زندگی میں یونہی دھرا تھا..... جس ننھے فرشتوں کو وہ اپنے وجود کے ٹکڑے خیال کر رہا تھا اور جس سانولی عورت کو لے کر وہ خواب گھروندہ بنا گیا تھا نہ تو وہ ننھے فرشتے اس کے تھے اور نہ ہی وہ سانولی عورت.....

وہ بہت خاموشی سے گھر چھوڑ گئی تھی..... اس عورت نے اس گھر کی پچھلی تاریخ کے بنا پر ہی اسے مہو بنایا تھا۔ لیکن غیرت و حمیت سے عاری اس شخص کو بزدل اس کی زندگی نے بنایا تھا جو حالات کی ٹھوکروں پہ اسے لے آئی تھی۔ مگر اس کا کیا قصور تھا۔"

اس انکشاف نے تو اس کے وجود میں چنگاری جلا دی تھی..... جس کی بنا پر وہ ہر دم دلکش سوچوں کے حصار میں گھرنے لگا تھا اور اب اسے اپنے اطراف بھی آگ کی تپش محسوس ہونے لگی تھی..... مٹی کے گارے سے آسمانوں کے کناروں سے چاروں طرف.....

"مقصد ختم، خواہش ختم..... پھر وہ کس کے لیے جیتا اور کیوں..... زندگی نے اس سے ہر مشقت کروائی، محنت کروائی، ذلت دکھائی، بے بسی دکھائی مگر وہ جیتا رہا کسی نہ کسی کے لیے کسی خواہش، کسی امید کے لیے پھر اب جب سب ختم ہو گیا تھا پھر اب وہ کیوں زندگی کا بار اپنے کندھوں پہ اٹھائے اور کیوں..... اس بوڑھے باپ کے لیے جو کبھی اس کا تھا ہی نہیں اور اب اگر تھا بھی تو کب تک۔

پھر وہ کیوں جیے..... سب کچھ بے معنی ٹھہرا..... خواہش، مقصد اور امید..... بے معنی ٹھہری زندگی..... اب طے ہے کہ وہ اس وجود کو زندگی کی قید میں نہیں رہنے دے گا کچھ نہیں دے گی یہ زندگی ہر لمحہ سسکتی ذلت کے سوا۔ جوار بھاٹا لاوا بن گیا۔ جس کی لپٹوں نے اس کے وجود کو گھیر لیا..... گرم گرم تیز تپش، اس کا وجود جلنے لگا دھڑ دھڑ ادھڑ..... اور اس کی سلگتی، دہکتی سوچوں کو فیصلہ کرنے کی طاقت دے گیا..... دو منزلہ بلڈنگ کی اس چھت کے آخری کنارے کے پار اک گہرا خلا تھا جو اسے زندگی سے نجات دے دیتا۔

وہ اٹھا اور چلنے لگا ہر دوسرے قدم پہ آگ تھی۔

"کوئی رشتہ نہیں..... کوئی حوالہ نہیں..... کوئی سہارا نہیں..... سوائے اس ایک سہارے کے....."

نیچے آگ تھی اور سامنے اک خلا..... آخری منزل..... جیسے جیسے وہ قدم بڑھا رہا تھا متواتر آتی اک آواز گہری ہو

رہی تھی۔

"اللہ اکبر۔" ملی جلی آوازوں کی تکبیر کے ساتھ اک آواز بے حد بھاری ابھری....

"اللہ انسان کے قریب ہے اتنا کہ جتنی اس کے سانسیں' ہر سانس کے ساتھ اس کے ہونے کا احساس ہے.... سوچو تو — پھر زندگی تشنہ لب نہیں رہتی یہ ایک مقدس حرف ہر محرومی' ہر غم سے نجات دلاتا ہے یہ احساس.... کہ کوئی ہمارا ہے کوئی ہمارے ساتھ ہر لمحہ ہے اور دیکھو ذرا انسان کو.... وہ پہچانتا کتنی دیر سے ہے۔" اس آواز کے سبب ست ہوتی قدموں کی رفتار کو تیز کرتے وہ سر جھٹک گیا۔

"اس کے چند قدم' بس یہ چند قدم اسے زندگی کی اس نفرت سے دور کردیں گے وہ آزاد ہوجائے گا ہر سلگتے سوال سے' ہر لمحہ تحقیر و نفرت بھری نگاہوں سے .... فقط یہ چند قدم۔" وہ سوچ رہا تھا مگر یہ بھاری نرم آواز گرم گرم لپٹوں کی تندی و تیزی میں سوئی کے ناکے کے برابر اس کے وجود میں راستہ بنانے کی کوشش کررہی تھی اس کے قدموں کو روک رہی تھی۔

"اب ہم کتنی محبت کرتے ہیں اپنے رشتوں سے' اپنے ماں باپ سے' دوست احباب سے' چاہے ان میں سے کوئی ہماری فکر نہ کرے ہمارا دشمن ہوجائے مگر اس کی ہر تکلیف پر افسوس ہوتا ہے.... ہوتا ہے نا" نرم بھاری لہجے کی پرتاثیر آواز کے اس سوال نے خلا میں ڈولتے اس کے قدم کو روک دیا۔

"ہاں بہت ہوتا ہے۔" اس کے وجود کے اندر کہیں یہ آواز ابھری تھی۔

"پھر کوئی چیز لے لو.... کوئی گھڑی' سوٹ یا کوئی عزیز از جان تحفہ جو ہم خود سے کبھی جدا نہ کرپائیں یا کوئی امید' کوئی خواب جو عمر کے ہر دور کے ساتھ پروان چڑھتا ہو.... وہ اگر لمحوں میں کھوجائیں یا ٹوٹ جائیں تو کتنا دکھ ہوتا ہے.... ہوتا ہے نا۔"

"ہوتا ہے بہت ہوتا ہے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔" وہ دہیں زیر لب کہتا کسی انجانی طاقت کے زیر اثر اس ایک قدم کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"پھر وہ تو ہمیں ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے وہ لازوال وہستی وہ بنانے والا ہر چیز پر قادر ہے.... وہ جس کی بادشاہت آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ جو کائنات کے ہر اسرار کو جانتا ہے' وہ جسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند' جو ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہنے والا ہے.... کسی بھی چیز کی کمی نہیں اس کے خزانے میں.... وہ ہم سے .... ہم مٹی اور خطا کے پتلوں سے .... اپنے بنائے بے حد پاک اور ہر خطا سے پاک فرشتوں سے بھی زیادہ بے اندازہ محبت کرتا ہے.... وہ نہ چاہے تو ہم کچھ نہیں پھر بھی وہ ہمیں چاہتا ہے۔ کھنکھناتی بدبودار مٹی سے بنائے گئے ہم انسانوں سے وہ حد درجہ محبت رکھتا ہے اتنا کہ چاہے گناہوں سے لتھڑ گیا ہو انسان فقط اک دل سے کی گئی توبہ کے عوض معاف کردیتا ہے اور چاہے انسان کفر کی دلدل میں پھنس گیا ہو مگر اس کے دین اسلام اک کلمہ پاک کے پڑھنے سے اسے ہر گناہ سے پاک کردیتا ہے.... اس کی پناہ میں آکر وہ کسی ننھے فرشتے جیسا پاک ہوجاتا ہے یوں جیسے اس نے ماں کی کوکھ سے ابھی ہی جنم لیا ہو۔ اتنی محبت اتنی چاہت.... مگر ہم اس کی چاہت و محبت کی نفی کرجاتے ہیں اسے بھول کر دنیا کے عارضی سہارے پر توقع کر بیٹھتے ہیں.... پھر کچھ نہیں ملے یا کسی کا ساتھ چھوٹ جائے یا بے روزگاری اور مفلسی عروج پہ پہنچ جائے تو زندگی جیسی نعمت کو عذاب سمجھنے لگتے ہیں.... اس کی بخشی اس نعمت کو کسی قابل نہیں سمجھتے اور اسے اپنے ہی ہاتھوں ٹھکرا دیتے ہیں.... یہ نہیں سوچتے کہ یہ آزمائش ہے ہمارے لیے جو اس دنیا میں کسی پہ زیادہ آتی ہے اور کسی پہ کم۔" آواز کی وہ نرمی بھاری لہجے کا وہ زیر و بم آگ کی لپٹوں پر صور پھونکنے لگا تھا۔

"یہ سوال بھی اٹھایا جاتا ہے کہ جس پہ گزرتی ہے وہی جانتا تھا ہاں صحیح ہے یہ بات بھی مگر اک ہتھیار ہوتا ہے ان چیزوں سے لڑنے کے لیے صبر.... صبر کی دولت سے ہم کسی بھی بڑی سے بڑی آزمائش کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ اس کی چھوٹی سی مثال ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک بار رسول پاک صلی اللہ علیہ و آلہ

وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ۔

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ لیا ہے۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیے اور دامن مبارک کو اٹھایا تو دو پتھر بندھے دکھائی دیے وہ مبارک ہستی کہ جس کے لیے اللہ رب العزت نے یہ کائنات بنائی وہ اتنی سادہ زندگی گزار گئے کہ بھوک کی حالت کو برداشت کرنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھ لیے.... جن کے لیے فرشتے ہمہ وقت ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے.... ان کا یہ عمل کس لیے تھا؟ اس لیے کہ ان کی امت آزمائش پر نہ گھبرائے صبر سے کام لے.... انسانو! اس رحمت العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو نہ کہ دنیا کی آزمائش سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے موت کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کرو جو صرف اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے لیکن یہ فعل کرکے وہ اللہ کو بھی ناراض کرتے ہیں اور اس کی محبت سے بھی منکر ہوتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بھی انکار کرجاتے ہیں اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی رب العزت کی نفی کرنے کے برابر ہے اور اس صورت میں زندگی بھر کا نقصان اپنے کھاتے میں لکھ جاتے ہیں دنیا میں رہ کر دنیا کو جیو مگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے....

یہ دنیا تو عارضی ہے اور اس عارضی دنیا کے پیچھے ہمیشہ زندہ رہنے والی ذات کو ناراض کردینا سراسر کم عقلی ہے کہ لوٹ کر تو اس کے پاس ہی جانا ہے تو پھر کیوں نہ اس سے محبت کریں اور اس زندگی کو آسان بنالیں اس کی خوشنودی کے لیے اس دنیا کی تمام آزمائشوں پر صبر سے راضی بارضا رہیں چاہے وہ رشتوں کی صورت ہو' بھوک کی صورت یا پھر بے انتہا نفرت کی صورت.... اپنے وجود کو اللہ کی امانت خیال کرتے فقط اس کے لیے ہی جی لیں تو کیا برائی ہے آخر.... رشتوں کی بے حسی ہو تو کیا.... زندگی میں کچھ بھی جینے کی وجہ نہیں تو کیا

.... اپنا رب تو ہے نا.... اپنا آقا.... اپنا داتا۔" مٹھاس کی وہ شیرینی لفظوں کی وہ سچائی اس کی روح کو جھنجھوڑ گئی۔

"اللہ اکبر...." ملی جلی آوازوں کی گونج فضا میں بکھری اور وہ گھٹنوں پر سر رکھ گیا لفظوں کے یہ امرت قطرہ بہ قطرہ اس کے اندر جلتے الاؤ کو سرد کرگئے۔

"میں اس دنیا کی ہر ذلت اور غلیظ و تحقیرانہ باتوں اور نگاہوں سے بددل ہوکر اپنی روح کو عذاب دینے والا تھا .... ہر انسان کا عمل اس کے ساتھ ہے جواب تو سب کو دینا ہے اور جو اعمال میرے رشتوں نے کیے وہ خود جوابدہ ہوں گے اور میں خود اپنے اعمال کا.... پھر میں نے تو سب اچھا ہی کرنا چاہا تھا ان کے ساتھ.... کبھی غلط بات نہیں سوچی ان کے متعلق.... پھر میں نے یہ بات کیوں سوچ لی جس سے یہ میرا آخری سہارا بھی چھن جاتا تیرے نام کا آخری سہارا.... میرے اللہ تو کہاں تھا جب میں یہ سوچ گیا۔" کیسے نئے در کھلے تھے سوچ کے' قفل تھا کوئی عقل پر جو ٹوٹا تھا اور اب وہ سر تیخ تیخ کر رو رہا تھا۔

"اور تو.... تو میری ہر سانس کے ساتھ رہا پھر میں اس قدر بے خبر رہا اپنی زندگی۔" بے یقینی سے سر اٹھا کر آسمان دیکھا تو آنکھوں کے آگے وہ بھی دھندلا گیا۔

"خواب گھروندہ میں سب سوچتا مگر تجھ کو بھول گیا تبھی تو سب ریت پر بنا محل ثابت ہوا.... اور اسے کچا خواب سمجھتا روتا پیٹتا رہا اپنا وجود جلاتا رہا.... اور اب جو غلطی بلکہ گناہ کر بیٹھتا تو تیرے سامنے کیسے آتا اور کیا ہوتا میرے اعمال میں.... دنیا اور اس کی طلب جس کے پیچھے بھاگتا رہا ساری عمر اور وہ بدلے میں مجھے ٹھوکر مارتی رہی.... اور میری زندگی میں تیرا نام لینے کا تجھے پکارنے کا کوئی لمحہ نہیں.... جس میں کبھی اپنے سر کو تیرے سامنے نہیں جھکایا پھر اس کے بعد تیرا سامنا کیسے کرتا.... میں یہاں سے گرجاتا' کچھ کھالیتا یا پھر پھندہ لگالیتا کہ جو الاؤ سلگ رہا تھا اس کے بعد زندگی آزار لگنے لگی تھی مگر پھر تاقیامت ۔ اسی عذاب میں

بتلا رہتا اور جس زندگی سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہ رہا تھا اس میں تو ماں باپ دیے تو نے، بہن بھائی بھی دیے پھر جو لمحے سکون کے آئے وہ ناشکری میں گزار دیے اور تو جیسے کچھ اور دیتا رہا... پھر اگر میرے ساتھ برا ہوا تو کیا ... کہ جس زندگی میں تیرے نام کا کوئی لمحہ، کوئی پل نہیں رہا پھر ایسی بے ہدایت و بے عبادت زندگی سانپ سی زہریلی نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔"

وہ لرز رہا تھا رو رہا تھا... اور اس کی آہ و بکا پہ آس پاس کھڑے مزدور جمع ہونا شروع ہو گئے۔

"کیا ہو گیا جمالے۔"

"ارے ایسے کیوں رو رہا ہے۔"

"کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی۔"

"نہیں شاید نصیبوں کو رو رہا ہے پہلے بہن بھائی اور اب بیوی بھی تو چھوڑ گئی۔" تاسف رحم، پریشانی بھانت بھانت کی بولیاں لیکن وہ سب سے بے نیاز روتا رہا پھر ایک دم ہی اٹھا نگاہ سامنے ہی گئی جہاں بے حد گہرا خلا تھا۔

"میں یہاں سے گر کر خودکشی کر لیتا اور میرا اللہ مجھ سے ناراض ہو جاتا۔" جوار بھاٹے کی گرمی نے اس کا فقط دم گھوٹا تھا، سانس و زندگی کے لمحے مشکل کر دیے تھے مگر آگہی سے پُر اس جملے نے اس کی روح پر کپکپی چھوڑ دی۔

"ارے کہیں اسے جاڑا، سردی تو نہیں چڑھ گئی۔" اس کے میلے کچیلے کپڑوں پر کوئی شال یا سوئیٹر نہ دیکھ کر کسی نے اس کی کپکپاہٹ پر خیال ظاہر کیا مگر وہ ہی جانتا تھا کہ کیا چیز اس کی روح کو کپکپا گئی ہے کہ وجود بھی قابو میں نہیں...

"اللہ کا سہارا کیا خودکشی کے سہارے سے بہتر نہیں۔" وہ لوگوں کی حیران و پریشان نگاہوں کو چیرتا دیوانگی لیے وہاں سے بھاگا۔

"اللہ اکبر..."

وہ اس آواز و مقام کے قریب آ کر گر گیا وہ کانپ رہا تھا سردی کے باوجود اس کا پورا وجود بھیگ چکا تھا۔

ڈوبتے سورج کے سرخ و سنہرے رنگ میں ڈوبا مسجد کا وہ مینار...

"مجھے تیرا سہارا چاہیے میرے رب... میری پچھلی غلطیوں کو معاف کر دے اور جو گناہ میں کرنے جا رہا تھا مجھے اس کے لیے بھی معاف کر دے... میں تیرے دامن میں آ کر پناہ مانگتا ہوں میرے مالک... تو مجھے معاف کر دے۔" مسجد کے منار کی اونچائی کو دیکھتے وہ بڑبڑا رہا تھا دھونکنی کی مانند چلتی اس کی سانسیں اعتدال پر آنے لگی تھیں۔ سوچ میں اتری اس نئی آگہی نے اس کے اندر سکون کی رمق پھیلا دی تھی جو اس کی آئندہ آنے والی زندگی پہ محیط ہونے والا تھا۔

"آج سے میں تیرے لیے جیوں گا... فقط تیری اور تیرے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کروں گا... فقط تیری رضا کے لیے دنیا کی آزمائشوں سے گزروں گا چاہے اب ساری زندگی ذلت برداشت کرنی پڑے یا نفرت و تحقیر مگر تیرے لیے زندگی کے یہ باقی دن ہیں کیونکہ اس زندگی کو تو نے دیا ہے تو اب یہ تیری امانت ہے میں نے جتنا ہے گزر دیا ہے... اب بے شک زمانہ مجھے ٹھوکروں پہ رکھے مگر میرے لیے فقط میرا رب ہی کافی ہے۔"

"حئی علی الفلاح۔" اذان کے پر تاثیر لفظوں کے ساتھ ہی مسجد کا دروازہ وا ہوا نمازیوں کے لیے اور وہ بھیگتی چمکتی آنکھوں سے خود کو سنبھالتا اس راہ پہ قدم رکھ گیا تاریکی آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تھی اس کی زندگی کا ایک تاریک دن ڈوبنے کو تھا۔ اس کے ہر قدم کے ساتھ تاریکی پیچھے رہ جاتی اور اس کا اٹھتا ہر قدم ایک نئی صبح ایک نئے سویرے کے پاس لے جا رہا تھا جہاں روح پر کوئی بوجھ نہ ہوتا اور زندگی جیسی انمول چیز بے معنی نہیں رہتی۔

☆ ☆

شعاع عمیر

روزہ رکھنے کی فضیلت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

"یوں تو بنی آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے سوائے روزے کے کہ وہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا اور روزہ (گناہوں سے) سپر (ڈھال) ہے پھر جب کسی کا روزہ ہو تو اس دن گالیاں نہ بکے اور آواز بلند نہ کرے پھر اگر کوئی اسے گالی دے یا لڑنے کو آئے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں اور قسم ہے اس پروردگار کی کہ محمد کی جان اس کے ہاتھ میں ہے کہ بے شک روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے آگے قیامت کے دن مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے اور روزہ دار کو دو خوشیاں ملتی ہیں۔ جن سے وہ خوش ہوتا ہے ایک تو وہ اپنے افطار سے خوش ہوتا ہے اور دوسرا وہ اس وقت خوش ہو گا جب وہ اپنے روزے کے سبب اپنے پروردگار سے ملے گا۔"

آمنہ امتیاز... کراچی

تین چیزیں

حضرت جنید بغدادیؒ طاقت، صبر اور غنا پر تقریر فرما رہے تھے، کسی نے سوال کیا۔

"آپ کے نزدیک طاقتور کون ہے؟" حضرت جنید بغدادیؒ نے جواب دیا۔ "جو غصے کو پی جائے۔" کسی اور نے سوال کیا۔

"اور صابر کسے کہتے ہیں؟" آپ نے جواب دیا۔

"جو اپنے افلاس کو چھپائے۔" تیسرے نے پوچھا۔

"اور غنا؟" آپ نے جواب دیا۔

"جو کم پر قانع ہو جائے۔"

روبینہ ناز... کراچی

حرفوں سے لفظ بنے ہیں

☆ سب سے بڑی خواہش ہر انسان کو خوشی دینے اور اسے متاثر کرنے کی ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ انسان نہ متاثر ہوں گے نہ خوش۔

☆ دنیا کو جب رات کی تاریکی کے بعد روشنی میسر آتی ہے تو اس کی آنکھیں خود بخود آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔

☆ حقیقت آئینے کے عکس کی طرح ہے۔ آپ قریب جاؤ، وہ قریب ہو جاتا ہے، آپ دور ہو جاؤ وہ دور ہو جاتا ہے، آپ سامنے سے ہٹ جاؤ تو وہ بھی ہٹ جاتا ہے۔

☆ اللہ کے دیے پر راضی ہو جاؤ ورنہ کوئی ایسا مالک تلاش کرو جو اس سے زیادہ دے سکے۔

☆ جو چیز ہمارے لیے بنی ہی نہیں اسے حاصل کر کے ہم اپنا بنانے پر قادر نہیں ہوتے۔

☆ اگر تم خود سے محبت کرتے ہو تب ہی دوسروں کو محبت دے سکتے ہو۔ جو چیز تمہارے پاس ہی نہیں وہ تم دوسروں کو کیسے دو گے؟

☆ کسی بھی حالت میں اپنے حوصلے کو مت گراؤ کیونکہ لوگ گرے ہوئے مکان کی اینٹیں تک اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

☆ دوست کپڑے میں لگے پیوند کی طرح ہوتے ہیں، اگر وہ کپڑے کا ہم رنگ نہ ہو تو معیوب سمجھا جاتا ہے۔

☆ خاموشی ایک ایسا پردہ ہے، جس کے پیچھے لیاقت بھی ہو سکتی ہے اور حماقت بھی۔
☆ محبتوں کی مروت میں کیا جانے والا ضبط بہت کڑوا ہوتا ہے۔
☆ ہلکی پھلکی بات، ہلکے پھلکے کھانے کی طرح جلدی ہضم ہو جاتی ہے۔
☆ اپنے زخم ان کو مت دکھائیے جن کے پاس مرہم نہ ہو۔ خوامخواہ زخم مزید تکلیف دہ ہو جائیں گے۔
☆ اگر آپ وفا کا سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں تو کسی شاخ کے پاس جا کر اک پھول توڑ لیجیے۔ وہ کچھ دیر بعد مرجھا جائے گا اسے ہی وفا کہتے ہیں۔
☆ استقلال کو برے معنوں میں ضد کہتے ہیں۔
☆ ہر مشکل انسان کا امتحان لینے آتی ہے۔
☆ امن دو جنگوں کے درمیان وقفے میں ایک دوسرے کو فریب دینے کا نام ہے۔

حرمت رو اکرم ..... ڈلوال

قائداعظم نے فرمایا

میرے نوجوان دوستو! میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کسی سیاسی جماعت کے آلہ کار بن گئے تو یہ آپ کی سب سے بڑی غلطی ہو گی یاد رکھیے کہ اب ایک انقلابی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ اب ہماری اپنی حکومت ہے اب ہم آزاد اور خود مختار مملکت کے مالک ہیں۔ اب ہمیں آزاد لوگوں کی طرح عمل اور اپنے معاملات کا انتظام کرنا چاہیے۔ اب ہم کسی بیرونی طاقت کے تسلط میں نہیں ہیں۔ ہم نے وہ زنجیریں توڑ دی ہیں۔ ہم نے غلامی کی بیڑیاں کاٹ ڈالی ہیں۔

میرے نوجوان دوستو! اب میں آپ ہی کو پاکستان کا حقیقی معمار سمجھتا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ آپ اپنی باری پر کیا کچھ کر کے دکھاتے ہیں۔ اس طرح رہیے کہ کوئی آپ کو گمراہ نہ کر سکے کوئی آپ کو غلط طور پر استعمال نہ کر سکے۔ اپنی صفوں میں مکمل اتحاد اور استحکام پیدا کیجیے۔ ایک مثال قائم کر دیجیے کہ نوجوان کیا کر سکتے ہیں۔ آپ کا اصل کام کیا ہونا چاہیے۔ اپنی ذات سے وفا، اپنے والدین سے وفا، اپنی مملکت سے وفا، اپنے مطالعے پر کامل توجہ۔

(21 مارچ 1948ء کو جلسہ عام ڈھاکہ سے خطاب)

صدف عبداللہ ..... یو اے ای

قائداعظم کے بارے میں رائے

○ جناح کو ڈرایا اور خریدا نہیں جا سکتا۔ (ماؤنٹ بیٹن)
○ اگر مسلمانوں کے پاس سو گاندھی ہوتے اور ہمارے پاس ایک جناح تو پاکستان نہ بنتا۔ (جواہر لعل نہرو)
○ جناح ایک سچے قوم پرست اور محب وطن انسان تھے۔ (جسونت سنگھ)
○ وہ جس کے دشمن بھی اس کو سلام پیش کریں وہ ہے ہمارا قائد۔

عنیلہ صبا ..... ربنالہ خورد

لفظوں کی خوشبو

☆ نصیحت کے لیے موت ہی کافی ہے۔ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ)
☆ زبان دشمن کو دوست اور دوست کو دشمن بناتی ہے۔ (حضرت عثمان)
☆ دولت کی مستی سے اللہ کی پناہ مانگو کیونکہ اس کے نشے کو سوائے موت کے کوئی دوسری چیز نہیں اتار سکتی۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ)
☆ خوش اخلاقی ایک ایسا ہیرا ہے، جو پتھر کو بھی کاٹ سکتا ہے (حضرت علی رضی اللہ عنہ)
☆ اپنے خیالات کو اپنا جیل خانہ نہ بناؤ۔ (شیکسپیئر)
☆ محبت کے معاملے میں ہم سب یکساں طور پر بے وقوف ہیں۔ (گوئٹے)
☆ دولت عزت نہیں ہمیشہ خوف پیدا کرتی ہے۔ (واصف علی واصف)

خوب صورت بات

عزت نفس اور انا میں وہی فرق ہے جو فخر اور غرور میں ہوتا ہے۔ عزت نفس اور فخر کہتا ہے میں بھی ہوں اور انا اور غرور کہتا ہے صرف میں ہی ہوں اور محبت کے اس باریک فرق کو الگ ماپنے کا پیمانہ ہے۔

فوزیہ ثمروٹ ..... گجرات

الف اللہ

اللہ کا نام الٹا طریقہ پر لیا جائے یا ادنیٰ طور پر اپنا اثر ضرور رکھتا ہے۔ دنیا میں بعض اشیاء ایسی ہیں کہ ان کا نام لینے سے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کا نام لیا جائے اس میں اثر نہ ہو۔ خالی نام میں بھی برکت ہے خواہ پوری توجہ سے لیا جائے یا کم توجہ سے۔ (اقتباس شہاب نامہ)

صابرہ ..... اسلام آباد

غم مسافر تھا

خواب اب یوں ہیں کہ جیسے کوئی ضدی بالک
آگ کو پھول سے ہاتھوں میں پکڑنا چاہے
سر کی چادر بھی ہوا میں نہ سنبھالی جائے
اور گھٹا ہے کہ برسنے کو بہانا چاہے
شاخ گل آئی ہے یوں میرے دریچے کے قریب
زندگی جیسے کوئی قرض چکانا چاہے
جانے کیا بات تھی اس روز کوئی در نہ کھلا
غم مسافر تھا اور ایسا کہ ٹھکانا چاہے

(ادا جعفری)

فرزانہ علی احمد ..... کراچی

برسات

ہم سے کہیے درد کے قصے
ہم سے کہیے رنج کی بات
ہم پہ بیتے کیا کیا موسم
تنہا دل لاکھوں آفات
آج ہی آنکھیں خشک سی تھیں
آج ہی ظالم ٹوٹ کے برسی
موسم کی پہلی برسات

راحیلہ ..... گجرات

چرب زبان

حیوان ظریف ہر طبقے میں ملتا ہے اور اپنے اپنے ظرف یا معیار کے مطابق داد ظرافت دیتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ہمارے ایک دوست کو خربوزے والا انداز ہی مذاق میں چونا لگا گیا۔ اس نے دروازے پر آ کر آواز لگائی۔

"خربوزے لے لو..... مصری سے میٹھے.....!"

ہمارے دوست خربوزے کے رسیا ہیں "فوراً" پانچ سیر تلوا لیے "کٹوا کر چکھے تو بالکل پھیکے..... فوراً" ملازم کو دوڑایا کہ "خربوزے والا جہاں بھی ملے "پکڑ کر لاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد ملزم گرفتار ہو کر پیش ہوا۔ انہوں نے کہا۔

"کیوں بے! جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہیں آتی، کہتا تھا مصری سے میٹھے اور نکلے بالکل پھیکے!"

وہ چرب زبان کہنے لگا۔

"حضور! میں نے ٹھیک ہی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ مصری سے کھائیے "میٹھے لگیں گے۔" دوست کو ہنسی آ گئی۔ خربوزوں کا پھیکا پن شیریں بیانی سے دور ہو گیا۔ گویا خربوزے والے کا "تربوز" اس کی تیز زبان کی وجہ سے سلامت رہ گیا۔

(مختار زمن کی کتاب "باتوں کے خربوزے" سے اقتباس)

انتخاب حمیرہ مہتاب ..... سعودی عرب

باتیں دل والوں کی

☆ خوش نصیب وہ ہے جو کسی انسان کی تلاش میں

سرگرداں ہے جو کسی کا منتظر ہے سچ تو یہ ہے کہ جس کے دل میں رفاقت کی روشنی ہے وہ کامیاب ہے جہاں وہ روشنی ہی نہ ہو وہاں چراغوں کے میلے کس کام کے؟

☆ محدود اور لامحدود کے لیے سفر کسی بیان میں نہیں آسکتا قطرے۔ قلزم آشنا ہونے کے لیے کن مراحل سے گزرتے ہیں یہ وہی جانتا ہے جس پر یہ مقامات اور مراحل گزرتے ہیں۔

☆ تم میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس کم ہوتا ہے لیکن وہ سب دے دیتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور زندگی کی سخاوت پر سوان کا صندوق کبھی خالی نہیں ہوتا۔

شگفتہ خان..... بھاولپور

وضاحت

میں نے اس کے بدلے لہجے کی وضاحت پوچھی
کچھ دیر خاموش رہا
پاگل
جب لہجے بدل جائیں تو
وضاحتیں کیسی؟

سدرہ وزیر، ناصرہ بتول..... خوشاب

کوا

کوا گرامر میں ہمیشہ مذکر استعمال ہوتا ہے۔ کوا صبح صبح موڈ خراب کرنے میں مدد کرتا ہے۔ ایسا موڈ جو ویسے بھی کوئی خاص اچھا نہیں ہوتا۔ کوا گا نہیں سکتا اور کوشش بھی نہیں کرتا، وہ کائیں کائیں کرتا ہے۔ کائیں کے کیا معنی ہیں؟ میرے خیال میں تو اس کا کوئی مطلب نہیں۔ کوے کا بچپن گھونسلے میں گزرتا ہے، جہاں اہم واقعات کی خبریں ذرا دیر سے پہنچتی ہیں اگر وہ سیانا ہو تو بقیہ عمر وہیں گزار دے لیکن سوشل بننے کی تمنا اسے آبادی میں کھینچ لاتی ہے، جو کوا ایک مرتبہ شہر میں آجائے۔ وہ ہرگز پہلا سا کوا نہیں رہتا۔ کہیں بندوق چلے تو کوے اسے اپنی ذاتی توہین سمجھتے ہیں اور دفعتاً "لاکھوں" کی تعداد میں کہیں سے آجاتے ہیں اور اس قدر شور مچاتا ہے کہ بندوق چلانے والا مہینوں پچھتاتا ہے۔ کوا اتنا غیر رومانی نہیں، جتنا میں اور آپ سمجھتے ہیں۔ شاعروں نے اکثر کوے کو مخاطب کیا ہے، کاگا جا ہمارو سندیس..... کاگا رے جا رے جا رے لیکن ہمیشہ کوے کو کہیں دور جانے کے لیے کہا گیا ہے، کسی نے بھی بھول کر بھی خوش آمدید نہیں کہا۔ اگر آپ کوؤں سے نالاں ہیں تو یہ مت بھولیے کہ کوے بھی آپ سے نالاں ہیں۔

(شفیق الرحمن کی کتاب "مزید حماقتیں" سے اقتباس)

پروین شکیل..... لاہور

افکار

○ اللہ عدل کرے تو بڑے بڑے جاندار اور جہانگیر لوگ اس کے آگے کانپتے رہیں گے۔

○ ہر چیز کو عزت کے ساتھ رہنے دیا جائے تو اپنی عزت بھی قائم رہتی ہے۔

○ جس انسان نے ماں باپ کو پرورش کرتے ہوئے دیکھا اور انہیں نہ مانا، اس نے اللہ کو دیکھے بغیر کیا جاننا ہے؟

○ وہ ملک ترقی کرتے ہیں جہاں اداروں کے سربراہ نیک فطرت لوگ ہوں۔

○ انسان مجبوری توڑنا چاہتا ہے اور فطرت اسے مجبور رکھنا چاہتی ہے، دونوں اپنے اپنے راستوں پر مجبور ہیں۔

○ مجبور ہونا کوئی بری بات نہیں اور سچ پوچھو تو مجبور ہونا کوئی اچھی بات بھی نہیں۔

تانی چوہدری..... آکسفورڈ یو کے۔

☆ ☆

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

مشعال جنید، کی ڈائری میں تحریر
فیض احمد فیض کی نظم

نثار میں تری گلیوں کے...

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کے جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد
بہت ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لیے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصور شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفت سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں
علاج گردش لیل و نہار رکھتے ہیں

کرن عدنان، کی ڈائری میں تحریر
امجد اسلام امجد کی نظم

یہ جو وقت ہے مرے شہر پر

یہ جو وقت ہے مرے شہر پر
کئی موسموں سے رکا ہوا
اسے اذن دے کہ سفر کرے
اسے حکم دے کہ یہ چل پڑے، مرے آسماں سے دور ہو
کوئی چاند چہرہ کشا کرے، کوئی آفتاب ظہور ہو
کہ نواح چشم خیال میں وہ جو خواب تھے
وہ دھواں ہوئے
وہ جو آگ تھی وہ نہیں رہی
جو یقین تھے وہ گماں ہوئے
کوئی دھند ہے جسے دیکھتے، میری آنکھ برف سی ہوگئی
وہ عبارت سر لوح دل، کسی ربط سے نہیں آشنا
کہ جو روشنی تھی کتاب میں وہی حرف حرف سی ہوگئی
کوئی گرد باد اٹھے کہیں، کسی زلزلے کی نمود ہو

یہ جو ہست، ہے مرے چار سُو، کوئی معجزہ
کہ یہ "بود" ہو
مری آنکھ میں یہ جو رات ہے
مری عمر سی، اسے ٹال دے
مرے دشتِ ریگِ ملال کو کسی خوش خبر کا غزال دے
یہ فلک پہ جتنے نجوم ہیں ترے حکم کے ہیں یہ منتظر
وہ جو صبحِ نو کا نصیب ہو مری سمت اس کو
اُچھال دے ...!

نمرہ اقراء، کی ڈائری میں تحریر
شہزاد نیر کی غزل

سخن کروں گا میں تجھ سے، یہ کائنات ہٹا
تو میری بات کے رستے سے اپنی بات ہٹا

میں اُس کو دیکھ بھی سکتا تھا، چھو بھی سکتا تھا
جب ایک موڑ پہ میرا حجابِ ذات ہٹا

ہزار رنگ کے منظر دکھائی دیں گے تجھے
بس آفتاب کے رستے سے ایک رات ہٹا

تمام کھیل کا انجام جانتا ہوں میں
یہاں بساط تو رکھ دے، یہ جیت مات ہٹا

وہ لڑکھڑایا، جھکا اور گر کے ٹوٹ گیا
جونہی پہاڑ کے شانے سے میرا ہاتھ ہٹا

میں تیرہ غار کو روشن سمجھتا رہتا تھا
پھر ایک روز اچانک یہ سنگِ ذات ہٹا

بہت عجیب سفر ہے یہ زندگی کا سفر
کسی کی نفرتیں رکھ لے کچھ التفات ہٹا

چلا بھی آ کہ فقیروں کے دل کشادہ ہیں
سب احتیاط پرے رکھ، تکلفات ہٹا

وہ شہرِ حسن کا حاکم بھی آئے گا نیر
تو پہلے دل کی سڑک سے تجاوزات ہٹا

افشاں گل، کی ڈائری میں تحریر
فاخرہ بتول کی نظم

محبت کی یہی تعریف ہے کہ
ازل سے ہے محبت ماورا لفظوں کی مالا
مگر یہ بھی حقیقت ہے
محبت سوچ کے آکاش پر بادل کی صورت میں
سدا پرواز کرتی ہے
کبھی بارش کی بوندوں میں سمٹ کر دل کی دھرتی پر
اُترتی ہے بکھرتی ہے
ادا لے کر صبا سے یہ، گلابوں سے مہک لے کر
دھنک سے رنگ لے کر اور ستاروں سے چمک لے کر
حسیں آنچل بناتی ہے
اسی آنچل سے پھر خوابوں کے سپنے گھر سجاتی ہے
محبت آزماتی ہے
کبھی یہ شعر بن کر لفظ کی حرمت بڑھاتی ہے
کبھی یہ ساز بن کر دھیرے دھیرے گنگناتی ہے
سراپا آنکھ بن جاتی ہے محبوب کو پا کر
انوکھا لمس بن جاتی ہے کوچۂ یار میں جا کر
نہ جانے کون سا منتر یہ پڑھ کر ہولے ہولے سے
کسی کی بند پلکوں میں بنا دستک دیے ایک دم
اُتر کر گھر بناتی ہے ... محبت مسکراتی ہے
یہ خوشبو ہے، ہمیشہ پھول کی سانسوں میں ہوتی
ہے
بنا دے چاند، تیرہ شب کو جو، یہ ایسا موتی ہے
کسک ہے دائمی اس میں، بہت بے نام لذت
ہے
محبت کی یہی تعریف ہے کہ یہ محبت ہے ...

صابرہ یار محمد، کی ڈائری میں تحریر
علی زریون کی غزل

یہ ہم جو اپنے بدن آئینے بنا رہے ہیں
ہم اپنے بجھتے چراغوں کا غم منا رہے ہیں

ہم اپنے عہد کے وہ مطمئن منافق ہیں
جو اپنے آپ کو ترتیب سے گنوا رہے ہیں

ہوا ہے عصر کوئی تعزیت تو کر، ہم سے
ہم اپنے ملک میں ہجرت کا دکھ اٹھا رہے ہیں

وہ شاعری ہو کہ کارِ دین و دنیا، ہم
جو کام کرتے نہیں ہیں وہی بتا رہے ہیں

تپا ہوا ہوں میں اُن سب پہ جو علی زریون
خدا کے نام پہ خلقِ خدا مٹا رہے ہیں

شیریں، کی ڈائری میں تحریر
رحمن سمیر کی غزل

ہمیں اپنے مقدر کے سویرے ڈھونڈنے ہوں گے
وگرنہ بد نصیبی کے اندھیرے ڈھونڈنے ہوں گے

اگر جینا پڑے گا ان تڑپتے رو تے لوگوں میں
ہمیں پھر ضبط کے زنداں میں ڈیرے ڈھونڈنے ہوں گے

نہیں محفوظ کوئی آج انسانوں کی بستی میں
ہمیں اونچے پہاڑوں پر بسیرے ڈھونڈنے ہوں گے

اگر ظلم و ستم سے قوم کو آزاد ہونا ہے
وطن کے کونے کونے سے وڈیرے ڈھونڈنے ہوں گے

نکالیں زہر آ کر آج انسانوں کی فطرت سے
سمیر اس کام کی خاطر سپیرے ڈھونڈنے ہوں گے

سیدہ نسبت زہرا، کی ڈائری میں تحریر
ارشد ملک کی نظم

تمہیں ضد ہے کہ میں کہہ دوں
مجھے ضد ہے کہ تم کہہ دو
مجھے تم سے محبت ہے
کہو مجھ سے محبت ہے
نہیں یہ جانتے دونوں
محبت کب محتاج ہے لفظوں کی، باتوں کی
محبت تو ہماری دھڑکنوں کے ساز میں شامل
سُریلے گیت کی مانند
محبت یاد کی دیوی
جو تنہا رات کو اکثر آتی ہے آنکھوں میں
محبت مسکراہٹ ہے
حسین نازک سے ہونٹوں میں
محبت صندلی ہاتھوں کی نازک لرزشوں میں ہے
محبت سوچ کی گہرائیوں سے پھوٹتی خوشبو
ہمیشہ ساتھ رہتی ہے
محبت آنکھ میں پلتا وہ پُراسرار جذبہ
جسے اب تک نہ کوئی سمجھ پایا
نہ اس کی کوئی صورت ہے
نہ اس کا کوئی پیمانہ
ڈھکے الفاظ میں اس کا بہت اظہار ہوتا ہے
کچھ ایسے ہی کہ جیسے اب تہہ دل سے تو ہم دونوں
اقرار کرتے ہیں
مگر پھر بھی نجانے کیوں تمہیں ضد ہے کہ میں کہہ دوں
مجھے ضد ہے کہ تم کہہ دو، مجھے تم سے محبت ہے
کہو مجھ سے محبت ہے

مجھے یہ شعر پسند ہے

شگفتہ سلیمان

فرزانہ علی احمد ——— کراچی
میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا
اجاڑ دے مری مٹی کو در بدر کر دے
مری زمین مری آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے

حمیرہ حمید ——— کراچی
ہم بے دئیے گھر لوگوں کی ایک دعا بس ایک دعا
مالک اشہر گلاب سلامت، ہم پر جو بھی آئے عذاب

اُمِ رومان ——— عبدالحکیم
خدا کرے مری ارض پاک پر اترے
وہ فصل گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
خدا کرے مرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو زندگی وبال نہ ہو

مان جٹ ——— عبدالحکیم
خمار آلودہ نظروں کی ہر اک جنبش ہے افسانہ
الٰہی ہم انہیں دیکھیں کہ ان کا دیکھنا دیکھیں

حمنہ حبیب ——— عبدالحکیم
تم بھی سادہ ہو کبھی چال بدلتے ہی نہیں
ہم بھی سادہ ہیں اسی چال میں آجاتے ہیں

افشاں اسلم ——— کراچی
کہیں کچھ اور نہ ہو جاؤں ریزہ ریزہ
ایسا ٹوٹا ہوں کہ جڑتے ہوئے ڈر لگتا ہے

روبینہ ——— لاہور
زندگی تیری حقیقت کی یہ ہے
تیری گفتار میں چھاؤں، ترے کردار میں دھوپ

مہک سہیل ——— لاہور
تم نہیں جانتے اس رنج کو ہم جانتے ہیں
راکھ کر جائے گا اس غم کا اثر آخر کار

صائمہ سلیم ——— گوجرہ
وہ سوئے اتفاق آملے تھے ہم سے
ہم ناداں سمجھے ہماری دعا میں اثر ہے

آمنہ امتیاز ——— کراچی
یا حسن رفاقت ہو، یا ترک رفاقت ہو
یا آپ بدل جائیں، یا مجھ کو بدلنے دیں
غم وہ کہ بہو کر دیں اندر سے ہمارا دل
ہم وہ کہ پگھل کر بھی آنسو نہ نکلنے دیں

امبرین ——— کوئٹہ
کیسی بے فیض سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کیسے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے
ایک پل چھین کے انسان کو لے جاتا ہے
پیچھے رہ جاتے ہیں سب ساتھ نبھانے والے

صائمہ ——— کوئٹہ
سلگ رہا ہوں میں جس کے فراق میں کب سے
خبر نہیں ہے کہ اس کو خبر بھی ہے کہ نہیں

عطیہ ——— سیالکوٹ
یوں ریزہ ریزہ ہو گیا سپنوں کے محل میں
بکھری ہوئی تم خواہش کا بدن جوڑتا رہا

صدف عبداللہ ——— رو، اے، ای
بہتے ہیں تیری یاد میں یوں آنکھ سے آنسو
جیسے کوئی ساون کی گھٹا ٹوٹ کے برسے

عروج خان ——— کراچی
وقف ہے ذہن فقط تیرے تصور کے لیے
تجھ کو بھولا ہی کہاں ہوں کہ تجھے یاد کروں

تحریم امان ——— گوجرہ
ڈھونڈتی پھرتی ہے دشت و بیاباں میں ہمیں
زندگی ہم سے بچھڑ کر خود بھی پچھتائی بہت

جاسمہ مریم نوید ——— کورنگی کراچی
بھی اس قدر عجب مسافت کہ کچھ نہ پوچھو
آنکھیں ابھی سفر میں تھیں کہ خواب تھک گئے

بینش ——— لاہور
میں کہ صحرائے محبت کا مسافر تھا فراز
ایک جھونکا تھا کہ خوشبو کے سفر پر نکلا

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات
کتنا آسان تھا تیرے ہجر میں مرجانا
پھر بھی اک عمر لگی ہمیں جان سے جاتے جاتے
اس کی وہ جانے اسے پاس وفا تھا کہ نہ تھا
تم فراز اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے

گڑیا شاہ ——— کہروڑپکا
ابھی مصروف ہوں کافی کبھی فرصت میں سوچوں گا
کہ تجھ کو یاد رکھنے میں میں کیا کیا بھول جاتا ہوں

نسبت سنیعر ——— کہروڑپکا
کس جان گلستان سے یہ ملنے کی گھڑی تھی
خوشبو میں نہائی ہوئی اک شام کھڑی تھی
یوں دیکھنا اس کو کہ کوئی اور نہ دیکھے
انعام تو اچھا تھا مگر شرط کڑی تھی

گیلانی سسٹرز ——— کہروڑپکا
بغیر اذن کے آیا ہوں تیرے دفتر میں
تو جونکے تھوڑا سا، گھنٹی بجا، بگڑ تو سہی

آسیہ جاوید ——— کراچی
اے کسی جان، تکلم کو تم مجھ سے تو ملواتے
تسخیر نہ کر پاتا، حیران تو کر جاتا

عظمیٰ غلام نبی ——— کراچی
صلیب شاخ پہ رقصاں گلاب دیکھے ہیں
شیراز حسن ہی جلتے شباب دیکھے ہیں
ہماری سوچ پہ کوئی نہ ہو سکا حاوی
کہ ہم نے صرف تمہارے ہی خواب دیکھے ہیں

صائمہ جبیں ——— کراچی
کسی کے آنے کی کچھ یوں بھی آہٹیں مانگوں
کواڑ بند رکھوں اور دستکیں مانگوں

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ
دوستو! تم پہ بھی گزرا ہے کبھی یہ عالم
نیند آتی نہیں اور خواب نظر آتے ہیں

رفعت ——— کراچی
دمک رہے ہیں مرے حرف لب پہ آئے بغیر
سمجھ رہا ہے وہ باتیں مری بتائے بغیر
یہ دور جراغ ہیں اور ایک لوسے روشن ہیں
دیا جلا نہیں کرتا لہو جلائے بغیر

اریبہ شاہ ——— بہاول پور
نہ جانے ہو گیا ہوں اس قدر حساس میں کب سے
کسی سے بات کرتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
ہزاروں موسموں کی حکمرانی ہے میرے دل پر
وصی میں جب بھی ہنستا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

زبیدہ ریاض ——— حیدر آباد
ویرانیاں دلوں کی بھی کچھ کم نہ تھیں ادا
کیا ڈھونڈنے گئے ہیں مسافر خلاؤں میں

نازش ریحان ——— کراچی
سر جھکاؤ گے تو پتھر دیوتا ہو جائے گا
اتنا نہ چاہو اُسے بے وفا ہو جائے گا

نواب زادی سومنگی ——— مورو سندھ
سزا یہ ہے کہ آنکھوں سے چھین لی نیند یں
جرم یہ تھا کہ اس کے ساتھ جینے کے خواب دیکھے تھے

ثمینہ، نمل ——— کراچی
نہ جانے کون سا فقرہ کہاں رقم ہو جائے
دلوں کا حال بھی اب کون کس سے کہتا ہے
مرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اشکوں کی
بھری بہار میں کیسا مکان ڈھتا ہے

کرن ——— فیصل آباد
اس کے یوں ترک محبت کا سبب ہوگا کوئی
جی نہیں مانتا وہ بے وفا پہلے سے تھا
تیرے آنے سے تو بس زنجیر ہی بدلی گئی
ہم اسیروں پر جفا کا باب وا پہلے سے تھا

نادیہ ——— گجرات
تمکنت سے تجھے رخصت تو کیا ہے لیکن
ہم سے ان آنکھوں کی حسرت نہیں دیکھی جاتی

سعدیہ سلیم ——— کراچی
اس کی حرمت کا مرے دل کو بھی ہے پاس بہت
چپ رہے گا مری ناموس کی خاطر وہ بھی

ارم آفتاب ——— کراچی
مجھے کیوں عزیز تر ہے یہ دھواں دھواں سا موسم
یہ ہوائے شام ہجراں مجھے راس ہے تو کیوں ہے
میں اجڑ کے بھی ہوں تیرا، تو بچھڑ کے بھی ہے میرا
یہ یقین ہے تو کیوں ہے، یہ قیاس ہے تو کیوں ہے

ریحانہ امجد بخاری

مسکراتی کرنیں

اظہار ہمدردی

ایک خاتون نے اپنی پڑوسن سے کہا۔
"آدھی رات ہو گئی ہے' میرے شوہر ابھی تک نہیں آئے' میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ معلوم نہیں وہ اس وقت کہاں ہوں گے؟"
"بہن پریشان نہ ہوں۔ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ اس وقت وہ کہاں ہیں..... تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری پریشانی دگنی ہو جائے۔" پڑوسن نے ازراہ ہمدردی کہا۔

پروین..... سوسائٹی' کراچی

ڈراپ سین

گولڈ اسٹائن نے ساری زندگی فلم نہیں دیکھی تھی۔ جب اس کی عمر نوے سال کی ہوئی تو اس کے بچوں' بچیوں' پوتوں' نواسوں اور نواسیوں نے طے کیا کہ اس سے قبل کہ بڑے میاں دنیا سے رخصت ہوں' انہیں کم از کم ایک فلم ضرور دکھائی جائے۔ سب کے سب گولڈ اسٹائن کو پکڑ کر فلم دکھانے لے گئے۔
فلم ختم ہونے کے بعد گھر پہنچ کر نواسیوں' نواسوں نے دریافت کیا۔
"فلم کیسی تھی؟"
"محض بکواس۔" گولڈ اسٹائن نے جواب دیا۔
"جب لڑکا اظہار محبت کر رہا تھا تو لڑکی اظہار نفرت کر رہی تھی اور جب لڑکی نے اظہار محبت کرنا شروع کیا تو لڑکا اظہار نفرت کرنے لگا اور آخر میں جب دونوں ایک دوسرے سے اظہار محبت کے لیے راضی ہوئے تو فلم ختم ہو گئی۔"

نویدہ مصطفیٰ..... اسلام آباد

قابل رشک

گزشتہ دنوں رات کے وقت شادی ہال میں اس وقت ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی' جب عین نکاح کے وقت دولہا نے فرار ہونے کی کوشش کی اور شادی ہال سے باہر بھاگ گیا۔ تمام لوگوں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے روکنے والوں سے درخواست کی کہ "آپ تو ڈوبے ہوئے ہیں' مجھے تو نہ ڈبوئیے' میں آپ کے لیے دعا کروں گا کہ آپ کی اپنی بیویوں سے بھی آپ کی جان چھوٹ جائے۔" یہ التجا اور دعا سن کر تمام لوگ پیچھے ہٹ گئے۔
دلہن کو جب یہ سب معلوم ہوا تو وہ سمجھ گئی کہ اب اسے ہی خود کچھ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ وہ فوری طور پر اسٹیج سے نیچے اتری اور دولہا کے پیچھے دوڑ پڑی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دولہا کو پکڑ کر لائی اور اس سے اپنا نکاح پڑھوایا۔
اس تمام صورت حال کے بعد جب لوگوں نے دلہن سے پوچھا کہ "آپ نے صنف نازک ہو کر ایک مرد کو کیسے پکڑا۔" تو اس نے جواب دیا۔
"میں سیف گیمز کی پانچ سو میٹر ریس کی گولڈ میڈلسٹ رہی ہوں۔"

امبر..... لاہور

بچے ہمارے عہد کے

☆ نرس زچہ وارڈ سے باہر آئی تو ننھا جمی بھی اپنے والد کے ساتھ بنچ پر بیٹھا تھا۔ نرس نے اسے ہی مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جمی بیٹا! مبارک ہو..... تمہیں عید کے لیے ایک ننھا سا بھائی تحفے میں ملا ہے۔"
"واقعی.....؟" جمی میاں نے اٹھتے ہوئے جوش سے کہا۔ پھر اندر کا رخ کرتے ہوئے بولے۔
"میں جا کر ممی کو بتاتا ہوں۔"

☆ نرس نے اسپتال میں کمسن راشد کا منہ لٹکا ہوا دیکھا تو پوچھا۔
"کیا بات ہے بیٹا..... کیا تمہیں اپنی نئی چھوٹی سی بہن اچھی نہیں لگی؟"
"اچھی تو ہے۔" راشد نے بدستور بجھے بجھے سے انداز میں کہا۔
"لیکن دراصل پرسوں میرے دوست فرحان کے ہاں بھی چھوٹی بہن پیدا ہوئی ہے۔ وہ سمجھے گا کہ ہم لوگوں نے اس کی نقل کی ہے۔"

☆ ننھے شوبی نے اپنے دوست منو سے پوچھا۔
"تمہارے گھر میں جو ننھی سی بہن آئی ہے' اس کا نام کیا ہے؟"
"پتا نہیں..... جب وہ بتائے گی تو پتا چلے گا..... ابھی تو اس کی کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آتی۔" منو نے منہ بنا کر جواب دیا۔

شائستہ..... کراچی

افسوس

ایک فقیر نے دوسرے فقیر سے پوچھا۔
"کیا بات ہے؟ اتنے اداس اور پریشان کیوں نظر آ رہے ہو۔"
"مجھے راستے میں اخبار کا ایک ٹکڑا پڑا ملا ہے۔ اس پر گھر میں ٹماٹو کیچپ تیار کرنے کی ترکیب لکھی ہوئی ہے۔" دوسرے بھکاری نے بتایا۔
"تو اس میں اتنی اداسی اور پریشانی کی کیا بات ہے؟" پہلے بھکاری نے حیرت سے پوچھا۔
"بس..... یونہی ذرا خیال آ گیا تھا کہ اگر اپنا بھی کوئی گھر ہوتا تو کم از کم ٹماٹو کیچپ تو بنا لیتے۔" دوسرے بھکاری نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

فرحانہ عارف..... کراچی

شکاریات

ایک صاحب کسی زمانے میں ماہر شکاری رہ چکے تھے مگر بڑھاپے میں سات برس سے پہیوں والی کرسی پر ادھر ادھر آتے جاتے تھے پھر بھی یہ خواہش انہیں بے قرار کیے رکھتی تھی کہ صرف ایک بار وہ کسی ریچھ کو اپنی بندوق کا نشان بنائیں۔
ایک روز ان کے دونوں پوتوں کو ان کا دل رکھنے کی سوجھی اور وہ پہیوں والی کرسی کو دھکیلتے ہوئے بڑے میاں کو دس میل دور گھنے جنگل میں لے گئے۔ اچانک ان کا سامنا ایک بڑے ریچھ سے ہو گیا۔ جونہی ریچھ نے انہیں دیکھا تو وہ ان کی طرف لپکا۔
دونوں پوتے چیختے چلاتے گھر کی طرف بھاگے اور اپنی والدہ کو بتایا۔
"غضب خدا کا دادا جان کو ریچھ نے مار ڈالا۔" ماں بولی۔
"چلانا بند کرو' تمہارے دادا تمہارے آنے سے پانچ منٹ پہلے ہی گھر پہنچ چکے ہیں۔"

ہما کاشف..... لاہور

احساس

"کیا بات ہے علی' اتنے پریشان کیوں نظر آ رہے ہو؟" زین نے پوچھا۔
"کیا بتاؤں یار' مجھ سے اتنی زبردست غلط سرزد ہوئی ہے کہ اب میری زندگی کا بڑا حصہ جیتے جی جہنم کی نذر ہو جائے گا۔"
"آخر ہوا کیا؟"
"دراصل میں اپنی ساس کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا میں نے کہا۔ آپ کا ڈوپٹہ پرانا ہو گیا ہے۔ میں آپ کو نیا لا دوں گا۔" وہ خوش ہوئیں تو میں نے کہا۔
"آپ کو سوٹ بھی سلوا دوں گا۔"
اور پھر میں نے مزید خوش کرنے کی کوشش کی۔

"آپ کے دستانوں پر بے شمار سلوٹیں پڑ چکی ہیں۔ میں آپ کو نئے دستانے بھی خریدوں گا۔"
"لیکن یار! جب وہ غرائیں تو مجھے احساس ہوا کہ ان کے ہاتھ میں دستانے تو تھے ہی نہیں۔"

افشاں خان..... لاہور

دکھائے کیا شوق جنوں

ایک صاحب کو پوسٹر پڑھنے کا بہت شوق تھا ایک دفعہ وہ کہیں سے گزر رہے تھے کہ ایک کھمبے پر ایک پوسٹر لگا ہوا تھا حسب عادت اسے پڑھنے کے لیے اوپر چڑھے' لکھا تھا۔
"کھمبا گیلا ہے۔ ہاتھ مت لگائیں۔"

سدرہ..... لاہور

مکھن

"مکھن کہاں ہے۔"
"مکھن ختم خلاص۔"
"سارا کھالیا۔"
"نہیں سارا لگا دیا یہ کھانے کی چیز تھوڑا ہی ہے۔ لگانے کی ہے۔ جس کو لگاؤ پھسل پڑتا ہے۔"
"جو پھسلے گا اس کی ٹانگ ٹوٹے گی۔"
"یہ سوچنا اس کا کام ہے۔ ہمارا کام تو لگانا ہے۔"
(ابن انشاء)

فوزیہ ثمرو بٹ..... گجرات

حسن انتخاب

قبضہ دلا دیا مجھے میرے مکان کا
میرے جو تھے وکیل عدیم النظیر ہیں
فیس ان کی پوچھتے ہو تو اب اس مکان میں
خود حضرت وکیل رہائش پذیر ہیں

کلام : انور مسعود

عرفانہ احمد..... دائرہ دین پناہ

✵ ✵ ✵

کہا میں نے بہت دن ہو گئے اب قرض کر واپس
عداوت تاکہ اپنی ختم ہو سکھ پائیں ہم دونوں
تو ہنس کر وہ یہ بولا دوستی کا فائدہ اب کیا
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

✵ ✵ ✵

جس کو فقیر آپ نے سمجھا ہے بھائی جان
کل تک تھا اس کو زعم کہ کوٹھی ہے کار ہے
بیٹھا ہے یہ جو سایہ دیوار کے تلے
سرمایہ دار کمپنیوں کا شکار ہے

کلام : مرزا حیدر عباس

شافعہ اعوان..... کراچی

تازہ..... تازہ

ایک صاحب نے ریسٹورینٹ میں بیٹھ کر تازہ ابلے ہوئے انڈے کا آرڈر دیا۔ انہوں نے بہت اصرار سے کہا کہ انڈہ تازہ ابلا ہونا چاہیے۔ ویٹر انہیں اطمینان دلا کر رخصت ہو گیا کہ ان کی ہدایات پر حرف بہ حرف عمل ہو گا۔ انڈہ آیا تو اس پر باریک لفظوں میں ایک پیغام بھی درج تھا۔
"میری عمر بائیس سال ہے۔ میں دنیا میں اکیلی ہوں۔ خوب صورت' زندہ دل اور خوش حال ہوں۔ شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ میری ذات میں دلچسپی محسوس کریں تو مندرجہ ذیل پوسٹ بکس کی معرفت خط لکھیں۔"
ان صاحب نے بہ صد اشتیاق پوسٹ بکس نمبر نوٹ کیا۔ انڈہ کھایا اور گھر آکر اس نامعلوم لڑکی کے نام ایک نہایت طویل اور متاثر کن خط لکھا کافی دن بعد جواب آیا۔
"آپ نے جن جذبات کا اظہار کیا بہت شکریہ۔ لیکن میری شادی ہوئے تو ڈیڑھ سال ہو چکا ہے۔"

حرمت ردا اکرم..... ڈلوال

✵ ✵

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

چکن دال بھرے کباب

اجزا :

مرغی (بغیر ہڈی کے)	250 گرام
چنے کی دال (ابال لیں)	ایک کپ
میدہ	ایک کپ
پیاز	ایک عدد
لہسن	تین جوے
ادرک	ایک درمیانہ ٹکڑا
ہری مرچ	چار عدد
ہرا دھنیا	1/4 گڈی
پودینہ	1/4 گڈی
کٹی ہوئی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	1/2 کپ

ترکیب :

مرغی کے ٹکڑوں کو پیاز، لہسن، ادرک، ہری مرچ، ہرا دھنیا، پودینہ، نمک اور کٹی ہوئی لال مرچ کے ساتھ مشین میں باریک پیس لیں۔ پیسنے کے دوران چار کھانے کے چمچے میدہ بھی شامل کرلیں۔

ابلی ہوئی چنے کی دال میں نمک اور کٹی ہوئی لال مرچ ملائیں۔

ہاتھ پر میدہ لگا کر مرغی کے تیار شدہ آمیزے کی ایک ٹکیہ بنائیں۔ اس کے اوپر ڈیڑھ چائے کے چمچے کے برابر دال رکھیں ایک اور ٹکیہ بنا کر اس کے اوپر رکھیں اسے کباب کی شکل دیتے ہوئے میدہ میں لپیٹیں اور گرم تیل میں تل لیں۔ مرغی کی دال بھرے کباب ٹماٹر سلاد پتا اور چٹنی کے ہمراہ پیش کریں۔

مونگ کی دال کے سموسے

اجزا :

تلی ہوئی مونگ کی دال	ایک پیکٹ
سموسے کی پٹیاں	دو درجن
پودینہ	1/2 گڈی
ہرا دھنیا	1/2 گڈی
پیاز	ایک عدد
سویا	ایک گڈی
لیموں	دو عدد
مکئی کا آٹا	ایک چائے کا چمچہ
انڈے (سفیدی)	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

ایک پیالے میں تلی ہوئی مونگ کی دال لیں۔ اس میں کٹا ہوا ہرا دھنیا، پودینہ، لیموں کا رس، نمک، کٹی ہوئی پیاز، سویا اور مکئی کا آٹا ملا کر تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیں۔

مونگ کی دال کے آمیزے کو سموسے کی پٹیوں میں بھریں اور کناروں کو انڈے کی سفیدی لگا کر اچھی طرح بند کرلیں۔

مونگ کی دال کے سموسوں کو سنہرا ہونے تک تلیں اور چٹنی کے ہمراہ پیش کریں۔

مسالا ڈوسا

اجزا :

چاول	تین کپ
ماش کی دال	ایک کپ
مرغی (بغیر ہڈی کے)	200 گرام
آلو (ابلے ہوئے)	تین سے چار عدد
پسا ہوا لہسن	ایک کھانے کا چمچ
لال مرچ (کٹی ہوئی)	ایک کھانے کا چمچ
کالی مرچ (کٹی ہوئی)	1/2 چائے کا چمچہ
زیرہ (کٹا ہوا)	1/2 چائے کا چمچہ
ہلدی	1/2 چائے کا چمچہ
رائی دانہ	1/2 چائے کا دانہ
کڑھی پتا/ تیل	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

تل کی چٹنی کے لیے :

تل	ایک کپ (بھنے ہوئے)
لہسن	تین سے چار جوے (بھون لیں)
ثابت لال مرچ	چار سے پانچ عدد (بھون لیں)
زیرہ	1/2 چائے کا چمچہ (بھون لیں)
املی کا گودا	1/2 کپ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

ماش کی دال اور چاول کو رات بھر کے لیے بھگو دیں صبح پانی میں پیس کر گاڑھا آمیزہ تیار کرلیں اور نمک شامل کرلیں۔ ایک برتن میں چار سے پانچ چمچے تیل گرم کر کے اس میں رائی اور کڑھی پتا کڑکڑائیں اور مرغی شامل کر کے بھونیں۔ آلو، کٹا ہوا زیرہ، کٹی ہوئی لال مرچ، ہلدی، نمک اور پسا ہوا لہسن ڈال کر گوشت گلنے تک پکائیں۔

توے پر تھوڑا سا تیل ڈالیں اور ماش کی دال کے آمیزے کو روٹی کی شکل میں پتلا سا پھیلا دیں۔ سنہری ہو جائے تو اس میں مرغی کا تیار مسالا رکھیں اور دونوں طرف سے رول کی طرح پلٹیں، دونوں طرف سے پکا کر اتار لیں۔ مسالا ڈوسا تیار ہے۔

تل کی چٹنی کے لیے :

تل، لہسن، لال مرچ، زیرہ، املی کا گودا اور نمک

تھوڑے سے پانی کے ساتھ بلینڈر میں ڈال کر پیس لیں اور ایک پیالی میں نکال کر مسالا ڈوسا کے ساتھ پیش کریں۔

جودھ پوری کچوری

اجزا :

میدہ	دو کپ
تیل	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	1/2 چائے کا چمچہ

برائے فلنگ :

دال چنا	ایک کپ
پیاز	دو عدد (باریک کاٹ لیں)
ہینگ	ایک چٹکی
ثابت دھنیا (کوٹ لیں)	ایک چائے کا چمچہ
ادرک (کش کرلیں)	ایک کھانے کا چمچہ
سونف	ایک چائے کا چمچہ
چلی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب :

میدے میں تیل اور نمک ملادیں۔ پانی کے ساتھ سخت آٹا گوندھ لیں۔ چنے کی دال کو پانچ سے چھ گھنٹے کے لیے بھگودیں اور پھر اسے گرائنڈ کر کے ایک گاڑھا پیسٹ بنالیں۔ پیاز اور دیگر تمام مسالے ملادیں۔ اچھی طرح مکس کرلیں۔ نمک نہ ملائیں۔

گوندھے ہوئے آٹے کے چھوٹے پیڑے بنالیں۔ انہیں کھوکھلا کر کے اس میں چنے کی دال کا مکسچر بھردیں۔ پوری کی شکل میں بیل لیں اور ہلکی آنچ پر تیل میں ڈیپ فرائی کریں۔ حتی کہ ان کی رنگت براؤن ہوجائے۔ گرما گرم پیش کریں۔

چائنیز چاؤمن

اجزا :

ایگ نوڈلز	ایک پیکٹ
مرغی	ایک (سینے کا حصہ)
جھینگے	250 گرام
شملہ مرچ	ایک عدد
گاجر	ایک عدد
پیاز	ایک عدد
ہری پیاز	ایک عدد
بند گوبھی	ایک عدد
لہسن	چار جوے (چھیل لیں)
ٹماٹو کیچپ	دو کھانے کے چمچے
اویسٹر ساس	دو کھانے کے چمچے
وارچیسٹر ساس	دو کھانے کے چمچے
سویا سوس	ایک کھانے کا چمچہ
کالی مرچ	1/2 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	چار کھانے کے چمچے

ترکیب :

ابلتے ہوئے پانی میں نوڈلز ڈال کر اسے پکنے تک مسلسل چلاتے رہیں تاکہ نوڈلز الگ الگ رہیں۔ جب نوڈلز پک جائیں تو چھلنی میں نکال کر اوپر سے ٹھنڈا پانی ڈالیں۔

ایک فرائنگ پین میں دو کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے نوڈلز اس پر بچھادیں۔ بغیر چمچہ استعمال کیے اسے ہلائیں اور ایک بار پلٹ کر پلیٹ میں نکال لیں۔ جھینگوں اور مرغی کے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں۔

پیاز، گاجر، شملہ مرچ، ہری پیاز اور بند گوبھی کو درمیانے سائز کا کاٹ لیں۔

فرائنگ پین میں ڈیڑھ کھانے کا چمچہ تیل گرم کر کے اس میں لہسن کو سنہری کریں تمام سبزیاں، مرغی اور جھینگے ڈال کر اچھی طرح سے ملائیں نمک، کالی مرچ، ٹماٹو کیچپ، اوسٹر سوس، وارچیسٹر سوس اور سویا سوس ڈال کر اچھی طرح سے ملائیں پانی خشک ہونے پر نوڈلز کے اوپر ڈال کر پیش کریں۔

حسن و صحت

ادارہ

خربوزے کے خواص اور فائدے

ویسے تو ہر پھل ہی نعمت خداوندی ہے، لیکن خربوزہ اپنے ذائقے، مٹھاس اور جلد ہضم ہونے کی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے مقبول و معروف ہے۔ اسے عربی میں بطیخ کہتے ہیں۔ مشہور و معروف پھل ہے۔ جتنا شیریں ہو بہتر اور لطیف ہے، جس قدر پھیکا ہو برا اور غلیظ ہے۔ پختہ لطیف ہے اور کچا کثیف ہے خربوزے اکثر ندیوں میں اور ان کے کنارے بالو ریت میں بوئے جاتے ہیں ان کے کھیت کو فالیز کہتے ہیں ایک قسم کا خربوزہ سردہ کہلاتا ہے جو پشاور میں ہوتا ہے نہایت شیریں دلدار از تمام خربوزوں میں بڑا اور لمبا اور قیمتی ہوتا ہے چلا خربوزہ بھی مشہور ہے۔

یہ ایک عام سا پھل ہے جو اپنے ذائقے اور خوشبو سے معروف و مشہور ہے۔ یہ ہمارے ملک میں بکثرت پیدا ہوتا ہے، اس کی کئی ایک قسمیں ہیں۔ اس کے مختلف رنگ اور ذائقے ہیں۔ مزاج کے اعتبار سے یہ پھل گرم و تر درجہ اول میں ہے۔ اس کے کھانے سے جسم کو تراوٹ و فرحت ہوتی ہے۔ یہ یرقان، جلندھر، پتھری اور قبض کے امراض میں مفید ترین ثابت ہوتا ہے۔ بندش پیشاب میں اس کا استعمال مجرب گردانا گیا ہے۔ یہ نہ صرف پیشاب میں اضافہ کرتا ہے بلکہ جسم سے زہریلے مادے بذریعہ پسینہ خارج کرتا ہے۔

اس کے بیج بطور مغز استعمال کیے جاتے ہیں۔ جو کہ مزاج کے اعتبار سے سرد ہوتے ہیں، ان سے مخصوص تیل بھی نکالا جاتا ہے، جسے لوگ دودھ میں ملا کر شوق سے پیتے ہیں اس میں غذائیت ہوتی ہے جو کہ جلن مثانہ اور پیشاب کی بندش کا خاتمہ کرتی ہے۔

خربوزے کے استعمال کے فوراً بعد پانی کا پینا نہایت مہلک اثرات مرتب کرتا ہے اس سے عموماً ہیضے کی شکایت لاحق ہوجاتی ہے۔ اس کے گودے میں جسم کو درکار موسم گرما کے عین مطابق پروٹین، چونا، فاسفورس اور نشاستہ دار اجزا بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس پھل کو کھانے کے بعد جسم میں قوت، چستی و چالاکی، بشاشت اور توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ خربوزہ ایک سستا اور طاقت سے بھرپور خزانہ ہے۔

جو خربوزے کا باقاعدہ استعمال کرتے ہیں ان کا چہرہ داغ دھبوں سے صاف رہتا ہے اور بدن میں خشکی تک نہیں ہوتی، رگوں و پٹھوں میں قدرتی لچک برقرار رہتی ہے ان کی بھوک میں اعتدال رہتا ہے اور یہ تسکین پاتی ہے۔ موسمی گرمی کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرنے والا وٹامن ڈی اس میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں فاسفورس، پوٹاشیم، کیلشیم، تانبا، گلوکوز اور وٹامن اے بی بھی پائے جاتے ہیں۔ گوشت بنانے کے اجزا کے علاوہ روغنی اور نشاستہ دار اجزا کا بھی نادر مجموعہ ہے۔ یہ ایک مشہور عام پھل ہے جو کہ ہمارے ملک میں عام ملتا ہے۔ ہندوپاک میں اس کی بافراط کاشت ہوتی ہے۔ گھٹیا قسم کے خربوزے میں سے صرف دس فی صد میٹھے نکلتے ہیں، خربوزے میں گرمے اور چتلے اس کی بہترین اقسام ہیں۔

یہ پھل رنگ میں مختلف زردی مائل ہوتا ہے۔ اس کا ذائقہ پھیکا یا شیریں ہوتا ہے۔ یہ مزاج میں گرم درجہ اول کا اور درجہ دوم کا تر ہوتا ہے۔ اس کی اس قدر مقدار کھانی چاہیے جو کہ با آسانی ہضم ہوسکے۔ یہ مصلح، سکنجبین، افعال و استعمال، قبض کشا اور مدر بول ہے۔ دوسرے درجے میں سرد و تر ہے بعض اطبا

خوب شیریں ہونے کے بعد گرم خیال کرتے ہیں کھنا بہت سرد ہے۔
یہ پھل پتھری توڑتا ہے' اس کے چھلکے کا لیپ چہرے کے رنگ کو صاف کرتا ہے۔ نہار منہ کھانا درست نہیں ہے۔

کیل مہاسوں کے لیے

چہرے پر کیل مہاسے حسن کو ماند کر ڈالتے ہیں' ان سے نجات کے لیے یہ نسخہ کارگر ثابت ہو گا۔ خربوزے کے خشک چھلکے لیں انہیں ہم وزن دال مونگ اور چنے کے آٹے میں ملا کر سل پر پیس لیں۔ یہ سفوف آدھا پاؤ دہی میں ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔
اس کا پتلا سا لیپ روزانہ سونے سے قبل چہرے پر کیجیے۔ چند دن بعد آپ کا چہرہ مہاسوں' داغ اور دھبوں سے پاک ہو جائے گا۔

بے خوابی کے لیے

نیند کا وقت پر آنا ایک قدرتی عمل ہے اگر اس میں بے ترتیبی واقع ہو جائے تو انسان کئی امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو یہ نسخہ استعمال کرنا چاہیے جو اچھی طرح سو نہیں پاتے۔ خربوزے کا مغز ایک چھٹانک لیں' اسے سل پر اچھی طرح رگڑ کر اس کا عرق نکال لیں' اس عرق کو گڑ والے چاولوں میں ڈال کر پکائیے اور سونے سے قبل نوش کر لیں۔ اس سے نہ صرف نیند میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ چہرے کی رنگت بھی کھل جاتی ہے۔ دماغ میں پائی جانے والی خشکی دور ہوتی ہے اور جسم کو فرحت آمیز نیند میسر ہوتی ہے۔

خشک کھانسی کے لیے

خربوزے کا مغز' گوند کیکر اور مکئی کا میدہ تینوں ہم وزن حاصل کریں' انہیں کسی کونڈے میں ڈال کر خوب باریک پیس لیں۔ یہ ایک لیس دار سا مرکب بن جائے گا اس میں حسب ضرورت پانی ملا کر اس کی چنے کی دال کے برابر گولیاں بنائیں۔ ان گولیوں کو سایہ دار جگہ پر رکھ کر سکھا لیں۔ اس کے بعد کسی شیشی میں ڈال کر محفوظ کر دیں۔ جب اس مرض کا سامنا ہو تو اس میں سے روزانہ چار گولیاں نکال کر چار چار گھنٹے کے بعد ایک ایک کر کے چوسیں۔ تین دن میں اس مرض سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

درد گردہ کے لیے

یہ مرض آج کل عام ہوتا جا رہا ہے اس کی ایک وجہ کثرت سے چائے نوشی بھی ہے۔ ایسے مریض کے لیے یہ نسخہ تیار کریں۔ خربوزے کے صاف ستھرے چھلکے جو خشک ہو چکے ہوں ایک تولہ کی مقدار میں لیں۔ انہیں کسی برتن میں ڈال کر اوپر سے تین چھٹانک عرق گلاب ڈال دیں' اب یہ آمیزہ دھیمی آنچ پر پکائیے' وہ جوش آنے پر اتار کر ٹھنڈا کر لیں اور مریض کو تین ماشے سیاہ نمک پسا ہوا ملا کر پلائیں اس سے مریض کو فوری تسکین ملے گی۔

سخت گوشت کے لیے

یہ ایک گھریلو ٹوٹکا ہے' اگر کبھی گھر میں سخت گوشت آ جائے اور وہ کافی دیر تک چولہے پر پکانے کے باوجود گلنے کو نہ آئے تو ایسے میں خربوزے کا خشک چھلکا پیس کر اس میں ڈال دیں۔ اس سے چند ہی منٹ میں گوشت گل جاتا ہے۔

ہاتھ......HANDS

آپ کے ہاتھ جسم کا ایک اہم عضو ہیں۔ آپ کے ہاتھوں کو اسی قدر دیکھا جاتا ہے جس قدر آپ کے چہرے کو دیکھا جاتا ہے۔ لہٰذا آپ کے ہاتھ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی اچھی طرح حفاظت کی جائے' ناخن کی صفائی' ان کی خوراک' ہاتھوں کی ورزش' ہاتھوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھا جائے' ہاتھوں کو پھٹنے سے روکا جائے' یہ ساری باتیں ایسی ہیں جنہیں اپنانے کے بعد آپ کے ہاتھ بے حد خوب صورت نظر آئیں گے اور اگر آپ نے اپنے ہاتھوں کی حفاظت نہ کی تو یہ آپ کے لیے اچھا نہیں۔ اگر کوئی بیماری ہے تو جلد از جلد

علاج کرانا چاہیے۔ ورنہ یہ دن بہ دن طول پکڑتی جائے گی۔ چند باتوں کا خیال رکھ کر آپ اپنے ہاتھوں کو خوب صورت بنا سکتی ہیں۔

ہاتھوں کی صفائی اور حفاظت

ہاتھوں اور ناخنوں کو دیکھ کر آدمی کے مزاج کا بھی پتا چلتا ہے۔ جس کا ہاتھ گندا ہوتا ہے یا وہ ہاتھوں کی مناسب صفائی نہیں کرتا۔ ایسے شخص کے مزاج میں بھی گندگی ضرور ہوتی ہے۔ آپ جب بھی ہاتھ دھوئیں کسی نہ کسی صابن سے اچھی طرح دھوئیں۔ مگر اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ صابن گھٹیا قسم کا نہیں ہونا چاہیے اور اس میں کوئی اس طرح کا کیمیکل نہ ہو جو آپ کے ہاتھوں کے لیے نقصان دہ ہو۔ ہاتھ خوب صورت اور چمکدار رکھنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک بڑا چمچہ سینجنے کی جڑ کا برادہ لے لیجیے۔ اس پر تھوڑا سا گرم دودھ ڈال کر ابٹن جیسا بنا لیں اور اسے ہاتھوں پر اچھی طرح مل کر سوکھ جانے دیں۔ پھر صاف اور ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیں۔ اگر انگلیوں اور ہتھیلی پر دھبے ہیں تو انہیں دور کرنے کے لیے گرم پانی سے ہاتھ دھو کر انہیں اچھی طرح خشک کر لیں۔ اس کے بعد سرکہ اور پانی ملا کر اس مرکب سے دوبارہ ہاتھ دھو ڈالیں۔ آپ دیکھیں گی کہ آپ کے ہاتھ نا صرف دھبوں سے نجات پا گئے بلکہ یہ نرم و ملائم اور چمکدار بھی ہو جائیں گے۔

ہاتھوں سے چکنائی دور کرنا

اگر آپ کے ہاتھوں پر چکنائی لگ گئی ہے اور صاف نہیں ہو پا رہی تو آپ سوکھی راکھ ہاتھوں پر رگڑیں اور اچھی طرح ہاتھ دھو ڈالیں۔
بعد میں کسی تولیے وغیرہ سے ہاتھ پونچھ لیں اسی طرح اگر آپ کے ہاتھ بہت سخت ہیں تو آپ لیموں کا عرق یا گلیسرین بھی لگا سکتی ہیں۔
خاص کر لیموں کا رس ہاتھ کی سختی کو دور کرتا ہے۔
آپ اپنے ہاتھ آگ میں مت سینکیں۔ اس سے آپ کے ہاتھ سخت ہو جاتے ہیں اگر آپ اپنے ہاتھ نرم و ملائم رکھنا چاہتی ہیں تو آپ جب بھی اپنے ہاتھ دھوئیں تو تھوڑا سا شہد خالص یا بادام روغن یا اس میں گلیسرین ملا کر لگا لیں۔ اگر آپ تھوڑے سے جو کے آٹے میں پانی ملا کر ہاتھ دھوئیں تو اس سے بھی آپ کے ہاتھ نرم و ملائم رہیں گے۔

ہاتھوں کا کھردرا پن

آپ سارا دن اپنے ہاتھوں سے کام کرتی ہیں' آپ کے ہاتھ کھردرے ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکثر آپ نے دیکھا ہو گا کہ کئی خواتین وزن اٹھانے کا کام کرتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے ہاتھوں پر گٹھلیاں بن جاتی ہیں اور ہاتھ کی کھال بھی کھردری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سبزی کا رس بھی انگلیوں کو خراب کر دیتا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ سبزی کاٹنے سے پہلے اپنے ہاتھوں پر تیل مل لیں اور جب وزن اٹھائیں تو جہاں درد محسوس کریں وہاں بھی تھوڑا تھوڑا تیل لگا لیں۔ اگر آپ رات سونے سے پہلے اپنے ہاتھوں میں اچھی طرح تیل مل کر سو جائیں اور صبح کسی اچھے سے صابن سے ہاتھ دھو ڈالیں تو اس سے بھی آپ کے ہاتھ اچھے رہیں گے۔ کام کرنے کے بعد اگر کسی اچھی سی کریم جس میں لینولین شامل ہو اس سے ہاتھوں کی مالش کی جائے۔ اس سے بھی ہاتھوں کا کھردرا پن دور ہوتا ہے۔

ہاتھوں کا پھٹنا

جن لوگوں کا خون خراب ہوتا ہے۔ ان کے ہاتھ عام طور پر سردیوں کے دنوں میں پھٹ جاتے ہیں۔ جو خواتین گرد و غبار والا کام کرنے کے بعد اپنے ہاتھ نہیں دھوتیں۔ ان کے بھی ہاتھ پھٹ جاتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کی رنگت بھی سیاہ پڑ جاتی ہے۔ اکثر آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض خواتین کام سے فارغ ہوئیں اور فوراً" آگ کے آگے ہاتھ سینکنے بیٹھ گئیں حالانکہ یہ طریقہ کار اچھا نہیں۔ سردیوں کے موسم میں ہاتھوں کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ اگر ہاتھ پھٹ جائیں تو ان میں سے خون رسنے لگتا ہے۔ جو اچھی بات نہیں ☆

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں ۱۹۸۱ء کے شمارے کے سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

نجمہ رفیع...... کراچی

س:۔ آپ اپنا نام بدل دیں۔ یہ تو لڑکیوں کا نام ہوتا ہے ذوالقرنین؟
ج:۔ نہیں بدلتے کوئی زبردستی ہے۔ ہوتا رہے لڑکیوں کا نام۔

عابدہ پروین...... کراچی

س:۔ دنیا گول نہ ہوتی تو؟
ج:۔ تو کیا دنیا چوکور ہوتی۔

صفیہ سلطان...... جیکب آباد

س:۔ نین صاحب! مئی جون میں جیکب آباد کا موسم بڑا۔ وہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کو بلائیں گے تو آئیں گے نا
ج:۔ مئی جون میں کراچی کا موسم بھی بڑا۔ وہ ہوتا ہے آپ کراچی آئیں ہمیں یقین ہے کہ بڑا وہ قسم کا موسم آپ کو ضرور پسند آئے گا اور ہاں صفیہ جی آپ کے مزید دو سوال نہایت ذاتی تھے۔ ان کے جواب ہمارے پاس محفوظ ہیں۔

فوزیہ بیگم...... کراچی

س:۔ نین جی! ذرا جلدی سے "ان" کا نام بتایئے؟
ج:۔ جنت بی۔ کیوں ہے نا آئیڈیل قسم کا نام۔

مسرت جبیں قادری...... پیرووالا

س:۔ یکم اپریل کو میری سالگرہ تھی۔ آپ کو دعوت نامہ نہ بھیج سکی۔ معذرت طلب ہوں؟
ج:۔ مبارک ہو ہائی اپریل فول بھیجی۔ معذرت قبول کی جاتی ہے۔

نائلہ نگار...... فیصل آباد

س:۔ مشورہ کب بلا چوں و چرا مان لیا جاتا ہے؟
ج:۔ جب وہ کسی بے عقل کا دیا ہوتا ہے۔

فہمیدہ موی...... کراچی

س:۔ کل ہم آپ کا انٹرویو لینے آ رہے ہیں۔ آپ کو کوئی اعتراض؟
ج:۔ نا۔ نا انٹرویو کی بات مت کرنا ورنہ وہ کرسی بھی ہاتھ سے جائے گی جس پر بیٹھا ہوں جم کے میں۔

عینی طفیل...... کراچی

س:۔ اگر کسی ماہ آپ کو کوئی سوال ہی موصول نہ ہوا تو؟
ج:۔ تو کیا؟ ہم دکان اپنی بڑھا جائیں گے۔

مدیرہ

نامے میرے نام

ادارہ کرن نے ہمیشہ آپ کے مزاج کو مدِنظر رکھتے ہوئے آپ تک بہتر سے بہتر تحریر پہنچانے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں ہم نے ہمیشہ معیار کو ترجیح دی ہے۔ اس بات کا سو فیصد خیال رکھا جاتا ہے کہ آپ تک پہنچنے والی کوئی بھی تحریر کسی اور کی کہانی کا چربہ یا نقل نہ ہو اس کے باوجود اگر کوئی خیال، کوئی جملہ یا کوئی کردار کہیں کسی دوسری تحریر سے میل کھاتا ہے تو یہ مماثلت محض اتفاقیہ ہو گی صریحاً "کوئی مصنفہ یا ادارہ اس غلطی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ہم تک جو بھی تحاریر پہنچتی ہیں ان میں سے پوری عرق ریزی کے بعد منتخب تحریروں کو ہی شاملِ اشاعت کیا جاتا ہے ادارہ کرن ہمیشہ سے انہی اصولوں پر کاربند رہا ہے کہ ان تحریروں پر موصول ہونے والی آرا، تعریف و تنقید پر مبنی بے لاگ تبصروں کو آپ تک پہنچا دے پچھلے ماہ سینئر مصنفہ "نگہت سیما کا ایک خط ہمیں موصول ہوا جسے اسی اصول کی پاسداری کرتے ہوئے ہم نے من و عن شامل اشاعت کر دیا۔ اس میں انہوں نے دعوا کیا کہ سعدیہ راجپوت کے ناول "عشقِ آتش" کا ایک کردار ان کے ناول "باروفا" کے کردار سے ملتا ہے 'یہ ان کی ذاتی رائے تھی جو ہم نے شائع کی اس کے حوالے سے قارئین کے جو خطوط موصول ہوئے ہم نے وہ بھی شائع کیے۔ ادارہ اس سلسلے میں قطعاً" غیر جانب دار ہے "نامے میرے نام قارئین کی آرا کا سلسلہ ہے اس میں شائع ہونے والے خطوط یا قارئین کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ہمارے لیے تمام پڑھنے والے اور لکھنے والے محترم ہیں، ہمیں کسی کو چھوٹا یا بڑا ثابت کرنا یا کسی کو نیچا دکھانا ہرگز مقصود نہیں۔ اس سارے مسئلے میں اگر کسی کی دل شکنی ہوئی ہو تو ہم اس سے معذرت خواہ ہیں۔ آئندہ اس امر کا پورا خیال رکھا جائے گا کہ ایسی کوئی تحریر کوئی خط یا تبصرہ جو کسی کی دل آزاری کا باعث بنے شامل اشاعت نہ کیا جائے۔

صدف عبداللہ...... لاہور

کسی ماہنامہ میں میں پہلی بار تبصرہ کر رہی ہوں۔ کرن پڑھتے ہوئے کافی وقت گزر گیا۔ کرن پڑھتے ہی چاند کی نرم و نازک چاندنی کا تصور ذہن میں آتا ہے۔
ابتدا حمد و نعت سے کی جو ہمیشہ دل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ انٹرویو بہت ہی دلچسپ تھے۔ افسانے' ناولٹ' مکمل ناول بہت اچھے تھے نئی لکھنے والی تمام رائٹرز بہت محنت سے لکھتی ہیں اور ان کی محنت ان کی کاوشوں میں نظر آتی ہے۔ اب آتے ہیں ناولز کی طرف۔ فوزیہ یاسمین کا "دست کوزہ گر" نے ہمیں اپنی سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ بہت ہی خوب صورت انداز میں فوزیہ یاسمین کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ ان کا ناول میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ ایک ریکویسٹ ہے کہ پلیز اس کے صفحے بڑھا دیں پورے ماہ بہت بے چینی سے اس ناول کا انتظار ہوتا ہے۔ نایاب جیلانی کا ناول "اور رے پیا" بہت اچھا لگا پر آخر میں باقی آئندہ دیکھ کر مزا کرکرا ہو گیا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے نایاب جب بھی لکھتی ہیں چھا جاتی ہیں۔
افسانوں میں صبیحہ اقبال کا افسانہ پسند آیا۔ "یہ شادی ہو کر رہے گی" "حریم ملک کی ہلکی پھلکی تحریر مزا دے گئی۔ مستقل سلسلے بھی بہت اچھے تھے۔ اب اجازت دیں اس امید کے ساتھ کہ میرا خط شامل اشاعت ضرور ہو گا باقی تفصیلی خط کے ساتھ ان شاء اللہ آئندہ ماہ حاضر ہوں گی۔

فرزانہ...... کراچی

جولائی کا کرن ملا ٹائٹل گرل بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ صبیح رحمانی کی حمد اور مضطر بخاری کی نعت دل و جاں کو معطر کر گئیں۔
انٹرویوز میں "نیلم منیر" سے ملاقات پسند آئی۔
اگلے ماہ اگر آپ ورسٹائل فنکار "عابد علی" سے ملاقات کروا دیں تو خوشی ہو گی۔ "مجھ سے ملیے" سلسلہ بہت پسند

آیا۔ اس سلسلے میں تمام پرانی مصنفین کے بارے میں جان کر خوشی ہوگی۔ معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گی "آواز کی دنیا سے" سلسلہ ہمیں پسند نہیں آیا، سلسلے وار دونوں ناول اچھے جا رہے ہیں۔ فوزیہ یاسمین تو دھماکے کر رہی ہیں۔ نبیلہ عزیز کا انداز بھی بہت اچھا ہے تینوں مکمل ناول اچھے تھے ضوباریہ ساحر کے ناول "اسیرِ موسمِ ہجراں" کا آخری حصہ پڑھ کر ہی تبصرہ کروں گی۔

افسانوں میں صبیحہ اقبال کا افسانہ بہت اچھا تھا۔ شاہدہ ملک نے بہت اچھی بات کہی کہ جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے حریم ملک کا ہلکا پھلکا افسانہ مسکرانے پر مجبور کر گیا میں پہلی بار آپ کے ڈائجسٹ میں خط لکھ رہی ہوں حوصلہ افزائی کی تو آئندہ بھی خط لکھتی رہوں گی۔

اُمِ رومان...... عبدالحکیم

کرن سترہ کو ملا۔ ٹائٹل بہت پیارا لگا۔ حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد فہرست دیکھی نایاب جیلانی، نبیلہ عزیز اور نازیہ کنول کے مکمل ناول دیکھ کے دل باغ باغ ہو گیا۔ لیکن سب سے پہلے ضوباریہ ساحر کا ناولٹ "اسیرِ موسمِ ہجراں" پڑھا۔ مسرت جہاں کا حال پڑھ کے بے حد افسوس ہوا۔ نجانے کب تک یہ مرد ذات بنتِ حوا کو محبت کے جال میں پھنسا کر نت نئے خواب دکھا کر بھٹکاتا رہے گا۔ لیکن انہیں بھی اپنی عزت کی پاسداری کرنی چاہیے تھی۔ کم از کم جو مرد سچی محبت کرے وہ کسی عورت کو بھاگ کر آنے کا مشورہ نہیں دیتا کیونکہ اسے اس کی عزت جان سے بھی پیاری ہوتی ہے جیسے عمیرہ احمد نے ٹھیک ہی کہا کہ "عورت کو محبت تو بہت سے مرد دیتے ہیں لیکن محبت کی ساتھ عزت بہت کم مرد دیتے ہیں" ضوباریہ جی! انتہائی سبق آموز ناولٹ ہے اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

اس کے بعد فوزیہ یاسمین کا "دستِ کوزہ گر" پڑھا جو کہ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا جا رہا ہے۔ نبیلہ عزیز کا ناول "درِ دل" بھی زبردست رہا علیزے کا ڈرائیور منصور حسین بھی بڑا دلچسپ کردار ہے نبیلہ جی! کیپ اٹ اپ بہت اچھا جا رہا ہے ناول پڑھ کے دل خوش ہو گیا۔

نبیلہ عزیز کا مکمل ناول "بے داغ" بھی بہت زبردست تحریر تھی۔ حد ہو گئی ان بھائیوں کی بھی جو بیویوں کی باتوں میں آ کر ہر رشتے کو بھول جاتے ہیں عذیر ہمدانی کا کردار

بے حد پسند آیا۔ نبیلہ جی! ایسے ہی زبردست ناول ہر بار ہمارے لیے لایا کریں آپ کے بنا تو ہمارا کرن ادھورا ہوتا ہے۔

نایاب جیلانی کا مکمل ناول "اور رے پیا" بھی بہت زبردست ناول ہے نایاب جی اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا اللہ تعالیٰ آپ کو اسی طرح لکھنے کی توفیق دے اور آپ کے پیارے بھائی کو جلد سے جلد رہائی دے۔ (آمین)

نازیہ کنول نازی کا "بات زندگی کی ہے" بے حد زبردست تحریر تھی عارضی دولت و شہرت کے لیے اللہ اور اس کے رسولﷺ کا دامن چھوڑنے والوں کا حال تو اس سے بھی برا ہونا چاہیے جتنا غلام عباس کی فیملی کا ہوا۔

اس کے بعد مستقل سلسلوں کی طرف آتی ہوں تو جناب اس بار بھی میرا کوئی شعر شاملِ اشاعت نہ ہوا بے حد افسوس ہوا "مجھ سے ملیے" میں شگفتہ بھٹی سے ملاقات بہت اچھی رہی "صدف عمیر" اور "میکال ذوالفقار" کے انٹرویوز اچھے لگے۔ "یادوں کے دریچے" سے سب کے انتخابات پسند آئے۔

اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے پیارے پاکستان کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے۔ اس کے تمام مسائل دور کرے اور ہمیں اچھے حکمرانوں سے نوازے، دہشت گردی اور ظلم سے پیارے پاکستان کو پاک کرے اور پیارے وطن کو ہزاروں جشنِ آزادی نصیب فرمائے (آمین) تمام قارئین کو جشنِ آزادی مبارک۔

حنا کاشف خان...... بستی بوہڑ ملتان

میں کرن، شعاع اور خواتین کی کتنی پرانی قاری ہوں اندازہ اس بات سے لگائیں کہ آج سے چند سال قبل پی ٹی وی پہ ڈرامہ "جناح سے قائد تک" چلا تھا اس کی ہیروئن کی تصویر ٹائٹل پر تھی اس وقت سے اب تک کا سفر نہایت تسلسل سے برقرار ہے پہلے بھائی اور اب میاں صاحب یہ ڈیوٹی بخوبی نبھا رہے ہیں۔

خیر اب آتے ہیں رسالے کی طرف فوزیہ یاسمین صاحبہ آپ کا ناول "دستِ کوزہ گر" آہستہ مگر بہت اچھا آگے بڑھ رہا ہے یہ میرا پہلا خط ہے شائع ہو گیا تو دوبارہ تفصیل سے لکھوں گی اب اجازت دیں۔

شمع علی...... فیصل آباد

میں یہ خط پہلی بار لکھ رہی ہوں مجھے کرن میں انٹرویو

ناولٹ، ناول سب بہت اچھے لگتے ہیں خاص کر نبیلہ عزیز کے ناولز، کرن کے ناولز کے اینڈ ہمیشہ اچھے ہوتے ہیں یعنی ہیپی اینڈنگ اور اس وجہ سے بھی میں یہ ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی ہوں آپ سے ایک درخواست ہے کہ آپ قارئین کی عدالت سلسلہ میں "عدنان جیلانی" کو بھی شامل کریں یا پھر ان کا انٹرویو "دو کا پہاڑہ" میں شائع کریں۔

سائرہ پرواعلی...... رجن پور

جولائی کا کرن ملتے ہی سب سے پہلے "درِ دل" کو پڑھا مدیحہ اور عدیل کا ٹکراؤ بے حد اچھا لگا۔ اب زری اور دل آور شاہ کو بھی ایک کر دیں نبیلہ جی اور میرا خیال ہے کہ منصور اور علیزے کا کپل بنے گا...!

پچھلے ماہ میں خط نہیں لکھ سکی تھی تو "گوشۂ عافیت" کا ذکر میں اب کر رہی ہوں۔ اس کی آخری قسط پڑھ کر بے انتہا رونا آیا۔ عصمہ میں مجھے اپنی جھلک نظر آتی ہے۔ یقین نہیں آیا، دلنشین اتنی جلدی اپنے پیار، اپنے محبوب شوہر وجیہہ کو بھول سکتی ہے۔ وجیہہ الحسن کی حالت نے خوب رلایا۔ وجیہہ الحسن جو اتنا قوی اور بہادر تھا۔ بولتا تو گویا بڑے بڑوں پر سحر طاری ہو جاتا آج وہ شخص خانہ کعبہ کے احاطے میں ملنگ بنا بیٹھا وارفتگی شوق سے کعبے کو تک رہا تھا اس نے عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کا سفر بہت جلد طے کیا تھا۔ شگفتہ بھٹی نے ایسا شاہکار تخلیق کیا ہے جو ہمیشہ ہمارے دلوں میں یاد بن کر چمکے گا۔

باقی ناولز ابھی پڑھے نہیں کیونکہ کچھ دن پہلے میری پیاری سی گڑیا ہوئی ہے۔ جس کا نام صالحہ علی ہے۔

صائمہ شاہین...... کری نہر، اسلام آباد

تبصرہ کرنے سے پہلے میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ پچھلے چھ سالوں سے میں کرن کی خاموش قاری ہوں پر قلم کو زبان اب دے رہی ہوں۔ اب آتی ہوں تبصرے کی طرف سرورق بہت اچھا تھا اس کے بعد فہرست تک پہنچے اور یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا کہ تین تین ناول وہ بھی میری پسندیدہ رائٹرز کے، فہرست دیکھنے کے بعد فوراً سلسلے وار ناول کی طرف چھلانگ لگائی سب سے پہلے "درِ دل" پڑھا ویل ڈن نبیلہ جی! آپ تو آج کل چھائی ہوئی ہیں میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں۔ جس رسالے میں آپ کا ناول دیکھ لیتی ہوں وہ پڑھ کر دم لیتی ہوں بلکہ پھر وہ رسالہ اپنے قبضے میں کر کے ہی چین آتا ہے۔ آپ کا ناول "رسم" مجھے

بے حد پسند آیا تھا آپ کی بہترین کاوش ہے بس آپ سے ایک ریکویسٹ ہے کہ ہر ماہ کرن کے لیے ایک اچھا سا ناول لکھ کر بھیجا کریں مہربانی ہوگی اس کے بعد "دستِ کوزہ گر" کی طرف آئے زبردست فوزیہ جی! ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔ بس اب جلدی سے نمل کی شادی خرم کے ساتھ کر دیں۔ اب ناولز کی طرف آتے ہیں نبیلہ آپی آپ نے اس دفعہ بھی دل کو چھوتی ہوئی تحریر لکھی ہے۔ پڑھ کر مزا آ گیا مجھے آپ کی کہانیوں کے ہیروز بہت پسند ہیں مضبوط قوتِ ارادی والے، نڈر اور بااصول۔

نازی آپی آپ کی بھی الگ ہی بات ہے آپ کا ناول "بات زندگی کی ہے" زبردست ناول تھا۔ نایاب آپی کا ناول ابھی پڑھا تو نہیں پر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ یہ ناول بھی آپ کی ہر تحریر کی طرح ٹاپ پر جائے گا۔ اب آتے ہیں افسانوں کی طرف ماشاءاللہ تینوں ہی زبردست تھے کسی ایک کو اچھا کہنا رائٹرز کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ مستقل سلسلوں میں یہ جو نیا سلسلہ "مجھ سے ملیے" کرن نے شروع کیا ہے۔ بہت ہی زبردست ہے اس طرح ہمیں اپنی پیاری پیاری رائٹرز کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے علاوہ "دو کا پہاڑہ" اور "قارئین کی عدالت" بھی دلچسپ سلسلے ہیں۔

"نامے میرے نام" میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ "مسکراتی کرنیں" اور "مجھے یہ شعر پسند ہے" بھی پسند ہیں۔ باقی تمام سلسلے بھی عمدہ ہیں۔ اب اجازت چاہتی ہوں میری دعا ہے کہ اللہ ہمارے پیارے پاکستان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

راشدہ راؤ...... بی ایم (13)

کرن حسبِ تاریخ گیارہ کو ملا۔ سب سے پہلے مستقل سلسلے کی طرف بڑھے "نامے میرے نام" میں اپنا نام نہ پا کر بہت تکلیف اور دکھ ہوا آپی اگر آپ نے اب کی بار بھی میرا خط شائع نہ کیا تو میں آئندہ ہرگز خط نہیں لکھوں گی۔ سب سے پہلے ہم حمد و ثناء کی طرف بڑھے اور دل کو ایمان کی روشنی سے منور کیا "مجھ سے ملیے" میں شگفتہ بھٹی کی باتیں پڑھ کر اچھا لگا۔ اس کے علاوہ مسلسل ناول میں "دستِ کوزہ گر" اور "درِ دل" بھی زبردست تھے اور اب تو یہ تیزی سے آگے بڑھنے بھی شروع ہو رہے ہیں تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اس کے علاوہ مکمل ناول "اور رے پیا" نایاب جیلانی کا زبردست ناول ہے اور اگلی قسط کا مجھے

شدت سے انتظار بھی ہے باقی کی رائے ناول مکمل ہونے کے بعد دوں گی باقی کے ناول بھی اچھے تھے۔ ضوباریہ ساحر کا ناولٹ بھی زبردست تھا اور "یہ شادی" حریم ملک کا افسانہ تو چھا گیا۔ واہ جی واہ۔ اس کے علاوہ کرن کے مستقل سلسلے لاجواب ہیں امید ہے آپ میرا خط ضرور شائع کریں گی۔ اب اجازت دیں آئندہ ماہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔

نوشین اقبال نوشی ...... گاؤں بدر مرجان

جولائی کے کرن کا ٹائٹل اچھا تھا۔ شگفتہ بھٹی سے ملاقات کر کے بہت ہی اچھا لگا۔ "دردل" نبیلہ عزیز بہت خوب صورت انداز میں کہانی کو آگے لے کر چل رہی ہیں کیپ اٹ اپ نبیلہ۔ "اورے پیا" نایاب جیلانی کا ناول پڑھا پر باقی آئندہ دیکھ کر مزا کر کرا ہو گیا۔ تبصرہ بھی اب آئندہ کریں گے۔ نازیہ کنول نازی کا ناول "بات زندگی کی ہے" بہت ہی شاندار لگا۔ عمدہ تحریر تھی نازی کی "بے داغ" نبیلہ عزیز تو ہر بار اتنا اچھا لکھتی ہیں کہ میدان مار لیتی ہیں۔ "اسیر موسم ہجراں" ضوباریہ ساحر جی ویل ڈن مکمل تبصرہ اگلے ماہ آخری قسط پڑھ کر کروں گی اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ "گردش دوراں" شاہدہ ملک اور "بلا عنوان" صبیحہ اقبال نے بہت ہی اعلا لکھا۔ بلاشبہ یہ دونوں افسانے پورے رسالے کی جان تھے۔ "یہ شادی ہو کر رہے گی" حریم ملک کی ہلکی پھلکی تحریر مزا دے گئی۔ بھرپور تبصرے کے ساتھ ان شاءاللہ پھر اگلے ماہ حاضر ہوں گی بشرطیکہ کرن جلدی اور ٹائم سے مل گیا تو۔ اپنا بہت سارا خیال رکھیے گا اور مجھے دعاؤں اور دلوں میں یاد رکھیے گا۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ، عمران بٹ ...... گجرات

جولائی کا کرن عمران صاحب نے بڑی منتوں کے بعد لا کر دیا۔ حسب عادت حمد و ثنا سے دل و روح کو معطر کیا انٹرویوز بھی ابھی سرسری پڑھے ہیں۔ خط لکھنے کی ایک اور وجہ بھی ہے شگفتہ بھٹی صاحبہ کا انٹرویو۔ شگفتہ صاحبہ اپنی تحریروں کی طرح اجلی اجلی سادگی سے پرنور چہرے والی خاتون اچھی لگیں۔ ان کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا اور [illegible] پروقار بھرے چہرے کے ساتھ۔ جن کا ظاہر و باطن ایک ہو [illegible] والی شخصیت کے مالک [illegible] قارئین کو وسعت عطا فرمائے۔

"قارئین کی عدالت [illegible]

وائف کو بھی لائیے۔

سب سے پہلے نبیلہ عزیز کا مکمل ناول "بے داغ" پڑھا اور پڑھ کر دل شاد ہو گیا۔ بہت عمدہ تحریر تھی۔ زرقون اپنے ماں جائی کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوئی۔ یہ تو زرقون کی خوش قسمتی تھی جو وہ بھابھی کے پلان کا حصہ نہ بنی۔ ورنہ تو اس کی بھابھی نے اسے تباہ کرنے کا پورا انتظام کیا تھا۔ مگر زرقون کو اللہ کا سہارا کافی تھا۔ زرقون کا بھائی کانوں کا کچا تھا خود کا بھی نقصان کیا اور اپنی بہن کو بھی مشکل میں ڈالا یہ تو زرقون کی خوش قسمتی تھی کہ عذیر جیسے شخص کو ملا دی۔

نایاب جیلانی کا "اورے پیا" بھی بہت اچھا تھا۔ خاص کر ہیرو کا نام ماہیر اچھا لگا اور ماہیر کی شرارتیں بھی۔ حریم اور ماہیر کی اتنی اچھی جوڑی ہیں۔ پلیز۔ اب کوئی ولن ان کی ہنستی مسکراتی زندگی کو ڈسٹرب نہ کرے۔ پہلے کیا کم ہے نند اور ساس صاحبہ جو حریم کو ہر وقت ہراساں کیے رکھتی۔ بے شک ماہیر کی پچھلی زندگی کو دہرا دے۔

دوسرا مکمل ناول "بات زندگی کی ہے" نازیہ صاحبہ یہ تحریر معاشرے کی عکاس ہے یہی کچھ تو آج کل ہم نام نہاد مسلمان کر رہا ہے۔ جنہوں نے اپنے ضمیروں کے تو سودے کر رکھے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں' ان کی راہیں کھوٹی کرتے ہیں۔ ایمان نے ہر مشکل پر اپنا ایمان قائم رکھا اور اس کے رب نے اسے تنہا اور مایوس نہیں کیا۔ بندہ ہمت نہ ہارے تو اس کا رب بھی اسے تنہا نہیں چھوڑتا اور یہی کچھ ایمان نے کیا اور مصنف جیسے پاک باز انسان کا ساتھ دیا۔

بے شک مصنف ایک گمراہ اپنے اللہ سے بے نیاز شخص تھا۔ ایمان کی کردار کی مضبوطی اور اللہ کی مہربانی سے ظاہر و باطن کو تبدیل کر دیا' قسمت والوں کے مقدر میں فلاح لکھی ہوتی ہے۔ جو بدنصیب ہوتے ہیں وہ غلام عباس جیسے ہوتے ہیں۔ جو اپنا اور اپنی اولاد کا سودا دنیاوی آزمائشوں سے کرتے ہیں اور تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتے ہیں۔

"گردش دوراں" شروع میں مائی سکھاں پہ بڑا ترس آیا۔ قریب تھا کہ اپنے رحم دل ہاتھوں ایک دو آنسو بھی بہا [illegible] کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو رہی ہیں مگر [illegible] عمل کا نتیجہ ہے جو مائی سکھاں [illegible] اپنی اولاد کے سکھ کے لیے [illegible] یہ اولاد اس کو سکھ دے

☼ ☼